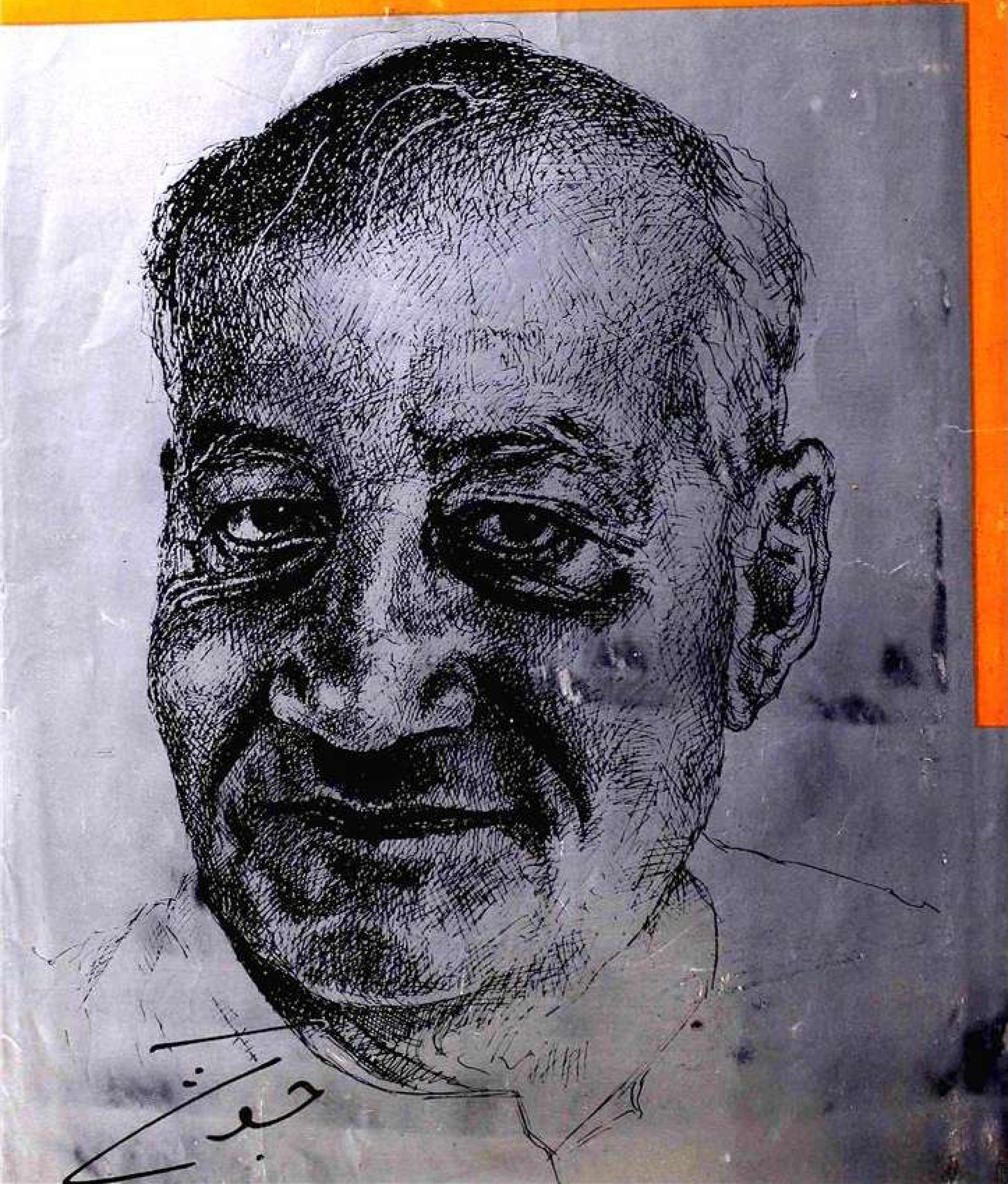
یادوں کی برات



یادوں کی برات ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ اِس مرقعے میں آپ کو وادیٔ گنگ و جمن اور سرزمینِ دکن کے قدیم و جدید معاشرے کی خوشنما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنّف نے اپنے ایّامِ طفلی و جوانی کے خوش حال طبقوں کی سماجی قدروں پر، ان طبقوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدوں اور وہموں پر، ان کے شوق اور مشغلوں پر، ان کے تیوہاروں اور تقریبوں پر، ان کے رہن سہن اور رسوم و رواج پر روزمرّہ کے واقعات کے حوالے سے بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔

یادوں کی برات جوشؔ ملیح آبادی کے ستّر سال کے تجربوں اور مشاہدوں کی برات ہے۔ اس برات میں فکر و نشاط کی شہنائیاں بجتی ہیں جنون و حکمت کے زمزمے گونجتے ہیں۔ رامش و رنگ کی محفلیں سجتی ہیں۔ لالہ رُخوں کے لب و عارض کی دل نشیں حکائتیں بیان ہوتی ہیں۔ یارانِ میکدہ کی محبتوں اور بے مہریوں کے قصّے سنائے جاتے ہیں اور اربابِ ثروت و سیاست کی تنگ حوصلگیوں کے تذکرے چھِڑتے ہیں۔ شاعرِ امروز و فردا کی یادوں کا یہ قافلہ کبھی کہکشاں سے ہو کر گزرتا ہے اور کبھی بحرِ ظلمات سے، لیکن مسرّت کی خیرہ سامانیوں سے اُن کے ایمان و یقین میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ طوفانِ حوادث کی تیرگیوں سے اُن کے پائے صداقت ڈگمگاتے ہیں۔ اُن کا کاروانِ حیات خرد کی مشعل لیے اور انسان دوستی کے رجز پڑھتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

قیمت =/ ۳۰ روپئے

سرورق - اقبال مہدی



یادوں کی برات

جوش ملیح آبادی

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے محسن اور دوست

روشن علی بھیم جی کی ذاتِ گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔

ناشر : جوشؔ اکیڈمی ۲/۴ اکبر روڈ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۰۲، کراچی ۳

طابع : مشہور آفسٹ پریس کراچی

اشاعت : ۱۹۷۰ء

کتابت : اظہر عباس جعفری

قیمت

مجلد : لائبریری ایڈیشن =/۳۰ روپے

عام ایڈیشن =/۱۵ روپے

فہرست

میرا خاندان

میرے چند قابلِ ذکر احباب

میرے دور کی چند عجیب ہستیاں

میرے معاشقے

اطراف و جہات کو مُرتّب کرلے
رُوداد حیات کو مُرتّب کرلے
اِس سے پہلے کہ بھُول جائے سب کچھ
یادوں کی بَرات کو مُرتّب کرلے

یک جاہے، تمام آفرین و توبیخ
دل داریٔ ناہید و جفائے مریخ
آنکھوں میں ہیں یادِ ایں و آں کے آنسو
قطرۂ طوفان کی لکھ رہے ہیں تاریخ

زندگی، خوابِ پریشاں ہے کوئی کیا جانے
موت کی لرزشِ مژگاں ہے کوئی کیا جانے
رامش و رنگ کے ایوان میں، لیلائے حیات
صرف اک رات کی مہماں ہے کوئی کیا جانے
گلشنِ زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں
دجلۂ خونِ رگِ جاں ہے کوئی کیا جانے
رنگ و آہنگ سے سجتی ہوئی یادوں کی برات
رہ روِ جادۂ نسیاں ہے کوئی کیا جانے

از منِ بے عاقبت، آغازِ ہستی رامپرس
کز گراں خوابی، سرِ افسانہ راگم کردہ اَم

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

یہ بھی اک دن خواب ہو جائے گا، وہ بھی خواب تھا

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

چند ابتدائی باتیں

سب سے پہلے یہ باتیں سُن لیجیے، ان سے، آگے چل کر، میرے سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی:-

(۱)

میں نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں، کامل چھ برس تک، زیادہ تر مسلسل، اور گاہ گاہ غیر مسلسل، عرق ریزی کی ہے۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسوّدہ طیار کیا، اُسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسوّدہ مکمل کیا، اُس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا، پھر ڈیڑھ پونے دو سال صرف کر کے، نو سو صفحوں کا تیسرا مسوّدہ تحریر کیا، اور تین ہزار میں اُس کی کتابت بھی مکمل کرالی، مگر جب اُس پر غائر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ اس مسوّدے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے، جو صبح

کو بیدار ہوکر، رات کے خواب کو، اس خوف سے، جلدی جلدی، اُلٹا سیدھا، لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔

اور خُدا خُدا کرکے، اب یہ چوتھا مسوّدہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا ہے کہ، دو برس مزید عرق ریزی کرکے، پانچواں مسوّدہ لکھوں، اور اسے بھی قلم زد کر دوں

اور، اُس کے ساتھ ساتھ، یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت، سر پر آپہنچا ہے، اور: "جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا" کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آرہی ہیں، اور یہ مصرعہ کہ :۔ نسیم، جاگو، کمر کو باندھو، اُٹھاؤ بستر، کہ رات کم ہے" دل میں گونجتا رہتا ہے، اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ——— تحریر ہی میں خدا کے فضل وکرم سے، موت آجائے، اور مسوّدہ نا تمام پڑا رہے اس لئے اب جیسا بھی ہے، یہ چوتھا مسوّدہ پیش کر رہا ہوں۔

(۲)

حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا ——— کئی مہینے کی بات ہے کہ، تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا، وہ تو کہیئے ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے، میں نے اُن سے پوچھا کہ یہیں کہیں، برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے، کیا آپ اُس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا کیا آپ جوشؔ صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا ——— اور رخصت ہوتے ہوئے اُنھوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر

میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا، میرا نام نصیر احمد ؟ ہے، جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور، میں نے، فرطِ شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوشؔ ہوں۔

اور تو اور، آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی، تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی، دل دُھڑ دُھڑ کرنے لگا، اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آجاتا، تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا۔

میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی، یا تقدّم و تأخر نظر آئے، تو آپ اُسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں، اور میری حالت پر ترس کھا کر، اُسے معاف کر دیں۔

(۳)

حالات قلم بند کرنے کی جگر کاویاں

پچھتر برس کی، پہاڑ سی زندگی کا احاطہ کرنا، بچوں کا کھیل نہیں۔ میں نے، بجھے ہوئے حافظے کے، تہ در تہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں، ٹٹول ٹٹول کر، یہ سفر طے کیا ہے۔ اُن اندھیاروں میں میرے حالات اس قدر اُلجھے، اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ملے کہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون واقعہ مقدّم ہے، اور کون مُؤخر، اور نسیان کا غول بیابانی مجھے کس طرف لئے جا رہا ہے، میں، پھونک پھونک کر، قدم رکھتا، آگے بڑھتا رہا، اپنی پیری کو لڑکپن کی سرحدوں تک کھینچ کرلے گیا، لڑکپن سے ریعانِ شباب کی جانب باگ موڑی، ریعانِ شباب سے، بھرپور جوانی اور جوانی سے، ادھیڑ عُمر کے کوہ و بیابان طے کرتا ہوا بڑھاپے کے اس بیہڑ تک آگیا۔ کیا بتاؤں اس جاں کاہ سفر میں کیا کیا جتن کرنا پڑے —— میں نے اپنے بڑھاپے کو، بچہ بنا کر، اپنے ماں باپ کے آغوش میں بٹھایا،

اپنے گھر کی انگنائی میں کُلیلیں کیں، پُرانی برساتوں کو جگایا، اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا، اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا، اپنے، موت کی نیند سوئے ہوئے، مُوّر خانِ شباب کے شانے ہلائے، اپنے دُور افتادہ دوستوں کو، اشاروں سے، قریب بُلایا، اپنے جوانی کے شبستانوں میں پہنچا، جہاں زلفوں کی شمیم اب تک مچل رہی ہے، اور ٹوٹے پیمانوں اور بجھی شمعوں کے انبار لگے ہوئے، اور گیسوؤں سے گری ہوئی افشاں کے ذرّے اب تک دُمک رہے ہیں، وہاں پہنچ کر اپنے بچھڑے ہوئے معشوقوں کو اس مسند پر بٹھایا قوسِ قزح اور کاہکشاں کے رنگ جس کا طواف کیا کرتے تھے — اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا تو، قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر، سب کچھ قلم بند کرلیا — اور آپ کو سُنانے بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں لکھنؤ میں ایک بوڑھے میرزا صاحب رہتے تھے، جنھوں نے حضرتِ جانِ عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں، ایک بار چند نوجوانوں نے اصرار کیا کہ میرزا صاحب قبلہ کچھ پُرانے حالات سُنائیے، انھوں نے، سینہ پیٹ کر کہا لِلّٰہ مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی، تمھاری تھوڑی دیر کی دل چسپی، ہو جائے گی اور میں پہروں کے لئے بیکار ہو کر رہ جاؤں گا، لیکن جب ان نوجوانوں نے ان کے قدم پکڑلئے، تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے، اور حالات سُناتے سُناتے، تھوڑی دیر میں ان کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رُندھ گیا، ہچکیاں لے لے کر رُونے لگے، اور "ہائے جانِ عالم" کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔ سو، بندہ پرور، اپنا حال سُنا کر، میں بھی، اسی طرح، ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہوں۔ ہائے ماضی کے ڈنک!!

اپنے، کبھی کے رنگ محل میں، جو ہم گئے
آنسو ٹپک پڑے، در و دیوار دیکھ کر

---

(۴)

خودکشائی

میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں :- شعرگوئی ۔عشق بازی ۔علم طلبی ۔ اور، انسان دوستی ـــ ان سب کو، سلسلہ وار، دیکھ لیجئے :- تاکہ آپ سمجھ لیں کہ میں کیا ہوں ۔

۱۔ شعرگوئی ـــ میں نے شاعر بننے کی تمنّا کبھی نہیں کی، بلکہ ۔ شعر، خودخواہش آں کردکہ گردد فنِ ما ۔ میں شاعری کے پیچھے نہیں دوڑا، شاعری نے خود میرا تعاقب کیا، اور، نو برس کی عمر ہی میں مجھ کو پکڑ لیا ۔ اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے، تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں، اور وہ اگر کوئی بُری چیز ہے، تو خدا کی قسم، میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں ۔

بار ہا گفتم و بار دگرے می گویم
کہ من دل شدہ ایں راہ نہ خود می پویم
در پسِ آئینہ، طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت، بگو، می گویم

شاعری، میری حاکم ہے، میں محکوم ۔ وہ جابر ہے، میں مجبور، وہ قاہر ہے، میں مقہور، وہ آمر ہے، اور میں مامور ۔ شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک خالص دینی مصلحت کی بنا پر، جس کی شرح کا یہاں موقع نہیں، یہ عجیب کُلّیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا، جو "بالقصد" کہا گیا ہو ـــ اگر یہ کُلّیہ تسلیم کر لیا جائے، تو چوں کہ میں نے آج کی تاریخ تک، ایک مصرع بھی "بالقصد" موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس لئے آپ کو اختیارِ کامل حاصل ہے کہ میرے تمام کلام کو، شاعری سے کُلّیتہً خارج فرما کر، میرے غیرِ شاعر ہونے کا اعلان فرما دیں ۔ میں خوش، میرا خدا خوش ۔

آپ نے مجھ کو شاعر ہونے کا انعام ہی کب دیا تھا کہ اب مجھے نا شاعر تسلیم فرما کر، اس انعام سے محروم فرما دیں گے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور بھی سُن لیجئے —— شاعری وہ بد بلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دَور کے سب سے بڑے شاعر ہو، اور اسی لیے باورچی ٹولے کا ہر لونڈا، اپنے کو نعمت خانِ عالی سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

جھُوٹ کیوں بولوں، میرے گوشِ مبارک میں بھی، شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضورِ اقدس و اعلیٰ، اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعرا ہیں —— لیکن، قوت و حیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے، اور وہ مجھ سے، نہایت سنجیدگی و دیانت کے ساتھ، کہتی ہے کہ خاں صاحب بہادر انائے شاعری کے فریب میں نہ آجایئے گا۔ اور وہ جو کچھ کان میں پھونک رہی ہے، اُس سے پھُول نہ جایئے گا۔ بے شک یہ ہوسکتا ہے کہ آپ شاعر، یا بہت بڑے شاعر ہوں، لیکن، اُس طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ، معمولی شاعر، بُرے شاعر، یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں۔ اس لئے دانائی یہی ہے کہ ابھی آپ اپنے باب میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

ذہنِ انسانی میں عملِ ارتقا، برابر جاری ہے، آپ کی موت کے سو، ڈیڑھ سو برس کے بعد، نقادانِ ادب کا ذہن اُس سطح پر آجائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔ اس لیے، سرِدست، دانش مندی یہی ہے کہ آپ گومگو میں رہیں عقل کا مشورہ باون تولے، پاؤ رتی کا ہے، اس کی معقولیت میں شُبہ کرنا حماقت ہے لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہُوا ہوں، ایک طرف کھوکلا انائے شاعرانہ ہے، ایک طرف ٹھوس عقلِ سلیم۔ جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو، اکڑ کر، باون گز کا ہو جاتا ہوں، اور جب عقل کی جانب سے ڈانٹ پڑتی ہے، تو، سُکڑ کر، بالشتیا بن جاتا ہوں۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے۔

۲۔ عشق بازی —— ہوش آتے ہی، اچھی صورتیں میری نگاہوں کو، اپنی طرف

کھنچنے لگی تھیں، اور یہ شعر، سب سے زیادہ مجھ پر صادق آتا تھا کہ:

ہوئے جوان، تو، مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو، موت ہی آئی، شباب کے بدلے!

یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا ایک بہت بڑا فریب ہے، جو اس لئے دیا جاتا ہے کہ انسان، افزائشِ نسل کے توسط سے، موت کے مقابلے میں حیات پیدا کرتا رہے۔ اپنے وجود میں کمی، اور آبادی کے تن و توش میں اضافہ کرے، اپنی جوانی گھالے، اور فطرت کے بچّوں کو، اپنا بچہ سمجھ کر پالے، اپنا جوہر گھٹائے، دنیا کی رونق بڑھائے، اور جب تک جوان رہے،

مرا، مہرِ سیہ چشماں، ز سَر بیروں نہ خواہد شُد
قضائے آسمانست ایں و دیگر گوں نہ خواہد شُد

کے نعرے لگاتا رہے۔ اور پھر، مرتے دم تک، شیرہ ٹپکی ہوئی جلیبی کی طرح پڑا رہے۔

"لیکن یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی ہے۔ کل دورِ عشق میں روتا تھا، اب عہدِ عقل میں اپنے پر ہنستا ہوں۔ لیکن اب کیا فائدہ" جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ چالاک فطرت، دھوکا دے کر، مُسکرا رہی ہے اور میں، ایک فریب خوردہ انسان کے مانند، جھینپا ہوا بیٹھا ہوں:۔

پر جھڑ گئے، دُم گر گئی، پھرتے ہیں لنڈورے

لیکن ماہ رُخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہو گی اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر، میں آدمی بن نہیں سکتا تھا، میرا تمام کلام، اور بالخصوص جمالیاتی شاعری کی کج کلاہی انھیں متوالیوں اور مُدھ ماتیوں کی جُوتیوں کا تصدّق ہے، اگر اُن کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے، گداختگی نہ پیدا کر دیتے تو، خدا کی قسم، مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد ہی بنا رہتا۔

میں نے کوئے بتاں میں، جس قدر بھی اپنی دولت، صحت، جوانی اور زندگی

مٹھیاں بھر بھر کر، لٹائی ہے، اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کر چکا ہوں، اور مُکھڑوں کے خدوخال چُن چُن کر، میں نے، اپنے گردوپیش اس قدر عظیم سرمایہ جمع کر لیا ہے، جسے آج تک، گھر بیٹھے، کھا رہا ہوں، اور، مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔!

ربِّ شباب کی سوگند کہ آج بھی جب کسی نُکیلے مکھڑے کو دیکھ لیتا ہوں، وہ مُکھڑا اَنی بن کر، میرے سینے میں، کُچ سے، چُبھ جاتا ہے۔

جانتا ہوں کہ بدتوفیق صالحین، میری یہ بات سُن کر، مُنھ بنائیں گے، لیکن ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں، لیکن بحمداللہ کہ میرا نامہ اعمال ابھی تک سیاہ ہے۔ اور آج بھی یہی کہہ رہا ہوں

گرچہ پیرم، تو چُناں تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ، ز کنارِ تو، جواں برخیزم

۳۔ علم طلبی —— عشق کی طرح، مجھ کو حصول علم کا چسکا بھی لڑکپن ہی سے تھا۔ میرے باپ چاہتے تھے کہ مجھ کو گھر کے مکتب ہی میں پڑھائیں، اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں، لیکن میں نے اتنا مہنامت مچایا کہ، وہ مجھ کو باہر بھیج کر، پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی، تو دیگر رئیس زادوں کے مانند جاہل رہ جاتا۔ میں نے، بچپن میں بھی کوئی کھیل نہیں کھیلا، اور ہوش آتے ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جوانی کی اندھیری برساتوں میں بھی، ہر چند میری جھنجھناتی راتیں، سارنگیوں کی رُوں رُوں، مجیروں کی کھن کھن طبلوں کی ٹکوروں اور گھنیری زلفوں کی مہکتی چھاؤں میں پینگ لیا کرتی تھیں، لیکن میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعر کی تخلیق، اور علما و شعرا کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔ اور جب دن کے وقت میرے منچلے دوست راش و رنگ کی دعوت دیتے تھے تو میں اُن سے کہا کرتا تھا کہ یاروں کا تو یہ اٹل اصول ہے کہ دن کو سولجر[۱] (سپاہی) بنے رہو، اور رات کو لوفر[۲] (اوباش)۔

۱؎ soldier ۲؎ Loafer

میرے دل میں، جوانی آتے ہی، دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور، میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض "مُسلّمات کا مذاق اُڑاتا ہوں، تو اُنھوں نے میرے منھ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تو، آگے چل کر گُم رُاہ ہو جائے گا (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا' اور میں "گُم رُاہ" ہو گیا۔ اُسے فضل کرتے نہیں لگی بار)۔

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکّر کی ابتدا ہوئی تھی۔ تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ ہیں کیا، ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے، انھیں کس نے بنایا ہے، اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے، بچوں کا دل موہ کر، اُن سے پوچھتے ہیں ننھّے میاں بھلا بتاؤ تو ہم کیا ہیں۔

جب سن آگے بڑھا، فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا، پورے نظامِ شمسی پر نظر پڑنے لگی، اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ علّت العلل کا سُراغ لگاؤں، ذات وصفات کے تمام مسائل کو اُلٹوں، پلٹوں، پگھلاؤں، کھُرچوں، کُریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھٹکوں، اُساؤں، چھُوؤں، چکھوں، سُونگھوں، بُلواؤں، سُنوں اور دیکھوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھاتا تھا، تو بار بار یہ سوال دل کو برمانے لگتا تھا کہ اَرے یہ سب کچھ ہے کیا؟ یہ سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی؟ یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے، یا کسی اندھی توانائی کی فقط اُچھل کود؟ اور یہ سب کچھ آخر ہے کیوں، اس کی پُشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں۔؟ اور، اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارہ مغرور اس قدر پائمال و معتوب کیوں ہے۔

میں نے ان مسائل پر غور کیا، بار بار غور کیا، دم گھٹنے کی حد تک غور کیا —— اس کوچے میں برسوں پاپڑ بیلے، کتابوں پر کتابیں پڑھیں، ہندو مسلم، یہودی، زرتشتی، بُدھی، جینی، اور عیسائی علماء کے سامنے برسوں، دریوزہ گروں کے مانند، کاسۂ

گدائی بڑھایا، علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑگڑا، گڑگڑا کر، دامن پھیلایا، لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اُس کے بعد، مدعیانِ معرفت یعنی صوفیا، و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے ان کی جوتیاں سیدھی کیں، لیکن، چند اشراقی اشاروں کے سوا، کچھ بھی پلّے نہ پڑا۔ اور وہ اشارے بھی کیا، سارے کے سارے وجدانی فریب۔

اس طرح عمر گزرتی، اور جوانی ڈھلتی گئی، اور، آخر کار، پیری آگئی۔ پیری آتے ہی، سر کے بال گر گئے، اور کھوپڑی میں آگاہی کا اکھوا پھوٹ آیا، ناتوانی نے، توانائی پیدا کر دی، اور، بالآخر، میں نے علم کے قلعے کو فتح کر لیا، آپ سمجھے کیوں کر؟ یعنی مجھے اس بات کا پورا پوُرا علم حاصل ہو گیا کہ میں جاہل، نرا کاجل اور بے پناہ جاہل ہوں۔

بندہ نواز، ارتقا کی اس ابتدائی طفلانہ و تاریک منزل میں، ایک نیم وحشی انسان کو اپنے جہل کا پتا چل جانا ہی سب سے بڑی سعادت ہے

سُن ہو گئے کان، تو سماعت پائی — آنکھیں پتھرائیں، تو بصارت پائی
جب، علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم — تب، دولتِ عرفانِ جہالت پائی

گواہ رہنا اے زمین و آسمان کہ میں نے علم کو ڈھونڈا، لیکن پایا نہیں، میں جاہل پیدا ہوا تھا، اور جاہل ہی مروں گا۔ تجھ پر ہزار افسوس اے "خلیفۂ رحمٰن" اے ظلوم و جہول انسان!!

۴۔ انسان دوستی —— (الف) ہاں انسان۔ کرۂ ارض کی جان —— انسان دشمنی، عظیم عدوان —— حبِ انسانی، عین ایمان۔ انسان کا چہرہ، گیتا اور قرآن۔ اور لا سلطان الا الانسان!

اے مجھے "کافر باللہ" کہنے والو، تم کو معلوم نہیں کہ یہ "کافر" مومن بالانسان ہے۔ خود تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت، سے یہ بعید نہیں کہ وہ کافروں کو، معاف کر دے، لیکن، حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں، خدا نے اپنا اقتدار بندوں کو بخش دیا ہے، اور جب تک مظلوم، اپنے ظالم کو معاف

نہیں کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا ۔ کافر باللہ کے لیے تو :-

شنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم

بداں را ، بنیکاں بہ بخشد کریم

کا سہارا موجود ہے ، مگر کافر بالانسان کے واسطے ، جب تک کہ انسان اس کو معاف نہ کر دے ، بخشش کا کوئی امکان ہی نہیں ہے دوستو ، انسان دوستی ، کوئی ہنسی کھیل نہیں ۔ اس کوچے میں ، ہر قدم پر ، خون تھوکنا پڑتا ہے ۔

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تمھاری نیتِ مجاہداتِ نفس کے سامنے حوُر و قصور اور کوثر و طہور کے پرے جمے ہوئے ہیں ۔ لیکن میرے جذبۂ حُبِّ انسانی کی گلی ، حوران مقصورات کے خیموں کی طرف نہیں مُڑتی ، براہِ راست دار کی طرف جاتی ہے ۔

جی ہاں میں خود اپنے تجربوں کی بنا پر اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ عشقِ شہوانی[1] بھی ایک ایسی بلائے بد ہے کہ انسان ، بلبلا اُٹھتا اور یہ کہتا پھرتا ہے :-

وہ نہیں بھولتا ، جدھر جاؤں

ہائے میں کیا کروں ، کدھر جاؤں

اور ایک عشق کی ماری نعرہ زن ہوتی ہے

جو سکھی میں جانتی کہ پِیت کرے دُکھ ہوئے

نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

لیکن عشقِ شہوانی اور حُبِّ انسانی کے شدائد کو جب تولا جائے تو عشق کا پلّا ، آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے اور حُب کا پلّہ زمین سے جنبش نہیں کرتا ۔ عشق ، ایک آنی تشنج ہے جسم کا ، اور حُب ، ایک ابدی اضطراب ہے رُوح کا ـــ عشق کا تعلق ہوتا ہے ، صرف ایک

---

[1] شہوانی کے علاوہ ، عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے ، اور جسے "پاک عشق" کہا جاتا ہے وہ بھی جذبۂ شہوانی کا ایک ایسا شدید تموّج ہوتا ہے کہ آدمی سُن ہو کر رہ جاتا ہے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا ۔[2] اے سکھی اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ عشق کرنے سے دکھ ہوتا ہے تو میں سارے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتی کہ کوئی عشق نہ کرے (میرا بائی)

ذات، یعنی محبوب سے اور حُب کا تعلق ہوتا ہے، روئے زمین کے اربوں انسانوں سے —— عاشق اپنی جنسی تسکین چاہتا ہے، اور، محبّ انسان، تمام دُنیا کے افراد کی تسکین کا طلبگار ہوتا ہے۔ عاشق پر جب معشوق مہربان ہو جاتا ہے تو اُس کے دل کی آگ بجھ جاتی ہے، لیکن محبِّ انسانیت کو روزگار، مہربان ہو کر جب کسی نعمتِ خاص سے نوازتا ہے، تو وہ چاروں طرف، گھبرا کر دیکھتا ہے کہ دوسروں تک بھی وہ نعمت پہنچی کہ نہیں، اور جب اوروں کو اس سے محروم دیکھتا ہے، تو عین محلِ شکر میں وہ شکایت کرتا، اور چیخ اُٹھتا ہے:۔

صد رفیق و صد ہمدم، پر شکستہ و دل تنگ

داورا نہ می زیبد، بال و پر بمن تنہا!

اور، خوب کان کھول کر، یہ بھی سُن لیجئے کہ عشق کا عقاب اُترتا ہے قیس و فرہاد کے سروں پر، اور حُبِّ انسانی کا قرآن نازل ہوتا ہے رحمۃً اللعالمین کے دھڑکتے ہوئے دل پر۔ ببیں تفاوت رہ، از کجاست، تا بکجا۔ پہلے میں عشق کے موذی مرض میں گرفتار تھا اب حب انسانی کے مہلک مرض کا صید زبوں ہوں، کل محبوب کی مفارقت میں تکیے بھگویا کرتا تھا، اب انسان کے مصائب پر رویا کرتا ہوں۔

ہر چند مستقبلِ انسانی بے حد روشن ہے، اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی، یہ درندہ آدمی، انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا، نہ عدالتیں ہی رہیں گی، نہ فوجیں، نہ پولیس، نہ اسلحہ سازی کے کارخانے، پیری، مستقل جوانی بن جائے گی، اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا، زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا، شمس و قمر ہمارے پاؤں چُومیں گے، ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے، اور قوائے کائنات، خدمت گاروں کے مانند، ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے۔ لیکن اس میں لگیں گے ابھی لاکھوں سال جب کہ میری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی۔

اس تصوّر سے، جو ایک دن ایک ٹھوس حقیقت بننے والا ہے، ہر چند میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے، پھر بھی یہ خلش رہ جاتی ہے کہ:۔

ہم نے مانا کہ کل وہ آئیں گے
عقل حیراں ہے، آج کیا کیجے

آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے — چھوٹے کُنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں، اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے، اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور مجھ نامُراد کا کنبہ تو ساری دُنیا کا احاطہ کئے ہوئے ہے، غور فرمائیے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔

جب کسی مفلس کے گھر کے چولھے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دُھواں اُٹھنے لگتا ہے، جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں، میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں، جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے، میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور، جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ہر چند امریکہ ظالم ہے، اور ویٹ نام مظلوم، لیکن ویٹ نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں، امریکہ کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بدبخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

(ب) اس درد مندی کا دوسرا پہلو بھی مُلاحظہ فرمایئے۔

یہ ایک، ناقابلِ ابطال حقیقت ہے کہ انفس و آفاق یعنی تمام ذی حیات و غیر ذی حیات، واحد العناصر، واحدُ الخمیر، واحدُ القوام، واحدُ العلت، واحد النسل، اور واحدُ الاصل ہیں، اور اس طرح واحدُ النسل ہیں، جس طرح پلاسٹک کے کھلونے، اور پلاسٹک کے پھول، ہر چند اسماء، اشکال اور اجسام کے اعتبار سے تمام کھلونے اور تمام پھول، ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف و متضاد نظر آتے ہیں، لیکن اگر انھیں پگھلا دیں گے تو پلاسٹک کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی قیامت تو یہ ہے کہ جاہل، ہوس پرور اور لیئم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر، انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

فوجی درندگی کے بل بوتے پر، فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو، ثقافت، لسان، اوطان، اور ادیان میں اُلجھا کر، چھوٹی چھوٹی، بر سرِ جنگ، ٹولیوں میں، تقسیم کر دیا جائے، اور پھر، بڑے اطمینان کے ساتھ، اُن پر فرماں روائی کی جائے۔

انھوں نے، انتہائی بد دیانتی کے ساتھ، "بین الاقوام" کی ترکیب تراشی ہے، اور نوعِ انسانی کو، جو مشرق سے لے کر مغرب تک صرف ایک قوم ہے، زبانوں، وطنوں، دینوں اور رنگوں کی آویزشوں میں مبتلا کر کے، پوری دُنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، ان ظالم مسخروں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ :-

لفظِ "اقوام" میں، کوئی جان نہیں ‏ ‏ اک نوع میں ہو دوئی، یہ امکان نہیں
جو، مشرکِ یزداں ہے، وہ ناداں ہے، فقط ‏ ‏ جو، مشرکِ انساں ہے، وہ انسان نہیں

لُطف تو یہ ہے کہ وہ بانیانِ فساد، خود تو سلامتی کے گوشوں میں دبکے بیٹھے ہیں، اور، روٹی کی خاطر، اپنے بھائیوں کی جانیں لینے والی فوجوں کو للکار دیا ہے کہ وہ خون کی ہولی کھیلتے پھریں۔

منہ پیٹنے کی بات تو یہ ہے کہ ان روٹی کے مارے، اور حب وطن کے فریب کھائے ہوئے سپاہیوں کو، جن کی کہنیوں سے ان کے بھائیوں کا تازہ خون ٹپک رہا ہے، فیلڈ مارشل، قومی ہیرو اور غازئ اعظم کے خطابات مرحمت فرمائے جا رہے ہیں۔ جہالت کی لے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں آچکے ہیں کہ ہم پاکستانی، ہندوستانی، افغانستانی، ترکستانی، اور انگلستانی ہیں، اور، اسی کے ساتھ ساتھ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ میں ہندو ہوں، مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، زرتشی ہوں، یہودی ہوں، لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور اُجاگر ہی نہیں ہوتا کہ میں انسان

ہوں۔ سب سے پہلے انسان ہوں، اور اس کے بعد اور کچھ۔

پروپگنڈے کی طاقت تو دیکھئے کہ دین ڈملک کے چکر میں آکر، ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں، اور یہ دیکھ کر بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی میں سے، اعداد کا یہ جرار لشکر کہاں سے نکل پڑا، عینیت کے اس چشمۂ شیریں میں، یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا، اور اس کعبۂ وحدت میں، یہ خنزیر شرک کیوں کر داخل ہوگیا۔ بسوخت عقل، ز حیرت، کہ ایں چہ بوالعجبی!

(ج) اب دیکھئے تیسرا رُخ ـــ سرمایہ داری کا نظام، ایک زبردست تن و توش کی جونک کے مانند، عامۃُ الناس کی گردن میں منہ گاڑے، بڑے مزے لے کر، اُن کا خون چوس رہا ہے۔

اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مُرّوت، لہجے سے نرمی، خیالات سے ہمدردی، اور دلوں سے دھڑکنیں چھین لی ہیں، اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کرکے، رکھ دیا ہے۔

یقین فرمائیے کہ جب تک آدمی، حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، نیرو، ابن زیاد اور یزید کے ہات پر بیعت نہیں کرلیتا، سرمایہ دار و صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔

اس فریب میں نہ آجائیے گا کہ مزدوروں، کسانوں، مفلسوں، اور اس قبیل کے کروڑوں انسانوں پر جو بیت رہی ہے، اس سے وہ بے خبر ہیں۔ جی نہیں، اُن کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے، اور یہ بھی سُن لیجئے کہ وہ اس علم سے، ترس کھانے کے بدلے، اُلٹے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب اُن کے دسترخوان پر مُرغ و ماہی کی قابیں چُنی جاتی ہیں تو وہ، اس تصوّر کی چٹنی چاٹ چاٹ کر، اپنے کھانوں کی لذّت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں آدمی رُوکھے سُوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے۔ اور، راتوں کو جب وہ اپنے اپنے گرم ریشمی لحافوں میں دبک کر، یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے، فٹ پاتھوں پر، سردی سے اکڑ رہے ہوں گے، تو ان کے لحافوں کی گرمی میں اضافہ

ہو جاتا ہے، اور جس وقت وہ ناداروں کو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں، تو ان کے حریر و پرنیاں کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے۔ لیکن روزگار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس سے ان کی نیندیں بھی حرام ہو کر رہ گئی ہیں وہ اپنے، بینکوں میں رکھے ہوئے سکوں اور اپنے کارخانوں کی چلتی ہوئی مشینوں کے، ناقابلِ برداشت وزن کے نیچے دبے پڑے ہوئے، بری طرح کراہ رہے ہیں۔ ایک بار دہلی کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار وصنعت کار نے، اپنے چاندی کے سے سفید بالوں کو نوچ نوچ کر، مجھ سے کہا تھا، جوش صاحب آپ کوئی (شاعر) ہیں، کویوں کے سر پر بھگوان کا ہات ہوتا ہے، آپ میرے مر جانے کی دُعا کریں، اور جب میں نے اُن سے یہ کہا تھا کہ اس ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس آرزو میں گھلے جا رہے ہیں کہ آپ کی دولت کا دسواں حصہ ہی ان کو مل جائے، تو انھوں نے کہا تھا ان لوگوں کو میری بپتا نہیں معلوم، نہیں تو وہ میرا سا بننے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھتے، اور جب میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آخر آپ کی بپتا کیا ہے، تو آنکھوں میں آنسو بھر کر، انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ جوش صاحب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، مگر من کو چین نہیں، ہر روز جب صبح کو جاگتا ہوں تو میرا دل، گڑگڑا، گڑگڑا کر، مجھ سے کہتا ہے لالہ جی آج دو پیسے اور کما لو —!!

دیکھا آپ نے فراوانی دولت کا انجام۔ اور افراطِ زر کی ناداری؛

زردار کا خناس نہیں جاتا ہے
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا ہے
ہوتا ہے جو شدتِ ہوس پر مبنی
تا مرگ وہ افلاس نہیں جاتا ہے

ہاں بہت جلد وہ ساعت آنے والی ہے کہ سوشلزم کے تند جھونکے، ان کے چراغوں کو بجھا کر، آوازہ بلند کریں گے:۔

دیدی؛ کہ خونِ ناحقِ پروانہ — شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند!

(د) اب چوتھا رُخ بھی ملاحظہ فرمایئے — اور وہ ہے موت کا یقین کامل۔

چو، پردہ دار، بشمشیر می زند ہمہ را
کسے، مقیم حریم حرم نہ خواہد ماند

گدا سے لے کر شاہ تک، اور خرابات سے لے کر خانقاہ تک، دنیا کے ہر سرا اور ہر در پر موت کا خونی گِد، منڈلا رہا ہے۔ اور ہر کوچے سے "رام رام ست ہے" اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" کی صدائیں چلی آ رہی ہیں۔ انسان نفسِ مطمئنہ کا طلبگار رہے، تسکین خاطر پر جان دیتا ہے، لیکن اس کو یہ دولت کہیں بھی نہیں ملتی، اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ:- بقدرِ ہر سکوں، راحت بود، بنگر مراتب را

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مُردن

تو اس کی سانس رُکنے لگتی ہے، اور نبضیں ڈوبنے کے قریب ہو جاتی ہیں، اور جب اس کے کانوں میں یہ آواز بھی گونج اُٹھتی ہے:-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے؟

تو وہ زندہ در گور ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایسی زندگی کس کام کی، جس کے ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے میں بھی یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ ابھی ہم کو موت نہیں آئے گی

موت، ایسی حیات سے اچھی

(س) اور ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ، —— اللہ اللہ، یہ نوجوان بیواؤں کی ٹوٹتی چوڑیاں — یتیم بچوں کی یہ، کچھ ڈھونڈنے والی آنکھیں۔ نادار بیماروں کی یہ اُبھری ہوئی پسلیاں۔ دُولھاؤں کے زانوں پر یہ چوتھی کی دلھنوں کی آخری ہچکیاں — براتوں کی یہ بھری ہوئی، ڈوبتی کشتیاں، عاشقوں کے سامنے، معشوقوں کی یہ اُلٹتی پتلیاں —— ماؤں کے آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے —— اور، بوڑھے باپوں کے کاندھوں پر یہ جوانا مرگ بیٹوں کے، پچھاتے

جنازے ——

اور، اس کے دوش بدوش، یہ جراثیم۔ یہ بچھو۔ یہ سانپ۔ یہ بستیوں کو بھسم کر دینے والی آتش زدگیاں۔ یہ قحط۔ یہ کال۔ یہ سیلاب۔ یہ طوفان۔ یہ وبائیں۔ یہ زہریلی دجھنتی ہوائیں۔ یہ آتش فشاں پہاڑ۔ اور شہروں کو اُلٹ پُلٹ کر کے رکھ دینے والے یہ بھیانک زلزلے۔ الامان والحفیظ —— فطری طور پر، دل میں یہ سوال بار بار مچلتا ہے کہ باوااِن آفات ارضی و سماوی کی پشت پر کوئی معقول برہان اور کوئی حکیم و عادل اور رحمٰن کارفرما ہے کہ نہیں؟ ارے اس زمین اور اس آسمان پر، ہے کوئی جو دُکھیا انسان، قدرت کے سوتیلے بیٹے، انسان کو اپنی پناہ میں لے لے؟ یہ گڑگڑاتی آواز، لاکھوں برس سے، اس بوڑھے آسمان کی بوسیدہ ڈاٹ کے نیچے گونج رہی ہے، لیکن ایک اَبدی سناٹا چھایا ہوا ہے، کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آتی۔

میر دَرد نے، تڑپ کر، بادِ صبا سے کہا تھا:۔

گر، صبا، کُوئے یار میں گزرے | یہی احوال دَرد کا کہیو
دن بہُت انتظار میں گزرے | کون سی رات، آن ملیےُ گا

میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن کسی مددگار کی چاپ سُنائی نہیں دے رہی ہے، قدموں کی چاپ تو بڑی چیز ہے، کوئی آواز پر آواز بھی نہیں دے رہا ہے۔ اے اتھاہ سناٹے، ہاں تو ضرور کچھ بول رہا، اور میں کچھ سُن بھی رہا ہوں۔ لیکن اُسے زبان تک لانے کی جُرأت نہیں کر سکتا — احمقانہ شہادت پر میں طیار نہیں۔ اور، گلا پھاڑ پھاڑ کر، یہ چیخ رہا ہوں کہ:۔

ایں میرؔ سید کہ بر غالبِؔ ناکام، چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

ارے میں نامراد اپنا دردِ دل کس سے کہوں؟

داوری دارم بسے، یارب کُرا داور کنم!

بنامِ قوّت وحیات!

میرا حادثۂ ولادت

میں ، اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے ، اور اس ، بظاہر رنگین و بباطن خون آلوُدہ زندانِ کوَن و فساد میں اُدبھنے کے واسطے کب لایا گیا ، اس امر کو ، صحت کے ساتھ ، بیان نہیں کرسکتا ۔ اس لئے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخِ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا ۔

البتہ میری دادی جان نے ، جو خاندان کی موّرخ تھیں ، مجھ سے ، میری ولادت کا جو سن بتایا تھا ، وہ سَن عیسوی کے حساب سے ، ۱۸۹۶ء تھا ، یا ۱۸۹۸ء ، یہ بھی یاد نہیں رہا ۔

بہرحال ، اپنی عُمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے ، اس لیے ، آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا —— (دو برس اور بوڑھا ہو گیا ، ہو جانے دیجئے ، (جُوتی کی نوک سے)

البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار[1] بجے پیدا ہوا تھا ۔

میرا وطن :-

آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا ، بور کی بوئے مستانہ سے

---

[1] شاید یہی علت ہو میری سحر پرستی کی ۔

چہکتا، کوئیلوں کی کوکو، اور پپیہوں کی پی ہو، پی ہو سے چہکتا ملیح آباد، ہندوستان کی تہذیبی جنت، یعنی لکھنؤ سے، فقط تیرہ میل کی مسافت پر، واقع ہے۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے، جس کے ایک گوشے میں، ہم لوگ، یعنی درۂ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی[1] اور دوسرے گوشے میں، قندھار سے آئے ہوئے، قندھاری آباد ہیں۔

ہندوستان آکر بھی، اور جوارِ لکھنؤ میں رہنے کے باوصف، ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی، اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین، ایک مدتِ دراز تک، تلوار چلتی رہی، اور فرنگیوں نے آکر، جب تلوار چھین لی، تو لٹھ پونگا ہونے لگا۔

ہندوستان آکر، اور خصوصاً لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر ہو کر، ہم لوگ، ایک عجیب گنگا جمنی قوم بن گئے۔

ہمارے خون میں، درۂ خیبر کی شعلہ بار دوپہر، مچلتی رہی، اور ہمارے سروں پر، اودھ کی سلونی شام، گل باریاں کرنے لگی —— اور ملیح آباد، لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب، اور قبائلی علاقوں کی بربریت و وحشت کا ایک عجیب نقطۂ اتصال بن گیا۔

ہمارے یہاں، ایک طرف تو لکھنؤ کی دُپلّی ٹوپیاں، ململ اور ریشم کے کڑھے کرتے، شربتی انگرکھے، سلمے ستارے کی رضائیاں، مخمل کے لحاف، چوک کا عطر، قنوج کا تیل پھلیل، اور مشروع کے پاجامے راہ پا گئے۔ اور پتنگ بازیاں، مرغ بازیاں، بٹیر بازیاں، اور ان کی پالیاں ہونے لگیں —— اور، ہم نے "السلام علیکم" کے بجائے "آداب، تسلیمات، کورنش، اور بندگی" کو اختیار کر لیا۔ اور، اس کے ساتھ ساتھ بیت بازیاں، اور مشاعرے بھی ہونے لگے، اور صحتِ زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں ——

اور، دوسری طرف "اللہ دے، اور بندہ لے"، قسم کے ہنگامے بھی جاری رہے اور، آئے دن، فوج داریاں اور خوں خواریاں بھی، برابر ہوتی رہیں۔

---

[1] ہم لوگ آفریدی، آدم خیل اور آدم خیلوں کی ایک شاخ "علی خیل" سے تعلق رکھتے ہیں۔

مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آجاتی تھی، اور وہ، کسی کے دروازے کے سامنے، تھوک دیتا تھا، تو صاحب خانہ صاحب، لٹھ لے کر، گلی میں آجاتے تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے مکان پر تھوک رہے ہیں، اور، تھوکنے والے خاں صاحب، اکڑ کر، یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھوکا تھا، تو اب تھوک رہے ہیں، آخ تھو، آخ تھو، اور، دونوں کے درمیان، بڑے زور شور سے، لٹھ چلنے لگتا تھا۔ اور، اگر کسی شادی بیاہ میں، دو حریف گروہ، آمنے سامنے کھٹولوں[1] پر بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ تو ان میں سے جب ایک گروہ کا آدمی: "کڑکڑ، کڑکڑ، کڑاک"، کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا، تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی، اس کو اعلان جنگ سمجھ کر، اس سے بھی کہیں زیادہ زور سے "کڑکڑ، کڑکڑ، کڑکڑ کڑاک، کڑاک، کڑاک"، کی آوازیں نکال کر، اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں، اور، اس ضدم ضدا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ، پل بھر میں، فریقین کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے۔

لکھنؤ کے کمشنر، یا گورنر نے، ملیح آباد کے باب میں، یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد، درۂ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے، جس کا، ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا ہے۔

میرے خاندان کے انحطاط کے بعد، ملیح آباد کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے، تینوں ڈیوڑھیوں[2] میں سے، اب ایک ڈیوڑھی بھی باقی نہیں رہی ہے ——— اور ملیح آبادی کی دھاک دم توڑ چکی ہے۔

پھر بھی، میرے ملیح آباد کے تیور، ابھی تک، کلیتہً بجھنے نہیں پائے ہیں۔ ہر چند زمینداری اور تعلقہ داری کی تنسیخ، فضا پر، ایک عبرت ناک سناٹے کی طرح، چھائی ہوئی ہے۔ مگر لوگوں میں پٹھنولی کا دم خم، اور سپہ گری کا طنطنہ آج تک باقی ہے۔

اب ملیح آباد کی حالت، لکھنؤ کے اُن میر صاحب کی سی ہے جو شباب میں اس قدر خوبرو، اور گبھرو تھے کہ بڑی بڑی تنگ چڑھی پری جمالوں تک کے غرورِ جمال کی پنڈلیاں اُن کے

---

[1] اونچی اور چوڑی چارپائی۔ [2] میرے باپ اور میرے دونوں چچاؤں کی ڈیوڑھیاں۔

رُو برو کا پینے لگتی تھیں، لیکن، شباب ڈھلنے کے بعد، جب وہ کسی شہر کی سرائے میں جا کر ٹھیرے، اور، برآمدے میں بیٹھ کر، حقّہ پینے لگے، اور بھٹیاری کی لڑکیاں، اُن کے حقّہ پینے کے انداز اور، ہر کش پر، ان کے گالوں کے نشیب فراز پر ہنسنے لگیں، تو انھوں نے، جھلا کر، کہا، ہنس لو کالی کلوٹی چھوکریو، جی بھر کے، ہنس لو۔ اگر جوانی میں تم مجھے دیکھ لیتیں" تو ہائے مرے اللہ ہائے مرے اللہ" کہہ کر، زمین پر بیٹھ جاتیں، اور چھلچھلانے لگتیں۔

اس طرح، میرا ملیح آباد بھی، از زبان حال ، کہہ رہا ہے:۔

یاراں کہ سرکشند، ز نخوت، بر آسماں
بر آستانِ مے کدہ، شامم، نہ دیدہ اند
آں ہا کہ آؤ رند شبک در نظر مرا
بے چار گاں، بکوئے مُغانم، نہ دیدہ اند!

میری حویلی کی اندرونی فضا۔

ہر طرف روشنی تھی، رنگینی تھی، چہل پہل تھی۔ لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں مُغلانیاں، انّائیں، ددائیں، کھلائیاں ـــــ اُستانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے، اور، راتوں کو، کہانیاں سُنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی، اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔

اس مستقل آبادی کے علاوہ، شریف گھرانوں کی غریب عورتیں بھی، چندے اچھے دن گزارنے کے لئے، آئے دن، بطور مہمان آتیں، ایک ایک، دو دو مہینے رہتیں، اور جب چلی جاتیں، تو نئی مہمان عورتیں اُن کی جگہ آ کر پُر کر لیتی تھیں۔

بیرونی فضا۔

خدمت گاروں، رکاب داروں، فرّاشوں، سپاہیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، ضلع داروں، اور کارندوں کا، ہر طرف، ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔

ان کے علاوہ بیرونی، لکھنوی شاعروں میں سے دو چار ہمیشہ، بطور مہمان رہتے، اور، آئے دن، مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

اور ہم بچے مزا لیا کرتے تھے، اپنے گھر کی ہتنی سے، جس کو ہم گنے کھلاتے تو وہ جھومتی، اور جب ہم اس کو، "نوری انڈا"، کہہ کہہ کر چڑھاتے تھے، تو وہ، غصّے کے مارے زنجیریں تڑانے لگتی تھی۔

میرا، مجموعہ اضداد، مزاج

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں، بچپن میں تھا کیا؛ شعلہ تھا کہ شب نم، حدید تھا کہ حریر، نوکِ خار تھا، کہ برگِ گل، خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خاں کا علم بردار تھا کہ "رحمۃ للعالمین" کا پرستار؟

ایک رُخ سے تو میں اس بلا کا سریع الاشتعال تھا کہ زرا زرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتا، اور، جو بھی سامنے آتا، اس کو پھاڑ کھایا کرتا تھا۔

اور، ایک رُخ سے اس قدر بے پناہ صاحب مہر و وفا اور اس حد کا سرچشمۂ لطف و عطا تھا کہ دوسروں کے واسطے، بڑی سی بڑی قربانی پر، آمادہ رہا کرتا تھا۔

میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے، اگر کسی بات پر بگڑ جاتا، تو بید مار مار کر، اُن بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا ——

اور جب ماسٹر بن کر، اپنا پڑھا ہوا سبق، ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا، اور دوسرے دن ان سے آموختہ دُہرواتا، اور وہ دُہرا نہ سکتے تو اُن کو، ڈنڈوں سے، پٹتیا، اور اُن کے کاندھوں پر سوار ہو کر، اُن کو، خچروں کی طرح —— اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن جایا کرتی تھی ——

اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ، وہ بھی، بچپن میں میری ہی طرح اس قدر بدمزاج، زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگامِ جنگ وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی، اور میں اس کے جھونٹے نوچ کر، پھینک دیا کرتا تھا۔

ہر تیسرے چوتھے روز انیس[1] سے میری مہابھارت ہوا کرتی تھی، اور، انگنائی میں،

---

[1] اور اب وہی انیس مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہے، اور جب لکھنؤ جا کر اس سے ملتا ہوں وہ میرے گلے لگ کر جل تھل بھر دیتی، اور ٹکٹکی باندھ کر، مجھ کو اس طرح دیر تک دیکھتی رہتی ہے گویا اپنے دل کے زخموں میں ٹانکے لگا رہی ہے۔

کنویں کے گرد و پیش کا حصّہ، ہمارا پانی پت کا میدان تھا، اور ایسا میدان کہ اگر مائیں، اصیلیں آ کر ہمیں چھڑا نہ دیتیں تو ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر کے رکھ دیتے۔

میری ماں، اپنے تمام بچوں میں، سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں، اور، دُودھ اور شہد کا پیالہ روز صبح کو مجھے، اپنے ہات سے پلایا کرتی تھیں، اور اگر کسی دن دُودھ کے پیالے میں کوئی ذرّہ نظر آجاتا تھا، تو میں، کم بخت، پیالے کو، تڑسے، زمین پر پٹک دیا کرتا تھا، اور وہ رونے لگتی تھیں۔

میں، اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا، اور، اس قدر کہ جب اُن کے سامنے جاتا تھا، تو میری چال بدل جایا کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود۔ جب ایک روز میں خربوزے کی قاشیں، چاکو کی نوک سے، اُٹھا اُٹھا کر، کھا رہا تھا، اور انھوں نے، ڈانٹ کر، یہ کہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے گدھے، چاکو کی نوک اگر تالُو میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں — تو مجھے اس قدر غصّہ آگیا تھا کہ میں نے، باپ کی طرف چاکو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ اُن کے سینے میں چُبھ جاتا، تو لہولہان ہو جاتے۔

اسی طرح، میں نے، ایک بار اور بھی، اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی تھی۔

میرے باپ کا، سختی کے ساتھ، یہ حکم تھا کہ ہم بچوں میں سے کوئی بھی، ان کی اجازت کے بغیر، پھاٹک سے باہر قدم نہ رکھے، اور جب وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے، تو چار پانچ سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ باغ تشریف لے جا چکے تھے، اُن کی غیبت سے فائدہ اُٹھا کر، میں مشیر احمد خاں رام پوری کے گھر، جو بالکل میرے پھاٹک کے سامنے تھا، چلا گیا، مشیر خاں کی ماں، اپنے پوتے، یعنی میرے دوست مختار کو کھانا کھلا رہی تھیں مجھے بھی اُنھوں دسترخوان پر بٹھالیا، اور اپنے ہات سے لقمے بنا بنا کر، مجھے بھنڈی کھلائی[1]۔

جب، مزے کی بھنڈی کھا کر گھر آیا، دیکھا کہ میرے باپ، باغ سے آگئے۔ اور، آرام کرسی

[1] اس بھنڈی کا مزا اب تک زبان پر تازہ، اور حافظے میں محفوظ ہے، اور اب جب کبھی بھنڈی کھاتا ہوں تو میرے منھ سے نکل جاتا ہے بے ساختہ "ہائے مشیر خاں کی ماں"

پر، لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی، اُنھوں نے، بڑی خشونت کے ساتھ، پوچھا کہاں گئے تھے، میں نے کہا مشیر خاں کے گھر، انھوں نے پوچھا اور میری اجازت کے بغیر، میں نے کہا آپ یہاں تھے کہاں، انھوں نے فرمایا میرے آنے کا انتظار کرتے، اور گئے بھی تھے تو سپاہیوں کو ساتھ کیوں نہیں لیا، میں نے کہا میاں دو قدم کے لئے سپاہی لے جاکر کیا کرتا، انھوں نے، برافروختہ ہوکر فرمایا، مجھ سے منطق بگھار رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور زہر دی کی پتلی سی جریب، اس زور سے، میری پیٹ پر ماری کہ میں بلبلا گیا، اور، انتہائی تیھے کے عالم میں، مجھ نالائق سے کی زبان سے بے ارادہ نکل گیا "اللہ کرے مر جائیں میاں"

یہ سنتے ہی میرے باپ، غصّے کے مارے دیوانے ہو گئے، گھر کھراتے مجھے اندر لے گئے، اور جریبوں پر جریبیں مارنے لگے، وہ تو کہئے میری دادی جان آگئیں اور اُنھوں نے میرے باپ کی پُشت پر لکڑی مار کر، کہا کیا مار ڈالے گا بچے کو۔ اور، میرے باپ نے، فوراً ہات روک لیا۔

معلوم نہیں کیوں، مگر "میاں بُسنت" میری چڑھ تھی ——

ایک روز میرے باپ کے کمرے میں، ایک، بڑی خوفناک داڑھی کے مولانا، اُونچا سا عمامہ باندھے، اور، موٹے تال کی کی عینک لگائے، کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ میں اُدھر آنکلا۔ مجھے دیکھتے ہی مشیر خاں نے، اُن مولانا کے کان میں کچھ کہہ کر، میری جانب اشارہ کیا۔ مولانا نے، جھپٹ کر مجھے گود میں بٹھالیا، اور میرے سر پر، بڑی شفقت کے ساتھ، ہات پھیر کر کہا "کہو میاں بُسنت کیا کھاؤ گے" یہ سنتے ہی میں نے ان کی داڑھی پکڑ لی، اور "ابے مار ڈالوں گا"، کا نعرہ لگاکر، اس زور سے ان کی داڑھی کو جھٹکا دیا کہ اُن کا عمامہ، عینک سمیت، فرش پر گر پڑا۔ اُن کے منھ سے دردناک چیخ نکل گئی، مشیر خاں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے، اور میرے باپ نے، زور لگاکر، ان کی داڑھی، میری گرفت سے، چھڑا دی۔ اور میں اوف اوف، اوف، "کرتا باہر نکل گیا۔

ایک روز میں اپنے پھاٹک پر، بڑی سی ہوائی بندوق بھرے کھڑا ہوا تھا کہ ایک نائی کا لڑکا، میرے سامنے سے گزرا، لیکن مجھے سلام نہیں کیا، اس کی اس گستاخی پر، مجھے

تاؤ آگیا، میں نے اُس پر، دن سے، فائر کر دیا، بڑا سا چھرا اس بیچارے کی پیٹ میں پیوست ہوگیا، اور، وہ گر کر، تڑپنے لگا۔ اور مجھ شقی نے، اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض، اس کی پسلی پر، زور سے، ٹھوکر مار کر، کہا ابے دو کوڑی کے نائی اُٹھ، اور سلام کر، اور جب وہ غریب، کراہتا اُٹھا، اور، جُھک کر مجھے سلام کیا، تو میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔

ایک روز، یاد نہیں، کسی خطا پر میں اپنے گھر کے غلام حُسین بخشا کو، زنانے مکان کے صحن میں کھڑا، مار رہا تھا، چھڑیوں سے، تڑاتڑ، تڑاتڑ، تڑاتڑ کہ، ڈیوڑھی سے، دادامیاں تشریف لے آئے۔ دم نکل گیا ان کو دیکھ کر کہ اب وہ مجھے ماریں، یا ڈانٹیں گے، لیکن یہ دیکھ کر، بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دادامیاں، مسکراتے آئے، میرا ہات پکڑا، مجھے میرے باپ کے کمرے میں لے گئے اور میرے باپ سے کہا بشیر میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تمھارا یہ منجھلا بیٹا بڑا سوُرما نکلے گا، اور بادشاہوں تک سے ٹکرلے گا۔ اور جب میرے باپ نے پوچھا باوا یہ اندازہ کیسے ہوا، تو انھوں نے فرمایا کہ یہ غلام کو مار رہا تھا، اور ایسے تیوروں سے مار رہا تھا کہ سوُرماؤں کے سوا ایسے تیور کسی کو میسّر ہی نہیں ہو سکتے۔

بشیر، ہم پٹھان ہیں، سورماؤں اور بُزدلوں کے تیوروں کو، ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ:- سو پشت سے ہے، پیشۂ آبا، سپہ گری۔

اور پھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ بربِّ کعبہ، میں دو گاؤں اور دو باغ تیرے نام براہِ راست، لکھ دوں گا۔ اور لے یہ دو گنیاں، اس کی مٹھائی کھانا، اور اس میں سے پانچ روپے اس غلام زادے کو دے دینا، جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا۔ اب میری مہر و وفا اور جود و سخا کا رُخ بھی دیکھ لیجئے:-

میرے بچپن تک، میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی، اور انڈے کھاتے، اور شہد آمیز خالص دوُدھ پیا کرتے تھے۔ اور، جاڑوں کے زمانے میں، ناشتے کے بعد، جب ہماری جیبوں میں چھلے چلغوزے

؎۱ ان کی یہ مخصوص قسم تھی۔ ؎۲ موت نے، ان کو، ایفائے عہد کی فرصت نہیں دی۔

اخروٹ کی گری کشمش، باداموں کا مغز، اور، صاف کئے ہوئے پستے، بھر دیے جاتے تھے تو میں، باہر آکر آواز دیا کرتا تھا کہ "برف کے چھڑ دیّو، چلو" — پہلے اس نعرے کو سمجھ لیجئے۔

میرے دادا کے برف خانے کی چھت پر، مٹی کے کورے ظروف مسالا لگا کر، رکھ دیئے جاتے تھے، جن میں پچھلے پہر تک، برف جم جاتی تھی اور، منہ اندھیرے، برف خانے کے آدمی پکارتے تھے مزدوروں کو، اے برف کے چھڑ دیّو چلو (اے برف کے چھڑانے والو، آؤ) اور وہ مزدور آکر، برتنوں سے برف کھرچ کھرچ کر، چھڑاتے، اور کھتوں میں، کوٹ کوٹ کر، بھر دیا کرتے تھے، اور ان کھتوں میں جست کی صراحیاں دبا دی جاتی تھیں —— اور یہ سمجھ لینے کے بعد، اب یہ سُنیئے کہ جیسے ہی میں "برف کے چھڑ دیّو، چلو" کا نعرہ لگاتا تھا، لونڈیوں، اور ماماؤں کے تمام بچّے، دوڑ دوڑ کر، میرے پاس آجایا کرتے تھے، اور میں یہ کہہ کہہ کر "اے میرے نانگھنو، چنے چباؤ" اپنا سارا میوہ انھیں کھلا دیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی سَمدا[1] تالاب کی جوگی، منہ اندھیرے:-

قفس کاٹا۔ چمن بویا۔ تری رحمت کا ہوں جویا۔ محمد، یا رسول اللہ
جوانی میں بہت سویا۔ بُڑھاپا دیکھ کر رویا۔ محمد، یا رسول اللہ
دُھواں پایا، دیا کھویا —— محمد، یا رسول اللہ

گاتے ہوئے، میرے دروازے پر آتے تھے، میں، چکارے کے سے ترارے بھرتا، گھر جاتا، اور، ہانپتی آواز میں کہتا، اماں ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں، انھیں بھیک دے دو۔ میری ماں کو، میری اس اُدا پر بہت پیار آتا تھا، اور وہ، بٹوے سے نکال کر، دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں، ساٹھ پینسٹھ برس کے بوڑھے حیدر خاں —— ایک روز میں نے دیکھا کہ ان کے چولھے پر، دودھ کی پتیلی کڑکڑا رہی ہے۔ اور، وہ کوئی کالی کالی گولی، پیالی میں گھول رہے ہیں۔ میں نے پوچھا حیدر خاں یہ کیا چیز ہے، انھوں نے کہا افیم گھول رہا ہوں۔ میں نے پوچھا افیم کیا چیز ہوتی ہے، انھوں نے کہا یہ دوا ہے،

---

[1] ملیح آباد کا ایک تالاب۔

مگر منجھلے بھیا، یہ چیز امیروں کی ہے، یہ روز پاؤ بھر ملائی (بالائی) مانگتی ہے، میں غریب آدمی ہوں، ملائی کہاں سے لاؤں —— حیدر خاں کی اس بے کسی پر مجھے بڑا ترس آیا، اُن سے کچھ نہیں کہا، سیدھا گھر کے اندر گیا، اور، گُل زار بُوا[1] کی نظر بچاکر، پیالہ بھر بالائی چُرا کر باہر لے آیا — بالائی کا بھرا پیالہ دیکھ کر، حیدر خاں کے افسردہ، لیکن سُرخ و سفید چہرے کی جُھرّیوں کے اندر شگفتگی و تشکر کی جو لہریں دوڑنے لگیں تھیں، وہ، میرے حافظے کے اُفق سے، آج تک رنگ برسا رہی ہیں۔ اس روز سے، میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہر صبح کو، بالائی کا ایک پیالہ، چُرا کر لاتا، اور حیدر خاں کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ ایک روز، حیدر خاں کو بالائی دے کر، گھر پہنچا تو دیکھا گُل زار بُوا، میری ماں سے کہہ رہی ہیں کہ بی بی میں دیکھ رہی ہوں کہ روز ملائی کم ہو جایا کرتی ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ظہورن کے سوا، اور کسی کی ہمت پھیری نہیں ہو سکتی، وہ مُردار بڑی چٹوری ہے، بی بی، کل میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا کہ وہ اپنا کھیر کا تھلوا چٹ کر کے، نصیبن کا تھلوا بھی، ہنک ہنک کر، زہر مار کر رہی تھی ——

میری ماں نے ظہورن کو بُلایا، وہ دوڑی آئی، اور، میری ماں کے بگڑے تیور دیکھ کر، سہم گئی۔

اب، مجھ سے ضبط نہیں ہُوا، میں نے کہا اماں، ظہورن نہیں، میں بالائی اُڑا کر، لے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر، میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ گُل زار بُوا نے سُنا تو، بگڑ کر کہا، بھاڑ میں جائیں حیدر خاں، بچّے کو پھسلا کر روز ملائی چاٹتے ہیں، خاک کھائیں، انگارے کھائیں حیدر خاں، علی کی تیغ ٹوٹے اُن پر۔

میری ماں نے فرمایا اے ہے گُل زار، اِتی سی ملائی کے چلتوں اس قدر، کٹّے کٹّے کوسنے دے رہی ہو، ایک پیالہ ملائی کی حقیقت کیا ہے، تم یہ نہیں سوچتیں کہ اِتی سی ملائی دے کر بچّے کا دل، ہات بھر کا ہو جاتا ہے۔

ماں کی یہ بات سُن کر میں بشاش ہو گیا، اور اب، کُھلے بندوں بالائی لے جانے لگا۔

---

[1] باورچی خانے کی نگراں تھیں۔

(حیدر خان، اب تم اس ترسانے والی دُنیا میں نہیں ہو، مگر تمھاری دعاؤں کی چاندنی، آج تک، میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے)

جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا، تو اُس کو دیکھتے ہی، میرے دل میں اُس کی محبت پیدا ہو گئی تھی، اور میں نے اس کا "للّو" نام رکھ دیا تھا ——

ایک روز میں "بڑے باغ" میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا، آب رسانی کی نالی کی کیچڑ میں ایک جوتہ دھنسا پڑا ہے، اُسے اپنے مالی "براجی" سے دُھلوا کر، میں نے اپنے مخملی کوٹ کی جیب میں رکھ لیا، براجی نے کہا "ارے بھیّا یو کا کرت ہو، جیب کھراب ہو جیہے" (ارے بھیّا، یہ کیا کر رہے ہو، جیب خراب ہو جائے گی)، میں نے کہا میں یہ جوتہ اپنے للّو کو پہناؤں گا — وہ ہنسنے لگا۔

اور جب اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ کر، میں نے وہ جوتہ جیب سے نکالا، اور چاہا کہ اُسے للّو کے پاؤں میں پہنا دوں، تو میری پھُپھی زاد بہن "اُمّی" نے چیخ مار کر کہا "اری ممانی، غضب خدا کا، یہ مخمل کا کوٹ اور اس کی جیب میں یہ چمڑو دھا جوتہ اور پھر اُس کو منجھلا اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے، یہ سُن کر، میری ماں ہنسنے لگیں، ساری عورتوں نے، مجھ کو گھیر لیا، سب نے مجھ پر قہقہے مارے — لیکن کسی نے میرے اس دردِ دل کی داد نہیں دی کہ میں اس جوتے کو للّو کے پاؤں میں پہنا نہ سکا۔

میرے دل میں اس قدر گدازِ خستگی اور اتنی زود آشنائی تھی کہ جب گھر سے کوئی مہمان رُخصت ہونے لگتا تھا، میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی تھیں۔

مجھے، آج کی تاریخ تک، وہ بے انتہا قلق یاد ہے کہ میرے نانا جان، جب[1] میری بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے بعد، آگرے جا رہے تھے تو میں اُن کے ریزرو کمپارٹمنٹ میں گھس کر بیٹھ گیا تھا، اور جس وقت، ایک زنبوری ہات نے، مجھ کو وہاں سے، دیوار میں ٹھنکی ہوئی کیل کے مانند، جھٹکا دے کر، باہر کھینچا تھا تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔

---

[1] رئیس احمد

ایک روز، ہماری ڈیوڑھی کے، ایک بٹیر پالنے پر مامور سپاہی، بندہ علی خاں، اپنے بیڑے کے دوسرے سپاہی، سے یہ کہ رہے تھے بھائی صالح محمد خاں، میری لڑکی کے بیاہ کے واسطے خاں صاحب (یعنی میرے باپ) نے جو چھ سو روپے مجھ کو دیئے تھے. وہ میں جوئے میں ہار گیا۔ اور اب میرے واسطے صرف یہی ایک بات رہ گئی ہے کہ، اس شرمندگی میں، کچھ کھاکر، سو جاؤں۔

بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سُنی، میرا دل دُھڑکنے لگا۔ اُن سے میں نے ایک حرف بھی نہیں کہا، مُنھ لٹکائے زنانے میں چلا گیا، اور، بستر پر دراز ہوکر، سوچنے لگا کہ ان کی جان کیوں کر بچاؤں، دیر تک سوچتا رہا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے میں، ایک چھپکلی، میری ماں کے تکیے پر، پٹ سے، آگری، میں نے اُس چھپکلی کو مارنے کے لئے تکیے پر جوتا کھینچ کر، مارا تکیہ نیچے گر گیا، چھپکلی بھاگ گئی، اور، یہ دیکھ کر، میری نبضیں تیز ہوگئیں کہ ماں کے سرھانے، سونے کی جڑاؤ چمپاکلی جگ مگ، جگ مگ ہو رہی ہے. میں نے چھپکلی کی دکھائی ہوئی، چمپاکلی، جھٹ سے اُٹھاکر، نیفے میں ٹھونس لی۔ اور، ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُسے بندے علی خاں کو جاکر دے آؤں کہ یکایک سہ دری سے، میری ماں آگئیں، اپنا تکیہ زمین پر، اور چمپاکلی غائب دیکھ کر، انھوں نے مجھ سے پوچھا ننھے تو یہاں کب سے ہے، میں نے کہا بڑی دیر سے، انھوں نے دریافت فرمایا ادھر کوئی ماما یا لونڈی تو نہیں آئی تھی، میری چمپاکلی غائب ہوگئی ہے. میں نے کہا کوئی نہیں، وہ، سر جھکا کر، بیٹھ گئیں، ماں کا یوں سر جھکاکر بیٹھ جانا، مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا، میں نے اپنے نیفے سے نکال کر چمپاکلی اُن کے حوالے کر دی، انھوں نے کہا تو نے اچھا کیا کہ چمپاکلی اپنے پاس رکھ لی، نہیں تو کوئی لونڈی باندی اُڑا کرلے جاتی.

میں نے بندے علی خاں کی ساری داستان سُناکر، یہ کہا کہ اس لئے اُٹھائی تھی کہ بندے علی خاں کو دے دوں گا، میری ماں نے کہا اُنھیں تو فقط چھ سو روپے کی ضرورت ہے، اور یہ چمپاکلی تو تین، ساڑھے تین ہزار کی ہے ـــــ یہ کہہ کر میری ماں کچھ سوچنے لگیں، اور پھر، بڑے ولولے کے ساتھ، سر اُٹھاکر کہا، کوئی بات نہیں، یہ چمپاکلی انھیں کی تقدیر

کی تھی، جا دے آ۔ اور جب میں، خوشی میں بھرا ہُوا، دوڑتا باہر جانے لگا تو میری ماں نے، مجھے آدھے راستے سے بُلا کر، چُپکے سے، ارشاد فرمایا، ننھّے تو نے میری چمپا کلی، مجھ سے مانگے بغیر اپنے پاس رکھ لی، اس کا نام ہے چوری۔ شریف بچے کبھی چوری نہیں کرتے، میرے سر پہ ہات رکھ کر، قسم کھا کہ اب کبھی ایسی گھٹیا بات نہیں کرے گا۔ میں نے ماں کے سر پہ ہات رکھ کر قسم کھالی۔ اور یہ سوچ کر کہ میں چور ہوں، میرا دل دُھک دُھک کرنے لگا۔

جب، باہر جا کر، اور سب کی نظر بچا کر، وہ چمپا کلی میں نے بندے علی خاں کے حوالے کی، اُن کے دل کی کلی کِھل گئی۔ اُن کے، مُرجھائے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی، اور دونوں ہات اُٹھا کر، انھوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں کہ الٰہی منجھلے بھیّا کی عمر دراز ہو، یہ در دربار میں سُرخ رو ہوں، اور ان کے دروازے پر ہاتی جھومیں۔ یہ سچ ہے کہ بندے علی خاں کی خدمت کر کے، مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ لیکن اگر دل میں یہ کانٹا نہ کھٹکتا کہ میں چور ہوں، تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

میری انّا لکھنؤ کی سیدانی تھیں اور مجھ کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ میری دُودھ بڑھائی کے بعد جب وہ لکھنؤ چلی گئیں، تو میری آنکھوں میں دنیا ویران ہو کر رہ گئی۔ اور میں، مکان کے گوشے میں "انّا جان، انّا جان" کہتا پھرنے لگا۔ اور آخرِ کار، اتنا بُڑک گیا کہ مجھے بخار آنے لگا ـــ میرے باپ نے، لکھنؤ آدمی بھیج کر، کئی بار انّا کو ڈھنڈوایا، لیکن اُن کا پتا کہیں چلا ہی نہیں۔

میری پچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم، جو مجھ سے بے پناہ محبّت کرتی تھیں، روئی کی ایک بڑی سی گڑیا بنا کر، میرے پہلو میں لٹا دیتی کہ لے بیٹا، تیری انّا آگئی، اور میں، اُس گُڑیا سے چمٹ کر، سو جایا کرتا تھا ـــ

نہ جانے مجھ میں یہ بات کیوں تھی کہ جو لوگ، ریل میں، میرے ہم سفر، یا گانے بجانے کی محفلوں، میں میرے ندیم، یا مُوسلا دھار پانی برسنے کے وقت میرے ہم نشین ہوتے تھے، مجھے اُن تمام لوگوں سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔

چُناں چہ، ایک روز، جب کہ، بڑے دھوم دھڑکّے سے، رُوم جھُوم پانی بَرس رہا

تھا۔ اولتیاں ٹپک رہی تھیں، پرنالے، دھڑا دھڑ چل رہے تھے، انگنائی کے بھرے ہوئے پانی میں، جا بجا، بھنور پڑ رہے تھے کہ محمّد شیر خاں سپاہی نے لہک لہک کر ملہار گانا شروع کر دیا۔ "مدن[1] موہن بن، کل نا پڑے رے۔ اری او سکھی، اری، او سکھی"

ہائے بھیگے درو دیوار، مستانہ بوچھار، جھڑی کا ستار، پی ہو کی پکار، برہا کی جھنکار، اور محمّد شیر خاں کا ملہار —— خدا ہی جانے کیا چوٹ لگ گئی میرے معصوم دل پر کہ میں رونے لگا زار قطار۔

ابھی میں برکھا کی جھڑی، اور ملہار کے جھولے میں جھول ہی رہا تھا کہ سارا مزا خاک میں ملا کر رکھ دیا ظہور علی خاں نے یہ کہہ کر محمّد شیر خاں تم کو خاں صاحب بہادر (میرے باپ) یاد فرما رہے ہیں۔ میں ہائے کر کے رہ گیا۔ کھن سے، چکنا چور ہو گیا، میرا ساغرِ سرشار، اور چٹ سے ٹوٹ گیا میرا۔ جھما جھم کا تار۔

اور، جب میں نے یہ سُنا کہ میرے باپ محمّد شیر کو، زور زور سے ڈانٹ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا کہار بلالاؤ، اور تم ابھی تک نہیں گئے تو، چھتری لگا کر، میں اپنے باپ کے کمرے میں جا کر بے اختیار رونے لگا، میرے باپ میرے اس گریۂ بے اختیار سے بے چین ہو گئے، اور بڑی حیرت سے پوچھا بیٹا کس بات پر رو رہے ہو، میں نے رُک رُک کر کہا۔ میاں یہ محمّد شیر خاں، یہ کہتے ہی، میری آواز رندھ گئی، میرے باپ نے، چارپائی سے اُٹھ کر، مجھے اپنے زانو پر بٹھالیا، اور بہت چُمکار کر پوچھا بیٹا جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔

میں نے رُہانسی آواز میں کہا، میاں پیٹے کا پانی برس رہا ہے، یہ ابھی مجھ کو ملہار سُنا رہے تھے، اور اب ان پر ڈانٹ پھٹکار ہو رہی ہے

یہ سُنتے ہی میاں نے مجھ کو چھاتی سے لگالیا، اور کہا بیٹا تو، آگے چل کر شاعر ہو جائے گا، اور ہمارے خاندان کا نام تجھ سے روشن ہو گا —— محمّد شیر جاؤ، اس کو ملہار سُناؤ، اور ظہور علی کو بھیج دو کہار بلانے کے لیے۔

آپ نے میرے دل کی سختی اور نرمی، یعنی میری حدیدیّت و حریریّت، اور میری شعلہ

---

[1] مدن موہن کے بغیر، اے سکھی، مجھے قرار نہیں ہے۔

افشانی و شبنم چکانی، یہ دونوں چیزیں دیکھ لیں —— اب میرے محبت و غضب کے مرکب جذبے کو بھی دیکھ لیجئے۔ جو ایک، بڑی انوکھی سی بات ہے۔ آب و آتش، ہم آمیختہ، از لبِ لعل۔

میں اپنی پچاسی برس کی کھلائی عبّاسی خانم کا ذکر کر چکا ہوں، جن کو میں "بڑی بی" کہا کرتا تھا۔ ہم دونوں، ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے۔ مجھ کو برفی بے حد پسند تھی، اور "گنجا" یا "للتہ" حلوائی کی دکان سے، ہر صبح کو، برفی کا ایک دُونا آجایا کرتا تھا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ میں برفی کھاؤں، اور بڑی بی کو نہ کھلاؤں —— اور یہی نہیں، میری یہ تمنا ہوتی تھی کہ آدھا دُونا میں کھاؤں، اور آدھا دونا اپنی بڑی بی کو کھلاؤں لیکن میری اُلٹی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بڑی بی کی سی پھونسی بوڑھی عورت آدھا دونا کیوں کر کھا سکتی ہیں۔ اور جب برفی کی دو چار ڈلیاں کھا چکنے کے بعد، وہ مزید کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتی تھیں کہ ننھے اب مٹھائی کھائی نہیں جا رہی ہے تو، فرطِ محبّت کے باعث، مجھ کو اُن پر اس قدر غصہ آجاتا تھا کہ اُن بے چاری کے، رُوئی کے سے بال پکڑ کر، ان کا سَر، زمین سے ملا دیا کرتا تھا، اور وہ، چیخیں مار مار کر، کہتی تھیں کہ ارے خدا کا واسطہ، کوئی اللہ کا بندہ آکر مجھ کو بچالے، ارے ننھّا مجھ کو مارے ڈال رہا ہے۔ اور مامائیں اصیلیں، دوڑ کر، میرے پنجے سے اُن کو چھڑا لیتی تھیں —— غذا رسانی کے سلسلے میں اللہ کے متعلق فقط سُنا ہی تھا کہ ؎۔ ورنہ ستانی، بستم می دہد" اور "ننھّے" کو اس پر عمل کرتے دیکھ لیا۔ واہ رے ننھّے، اخلاق الٰہی کا پورا اتباع کر کے دکھا دیا۔ ایں کار، از تو آید و مرداں چنیں کنند!

میرے کھیل

کوئی، ایک کھیل بھی، جم کر، میں نے کبھی نہیں کھیلا، یوں تو، دوسروں سے، پچھڑیا دلا کر، پتنگ بازی بھی کی، بھدّے طور سے گولیاں بھی کھیلیں، آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا، فٹ بال اور ٹینس بھی، بُرا بھلا کھیلا، اور سَت گھڑے کے خانوں میں بھی اُچھلا کودا، مگر دو دو چار بار کھیل کر، ہر کھیل ترک کر دیا۔ اپنا پڑھا ہُوا سبق، اپنے ہم عُمروں کو، پڑھانا،

ؔلہ بڑی بی تم مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو، اور تمھارا "ننھا" ابھی تک زندگی کو بھوگ رہا ہے، زندگی کے بوجھ سے تمھارے "ننھے" کے شانے ٹوٹے جاتے ہیں، میری اچھی بڑی بی اپنے بوڑھے ننھے" کو بلالو، اب تو بلالو، اپنے پاس۔

داغ و امیر کے دیوان پڑھنا، اور اپنے کمرے کو سجانا - یہ تھے، میرے محبوب کھیل ——— پڑھاتا تھا، میز کرسی پر بیٹھ کر، میز پر بید رکھا، اور میز کے سامنے، دادامیاں کی عدالت[1] کا کٹہرا لگا رہتا تھا ——— داغ و امیر کے دیوان، لچکاٹکے ہوئے، مخمل کے جز دان میں رکھتا تھا، اور میرے کمرے کی سجاوٹ کیسی تھی، اسے بھی ملاحظہ فرمایئے ——— میرے خاصے چوڑے، لیکن چوڑے سے زیادہ لانبے کمرے میں ایک جانب تو تختوں کا چوکا تھا، چوکے پر گدّا، گدّے پر سفید چاندنی، چاندنی پر زرّیں قالین، مخمل کے گاؤ تکیے، سنگ مرمر کے میز فرش، داہنے بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں، کرسیوں کے سامنے، چھوٹی چھوٹی میزیں، میزوں پر گل دان، اِدھر اُدھر چاندی کے اُگال دان، پختہ فرش پر سُرخ دری، آسمانی چھت گیری، چھت گیری میں رنگین قمقمے، ایک اونچے اسٹول پر گراموفون، دوسرے پر، آگرے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل، ایک ایسی، نہایت خوب صورت، زرّیں و مخملی کرسی، جس پر بیٹھتے ہی باجہ بجنے لگتا تھا، دروازوں پر چلمیں، سامنے، چاندی کے فریم میں جڑا، قدِ آدم آئینہ، آئینے کے تختے پر، ارگن بجانے والی ٹائم پیس، پیتل کا عود دان، لکھنے کی میز پر بلوریں دوات قلم، ایک بڑا خوب صورت لیمپ، جس کے گلوب میں، جھاڑوں کے سے رنگین قلم، دیواروں پر، بڑی بھڑکیلی دیوار گیریاں، الماری میں شعرا، کے دیوان، الماری کے دروازے پر، گوند سے چپکائی، اور کپڑوں کے تھانوں سے چھڑائی ہوئی سنہری چِٹھیاں[2] ——— یہ تھی میرے کمرے کی آرائش -

---

[1] دادامیاں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ [2] ان میں سے، ایک چِٹھی کا آدھا حصہ، الماری کے دروازے پر آج تک چسپاں ہے، اب اُس کمرے میں میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد رہتا ہے، جس نے، اپنی بے پروائی کے ہاتوں، اُسے اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ——— اب، جب کبھی ملیح آباد جاکر، اس کمرے میں قدم رکھتا ہوں تو اس کے ذرّات چیخ اُٹھتے ہیں "ارے ہمارے منجھلے بھیا آگئے" اور جب الماری کے پٹ پر چپکی ہوئی دھندلی سی چِٹھی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں، تو اس چِٹھی کے اندر سے، بالکل میری صورت کا ایک لڑکا، جرنیلی ٹوپی پہنے، برآمد ہو جاتا ہے، اور اس لڑکے کو دیکھ کر، میری، ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ اور اس عالم میں رئیس کا خوب صورت گوکانا دحسین، روتا ہوا میرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، جس کے رخسار سے میرے لبوں نے، اس کمرے میں بوسے کا، اوّلین تجربہ حاصل کیا تھا۔ اور کھڑکی سے بڑی بی کی تھرتھراتی آواز آنے لگتی ہے کہ ننھے آؤ، اماں دودھ کا پیالہ بھرے بیٹھی ہیں" ——— ہائے، ہائے، ہائے، ہائے۔

میرے زمانے کے اوہام

میرے خاندان کی خواتین پر، خوف ناک، تصوّرات مُنڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو، ہر محل میں، "ارواحِ خبیثہ" کی عمل داری تھی۔ لیکن وُہ محل، جس میں دادامیاں رہتے، اور جس کا نام تھا، "بڑا محل" وُہ تو، خصُوصیت کے ساتھ ـــــ دنیا بھر کے شہید مردوں، ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے تمام مقتول گوروں ـــ بھوتوں، پُریتوں، پَلیدوں، دیووں، چُڑیلوں، بُھتنیوں، پچھل پائیوں، بُڑ سریوں، خبیثوں، اور جنّوں کی راج دھانی سمجھا جاتا تھا ـــــ اور، تمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیارے میں، اس محل کے تمام گوشوں، کونوں کھتروں، کوٹھریوں، مچانوں، طاقوں، صحنچیوں، سہ دریوں، زینوں، گلیوں، نالیوں اور ناغولوں سے، نکل نکل کر، خبیث رُوحیں دھماچوکڑیاں کیا کرتی ہیں، مُہیب آوازیں نکال نکال کر، سونے والیوں کی چارپائیاں اُلٹتی، ان کے گلے گھونٹتی، دانت کٹکٹاتی، اور، جبڑے ہلاتی، پھرا کرتی ہیں ـــــ اور لُطف یہ کہ یہ تمام باتیں سُنی سُنائی اور قیاسی نہیں، بلکہ بڑی بوڑھیاں، بڑے خوف ناک تیوروں سے، اس بات کا دعویٰ کرتی تھیں کہ وہ ان تمام کرشموں کی عینی شاہد بھی ہیں ـــ اور، ایک دفعہ ہی نہیں، وہ بارہا ان خبیث روحوں سے دوچار اور فگار ہو چکی ہیں

رات کے کھانے کے بعد، اکثر بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے، اور خواتین کے ساتھ ساتھ، تمام لونڈیاں باندیاں اور مامائیں اصیلیں بھی، اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن، بہت تڑکے، جب کہ دادی جان، اپنے کھٹّے پر بیٹھی، حقّہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھوکری، ہانپتی، کانپتی اُن کے پاس آئی، اور، سہمی آواز میں، کہنے لگی، بڑی بی بی، آدھی رات کو، جب گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا، ٹھَن ٹھَن، ٹھَن ٹھَن۔ کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدوں اور بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلوٹی، بننگن لوٹی، ڈھم ڈھوسڑ چڑیل، انگنائی میں کھڑی، اپنے جھونٹے نوچ رہی ہے، چَر چَر ـــ اور پھر جھونٹے نوچتی ہوئی، مُرمرے بھرے تھیلے کی طرح، ہائے اللہ، میری طرف، مُسمساتی اور منمناتی

چلی آرہی ہے۔ اے بڑی بی بی، میری چھاتی دَھک دَھک کرنے لگی۔ اور جیسے ہی وہ ہتنی، پولے پولے قدم رکھتی ہوئی، میرے پلنگ کے قریب آکر، کھڑی ہوگئی ۔ میری اُوپر کی سانس اُوپر، نیچے کی نیچے ہوکر رہ گئی، جی میں آیا چیخ مار کر، گھر بھر کو جگادوں، مگر، ڈر کے مارے، گلے میں گونجے سے اٹک گئے، کِتنا کِتنا زور لگایا، مُنہ آواز نہیں نکلی۔ دانت بیٹھ گئے، گھِگّی بندھ گئی —— اور، میرا دم نکل جانے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی، کہ، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وُہ جو سہ دری کے، سبز عمامے، اور لال جریب والے شہید مرد ہیں، وہ سہ دری سے نکل کر، کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتے، آگئے، اور، آتے ہی اُنھوں نے اس مُردار کی کھوپڑی پر ایسی کس کے، جریب ماری کہ وہ بُھتنی بلبلا اُٹھی، اور "اچھا، آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی، آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی" کہتی ہوئی، بھاگی، اور، دھواں بن کر، پائے خانے کی نالی کے اندر غائب ہوگئی۔

دادی جان نے یہ ماجرا سُن کر، اس چھوکری سے کہا سہ دری والے شہید مرد، اس محل میں بہت سی جانیں بچا چکے ہیں، دیکھ آج ان کی نیاز دلا کر ان کا طاق بھر دینا —— اری تو تو کل کی چھوکری ہے، میں تو اس محل کے سیکڑوں کرشمے دیکھ چکی ہوں۔ جب میں یہاں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی، تو اس محل کے کوٹھے سے، کبھی کبھی رات گئے، لفٹ رائٹ، لفٹ رای (لیفٹ، رائیٹ) کی آوازیں بڑے زور زور سے، آنے لگتی تھیں۔ اور جب سپاہی، بندوقیں بھر بھر کر اُوپر جاتے تھے، تو وہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور ان کے اُترتے ہی پھر وہی اُدھم ہونے لگتا تھا۔ ایک عامل کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں، جن گوروں کو یہاں مارا گیا تھا، کبھی کبھی اُن کی رُوحیں آکر "لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ" کیا کرتی ہیں۔

ایک رات کو، جب کہ محرّم کی نویں تاریخ کو، ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے، انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر، چیخیں مار مار کر کہنا شروع کر دیا "اری تو تو کون ہے، اری تو کون ہے، اری تو کون ہے؟"

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی، تمام عورتیں آنگن میں جمع ہوگئیں، اور پوچھنے لگیں، اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی تھی، اس نے کہا۔ بیبیو، میں نے دیکھا ایک، بڑے بڑے دانتوں کی بُھتنی، اُوپر کی مُنڈیر سے، جھک جھک کر، تعزیہ دیکھ رہی ہے، اور جب میں نے اُس سے

پوچھا اری تو کون ہے، تو اُس نے، منمنا کر کہا دُور ہوائے شنقتل، ہم زیارت کرنے آئے ہیں، اور یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گئی۔

یہ سننے کے بعد، ہر عورت کے چہرے سے خوف ٹپکنے لگا، اور گھر بھر پر سناٹا چھا گیا ــــ

میرا ڈرپوک پن

یہ باتیں سُن سُن کر میں اس قدر سہم گیا تھا کہ، رات کو گھر سے باہر قدم رکھنا تو درکنار، جب شام کے وقت، مردانے مکان میں جاتا تھا، تو ڈیوڑھی کے اس دروازے سے لے کر، اس دروازے تک، کوئی نہ کوئی ماما مجھ کو پہنچانے جایا کرتی، اور غسل خانے جاتا تھا تو ماما، دروازے پر سے، بار بار آواز دیا کرتی تھی کہ بھیّا ہم دروازے پر کھڑے ہیں، ڈر نا مت۔

تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک میری بُزدلی کا یہ عالم رہا کہ جب تک بڑی بی، گڑ گڑا کر میری پائینتی لیٹ نہیں جاتی تھیں، میں سو ہی نہیں سکتا تھا، اور جب کبھی، رات کے وقت چڑیل والی کٹیا کی طرف آنکھ اُٹھ جاتی تھی، تو میں تھرّا جاتا، اور کپکپا کر، فوراً آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا۔

دادی جان کا یہ ایک، بندھا ٹکا، اصول تھا کہ وہ ہر رات کو، سوتے وقت، بلا ناغہ، کچھ پڑھ کر، اور، دُور دُور تک، حصار کھینچ کر، تین بار، تالی بجایا کرتی تھیں، اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی، میرا دل دھڑکنے لگتا، اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور، آج بھی، جب کہ میں بُوڑھا ہو چکا ہوں اور، ارواحِ خبیثہ کو وہم کی خلّاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا، پھر بھی میرا یہ عالم ہے، کہ ابھی سالِ گزشتہ جب ملیح آباد میں دادا میاں کا محل دیکھنے کو گیا تھا، تو، ہر چند دن کا وقت تھا، لیکن، دو چار آدمیوں کو ساتھ لئے بغیر، میں اندر قدم ہی نہیں رکھ سکا ــــ اللہ اکبر، کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں بچپن[۲] کے اثرات۔

---

[۱] ہمارے گھر کے ایک گوشے میں ایک کٹیا (تیلی سی جگہ) تھی، کہا جاتا تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے۔

[۲] میرے نزدیک، یہ بچپن کے، کبھی نہ مٹ سکنے والے اثرات ہی ہیں جو نوعِ انسانی کو، ہندو، مسلم، عیسائی، بدھی، زرتشتی، یہودی، جینی، اور سکھ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ "دادا میاں کے محل" سے نکلنا، آدمی کا نہیں، دیو کا کام ہے۔

میری بسم اللہ

ارے، میں اپنی بسم اللہ کا حال لکھنا تو بھول ہی گیا، اسے پہلے ہی آنا چاہیۓ تھا، خیر، اب سُن لیجیۓ، ذرا سی بات تو ہے ہی ــــ اُس موقع پر کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں، بالتفصیل یاد نہیں ہیں۔ بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں، میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات، سونے کے خول کا قلم، اور قرآن میرے سامنے رکھا گیا تھا، اور میرے اولین معلم مولوی نیاز علی خاں نے مجھ سے کہا تھا میاں صاحب زادے، کہیۓ "بسم اللہ"۔ اس کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے، اور مٹھائی تقسیم کی گئی تھی ــــ دادا میاں بھی موجود تھے، جنھوں نے، باآواز بلند یہ مصرع پڑھا تھا: "قلم گوید کہ من شاہ جہانم" ــــ اُسی رات کو زنانے میں ڈومنیوں کا گانا، اور مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوا تھا ــــ اور میں دُولھا بنا کر، بیچ میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میرے مُعَلّم

میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں، اُردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلّم تھے مولوی قدرت اللہ بیگ، اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گومتی پرشاد۔

مولوی نیاز علی خاں ایک روکھے سے خشک مزاج آدمی تھے، مولانا طاہر بڑے ہی شگفتہ مزاج تھے، اور شاعر بھی، ان کا یہ ایک شعر اب تک یاد ہے:

شہرہ جو سُنا حُسن کا، طاہر کی زبانی ـــ نادیدہ میں عاشق ہوا، تجھ پر، مری جانی

مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ میرے پاس ان کی ایک مثنوی موجود ہے، جو غالباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اور، حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے تمام اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی نقطہ دار موجود نہیں ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے ان کے بے پایاں ذخیرۂ الفاظ، اور فراواں روائی لغات کا۔

اب رہے ماسٹر گومتی پرشاد، سو وہ بڑے ہی مسکین، اور خاموش آدمی تھے لیکن اس اسلوب سے پڑھاتے تھے کہ حرف حرف دل نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بہت دن کے بعد میرے باپ نے حضرت مانی جائسی کو میرا ٹیوٹر مقرر فرمایا تھا۔

طلوعِ صبح کا اوّلین دیدار :-

ہمارے گھر کے اندر لطیفوں، نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر، دن رہتا تھا، رات کے گیارہ بجے تک، اور، رات رہتی تھی، دن کے بارہ، ایک بجے تک — اس لئے، اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں کر ہو سکتا تھا، صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالا مال ہوا میں اس دولتِ بیدار سے، اور کیوں کر یہ قرآن اترا میری آنکھوں پر، اس کی رُوداد بھی سُن لیجئے۔ میرے باپ، ربیع و خریف کے زمانے میں، دو بار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے، اور اُن مواقع پر، وہ سو رہتے تھے آٹھ نو بجے رات کو، اور جاگ اُٹھتے تھے، صبح تین چار بجے۔ [1]

ایک بار جب وہ دورے پر جانے والے تھے، تو میں نے درخواست کی تھی کہ میاں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتے چلئے گا۔ تو انھوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے، بُوا الحافظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو، بہت تڑکے، جگا دیں۔

اب سُنیئے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے — جب لحافظن بُوا نے، بہت تڑکے، مجھ کو، جھنجوڑ کر، جگایا کہ بھیّا اُٹھ بیٹھو، میاں کے ساتھ گاؤں جانا ہے، تو میں اُٹھ بیٹھا — اور، آنکھیں مل کر،

---

[1] ایک مدت دراز سے میں سو رہتا ہوں رات کے آٹھ نو بجے، اور جاگ اٹھتا ہوں صبح کو تین چار بجے، جس کے یہ معنی ہیں کہ میرے گھر میں ربیع و خریف کی فصل ہمیشہ رہتی ہے، اور میں ہر روز، اپنے علاقے کے دورے پر جاتا رہتا ہوں، بارکلی علاقہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دریائے سخن، سدا ہے جاری۔

نگاہ اُٹھائی، تو، بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگِ مرمر کی تراشیدہ، اور دُھوپ چھاؤں کی پروردہ، نیم پیدا، نیم پنہاں، گنگا جمنی پریاں، نقابوں کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے، رمساتے آسمان سے، کسمساتی زمین کی طرف، اُڑتی چلی آرہی ہیں، تو میرے دل نے پوچھا ارے یہ ہو کیا رہا ہے، اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے! — دن ہے نہ رات۔ اندھیرا ہے نہ اُجالا۔ اندھیرے میں اُجالا — اُجالے میں اندھیرا — صباحت میں ملاحت، ملاحت میں صباحت — سُرمئی نقاب، کندنی مکھڑا — سُرخی میں، گدرائی فضا کی انگڑائیاں۔ آدھے جلوے، آدھی چھائیاں — ظلمات میں، آبِ حیات کا آبشار، آبنوس کے شہر میں، مصر کا بازار — ایک طرف مخمل، کم خواب، سُرمہ، کاجل، گیسو، ململ، کریب اور ریشم، اور، ایک طرف، افشاں، سلما، ستارہ، قشقہ، غازہ، گوٹا، کناری، سونا چاندی، مرمر، لچکا، پٹھا، ابیر اور گلال، فضا پر سُنہرے تاروں کا جال، اور بڑی آہستگی کے ساتھ، اُبھرتا ہوا، کندن کا تھال۔

ٹہلنے لگیں بھرتا، نیم کے نیچے گیا، شاخ پر چہچہاتی چڑیاں، پھرّا مار کر، اڑگئیں، ہات پھیلا کر، نیم کو چھاتی سے لگا لیا، ڈالی کو جھکا کر، اس کی پتیوں کو چوم لیا، مرغانِ سحری کی بانگ نے، خُون کو گرما کر دیا — دیوانہ وار مردانے میں پہنچا۔ دیکھا کہ میانہ صحن میں رکھا ہوا ہے، میانہ محل نظر آیا۔ کہار، چلمیں پی پی کر، کھانس رہے ہیں، ان کی کھانسی بھی اچھی لگی، سپاہی "لا الٰہ الا اللہ"، کہہ کہہ کر، منھ دھو رہے ہیں، اُن کے چھپکوں کی آواز نے دل موہ لیا۔ پھاٹک کے قریب، گھوڑے، دُمیں ہلا رہے ہیں، کنوئیں کے پاس کھڑی ہوئی ہتنی، جھوم رہی ہے، الاؤ کے گرد پاسی بیٹھے تاپ رہے ہیں، الاؤ کی اُچھلتی آنچ میں، زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور یہ سارا سماں، اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہوگیا — میں وحشی چکارے کے مانند، دوڑ کر، سامنے کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے کی اسموئی ہوئی گرمی سردی سے جی خوش ہوگیا — میں، ذرا سا مڑ کر، اور ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر، اپنا منھ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سُرخی کے ہلکورے، آنکھوں میں گلابی ڈورے — چھریرا بدن، پتلی کمر، گھنیرے بال، پتلے پتلے

لے ایک ادنیٰ قوم جس سے زمیں دار پولیس کا کام لیتا ہے۔

ہونٹ، لانبی لانبی پلکیں، — بر میں ریشمی کرتہ، کرتے پر، روئی بھری مخملی صدری، سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی، ٹوپی کے گرد، آگرے کا سنہرا فیتہ، اور داہنے کان میں، ہلتا ہوا، سونے کا، جھلاجھل، دُر۔ اُف میں کس قدر حسین ہوں، زندگی میں، پہلی بار، اس کا پتا چلا۔ اللہ بھلا کرے طلوعِ صبح کی رنگینی کا، جس نے، میرا پوشیدہ اجمال، مجھ پر آشکارا کر دیا۔

وہ جمال۔ جو آگے چل کر، زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کے سروں کو، اپنے قدموں پر جھکا لینے، اور ایک دن: پریانِ حاضر ناز اٹھانے، ہائے جوانی، ہائے زمانے" کا نعرہ لگانے والا تھا۔ اور وہ آنی و فانی جمال کہ اب اس اَرذل عمر میں، جب کبھی دہ یاد آ جاتا ہے — تو، ہر چند میرے مفکر شبیر حسن خاں پر قطعی ملال طاری نہیں ہوتا، لیکن میرے شاعر، جوش ملیح آبادی کے دل سے، خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں، اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ:

ہم پر بھی، حسینوں کا کرم تھا، اک روز
اس قوم میں، اپنا بھی بھرم تھا، اک روز
بے زار نگاہوں کی گزرگاہ ہے اَب
وہ چہرہ — کہ نظروں کا حرم تھا، اک روز

کردگارا! پھولوں سے چہروں کو، ہڑوں کی شکل میں تبدیل کر دینے سے، آخر تجھے کیا مزا آتا ہے؟

گاؤں کا پہلا نظارہ ——

کرن پھوٹتے ہی ہمارا قافلہ چل کھڑا ہوا۔ میرے باپ، آٹھ کہاروں والے میانے میں، ضلع دار[1] و اقربا، گھوڑوں پر، میرے بڑے بھائی، مشیر احمد خاں رام پوری، اور رتھ میں، ہتنی پر، باقی تمام خدمت گار، سپاہی، اور گُرَیتے[2]، پیدل۔

پانچ چھ میل کی مسافت طے کر کے، جب ہمارا قافلہ حُدودِ سیدآپور[3] میں داخل ہوا، تو، چوں کہ اس سے بیش تر، میں نے کبھی گاؤں دیکھا ہی نہیں تھا، میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

---

[1] زمیں دار کا مقرر کردہ تحصیلدار [2] وہ پاسی جو، گاؤں میں پولیس کے فرائض انجام دیتے تھے [3] ہمارے علاقے کا، سب سے بڑا "تخت" گاؤں، جس کا لقب تھا، "چاندی کا پرنالا"۔

اللہ اللہ، تاحدِ نظر، جھومتے، لہلہاتے، اور گنگناتے کھیت۔ کھیتوں میں، دھرتی ماتا کی اُگی ہوئی تمنائیں، اور، مستجاب دعائیں، بیچ بیچ میں، مانند زلفِ بتاں، پیچ و خم کھاتی، پگڈنڈیاں۔ چلتی "بیڑیوں" اور "پراہیوں" کی بدولت، گہری گہری نالیوں میں، شہر کے جُھلسوں کو آگ بخشنے والے بہتے پانی کی، گڑبڑ، گڑبڑ۔ سُنہری اور ملائم کرنوں سے جھیل کی موجوں کی جھلمل، جھلمل۔ ساحل پر خوب صورت مُرغابیوں کی قطاریں پرفشاں، اور موجوں میں، اُن کی، رہ رہ کر ڈبکیاں۔۔ اور ملائم دوش پر۔ کھیتوں کی تراوٹ اور بالیوں کی خوش بو اُٹھائے ہوئے ٹھنڈے جھونکوں کی، پاکیزگی و لطافت — اور کھیتوں سے دُور، کچے کچے، لپے پُتے، مکانوں کے چھپّر۔ اُونچے اُونچے کھلیان — نکائی کرنے والی جوان جوان عورتیں، اور رُکتا رُکتا رچھوکریاں، اُدھر طوفان، اِدھر اُٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے، اُودی اُودی چُندریاں، ان کے خالص ہوا، اور مسلسل محنت کے پروردہ، چھلکتے شاداب چہرے، اور، گٹھے گٹھے، چنکتے بدن۔ ایسے بدن کہ، کہ، پوری طرح کسمسا کر انگڑائی آئے، تو جلد مسک کر رہ جائے، اور، دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھومیں مچائے کہ، انھیں چھو کر بھی دیکھ لیا جائے کہ یہ بنی ہیں کن عناصر سے۔ یہ سماں دیکھ کر، میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں — رگ رگ میں، بشاشت کے فوارے چھوٹنے لگے، نچلے پپوٹوں کے نیچے خُنکی دوڑ گئی، آنکھیں جیسے، ایک دم سے، بڑی ہو گئیں، نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سُرخی نظر آ گئی، پور پور میں تازگی، اُنگلیاں چٹخانے لگی، سانس لینے کا، غیر محسوس عمل، ایک محسوس عیاشی بن گیا، اور میرے جسم کے اندر پَو پھٹنے لگی۔ سویرا ہو گیا۔

اسی عالم میں ہمارا قافلہ، کھیتوں کے پیچ و خم سے گزرتا — صدہا زمیں بوس سلاموں کا، صرف ایک سر کی جنبش سے، جواب دیتا — ہتنی کی، بار بار بڑھتی ہوئی سونڈیں، ٹوٹتے گنّوں کی چٹاخ چٹاخ سنتا۔ کورے پنڈوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا — اور، پیتل کی جھلکتی، چھلکتی، گاگروں کے نیچے، صراحی دار گردنوں، اور پتلی پتلی کمروں کی لچک دیکھتا ہوا، بالآخر تھانے[1] پہنچ گیا۔

---

[1] تعلقہ داروں اور زمین داروں کی قیام گاہ۔

ہمارے، تھانے پہنچتے ہی، رعایا، جوق در جوق آنے، اور ہم دونوں بھائیوں کے، پاؤں چھو چھو کر، نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپوں کو، سامنے کے کھرّے تخت پر، بڑی بے پروائی کے ساتھ، کھنا کھن، اور چھنا چھن، پھینکنے لگے — اور، تھوڑی دیر میں، پیاز کے تسلوں کے سے چمکتے سکّوں کا تخت پر انبار لگ گیا، پہاڑی سی بن گئی۔

رعایا، جب روپیہ برسا چکی، تو سیدا پور کے پستہ قد مہاجن، بھلڑ شاہ، ہاتوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے، اور، چاندی کی شام، اور، لوہے کے گولے کی، ہرَوتی باندھے، جھکے جھکے آئے — اپنے خادم کے سر سے، روپوں کا بھرا ہوا، چوٹی دار تھال اُتارا — اُسے، ہم دونوں بھائیوں کے سر پر، تین بار بطور صدقہ، گھمایا، اور پھر ایک بڑے کھنا کے سے، تھال کا تمام روپیہ، فرش پر گرا دیا — خالص چاندی کے کھنکتے روپے، فرش پر اِدھر اُدھر ناچنے اور دوڑنے لگے — اور ہمارے خدّام نے، حسبِ دستورِ قدیم، وہ تمام روپے لوٹ لیے۔ اس ہنگامۂ رقص طلا کے بعد، اب دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا — جبّو[۲] علی نفیر، دسترخوان پر، اپنے ہات کا پکا یا کھانا چننے لگا، اور، دم بھر میں، ہمارے مراد، اہیر اور برہمن کاشت کار، اپنے اپنے سروں پر پکوان اُٹھائے ہوئے آئے، اور، دیکھتے ہی دیکھتے، ہمارے سامنے، پوریوں، کچوریوں، بھانت بھانت ترکاریوں، تلی مچھلی کے ٹکڑوں گلگلوں، پھلکیوں، دُودھ دہی کی ہانڈیوں، مٹھائیوں اور رسادل کی، بڑی بڑی کنٹیوں کا ایک انبار لگ گیا۔

خاصہ تناول فرما کر، میرے باپ، حسبِ معمول اندر کے کمرے میں جا کر، سو گئے — میں بھی تکان محسوس کرنے کی بنا پر چاہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے واسطے لیٹ جاؤں۔ کہ باہر سے، عالم گیر تھپیا[۳] کی، گرجتی آواز سنائی دی — باہر گیا تو یہ دیکھا کہ ایک، سر سے پاؤں تک، چیتھڑوں میں لپٹا ہوا، کاشت کار، اپنے بیٹے کے شانے پر ہات رکھے، تھپیا سے، اپنی زبان

---

[۱] لکشمی دیوی اپنی اس اہانت کا مجھ سے اب انتقام لے رہی ہیں، لیکن یاد رکھو دیوی جی، میری پیشانی، تمھاری چوکھٹ پر، کبھی جھکی ہے، نہ جھک سکے گی۔
[۲] وہ، ہمارے دس پانچ مسلم کاشت کاروں میں سے ایک تھا، جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا تھا۔
[۳] تھپیا، ہمارے پورے علاقے کے صدر ضلع دار، بے حد شعلہ خو، دشنام کار، انسان تھے

میں یہ کہہ رہا ہے کہ خان صاحب بہادر آپ خود میری سامنے کھڑی ہوئی بیوی کو دیکھ لیں، اس کو شوکھے کا روگ لگ گیا تھا، اس کی دوا دارو نے مجھ کو کھک کر دیا ہے، آدھا لگان اب لے لیجئے، آدھا دوسری فصل پر ادا کر دوں گا۔

اس کا یہ عذر سن کر، پھپانے، اس کو ایک موٹی سی گالی دے کر، کہا ابے ایک آنہ بھی کم نہیں لوں گا، پورا لگان ادا کر پورا ۔۔۔ اس بوڑھے پھوس نے، تھرتھراتی آواز میں کہا بھگوان کی قسم آدھے لگان سے زیادہ میرے پاس، ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی پھپا اٹھے، اور ایک تھپڑ اس کے منھ پر اتنے زناٹے سے مارا کہ وہ، دھڑام سے، زمین پر گر پڑا، اس کی مرجھائی ہوئی بیوی کی آنکھوں سے، ڈھل ڈھل، آنسو بہنے لگے، اس کے بیٹے نے، شرم سے، آنکھیں جھکالیں۔ گرے ہوے بوڑھے نے، اپنی روتی ہوئی بیوی، اور اپنے جھینپے ہوئے بے بس لڑکے کو، ایسی نظر سے دیکھا کہ میری سانس، میرے گلے میں الجھ گئی، اور پھر ایک دردناک چیخ مار کر، میں تھانے میں داخل ہو کر، اپنے سوتے ہوئے باپ کے سرہانے جاکر کھڑا ہو گیا، اور ہچکیاں لے لے کر، رونے لگا ـــ میری ہچکیوں سے ان کی آنکھ کھل گئی، اور، انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ، انھوں نے مجھ سے پوچھا، ارے کیا ہوا، ارے کیا ہوا

میں نے اس بوڑھے کسان کی حالت اور پھپا کی شقاوت کا سارا ماجرا بیان کر دیا ـــ میرے باپ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں، صالح محمد خاں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کسان کو میرے پاس بلا لاؤ، وہ بوڑھا، میرے باپ کے قدموں پر گر کر، کہنے لگا دُہائی خان صاحب بہادر کی۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی، اپنے فرزند کے ساتھ آگئی، اور وہ دونوں بھی زار قطار رونے لگے۔ میرے باپ نے انھیں تسلی دے کر، گرجتے کو حکم دیا کہ ماتا دین پٹواری کو بلا لاؤ پٹواری آگیا، تو انھوں نے فرمایا، ماتا دین، سیاہے میں اس مُراؤ کے لگان کی پوری بیباقی درج کر لو، اور، اسی وقت، رسید اس کے حوالے کر دو ـــ

میری باپ کے ترحم آمیز برتاؤ کو دیکھ کر، بوڑھے کسان، اس کی لاغر بیوی اور اس کے بیٹے کی آنکھیں، شکریئے کے آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگیں ـــ اور مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے میرے دل کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے۔ اور جب وہ تینوں آدمی جے کھان

صاحب بہادر کی۔ اے بھگوان کھان صاحب بہادر کا راج گنگا دھار تک ہے۔ کہتے چلے گئے — تو میرے تمام رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مجھے اپنے باپ کی صورت اور بھی اچھی لگنے لگی، اور عالم گیر بڈھیا سے ایسی نفرت ہوئی کہ جب میرا زمانہ آیا، تو، بڑے لطیف حیلے کے ساتھ، میں نے ان سے ضلع داری نکال کر، اپنی پھپی زاد بہن کے فرزند، خواجہ حسن خاں کے سپرد کر دی۔ لیکن خواجہ حسن بھی بڑے ثابت ہوئے، پھپانگی تلوار تھے، تو وہ میٹھی چھری نکلے۔ غرض کہ — رعایا کو آرام نہیں[1] مل سکا۔

خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا — جب رات کا وقت آیا تو میں کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہوگیا۔ اور کہانیاں سنانے والے، کہانیاں سنانے لگے۔

میرزا ایوب بیگ اور بنو خاں کے بعد جب ظہور علی خاں کی باری آئی، تو انھوں نے ایسی دل چسپ کہانی سنائی، جس کے بعض حصے، اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی سُن لیں:۔

"ایک بار، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ایک خوب صورت گبھرو جوان، تاروں کی چھاؤں میں نوکری تلاش کرنے کے واسطے اپنے گاؤں سے، ایک شہر کی طرف روانہ ہوا —

لق ودق میدانوں، گہری ندیوں اور گھنے جنگلوں کو طے کرتا وہ، اس وقت شہر کے کنارے، پہنچا، جب کہ چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے — تو دیکھا کہ، حاشیۂ شہر کے ایک، چھوٹے سے مکان کی دیوار پر، ایک کبوتر بیٹھا دُم ہلا رہا ہے، بھوکا پیاسا تو تھا ہی، جی میں آیا کبوتر کو مار کر بھونوں اور کھا جاؤں۔ اس تمنا میں، دَن سے، فیر کر دیا — مقدر کی بات کہ گولی کھا کر، کبوتر اِدھر نہیں، اُدھر مکان کے اندر گر گیا۔ سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بندوق کا کندہ لگا کر، دیوار پر چڑھ گیا، دیوار سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، کوئی نظر نہیں آیا، دَھم سے کود پڑا۔ کودتے ہی دیکھا کہ ایک خوب صورت جوان پٹھا خاصی عورت،

---

[1] دراصل وہ تمام نظام ہی اس قدر ظالمانہ تھا کہ اس سے کسی نوع کی شرافت کا تصور ہی وابستہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا بھلا کرے حکومت ہند کا کہ اس نے ہر "پٹی دار" ہر "نمبردار"، ہر "تعلقہ دار"، ہر جاگیردار، اور دیسی ریاستوں کے ہر تاج دار کو دار پر چڑھا کر، اللہ کے کروڑوں بندوں کی گلو خلاصی کر دی۔

ہر چند تیغ جاگیرداری، اسے تباہی مجھ پر بھی آئی۔ لیکن کوئی پروا نہیں، ایک میری بربادی نے بے شمار انسانوں کو آباد کر دیا۔ جی ہاں، آنکھ گئی، پیر گئی۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

دالان سے نکل کر، بال بکھرائے، اُس کی طرف چلی آرہی ہے، سپاہی سٹّی بھول گیا، زمین نے قدم پکڑ لیے، بھاگنے کی طاقت سلب ہو گئی، کبوتر کو بھول گیا، اور اس مورتی کو دیکھنے لگا ——— عورت ڈھیٹ تھی، ڈری نہیں۔ اور بانکے سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی "پرائے گھر میں کود پڑے دھم سے، یہ کون سی بھل منسئی ہے، تم کوئی چور رہو، اُٹھائی گیرے ہو، ہت پھیریے ہو، ڈاکو ہو، اُچھال چھکا ہو، یا دیوانے"۔ ——— سپاہی نے، سر جھکا کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اور کہا جو چاہو، سزا دے لو، بھوک میں مجھ سے بڑی بھول ہو گئی ——— عورت نے کہا، میں نے تمھاری سزا سوچ لی ہے "ادھر آؤ، میرے پیچھے پیچھے، دالان میں۔ سپاہی نے دل میں کہا اس کی ماریں بھی مزا آئے گا۔ اس کے پیچھے، گردن ڈال کر، روانہ ہو گیا ——— دالان میں پہنچ کر عورت نے کہا چٹائی پر بیٹھ جاؤ، سپاہی چٹائی پر بیٹھ گیا تو اُس نے، یہ کہہ کر، اس کے سامنے کھانا رکھ دیا کہ پہلے کھانا کھلاؤں گی، پھر تم کو، اس گھر میں کود پڑنے کا مزا چکھاؤں گی۔ جب سپاہی کھانا کھا کر، ہات دھو چکا تو اس عورت نے، کہا اب میں تمھاری ناک چھیدوں گی، اور اس میں نکیل ڈال دوں گی، سپاہی اس کا منھ دیکھنے لگا، اس نے گردن جھکا دی ——— پھر، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس عورت نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا تم کون ہو، گبھرو کی سانس تیز تیز چلنے لگی، اس نے اپنا نام بتایا، عورت نے پوچھا کس کام کے لیے یہاں آئے ہو، اس نے کہا میں سپاہی ہوں، کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں نوکری کر لوں گا۔ عورت اُس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی، اس کے منھ سے نکل گیا "ائے" عورت نے، مُسکرا کر کہا تمھاری سزا یہ ہے کہ آج سے تم میرے نوکر ہو گئے ہو، کھانا پینا، کپڑا لتا، میرے ذمے رہے گا ——— تنخواہ تمھاری ایک روپیہ روز ہو گی، تم کو منظور ہے، سپاہی نے ریشہ خطمی ہو کر کہا، جان و دل سے منظور ——— عورت نے کہا لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میرے میاں کے آنے کا وقت ہو گا، اس سے آدھے یا ایک گھنٹے پیش تر ہی، تم میری سہیلی کے گھر جا کر، ایک کوٹھری میں سو جانا، جب وہ چلا جائے گا، تو میں تمھیں بلا لیا کروں گی ——— یہ دیکھو، کونے میں سہیلی کے گھر کی کھڑکی ہے ——— یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور اپنی سہیلی کو بُلا لائی، اور ساری بات اس کو سمجھا دی ——— اور پھر اس نے سپاہی سے یہ کہا شام ہوتے ہی نہا دھو کر میری سہیلی کے ساتھ، ایک تنبولی کی دُکان پر جانا، اور ایک روپے کی گلوری مانگنا ——— اور گھوم

پھر کر، پھر گھر چلے آنا۔ چناں چہ، شام ہوتے ہی، سپاہی نہایا دھویا، عورت نے اس کو ایک ریشمی لنگی اور ململ کا، دُھلا ہوا، ایک کرتا دیا۔ اور ایک جریب۔ اس کے سر میں تیل ڈالا، کنگھی کی، کرتے میں عطر ملا، اور اپنی سہیلی کے ساتھ بازار روانہ کر دیا۔ سہیلی نے، دُور سے اشارہ کر کے، تنبولی کی دکان بتادی۔ سپاہی، عطر کی مہکو میں ڈوبا گیا اور ایک روپیہ اس کے تھال پر پھینک کر کہا، اے تنبولی، ایک روپے کی ایک گلوری۔

اُس زمانے میں، ایک پیسے کی ایک گلوری ملا کرتی تھی، اس لیے "تنبولی، ایک روپے کی ایک گلوری" سُن کر، بھوچکا ہو کر رہ گیا، دل میں سوچنے لگا، ہو نہ ہو یہ کوئی بھولا بھالا رئیس زادہ ہے، لیکن اس نے سوچا، رئیس زادے، بازاروں میں لنگی باندھے کب پھرتے ہیں۔ سپاہی نے تنبولی کو سوچتے دیکھا تو گرج کر کہا، اے تنبولی، ایک روپے کی ایک گلوری، جلدی کر۔ تنبولی نے، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میاں تم کون ہو، اس نے کہا ہم سپاہی ہیں سپاہی، تنبولی نے دریافت کیا میاں کس ڈیوڑھی پر نوکر ہو؛ سپاہی نے کہا پورب کی طرف سے آتے ہوئے، جو سب سے پہلا لال اینٹوں کا مکان ہے، اس مکان کی مالکن کا سپاہی ہوں۔ تنبولی نے گلوری تو اس کو دے دی، مگر دل میں سوچنے لگا کہ یہ سپاہی جو مکان بتا رہا ہے، وہ تو میرا ہی مکان ہے، کیا، میری عورت بگڑ گئی ہے، لوگوں نے سچ کہا تھا کہ تم ادھیڑ ہو کر جوان عورت سے شادی نہ کرو، نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے تنبولی نے، وقت سے پہلے ہی، اپنی دکان بند کر دی، اور، افتاں و خیزاں جا کر، اپنا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میاں کے قبل از وقت آنے سے تنبولن گھبرا گئی، سپاہی نے بندوق اٹھالی، تنبولن نے بندوق چھین لی، کہا جلدی سے بندوق سمیت، اس سامنے والی کٹھیا میں جا کر کود پڑو۔۔۔ سپاہی کٹھیا میں کود پڑا۔ تنبولن نے، سر میں پٹی باندھ لی، اور دروازہ کھول کر کراہنے لگی۔ تنبولی نے پوچھا دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی، تنبولن نے کہا ارے دیکھ میرے سر کی پٹی، درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے، گڑ مرادی پڑی تھی، کھٹ کھٹ سُن کر، بڑے جتن کر کے اٹھی ہوں۔ تنبولی، چُپ منہ، گھر میں گھسا، اور چراغ ہات میں لے کر، ادھر اُدھر گھومنے لگا، تنبولن نے

کہا یہ تجھے آج کیا ہو گیا ہے کہ سارے گھر میں، چراغ لیے چھوٗ چھوٗ کرتا پھر رہا ہے، تنبولی نے، بگڑ کر کہا تیرے یار کو ڈھونڈ رہا ہوں ـــــ یہ سنتے ہی، تنبولن نے، آنکھیں پھاڑ کر، اور چھاتی پر گھونسا مار کر کہا یا اللہ یہ بھی سُننا تھا مُجھ کرموں جلی کو۔ ارے میں اور یار، اگر میں ایسی ہوں، تو بجلی گر پڑے مجھ پر۔ علی کی تیغ ٹوٹے مجھ نگوڑی پر ـــــ تنبولی نے، کڑک کر کہا اگر تیرا کوئی یار نہیں، تو پھر میری دکان پر یہ ایک روپے کی گلوری کھانے والا کون آیا، اور میرے مکان کا پتا یہ کس نے بتایا تھا؟ تنبولن نے، سر پیٹ کر کہا ارے مورکھ، اب میں بات کی تہ کو پہنچ گئی۔ یہ سارا سوانگ اُس موے کا بھرا ہوا ہے، جو چاہتا ہے مجھ سے تجھ سے چھٹم چھٹا ہو جائے، تو مجھے فارخطی دے دے، اور، تھو، تھو، سات سات سمندر پار، پھر وہ مجھ سے بیاہ رچالے۔۔ ارے اُس موٗے کے مُنھ کو لوکا، اگر تو، خدا نہ کرے اشیطان کے کان بہرے، مجھے چھوڑ بھی دے گا، پھر بھی، اس اٹھائی گیرے کے منھ پر بھی نہیں تھوکوں گی۔ وہ تو دو کوڑی کا بجوڑا ہے، میں تو، کان پکڑ کے اور توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں کہ تیرا مُنھ دیکھ کر، اب کسی ہفت اقلیم کے بادشاہ کا منھ بھی نہیں دیکھوں گی۔

تنبولی نے کہا بتا وہ ہے کون بدماش؟ ۔ تنبولن نے، منھ پر انگلی مار کر کہا، میرے قریب کان لا۔ اور پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سارا بس اسی بدماش کا بویا ہوا ہے۔ اس کی گھر والی، تو جانتا ہے کہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے، خود اس نے، میرے کان میں کہا تھا کہ میرے خصم کا تجھ پر دانت ہے، ہشیار رہنا۔ مدا تو ابھی چپ رہنا، میں اپنے چاروں بھائیوں کو بُلا کر، اس کی ایسی مرمت کرادوں گی کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تنبولی کو یقین آگیا کہ بس یہی بات ہے، اور اسی بدذات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے، اس نے، پشیماں ہو کر، سر جھکا لیا، اور جب تنبولن نے دیکھ لیا کہ اس کا جادو چل گیا ہے، تو وہ منھ ڈھانپ کر رونے لگی، اور تنبولی کہنے لگا اری مجھ سے بڑی چوک ہو گئی کہ اول فول بکنے لگا، ماف کر دے مجھے۔ تنبولن نے، ڈھیلے ہات سے، اس کے منھ پر تھپیڑ مار کر کہا، جا، بڑے پیر کی نیاز دلاؤں گی، بزار سے لڈو لے آ ـــــ یہ انھیں کی برکت ہے کہ میری بات، تجھ مُورکھ کی سمجھ میں آگئی۔

تنبولی جب باہر چلا گیا لڈو لانے، تنبولن نے، کٹھیا میں منہ ڈال کر، کہا، تھوڑی دیر اور سُسیتا بیٹھا رہ، ابھی تجھے تازے تازے لڈو کھلواؤں گی، اور جب موا بڈھا چلا جائے گا تو تجھ کو باہر نکال لوں گی۔ اس کے بعد، کھڑکی میں منہ ڈال کر، اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس نے اپنے پاس بلا لیا، اور یہ سارا ماجرا اس کو سنا دیا۔ جب تنبولی، بڑے سے دونے میں، لڈو لیے، خوش خوش، اور جھینپا جھینپا آیا۔ سب سے پہلے اس کی سہیلی نے اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی، پھر تینوں نے، مل کر لڈو کھائے۔ اور جب آدھے سے کچھ کم لڈو رہ گئے تو اس نے اپنے میاں سے کہا، تو بڑا نشانہ باز بنتا ہے، تو بھی کٹھیا کے اندر لڈو پھینک، اگر ایک لڈو بھی نیچے گر گیا تو تو ہار جائے گا، اور سانولیا، اتنے ہی لڈو تو پھر لائے گا۔

تنبولی نے ایک، ایک کر کے تمام لڈو کٹھیا کے اندر اتار دیے اور، قہقہہ مار کر کہا اری دیکھا میرا نشانہ۔ تنبولن نے اٹھ کر، تنبولی کی پیٹ ٹھونکی، اور، پڑوسن کی طرف دیکھ کر آنکھ مار دی۔

جب دوسری شام آئی، سپاہی، نہا دھو کر، پھر تنبولی کی دکان پر پہنچا، سپاہی کو دیکھ کر، تنبولی کی آنکھوں میں خون اتر آیا، مگر وہ غصہ پی گیا — سپاہی نے دو روپے جیب سے نکال، کر، اس کے تختے پر پھینک دیے اور کہا اے تنبولی، دو روپے کی ایک گلوری — تنبولی نے اڑندھے گلے کے ساتھ کہا، دو روپے کی ایک گلوری"! سپاہی نے کہا ہاں ہاں دو روپے کی ایک گلوری۔ — تنبولی نے گلوری دے کر کہا میاں سپاہی، یہ تم کو یہاں روپے دے کر، کون بھیجتا ہے؟ سپاہی نے کہا ارے وہی لال اینٹوں کی مکان والی، جس نے ہم کو نوکر رکھا ہے، تنبولی نے پوچھا میاں سپاہی کل بھی وہاں گئے تھے؟ اس نے کہا گئے کیوں نہیں تھے، ہم تو نوکر ہی اس بات کے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اس نے گزشتہ رات کا سارا ماجرا اس کو سنا دیا، اور پھر، قہقہہ مار کر کہا عورت ہو تو ایسی، اس نے اس سالے کے ہاتوں سے مجھے کٹھیا میں لڈو بھی کھلوا دیے — تنبولی کا خون کھولنے لگا، اور سپاہی جانے لگا تو اس نے دانت پیس کر کہا، میاں سپاہی، آج بھی وہاں جاؤ گے؟ سپاہی نے، بگڑ کر کہا، یہ بیر بیر دبار بار، کا پوچھنا کیا، ابے کہہ تو دیا کہ ہم تو نوکر ہی اسی بات کے ہیں۔

تنبولی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جلدی جلدی دکان بند کی، راستے سے مٹی کے

تیل کا پیپا لیا، دیا سلائی جیب میں رکھ لی، گھر آتے ہی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ تنبولن نے، یار کو، بڑے سے صندوق میں چھپا کر، دروازہ کھول دیا۔ اس نے، گھر میں قدم رکھتے ہی، تنبولن کو گالیوں پر دھر لیا۔ تنبولن نے کہا ارے کیا آج چرس پی کر آیا ہے۔ تنبولی نے کہا تیرا خون پینے آیا ہوں، کل تو نے اپنے دھگڑے کو، کٹھیا میں چھپا کر، میرے ہات سے اس حرامی کو لڈو کھلوائے، لے چھنال، آج میں در باہی پھونکے دیتا ہوں، یہ کہہ کر، اس نے، ہر طرف، تیل چھڑک کر، مکان کو آگ لگا دی، اور گھر، دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ پڑوسن بھی آگئی، دو ایک پڑوسی بھی دوڑ کر آ گئے، تنبولن نے ان سب سے کہا ارے لوگو یہ تو دوانا ہو گیا ہے، ارے جس صندوق میں اس موئے کے باپ دادا کے کاغذات، گھر کا سارا زیور اور مال تال رکھا ہوا ہے، اسے تو ہات لگا کر نکال لاؤ، ابھی ادھر آگ نہیں گئی ہے، اگر وہ صندوق بھی جل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پڑوسیوں نے، مل جل کر، وہ صندوق باہر نکال کر، انگنائی میں رکھ دیا۔ اور جب صندوق باہر آ گیا تو بی تنبولن اپنے بال نوچ نوچ اور اپنی چھاتی کوٹ کوٹ کہنے لگی، ارے خدائی خوار، سنجے پورے ہو گئے اس بدماش کے، ارے میری سہیلی سے پوچھ کہ اس کی تہ میں بات کیا تھی۔ تنبولی، دوڑا ہوا سہیلی کے پاس گیا، اس نے اس کے کان میں کہا جب تو کٹھیا میں لڈو پھینک رہا تھا، میرا پاپی خصم موکھے سے جھانک رہا تھا، اُس نے اپنی آنکھوں سے سارا تماشا دیکھا، اور اپنے گرگے کو تیرے پاس بھیج دیا کہ وہ تیرے سامنے رات کی، ساری بات دہرا دے، اور تجھ کو یقین آ جائے کہ تیری بیوی بگڑ چکی اور دُھگڑا پالے ہوئے ہے، اور آخر تو اس کو فارخطی دے دے، اور وہ گل چھرے اڑانے لگے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بات پوچھ، پتّا مار کے، تو نے ٹھنڈے دل سے بات نہیں سنی، اور تیہے میں آ کر، لاکھ کا گھر، خاک میں ملا دیا۔۔۔ تنبولی، سر پکڑ کر، خاک پر بیٹھ گیا۔ اور ندامت کے مارے پسینے پسینے ہو گیا، اتنے میں تنبولن آئی، اور کہا، اب پچھتائے کا ہوت ہے، جب چڑیاں چن گئیں کھیت۔ دیکھ لیا تو نے، اگر میرا دھگڑا یہاں ہوتا تو اس کی جلی ہوئی لاش تو تیرے سامنے آ جاتی۔

سہیلی نے آ کر کہا، ارے دیر نہ کر، یہ سامنے کے موڑ پر ٹیٹوں اور ٹھاٹھروں کی دکان

ہے۔ جا کچھ ٹٹیاں اور ٹھاٹھرلے آ، جسے، مکان کے چاروں طرف لگا دیں، اور جو ایک کوٹھری جلنے سے رہ گئی ہے، اس کو بھی، رہنے کے لئے، اچھی طرح گھیر لیں —— نہیں تو رہے گا کہاں۔

تنبولی، ٹٹیاں اور ٹھاٹھر لینے کے لیے جب چلا گیا، تنبولن نے جھٹ سے صندوق کھول کر، پسینے میں تر بتر سپاہی کو باہر نکال لیا، اور گوپھے میں لے کر، سہیلی کے گھر پہنچا دیا۔

"بھیّا، ایسی ہوتی ہیں چلتر باز عورتیں" یہ کہہ کر، ظہور علی خاں نے کہانی ختم کر دی۔

چوتھی کی دلہن، یعنی طلوع سحر کا دوسرا دیدار ؛ —

چوکی دار کی آواز سے جب، منھ اندھیرے، آنکھ کھلی، تو، دیر تک یہ بات سمجھ ہی میں نہیں آئی کہ آخر یہ میں ہوں کہاں —— آنکھیں مل مل کر، بڑی حیرانی کے ساتھ، بدلے ہوئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ کی حیرت کے بعد، حافظے کا مطلع جب صاف ہوا، تو یاد آ گیا کہ میاں کے ساتھ میں سیدا پور آیا ہوا ہوں —— طلوع سحر کا مزا تو منھ کو لگ ہی چکا تھا، میں بستر سے اٹھا، اور تھانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ تھانہ سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا، جس کی چھت سے، تمام گاؤں نظر آتا تھا ——

چھت پر گیا تو نسیم صبح، میری رضائی میں آ کر، مچلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے، سردی زیادہ تھی، نہ کم، ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچۂ خاطر چٹک گیا —— دل میں وہ راگنی چھڑ گئی، جس کو انسانوں کے گلے، یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے —— دھندلکے نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیے۔ آسمان نے زمین پر، موتی رول دیے —— ولولۂ انشا نے، مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا —— آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا کہ فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے، ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں۔ لیلائے شب مستی کی دھڑی اور افشاں چھڑا کر اور رنگین آنچل سے، کاجل پونچھ کر، سرخ شلوکا پہن رہی ہے۔ سرمئی وادیوں میں مقیش کے خیمے نصب ہو رہے ہیں۔ تارے، کانپ کانپ کر، کجلائے چلے جا رہے ہیں —— افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن دائرہ نور، گھوم رہا ہے۔ اور اس کے گرد، ایک سنہرا سا ہالہ بنتا چلا جا رہا ہے —— اور، چند لمحوں کے بعد

پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گریباں مسکنے لگا — اور مسکتے مسکتے، چرے پھٹ گیا — پھر وُہ دائرہ نور، سونے کا تھال بننے لگا، تھال کا ایک سرا، کسی غرفے سے جھانکنے والی کی پیشانی کے مانند، دُور سے دَمکنے لگا۔ پھر اس کو ایک سیاہ جُونا صاف کرنے لگا — پھر وہ جُونا غائب ہو گیا — آدھا تھال سامنے آ گیا — اور، ایسا نظر آیا کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنویں سے نکل کر، جگمگا رہا ہے۔ پھر کیا تھا، چڑیاں چہکنے، ڈالیاں جھلنے، اور مرغانِ سحر بانگ دینے لگے۔ کعبۂ نور میں اذاں ہونے لگی۔ آسمان دائرہ بجانے لگا۔ زمین چوڑیاں کھنکانے لگی — جھیل نے انگڑائی لی، پانی میں سونا بہنے لگا۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بَراتی دھوم مچانے لگے۔ اور، گُرم دُھم، گُرم دُھم کی زمین پر، شہنائیوں کی پھوار پڑنے لگی — اری آج آئے سیّاں — مرے آج آئے سیّاں۔ سکھی، سوئے بھاگ جاگے — مرے تن میں راگ جاگے — مری تھامنے کو بہیاں، مرے آج آئے سیّاں، مرے آج آئے سیّاں !!

میرا ختنہ :-

لیجئے اپنی "بسم اللہ" کی طرح، میں اپنے ختنے کا بھی ذکر کرنا بھول کر، آگے، بہت آگے نکل گیا — کیا کروں، اب سنائے دیتا ہوں، کوئی پنواڑا تو ہے نہیں — میرا ختنہ کم سنی میں ہوا تھا۔ اور خوب یاد ہے کہ دادا میاں نے فرمایا تھا کہ دیکھ بیٹا، رونے کی آواز منہ سے نکلنے نہ پائے — لیکن، لال داڑھی کے جاں علی حجام نے، گھوڑی چڑھا کر، جب، گھٹ سے، میرا ختنہ کر دیا — میری چیخ نکل گئی تھی۔ دادا میاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے — اور میں، فرطِ شرمندگی سے، گڑ کر رہ گیا — اور آج بھی دادا میاں کی پیشانی کے بل جب یاد آتے ہیں تو دل پر کٹاریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ہر چند میرے ختنے کی رسم، بڑی دھوم دھام سے، منائی گئی تھی — دیگیں چڑھی تھیں، طوائفوں کے مجرے ہوئے تھے، کشمیریوں نے نقلیں کی تھیں، مگر، میرے دل کی کلی مُرجھائی سی ہی رہی تھی۔ اس مُرجھاؤ کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو وہی میری، ختنے کے وقت کی چیخ تھی۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ختنے کی خوشی میں جس وقت، ملیح آباد کے ایک لُہار نے

ایک بڑی خوب صورت اور جھلجھلاتی کرُچ بطورِ نذر پیش کی تھی، تو اس کرچ کو ہات میں لیتے ہی، مجھ پر ایسا جنون طاری ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے غلام زادے حسین بخش کے ننگے سر پر، وہ کرُچ، کھچ سے، مار دی تھی، اور اس بے چارے کے سر سے، دُھل دُھل خون بہنے لگا تھا۔ خیر، اس کی تو فوراً مرہم پٹی، اور اس کے باپ کی منھ بھرائی کردی گئی تھی، لیکن میرے دل کا زخم بھر نہیں سکا تھا — اور مجھے خوب یاد ہے کہ کاشمیریوں کی ہنسانے والی نقلیں بھی مجھ کو ہنسا نہیں سکی تھیں۔ دل ہی تو ہے۔

موسموں کے تاثرات اور میرے زمانے کے تہوار

موسمِ گرما

ارے، پھٹّے سے منہ کا موسمِ گرما ـــــ دھوپیا، دُندکیا، دہکاریا ـــ پسینیا، نچوڑیا. بھاڑیا، بھنبوڑیا، تنُوریا، چنگیزیا، چنگاریا ـــــ اُگل کھرا، جَل لکڑ، گھُنتا ـــــ رُودڑھا، بڑدتا، سبڑا، ہبڑا، بھینگا، بڑدتا ـــــ شیاطین کی آنکھ کا تارا، لوکا راج دُلارا، الاؤ کا گہوارہ، اور، شُعلوں کا فوّارہ ـــــ خونی ریچھ، لاگو بھیڑیا، اور بَنڈیلا سُوَر.

نفرت ہے مجھ کو اس محرور المزاج، مغضوب، مبغوض، معتوب، اور مُردود شُہدے سے ـــــ اُس کی صبحیں بھی چنگاریاں، اس کی شامیں بھی کٹاریاں ـــــ اس کا شعلہ خو آفتاب، دریچۂ اُفق سے، ایک بدتمیز گنوار کے مانند، بھَق سے نکل کر، فوراً آگ برسانے لگتا ہے ـــ اس کی بے مہر کرنیں، عیاذاً باللہ ـ گویا جلمی پاپی اور، بوڑھے سُودخوار لالہ رام لال کی نگاہ.

اس کٹخنے چمار موسم میں جب حرام زادی لُو کے جھکّڑ، غاؤں غاؤں، اور ہُو ہُو، ہُو ہو، کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتویں جہنّم کے گنڈے فرشتے، آتشیں گُرز مار مار کر، زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں.

جب یہ خبیث موسم آجاتا تھا، تو، دوپہر سے پیش تر ہی، ہم سب بچّوں کو، مرغیوں کی طرح "کڑ ی، کڑ ی"، کر کے خس خانے میں بند کر دیا جاتا تھا ـــــ

سقفی پنکھے کی سریلی چوں چوں کا ر ـ ٹٹیوں پر، پانی چھڑ کے جانے کی جھنکار، ننھی ننھی

بوندیوں کی پٹکار، ــــــ خَس کی، سوندھی سوندھی، اور عطرِ خَس کی، بھینی بھینی مہکار ــــــ ان سحر کاریوں کے آغوش میں، ایسی ٹھنڈی، میٹھی، مہکتی، اور گہری نیند آجاتی تھی کہ، شام سے پہلے، ہم میں سے کسی کی آنکھ کھلتی ہی نہیں تھی۔

اور جب شام کو ہم خَس خانے سے نکلتے تھے، انگنائی کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوش بو ہمارا استقبال کرتی تھی ــــ ہم سب بھائی بہن، تختوں کے چوکوں، اور آرام کرسیوں پر آکر بیٹھ جاتے، اور تاڑ کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے ــــــ تربوزوں اور خُربُزوں کی قاشوں، بالائی کی قفلیوں اور آب خوروں، نَمَش کے تھَلوُں، اور فالودے کے، برف میں جھَلے، گلاسوں سے، ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی۔ اور رات کو، بڑے سے آنگن میں، ہم سب کے پلنگ، اُونچے اُونچے کھمبوں، پر لٹکے ہوئے جھالر دار پنکھوں کے نیچے، بچھا دیے جاتے، اور، علاقے سے، باری باری آنے والی عورتیں[۱]، صبح تک، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔

مُوسِمِ سَرما

آیا، میرا کنُوار، جاڑے کا دُوار!

آہا جاڑا ــــ چَمُپئی، شربتی، گلابی جاڑا ــــ کُندن سی دمکتی انگیٹھیوں کا گُل زار،

---

[۱] یہ بات، مجھ، آج تک یاد ہے کہ ایک بار، پچھلے پہر، دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی تھی، اور یہ دیکھ کر، میرے دل پر سانپ لوٹ گیا تھا کہ ہمارے گھر کی مغلانی، حیدری خانم، نوخیز پنکھا جھلنے والی کی پیٹ پر، یہ کہہ کر، گھونسے مار رہی ہیں کہ مُردار پُنیا، پنکھا جھلنے آئی ہے، یا، پاؤں پسار کر خرّاٹے لینے کے لئے۔ بوڑھی حیدری خانم کی بے مہری، اور نوخیز پاسن کی بے کسی دیکھ کر، میرے دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ پھر میں سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس واقعے کے بہت دن کے بعد، ہمارے گھر کی کسی تقریب میں جب ایک طوائف نے یہ ٹھُمری شروع کی "ماری جیہو، ڈُلائے جاؤ بنیا، ڈُلائے جاؤ بنیا، ماری جیہو، ڈُلائے جاؤ بنیا" (پنکھا جھلتی رہو، ورنہ ماری جاؤ گی) تو اُس گدبدی نوخیز پاسن کی پیٹ پر، حیدری خانم کے، دھمادم، گھونسوں کی یاد نے، میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہائے پُرانی یادیں، ہائے پُرانی چوٹیں!

دل کی چوٹوں نے کبھی، چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا!

لحلے پتھے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دل دار ۔ دل کا سُرور، آنکھوں کا نور — دُھندلکے کا راگ، جھٹپٹے کا سہاگ — زُلیخا کا خواب، یوسف کا شباب — غذیو بربط و چنگ، شاہ زادۂ رامش و رنگ — رُوئی دوئی کا سُبتیا، مسلم کا قرآن، ہندو کی گیتا — اور، صُبح کو سونے کا جال، رات کو چاندی کا تھال —

قصیرُ النّہار، طویلُ الیل — تنگ آستین، دراز گیسو — موتی کی آب، موتیے کی اوس — رگوں میں، چٹکیاں لیتی سردی، چہروں پر، انگڑائیاں لیتی، سُرخی — مہکتے لحافوں کی نیند، چٹکتے انگاروں کا ناچ — شمس در آستیں، قمر جبیں — ٹھنڈی تارا ماتھے چاند — ماہ رُو، سوسن خو، گبھرو، لچکیلا، چھرہرا، چٹکتا، مدھ بھرا، بانکا، ترچھا، نکیلا، نُپیٹا، رسیلا، چھبیلا، سجیلا، سانولا، سلونا، اور سُہانا جاڑا۔

ہائے وہ چراغوں، موم بتّیوں، شمعوں، اکوں، اور جھاڑوں کی، پردہ نشیں، لجاتی، اور، بامُروّت، ٹھنڈی روشنی — ایسی روشنی جو اپنی جھکی ہوئی نظروں سے، در و دیوار کو توجگ جگ کردے، مگر کیا مجال کہ نندا سی آنکھوں میں چبھے —

ہائے وہ، ماہ پُوس کی، کالی کالی زُلفوں والی، بیچ میں جھلی، انگیٹھیوں کی سموئی ہوئی، جادو بھری، خاموش، لمبی لمبی راتیں — وہ، اونچے اونچے دروں کے، بھاری بھاری پردے مسہریوں کے سامنے، وہ تختوں کے چوکے، چوکوں پر وہ، مخمل کے گدّے اور گاؤ تکیے، اور تکیوں پر ٹیک لگائے، اور، پاؤں پر دوشالے ڈالے وہ، گھر کی، بڑی بوڑھیاں —

دائیں بائیں، چاندی کے اُونچے اُونچے اُگال دان - رہ رہ کر کھلتے اور بند ہوتے پاندان اور وہ ڈلی کے کٹنے کی، کٹاکٹ آوازیں - دُوسرے تخت پر، وہ، رضائیاں اوڑھے ہوئے کہانی کہنے والیاں — اُن کے پیچھے، اونچے اونچے مُوبافوں کی، ماماٸیں، اصیلیں، اور لونڈیاں باندیاں، پُشت پر، اگر دان، بیچوں بیچ انگیٹھی، انگیٹھی میں، چٹکتے کوئلوں کی چنکار، اور سُنہری آنچ کا ناچ۔

اور ہائے - مواقع و مناظر کے بیان کرتے وقت، کہانیاں کہنے والیوں کے وہ بار بار، نئے نئے رُوپوں میں ڈھلتے چہروں، آنکھوں کے بار بار بدلتے اشاروں، اور،

حسبِ حال، بڑھتے، گھٹتے، اُبھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ، اور ٹھہراؤ کے ساتھ، وہ کہانیوں کا، ان، الفاظ میں، آغاز:-

"کہانی سی جھوٹی کوئی بات نہیں، کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں — جھوٹ سچ، کہانی بنانے والے کی گردن پر، کہانی بنانے والے پر عذاب، سننے والوں کو ثواب۔ آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر۔ سوئے سنسار، جاگے پاک پروردگار — ایک تھا بادشاہ — ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ کی ایک چاند سی لڑکی تھی۔ سو، اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی ایک دن، سہیلیوں کے ساتھ، باغ میں ٹہل رہی تھی کہ...."

ہرچند، اب وُہ دن ہیں، نہ وہ راتیں۔ لَد چکے ہیں وہ زمانے، بیت چکی ہیں وہ گھڑیاں، اور، موت کی نیند سو چکی ہیں وہ کہانی کہنے والیاں — اور، قبر کی جانب، مُڑ چکی ہے، میری عُمر۔ لیکن اُن کہانیوں کے بھوتوں کے غُل غپاڑے۔ اُن کے اندر کے اکھاڑے۔ اُن کی پریوں کے غول، اُن کے گُل فاموں کی ٹٹول۔ اُن کے اُگیا بیتالوں کے اشارے، اُن کی راگنیوں کے مُڑتے دھارے، اُن کے، طوفاں میں پھنسے بیڑے، اُن کی برساتوں کے دڑیڑے، اُن کے، موتی برساتے سویرے، اُن کے ہونکتے جنگلوں کے اندھیرے۔ اُن کے شاہوں کا جلال، اُن کی شاہ زادیوں کا جمال، اُن کا فراق و وصال۔ اُن کی آہیں اور کراہیں، اُن کے گانے اور شادیانے۔ میرے دل میں، ٹوٹے ہوئے شیشوں کے نکیلے ٹکڑوں کے مانند، آج بھی چبھتے اور کھٹکتے رہتے ہیں۔ یا اللہ، کیا کروں۔ اے میرے بچپن کی اُداس انگیٹھی[1]

جن کو بھُلا چکی ہیں، ہماری جوانیاں
اب، ان میں، تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

موسم برشگال

رُوم جھُوم، بدرا برسے۔ پی درشن کو، جی ترسے
رُوم جھُوم، بدرا برسے!

[1] میری نظم "انگیٹھی" ملاحظہ فرمائیے۔ جو میرے کسی مجموعے میں چھپ چکی ہے۔

اوہو، جھومتی، جھلکتی، جھولتی، جھرجھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جوبن والی، جونٹی برسات۔ گھُپ اندھیروں، اور، گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں، گھرتی، گھومتی، گھمرتی، گنگناتی، گمکتی، گاتی، گرجتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی، گھونگروالی برکھا۔

آسمان کو گھماتی، زمین کو نچاتی، فضا کو چلاتی، شمس و قمر کو گہناتی، چوبای کو تھپتھپاتی، طوفانوں پر طوفان اٹھاتی، زلفیں چھنکاتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں چٹخاتی، اور، چھڑے کو کڑے سے بجاتی برکھا۔ ابرِ سیاہ، بیاباں در بیاباں، گلستاں در گلستاں، گلُ چکاں، گوہر فشاں، رقصاں، پرّاں، غلطاں، رواں دواں، آسماں پا بجولاں زمیں کشاں کشاں، لکے، بال کشا و نعرہ زناں، اور، سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں۔

اُف وُہ بجلیوں کی کڑک، وُہ بدلیوں کی لٹک۔ اور وُہ بانکی دھنک۔ وہ مینڈکوں کا شور، وہ پُروا کا زور، اور وہ گھٹائیں گھنگھور —— وُہ جھینگروں کی جھنکار، وہ موروں کی پکار، اور نہروں پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار —— وہ شاخ شاروں کی گلخنپ، وہ انبیوں کی ٹپاٹپ —— وہ، امریوں کے جھومتے جھولے، وہ الھڑوں کے گھومتے گولے —— وہ برستے گیت پر گیت، وہ مچلتی بیت کی ریت —— وہ یاروں کے چہچہے، وُہ نگاروں کے قہقہے —— وہ آڑی ترچھی پھواریں، وہ ستاروں کی "آریں، آریں" —— وہ ہوا کی گھوم، وُہ بوچھار کی دھوم —— وہ متوالی پی ہو، وہ نشیلی کوکو —— وہ جگنوؤں کے غول، وہ بارہ ماسوں کے بول —— وُہ دوب کا مخمل، وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل —— وہ جل تھل میدان، وہ پرنالوں کا ہیجان۔ وُہ، موجوں کی روانی وہ دھرتی بورانی —— وہ، چھاجوں پانی، وہ چھوکریوں سے چھیڑخانی،

اور وُہ : ہائے زمانے، ہائے جوانی

اللہ اللہ، وہ مچلتی گھٹائیں، وہ چڑھتے دریا، وُہ گرجتے نالے، وہ بھڑکتے ولولے، وُہ کوکتی ترنگیں، وہ اُبلتی امنگیں، وہ چھلکتے رنگ —— اور وہ زبردست و پُرشور دونگڑے، اور ایسی گرجتی پروائی کہ دھرتی بولے رام دہائی! جب موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا، میں، رسیاں تڑا کر، انگنائی میں آجاتا تھا، عورتیں چیختی تھیں کہ ارے نہ بھیگ، بخار آجائے گا، میں کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ صحن کے گوشے گوشے میں، قلقاریاں مارتا، دھوم مچاتا،

اُچھلتا کودتا، دندناتا، تالیاں بجا بجا کر، "برسو رام دھڑاکے سے" اور "کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں" کے نعرے لگاتا پھرا کرتا تھا۔

جب، پانی برس کر کھُل جاتا تھا تو، باورچی خانے کے برآمدے میں کڑھائیاں چڑھ جاتیں، اور برساتی پکوان، یعنی پوریاں، کچوریاں، اَرویاں، پُھلکیاں، دہی بڑے، بُرہیاں، چنے کا بھُرتا، اندرسے، گلگلے، چلتے دنداں مصری، اور مولی کے پتے پکنے لگتے تھے — اور، انگنائی کی، نہائی ہُوئی، کڑوی کڑوی خوش بو والی نیم کی بھیگی شاخوں میں جھولے ڈال دیئے جاتے، اور ہم سب کودتی شوخیوں کے ساتھ، جھولنے لگتے تھے — اور، ایسی لال، پیلی چندریوں والیاں، ہم کو، پینگ دے دے کر، گانے لگتی تھیں۔ جن میں کچھ مُنہ بند کلیوں کے مانند کچی، کچھ گدر، اور کچھ، ایسی گُوالا کھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھرپُور انگڑائی لے لیں، تو، انگیا کے بند، ٹوٹ جائیں اور، اور، مَسک کر، پارہ پارہ ہو جائے۔

ہائے وہ پاپی برکھا کے نکیلے کافر گیت — جو ٹھنڈی ہوا، اور رنگین فضا سے، تیرتے میرے کانوں تک آتے، اور میرے مُلائم سینے میں، کھچ سے، چُبھ جایا کرتے تھے — اور جب اُن بولوں کے کٹاؤ، اَن دیکھے منظروں، اور اجنبی مکھڑوں میں تبدیل ہو ہو کر، میری نظروں کے سامنے سے، بڑی تیزی کے ساتھ، گزرنے لگتے تھے، تو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ ان دیکھے پربت، یہ کھیت، یہ جل تھل میدان، اور یہ اجنبی، جگر جگر مکھڑے کس دیس کے ہیں، اور آخر اس وقت مجھ کو یہ رونا کیوں آ رہا ہے۔

اسی برکھا رُت میں، ہماری انگنائی کے بیچوں بیچ، ایک روز، آنسوؤں اور ہچکیوں کا ایسا مُوسلا دھار پانی برسا تھا، کہ ہمارا سارا گھر اس میں ڈوب گیا تھا۔

سُنیئے اس کی داستان

ایک دن، جس وقت کہ ہم لوگ جھول جھول کر، کجریاں سُن رہے تھے، اور باورچی خانے کے برساتی پکوانوں کا نمکین دھواں، نیم کی شاخوں کے نیچے مچل رہا تھا کہ میری کھلائی، ہانپتی کانپتی، لکڑی ٹیکتی آئیں، گانے والیوں سے کہا، بچیو، ذرا ٹھہر جاؤ، آج یہ پھوس بڑھیا گائے گی، وہ سب کی سب، پیچھے، سرک سرک کر بیٹھ گئیں۔ بڑی بی نے، اپنے سر کی چادر

پھینک دی، اُن کے سفید بال اُڑنے لگے، اور اپنے سینے پر ہات رکھ کر، بڑے درد ناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔ گانا نہیں، یہ نوحہ شروع کر دیا۔ "ہائے تمرے بنا، برکھا" نا سُہائے، ارے مورے کلکتے کے جُویا، اللہ تمھیں لائے، ہائے، اللہ تمہیں لائے،

اللہ تمہیں لائے، اللہ تمھیں لائے۔ بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھا تو میں، جھُولے سے کوُد پڑا، ان کے سینے سے جاکر لپٹ گیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے روتے ہی تمام گانے والی چھوکریاں بھی، مُنہ پر پلّو رکھ رکھ کر، رونے لگیں، گھر کی تمام خواتین، انتہائی سراسیمگی کے ساتھ، دوڑ پڑیں، اور پوچھنے لگیں، اُرے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہوگیا ہے، بڑی بی کوئی جواب ابھی نہیں دے سکی تھیں، کہ رونے کا شور سُن کر، میری انتہائی مغلوب الغضب پھُپی نواب بیگم، بھی دوڑی ہوئی وہاں آگئیں، اور بے حد غصّے کے عالم میں کہنے لگیں بھاڑ میں جائے ایسا مُوا گیت، ارے بڑی بی یہ نہیں دیکھتیں کہ مُنجھلا کسقدر ہچکوں، پہکوں رو رہا ہے، اسے آگ لگے ایسے گیت کو۔

بڑی بی پر جب یہ ڈانٹ پڑی، تو اُن کا لتا پتا دل، جو پچاسی برس سے مسلسل، دھڑک رہا تھا، بُری طرح زخمی ہوگیا۔ اُنھوں نے، اپنی، بیٹھے ہوئے کنُوؤں کی سی، خوں بار آنکھیں

لہ ہائے تمھارے بغیر، برکھا اچھی نہیں لگتی، اے میرے کلکتے جانے والے، اللہ تمہیں لائے" یہ گیت حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں کہا گیا تھا۔ اور، میرے بچپن میں، جب برسات آتی تھی تو اودھ کی گلی گلی میں، یہ گیت گایا، اور دھوم سے ماتم کیا جاتا تھا۔ کیا انسانی تاریخ پیش کر سکتی ہے، حضرتِ جان عالم کا ساکوئی محبوب بادشاہ، جس پر، پَون صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے ہوں! اے جانِ عالم، فرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا، اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے، اتنے ہی بُرے بنا لیے گئے۔

آسماں را حق بود، گر خوں ببارد، بر زمیں

اے میرے فرض شناس، جفاکوش، عدالت پناہ، اور فقیر منش بادشاہ۔ اے میرے ظرافت سنج، ہنرور، نکتہ رس، علم نواز، اور ادب پرست شاعر۔ اور اے میرے صبح کے سپاہیٔ وشہریار، اور اے میرے شام کے موسیقار فن کار مالک! آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں گویا کا یہ پَرپوتا، جوش ملیح آبادی، آپ کے آستانِ عالی پر سر رکھ رہا ہے، اس بندۂ درگاہ کا ناچیز سلام قبول فرمایئے اے فرشتہ خصلت و مظلوم آقا۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!!

لہ ہائے بڑی بی کی آواز کا درد، جب وہ "اللہ" کہتیں، تو "اللہ" کے لام کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتیں اور ایسے دبے اور درد ناک کھٹکے کے ساتھ "اللہ" کہتی تھیں، گویا وہ اپنے کلیجے سے، چھبا ہوا نیزہ نکال رہی ہیں۔

لہ اُن کو ہم لوگ آپا، اور مامائیں وغیرہ "بنّو بی بی" کہتی تھیں۔

اُٹھائیں، اور، تھرّاتی آواز میں کہا، نبتن بی بی، میں سر جھکائے دیتی ہوں، چاہو تو مجھ۔ آج نہیں، تو کل مری، بُڑھیا کو، جی بھر کے مار لو۔ میں تو آدھی سے زیادہ قبر میں اُتر چکی ہوں۔ لیکن نبتن بی بی، ہات جوڑ کر کہتی ہوں، ذرا انصاف سے کام لو، اپنی چھاتی پر، ہاتھ رکھ سوچو تو کہ برکھا رُت مینھ برسائے، اور ہائے جانِ عالم پیا کی یاد نہ آئے۔ ہائے قیصر باغ میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھے ہوئے ہوں، میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ بہاریں — ہائے میرے جانِ عالم پیا، موئے فرنگیوں نے، گلا گھونٹ کر، تم کو مار ڈالا — ہائے لکھنؤ کا سہاگ لُٹ گیا۔ ہائے قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب گئی، ہائے شاہ زادیاں ٹھوکریں کھاتی پھرنے لگیں — اتنا کہہ کر، بڑی بی نے، اپنی آنکھوں پر دوبارہ پلّو رکھ لیا، اور، رو روکر گانے لگیں:۔ ہائے تمُرے بنا۔ ہائے تمُرے بنا، برکھا۔ نا سُہائے، نا سُہائے، ائے مورے کلکتّے کے جوگیا، اللہ تمھیں لائے، اللہ تمھیں لائے"۔

بڑی بی کے اس دردِ دل نے، پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا، سب کی آنکھوں سے بیران جاری ہوگئے میری ماں نے چیخ ماری، میری غضب ناک پھپّی کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں، دادی جان، بھی مُنھ پر آنچل لے کر رونے لگیں، اور گانے والی چھوکریوں کا تو بُرا حال ہوگیا، اور گھر کا ذرّہ ذرّہ چیخنے لگا:۔ "اللہ تمہیں لائے، ہائے اللہ تمہیں لائے، اللہ تمھیں لائے۔ اللہ تمہیں لائے ——————

ہولی

یادش بخیر، ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہولی دوالی، فقط ہندوؤں ہی کے نہیں، ہمارے بھی تہوار تھے۔ ہولی کھیلنے کا بہت پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا، ہر سال، نئی پچکاریاں

لہ ایک دَور وہ بھی تھا کہ ہندو مسلم شیر و شکر تھے۔ "رام رام" اور "السلام علیکم" نے "آداب عرض" کا لباس زیب تن کر لیا تھا، کعبہ و کاشی نے ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کوثر و گنگا کو ملا کر، ایک گنگا جمنی عظیم، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی سنگم تعمیر کر دیا گیا تھا، مسلمان، ہندوؤں کے، اور ہندو، مسلمانوں کے تہوار (صفحہ پر)

بنوائی جاتی تھیں، بڑی بڑی دیگوں میں، رنگ بھرا جاتا تھا، اور، ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شور بور، اور گھر کے تمام در و بام، رنگین ہو جایا کرتے تھے۔

ہولی کھیلنے کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ ہماری رعایا میں سے، دس بیس، اُونچے طبقے کی ہندو عورتیں، صبح نو دس بجے، "ابیر گلال کے جھل جھل تھال، سروں پر اُٹھائے، ہمارے گھر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ میری دادی، اور میری ماں کے ماتھوں پر رنگین ٹیکا لگا کر، ان دوپٹوں کے پلّوؤں پر رنگ چھڑک کر، ہماری انگنائی میں، حلقہ باندھ کر، "ہوری آج جلے، چاہے کال جلے۔ مورا کنور کنھائی موسے آن ملے۔ ہوری آج جلے، چاہے کال جلے" گانا شروع کر دیا کرتی تھیں۔ اور اس گانے کی گونج میں، ایسی دھوم سے پچکاریاں چلنے لگتی تھیں کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور، چراغ میں بتّی پڑتے ہی، ملیح آباد کے تمام ہلیا سے پوریاں، کچوریاں، اور مٹھائیاں، سروں پر اُٹھائے، گاتے بجاتے، ناچتے اور ٹمڑک بجاتے، ہمارے مردانے احاطے میں، نذر کے واسطے آیا کرتے تھے۔ اور، بڑی دیر تک، بڑا چکلس رہا کرتا تھا۔

عام ہلیاروں کے بعد، قرب و جوار کے ہندو زمیں دار، جن میں لالہ صاحب مادھو پور کی شخصیت بہت نمایاں تھی، اپنی اپنی رعایا کے ساتھ آتے، ان کا گانا سنواتے، اور مٹھائیوں کے تھال پیش کیا کرتے تھے۔ اور اُس کے بعد ہمارے وہاں ان کی دعوت ہوتی تھی جس میں ایک دو بجے رات تک طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔

دوالی

دوالی میں، ہولی سے زیادہ، دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا — آنگن کے ایک گوشے

مناتے تھے۔ اور، دونوں نے، انتہائی وسعت قلب کے ساتھ، اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کر کے ایک ہندوستان گیر زبان، یعنی اُردو کی طرح ڈال دی تھی۔ اور آج یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ صد حیف کہ خبیث فرنگی نے جو ہندو مسلم نفرت کا پودا بویا تھا، ہم آج اس کے پھل کھا کھا کر، پاگل ہو چکے ہیں۔ اور اس قدر پاگل کہ اب ہم، ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں رہے ہیں کہ:

کبھی ہم میں، تم میں بھی پیار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں، بڑے بڑے رنگین گھروندے بنائے[2] جاتے تھے — ان بلند و خوب صورت گھروندوں کو شیشوں، اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا۔ جن میں، مُرمُرے، چڑوے، کُھٹیاں، گٹے[3]، اور مٹھائی کے، حسین اور باریک کھلونے، بڑے سلیقے کے ساتھ، ہر طرف چُن دیئے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی پہلے ان گھروندوں، اور پھر پورے مکان میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ اور ہر گوشہ جگ٘ جگ٘ کرنے لگتا — اور، عین اُس وقت، جب کہ چراغاں کی، "پلکیں جھپکاتی روشنی میں، خالص گھی کے چراغوں کے رقصاں دھویں کی خوش بُو، ہوا میں تیرنے لگتی تھی۔ عین اس وقت ہمارے، بڑے دالان میں، ڈھولک پر تھاپ پڑتی، اور، ڈومنیاں، اور مراثنیں گانا شروع کر دیا کرتی تھیں: — آئی دوالی، آئی دوالی۔ مدھ ماتی، جوبن والی، آئی دوالی، آئی دوالی۔ آہا، سر پہ تھالی، منہ پہ لالی، آئی دوالی، آئی دوالی۔ جگمگ، جگمگ، جگمگ کرتی، دیپک والی، آئی دوالی، آئی دوالی، آہا ہاہا، آئی دوالی۔ او ہو، ہو، ہو، آئی دوالی، ڈھولک دُھم، دُھم، پائل چھُم چھُم، بھولی بھالی، آئی دوالی، آہاہاہا، آئی دوالی، او ہو ہو، ہو، آئی دوالی"

اُدھر ڈومنیوں کا تال سَم، اِدھر مٹھائیوں کی چرندم خورندم — منہ میں مٹھائی، کانوں میں گیت، زبان و گوش دونوں شیرینی میں غرق ——

ایک بار جب اُدھر ڈومنیاں گا رہی تھیں، اور اِدھر، میرے دانتوں کے نیچے، مٹھائی کے کھلونے، ٹوٹ ٹوٹ کر، "کرُم کرُم" کی آواز پیدا کر رہے تھے تو ایک بات یاد آکر، مجھے، بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ ایک روز، جب بڑی دھوم کے ساتھ، پانی برس رہا، اور، بڑے انداز سے پروائی سنک رہی تھی تو میرے ایک ملازم سالک رام، حضرت امیر مینائی کا یہ شعر، لہک لہک کر، گا رہے تھے:۔

سب کرشمے تھے جوانی کے، جوانی کیا گئی
وہ اُمنگیں مٹ گئیں وہ بُلبُلا جاتا رہا[1]

---

[1] ہولی آج جلے یا کل جلے پروا نہیں، مگر، میرا کنور کنھائی مجھ سے آن ملے
[2] گھروندوں کی تعمیر کا کام ایک ہفتے پیش شروع ہو جایا کرتا تھا۔

اُس پر میں نے پوچھا تھا کہ سالک رام یہ "بُلبُلا جاتا رہا" کیا کہہ رہے ہو تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ بھیّا جب ہم "بُلبُلا" کہتے ہیں (کہتے ہیں) تو، مُنھ کے اندر، بڑا مجا آوت ہے (مزا آتا ہے)۔

سو میرا بھی اُس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ ساتھ، جب مٹھائی کے کھلونے میرے منھ میں، ٹوٹ ٹوٹ کر، گھل رہے تھے تو مجھ کو اپنے مُنھ کے اندر بڑا "مجا" آرہا تھا۔

شبِ برات

شبِ برات سے، ایک مہینہ پیش تر ہی، ملیح آباد کا سب سے بڑا آتش باز، جس کو، بارُود سے ایک ہات اُڑ جانے کی بنا پر، "ٹنڈا آتش باز" کہا جاتا تھا۔ ہمارے واسطے آتش بازی طیّار کرنا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اور شبِ برات سے دو روز قبل ہی، تمام آتش بازی ہمارے گھر پہنچ جاتی تھی، اور، اس کے ساتھ ساتھ، مردانے احاطے کے ایک گوشے میں، ایک لمبی چوڑی اور گہری سُرنگ کھود کر، وہ اس میں بارُود بھر دیتا، اور سُرنگ پر ایک قلعہ تعمیر کر دیتا تھا۔ اور شبِ برات کے دن، غروب کے بعد، جب تاریکیوں کا دامن دراز اور بوجھل ہو جاتا تھا، تو نوکروں چاکروں کی کڑی نگرانی میں کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آجائے ——— پھُلجھڑیوں" گھن چکّروں، گولوں، غبّاروں، پٹاخوں، ہوائیوں، ٹونٹوں، اور اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ، شائیں شائیں، غائیں غائیں، غوں، غوں، سَر سَر سَراٹ، دُھم دُھم دھماک، تڑ تڑ تڑاق، اور شر شر شراق سے، دور دور تک، ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جایا کرتا تھا ———

شرُوع شرُوع میں آتش بازی کی روشنی پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی، لیکن جب اندھیرا بہت زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا، آتش بازی کا رنگ نکھر اور اُبھر جایا کرتا تھا۔

لہ امیرؔ نے تو یوں کہا تھا کہ :۔ وہ اُمنگیں مٹ گئیں، وہ ولولہ جاتا رہا، کو سالک رام "بُلبُلا جاتا رہا" کہہ رہے تھے۔
لہ آتش بازی، اور عقائد میں کس بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح آتشبازی، روشنی میں زرد رُو اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے، اور تاریکی بڑھ جائے تو اُس کا جوبن اُبھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح، عقائد، علم و فکر (اگلے صفحے پر)

اُس کے بعد، کھانا چن دیا جاتا تھا، کھانا دانا کون کھاتا، بس ذرا سا مُنہ جُھٹال کر، ہم لوگ نیاز کے حلوے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

رمضان

جہاں تک کہ روزہ رکھنے کے تعلق ہے، رمضان ہمارے گھر آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن، جہاں تک کہ افطار کا تعلق ہے، رمضان ہمارے گھر میں اس دھوم دھام سے آتا تھا کہ اور کہیں آتا ہی نہ ہوگا۔ عقائد کے اعتبار سے میرے آبا و اجداد اس قدر پکّے مسلمان تھے کہ تمام دینی انجمنوں کو، جی کھول کر، ہر ماہ چندے دیا کرتے، اور اسلام کے نام پر تُن، مَن، دُھن قربان کر دینے پر، ہر وقت آمادہ رہتے تھے ـــ لیکن، اعمال کے اعتبار سے، رئیس زیادہ اور مسلمان بہت ہی کم تھے ـــ اور، اسی وجہ سے، روزہ نہ رکھنے کے باوجُود، ہمارے گھر میں دس بارہ قسم کی افطاری پکائی جاتی، اور، اذان سے بیش تر، مَردانے صحن کے تختوں کے چوکوں پر، چن دی جایا کرتی تھی، اور، کم و بیش، سَو، ڈیڑھ سو اقربا و احباب اور ملازمین، ہمارے یہاں روز افطار کیا کرتے تھے۔ اقربا و احباب میں اکثریت ہوتی تھی روزہ خوروں کی، البتہ نوّے فی صد ملازم روزہ رکھتے تھے۔ اور افطار کے بعد شاعری کی محفل گرم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے سپاہیوں اور خدمت گاروں کے افطار کا انداز ساری دُنیا سے نرالا تھا ـــ ایک بڑی سی چٹائی پر ان کی افطاری چُن دی جاتی تھی، اور اُن کے سامنے، بجھوا تمباکو کے چالیس پچاس، ڈیڑھ خمے، مداری حُقّے رکھ دیئے جاتے تھے، اور اُن کی پُشت پر، چھ سات بھشتی، بھری ہوئی مشکوں کے ساتھ، کھڑے کر دیئے جاتے تھے ـــ اور جب اذاں ہوتی تھی، تو وُہ، افطاری کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اور حُقّوں پر ٹوٹ

کی روشنی میں جھینپے جھینپے اور مدھم مدھم نظر آتے ہیں، اور جہل کی تیرگی میں جگمگاتے اور، مونچھوں پر تاؤ دینے لگتے ہیں۔

[1] صرف رمضان کے مہینے میں ان کو، میرے باپ کے سامنے، حقہ پینے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔

پڑا کرتے تھے، اور اس قدر، کھینچ کھینچ کرو ہ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک، کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک حُقّے پیتے تھے کہ، بوڑھے تو بوڑھے، جوانوں تک کے گالوں میں گڑھے پڑ جایا کرتے تھے، چلموں سے، بالشت بالشت بھر کی لویں نکلنے لگتی تھیں، بسا اوقات، چلمیں، پھٹ کر، دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھیں، اُن کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے، اور، آخر کار، وہ بے ہوش ہو کر، گر جایا کرتے تھے۔ اور اُس عالم میں بہشتی، اپنی اپنی مشکوں کے دہانے کھول کر، ان کے منہ پر، پانی چھڑکنے لگتے تھے، میرے باپ، رمضان بھر میں، کبھی پہلا، اور کبھی منجھلا روزہ رکھتے تھے ـــــ

میرے لڑکپن میں رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا۔ اور روزے کے دن میرے باپ سہ پہر تک، خس خانے میں سوتے رہتے تھے ـــــ جس دن ان کا روزہ ہوتا تھا، خدا جانے گھر والوں کو کیا کیا تلخ تجربے ہو چکے تھے کہ، اس دن صبح سے شام تک، تمام گھر پر ایک دہشت ناک سنّاٹا چھایا رہتا تھا ـــــ کسی کے مُنہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی، اشاروں اشاروں میں باتیں ہوا کرتی تھیں ـــــ اور لونڈیاں باندیاں، نیم کے نیچے، لگّے لیے، کھڑی رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیا اُس کی شاخوں پر بیٹھ کر، آواز نکالنے لگے۔

عید

آہا عید ـــــ اللہ اللہ، رمضان کی اُنتیسویں، یا تیسویں شام ـــــ صبح عید کا پیغام، اور رویت ہلال کا اہتمام۔ ایک بلند چبوترے پر، گھر کی تمام بیبیاں، چاند دیکھنے کی تمنّا میں جمع ہو جاتی تھیں۔ اور چاند نظر آتے ہی، سب کی سب، جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں، درُود پڑھتیں، ہات اُٹھا اُٹھا کر، زیرِ لب، دعائیں مانگتیں، دعائیں مانگ کر، اپنے اپنے چہروں پر ہات پھیرتیں، اور پھر، ایک دوسرے کے مُنہ پر، چاند دیکھا کرتی تھیں[1]۔

---

[1] اس رسم کی پشت پر یہ واہمہ کار فرما تھا کہ، چاند دیکھنے کے فوراً بعد، جس کے چہرے پر نگاہ اولیں پڑے، وہ عورت بھاگوان ہو تاکہ پورا سال خوشی میں گزرے۔ اور اس وقت اگر کوئی بھاگوان عورت موجود نہیں ہوتی تھی تو پھر کسی ہرے بھرے درخت یا پھول پر نگاہ جمالی جاتی، یا، آرسی میں، خود اپنے ہی منھ پر چاند دیکھ لیا جاتا تھا (مرتّب)

اس کے بعد "عید مبارک، عید مبارک" کے نعروں سے، در و دیوار گونجنے، چوڑیاں کھنکنے، اور، چہروں کے رنگ چہکنے لگتے تھے۔ اور، مردانے میں، گولے چھوٹنے، اور بندوقیں دُغنے لگتیں تھیں، اور، مرد، تلواروں میں اپنا منھ دیکھنے لگتے تھے۔ اور دروازے پر نوبت بجنے، اور شہنائی کی آوازیں، ہوا پر مچلنے لگتی تھیں۔

چاند دیکھ چکنے کے بعد، میرے سرہانے کے اسٹول پر، سنہری جرنیلی ٹوپی، جھمکتا ریشمی جوڑا، اور پائینتی کے اسٹول پر، روئی کا ساڈائن کا چمکیلا جوتہ رکھ دیا جاتا تھا۔

عید کی خوشی میں نیند کسے آتی تھی۔ بس ایک ذرا سی جھپکی سی آتی، اور، بار بار آنکھ کُھل جایا کرتی تھی — بار بار اپنی سنہری ٹوپی کے ایک ایک پھول کو دیکھتا، جی میں آتا کہ ابھی ٹوپی پہن لوں، خیال آتا کہ جھوٹی ہو جائے گی — پھر، تہ کیے جوڑے پر، بڑی آہستگی کے ساتھ، بار بار ہات پھیرتا، اس کی نرمی کا لمس، تمام بدن میں، جھرجھری بن کر دوڑ جاتا۔ پھر جوتے کی، نظر کو پھسلا دینے والی چکنائی پر، انگلیاں دوڑاتا، اور، اُس کو سونگھ بھی لیا کرتا تھا۔

اور جب، دُھندلکے کا چمپئی رنگ، فضا پر کروٹیں لے لے کر، میرے خون کی گردش میں شریک ہو جاتا تھا، تو سینے میں نشاط کی گھنٹیاں، ٹن ٹن، ٹن ٹن بجنے لگتی تھیں اور میں، بستر سے جست کر کے، انگنائی میں اس طرح آ جاتا تھا، جیسے اسپرنگ دار گڈا، ڈبیا کا ڈھکن کھلتے ہی، شن سے، کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہائے، دل میں، وہ صبح عید کی دُھومیں، انگنائی میں وہ رنگوں کی گھومیں — وہ

منحوس عورتوں کی طرح بچوں کے منھ پر بھی اس داہمے کی بنا پر، چاند نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ سال بھر تک ٹھوکریں کھاتے، اور گرتے رہیں گے۔ اگر انتیسویں کا چاند نظر نہ آتا تو اس خیال سے عورتیں افسردہ ہو جاتی تھیں کہ ہو نہ ہو، چاند کسی بلا میں پھنس گیا ہے، اور جب وہ تیسویں کو نظر آتا تھا تو، سب کی سب بڑی سریلی آوازیں، یہ کہنے لگتی تھیں کہ: "آج کی رات کا چاند، حضرت صاحب کے گریبان میں چھپا، آستین سے نکلا، آستین میں چھپا، گریبان سے نکلا، جیسے چاند کی بلا ٹلی، ویسی ہی، سب کی بلا ٹلے، آمین"۔ (چاند دیکھنے کے فوراً بعد، کسی رفیق کے چہرے کی طرف نظر اُٹھانے کو، (کسی کے) "مُنھ پر چاند دیکھنا" کہتے ہیں)۔ ؎ حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر سے، ڈائن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:-

بوٹ، ڈائن نے بنایا، ہم نے اک مضموں لکھا
مُلک میں مضموں نہ پھیلا، اور جوتہ چل گیا

؎ آپ نے کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے کہ، خصوصیت کے ساتھ، بچوں کو عید کی خوشی کیوں ہوتی ہے؟ میرا تو یہ ناچیز خیال ہے کہ چوں کہ بچے ماں باپ کی زبان سے، تواتر کے ساتھ یہ سُنتے رہتے ہیں کہ عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے (صفحہ ۹۰ پر)

سقف و بام کے قہقہے، وہ زمین و آسمان کے چہچہے — وہ، رگ و پے میں خوشی کی سرسراہٹیں، وہ، سینے میں، کسی اُٹھرا کی سی، آہٹیں، وہ لبوں پر، بے اختیار، مسکراہٹیں — وہ، فوّاروں کی سی اُچھلتی اُمنگیں، وہ ترنگوں کی، غزالانِ رمیدہ کی سی شُلنگیں — سانس اندر کھینچتا تو، جگر تک، ٹھنڈک جاتی، اور سانس باہر لاتا تو کُڑم دُھم، کُڑم دُھم کی صدا آتی۔

حمام سے، بالیدہ روح، اور بے وزن جسم کے ساتھ، جب نکلتا تھا، تو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ میں کسی مثنوی کا شاہزادۂ گُل فام ہوں، جس کو، پریاں اُڑا کر، پرستان لے آئی ہیں، اور تتلیوں کے پروں کی کشتی میں بٹھا کر، پنکھڑیوں کے دریا کی سیر کرا رہی ہیں۔

عید گاہ جاتا تو خوشی، اس حیرت ناک منزل تک پہنچ جاتی تھی کہ عیدگاہ کے مُلّاؤں کے ترشے لب، اور جُلاہوں کی کچّی داڑھیاں تک اچھی لگتی تھیں۔ عیدگاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھتا کہ، بڑی سُریلی آواز میں، میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے، میرے باپ کا دربار جما ہُوا ہے، احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تِل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔ صحن کے ایک گوشے میں، گوٹے پٹھے کے انگرکھے پہنے، اور، سروں پر، گول گول مندیلیں رکھے ہوئے چھلاب دار، دُف بجا بجا کر:-

"بر تو، ایں محفلِ شاہانہ مبارک باشد"

گا رہے ہیں - اور، چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے، سوّیوں، اور شیر خُرمے کے تھال، حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں، اور خاص دان و عطر دان گردش کر رہے ہیں، جَو سیرے کی تمباکو کے، ہاروں میں لپٹے ہوئے حقّوں اور عطرِ خَس کی لپٹوں سے تمام احاطہ بھرا ہوا ہے — اور، سپاہی، برہنہ تلواریں، ہات میں لیئے، سلامیاں دے، اور انعام

تو اسی حدیثِ متواتر سے متأثر ہو کر، وہ بے بُجھے بُوجھے، عید کے دن خوشیاں مناتے لگتے ہیں۔ اور یہ بات صرف عید ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ دنیا کی بے شمار باتیں جن کو ہم حقیقتِ کُبریٰ سمجھے بیٹھے ہیں وہ اسی آبائی پروپگنڈے کے بطن سے پیدا ہوتیں اور ہمارا ایمان بن جایا کرتی ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت کثیر ایمان لے آئے ہوئے ہوا ان باتوں پر، جو کھوپڑی، یعنی فکر پر نہیں، فقط کانوں، یعنی اقوال پر مبنی ہوتی ہیں۔ اے بھولے جذباتی انسان، تیرے یہ کان، تیری کھوپڑی پر کب تک حکومت کرتے رہیں گے۔

لے رہے ہیں۔

بقر عید

اللہ اکبر۔ چلتی چھریوں، تڑپتے جان وروں، اور بہتے خون میں ڈوبا ہوا یہ تہوار ـــــ جب، موت کے خوف سے لرزتے اور چیختے، بیکس و معصوم بکروں، میمنوں، دُنبوں اور بچھڑوں کو، کان پکڑ پکڑ کر، ایک دوسرے کے سامنے، بڑی سختی کے ساتھ، کھینچا جاتا ہے، اور پھر اُنھیں چت لٹا کر، ان کی گردنوں پر، انتہائی صاحب شقاوت کے ساتھ، اللہ کا نام لے کر، چھُری چلائی جاتی ہے۔ خون کا فوارہ اُن کی گردنوں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں، اور پھر وُہ، اپنے ہی خون میں، تڑپ تڑپ کر، دم توڑنے لگتے ہیں۔ میں، لڑکپن میں، سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دے رہے ہیں ـــ ایک دن، ڈرتے ڈرتے، میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں، بقر عید کے دن یہ کیا ہونے لگتا ہے؟ ـــ میاں نے، آنکھیں نکال کر، ارشاد فرمایا تھا خاموش رہو، یہ اللہ کا حکم ہے ـــ اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے۔

ہر چند، جہاں تک کہ زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے، یہ تہوار بڑا ہی لذیذ ہوتا ہے، اور، ہم کو، ان کی ماؤں کے سامنے ذبح ہونے والے، حلوانوں کی، کو کور، بوٹیوں کا پلاؤ، خوب گلے ہوئے گوشت، سفوف کی حد تک پسے ہوئے، بوٹیوں کے سیخ کباب، اور انگاروں پر بھُنی ہوئی رانیں کھلاتا ہے ـــ مگر کیا کروں، جب یہ ساری چیزیں دستر خوان پر آتی تھیں، تو زبان کے مزوں کے تصور پر، آنکھوں کی دیکھی لاشوں کا منظر غالب آجاتا تھا، اور میری آنکھیں نم ناک ہو کر رہ جاتی تھیں۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا!

مُحَرّم

اس کو "تہوار" نہیں، "ماہ عزا" کہنا چاہیئے —— میرا پُورا خاندان سُنّی ہے —— ہرچند میرے پردادا کے زمانے ہی سے، ہم لوگوں میں، شدید قسم کی، تفضیلیت راہ پا چکی تھی۔ لیکن میری دادی کے آنے سے بیش تر، ہمارے گھر میں عزاداری کا مطلق رواج نہیں تھا — اور یہ میری شیعہ دادی تھیں، جنھوں نے، امام باڑہ تعمیر کرا کے، ہمارے گھر میں عزاداری کی طرح ڈالی تھی۔

ہرچند وہ اپنے بچوں کو شیعہ نہیں بنا سکیں، پھر بھی انھوں نے اُن کو، اور ان کے ساتھ گھر کی تمام عورتوں کو حُسین کا سوگ وار ضرور بنا دیا۔ یہاں تک کہ خود دادامیاں بھی امام باڑے میں آنے ، اور، نوحے سُن سُن کر، آنسو بہانے لگے —— اور انھوں نے پورے گھر کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی، تمام بہو بیٹیاں اور مامائیں اصیلیں تک، زیور بڑھا دیتیں، پان[۱] کھانا ترک کر دیتیں، اور سیاہ لباس پہن لیا کرتی تھیں۔

ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے، دادی کی قیادت میں، ماتم ہوتا تھا، جس میں، میری ماں بہنوں وغیرہ کے علاوہ، ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں[۲] اور مغلانیاں بھی شریک ہُوا کرتی تھیں۔

پہلی مُحَرّم کا ماتم اس نوحے سے شروع ہوتا تھا:- "پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے، سَر پیٹو، مُحِبّو"۔

اور، نویں محرم کے ماتم، کا آغاز اس نوحے سے ہوتا تھا:- آج، شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے" اور، محرم کی گیارھویں[۳] کو، ہماری ضریح، تین بجے سہ پہر کو اُٹھتی تھی اور اس آخری نوحے پر، بڑی ہَیس کا ماتم ہوا کرتا تھا:- اے مومنو، اُٹھاؤ، جنازہ حسین کا"

---

[۱] الائچی، لونگ کتھا چونا اور زردہ ملا کر، کھایا جاتا تھا۔ [۲] ملیح آباد میں، اِنے گِنے چند شیعہ خاندان بھی تھے۔
[۳] لکھنؤ کے مرثیہ خواں، چوں کہ عشرے کے دن ملیح آباد نہیں آسکتے تھے، اس لیے، ہماری ضریح گیارھویں تاریخ کو اٹھائی جاتی تھی۔

اور جب، ماتم و شیون کی گونج میں، ہم لوگ ضریح کو، باہر نکالتے، اور زنانے کے آخری پھاٹک کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر لا کر رکھ دیتے تھے، تو لکھنؤ کے ایک، مانے ہوئے مرثیہ خواں، ضریح کے سامنے، سر کھول کر "جب خاتمہ بخیر ہُوا، فوج شاہ کا" پڑھتے تھے، تو ڈیوڑھی میں، خاک نشین و برہنہ سر خواتین پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ در و دیوار سے رونے کی صدا آتی تھی

اس کے بعد، کوئی چار بجے ضریح اُٹھتی، اور، بازار سے گزرتی ہوئی، رات کے دو، یا تین بجے، ڈاک بنگلے کے بالمقابل میدان میں، ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔

ضریح کے ٹھنڈے کرتے وقت، ظہور علی خاں سپاہی کی سرکردگی میں، بڑے زور شور سے "حُسین، حُسین، حُسین"، کے دردناک نعروں کے ساتھ، سینہ زنی ہوا کرتی تھی جس میں، مقامی و بیرونی، سیکڑوں شیعہ سُنّی، اور ہندو شریک ہوا کرتے تھے۔

اس گیارھویں محرم کے جلوس میں، ایک بار، جو ایک انقلاب انگیز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، وہ بھی سُن لیجئے

یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضریح جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے، ضریح کے سامنے "جھنڈا[1]"، پڑھنا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے خاندان کے کچھ افراد بھی، ان کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں۔ میں بھی لونڈا تھا، یہ سُن کر، میرا خون کھول گیا، اور میں نے، بڑے طنطنے کے ساتھ، پکار کر کہا، کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھے۔ اگر ایسا کوئی سُورما ہے تو سامنے آئے،

---

[1] اس فعل کو اس بنا پر "جھنڈا"، کہا جاتا تھا کہ :- "چار سو جھنڈا گڑا ہے، چار یار پاک کا" اس کا آغاز ہوتا تھا، اور شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے، تاکہ شیعہ سُنّی لڑتے رہیں۔ حکومت نے ایک طرف تو دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول حسین کو تبرہ بازی، اور دوسری طرف لکھنؤ کے ایک سُنّی مولوی عبدالشکور کو "جھنڈا بازی" پر مامور کر دیا تھا، وہ شیعوں کو تبرے پر اکساتے، یہ سنیوں کو جھنڈے پر اُبھارتے اور اس غداری کے صلے میں، دونوں، گھر بیٹھے وظیفہ کھاتے تھے۔ فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا بلکہ ہندوؤں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھی ٹکراتا تھا، اُدھر آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں، اِدھر سُنّیوں اور شیعوں کو ایک دوسرے کی خوں ریزی پر للکارا کرتا تھا۔ ارے فرنگی کا رونا کیوں روئیں، اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ یہ مان لیا کہ وہ لڑواتا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے

عبث یہ ٹوہ ہے، کیڑے پڑے کیوں؟ میں تم سے پوچھتا ہوں تم سڑے کیوں؟

اور، اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لائے

میری اس للکار سے، چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہو گئی، اور غضب کی شکنیں، ماتھوں پر اُبھر آئیں۔ اور، ایک کم رُو سا آدمی، ایک صاحب کا اشارہ پا کر، جھنڈا پڑھنے کو، ضریح کے سامنے آگیا۔ میں نے ابرار کو اشارہ کیا، اُنھوں نے، جھپٹ کر، اس کی، بوکڑ کی سی داڑھی پکڑ لی، اور اس کے کالے سے، مُنھ پر، تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

اُس کے حمایتیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور شور برپا ہو گیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ اتنے میں عالم گیر پُھپا، جن کی دُور دُور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مجمع کو چیرتے ہوئے، ضریح کے سامنے آگئے،، انھوں نے، اپنے ڈنڈے کو زمین پر کھٹکھٹا کر، کہا آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں، بشیر احمد خاں (میرے باپ) کے پاس جایئے، ضریح ان کی ہے، وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا پڑھیے۔ لوگوں نے پُھپا کی بات مان لی، اور سیدھے میرے باپ کے پاس چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں، میرے باپ نے، سپاہی بھیج کر، جب مجھے طلب فرمایا، تو میں، ضریح کے ارد گرد کے سپاہیوں کو یہ حکم دے کر جب تک میں نہ آؤں، ضریح یہاں سے جنبش نہ کرے، اور کسی کو جھنڈا پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے، اپنے باپ کی جناب میں، سر جھکائے پہنچ گیا۔

انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا تم نے جھنڈا روک دیا ہے، میں نے کہا، جی ہاں میاں، انھوں نے فرمایا "کیوں"؛ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں، پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے حسین آباد اسکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آئے ہیں، اگر اُن کے مُنھ پر جھنڈا پڑھا گیا، تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہو گی، اور، دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں، جب وہ سُنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے، تو اُن کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ امام حسین کی شہادت سے جھنڈے کا تعلق کیا ہے۔ جنازے کے ساتھ، رونا پیٹنا ہوتا ہے، یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے پڑھے جاتے ہیں۔؟

میاں نے، سیدھے ہو کر، ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اُٹھائی، جو میری شکایت

لے کر آئے تھے۔ اور، مجھے مخاطب کر کے، ارشاد فرمایا شبیر، تم معقول بات کہہ رہے ہو، یہ فرما کر، میاں اُٹھ کھڑے ہوئے، ان کے اُٹھتے ہی تمام حاضرین، اور سپاہی بھی کھڑے ہو گئے اور کمرے سے نکلتے ہوئے ارشاد فرمایا میں تمھارے ساتھ چل رہا ہوں، اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون سادنت ہے کہ ضریح کے سامنے، جھنڈا پڑھنے کی جسارت کر سکے۔

اس کے بعد، کس کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا پڑھتا ــــ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو پڑھا نہیں جاسکا، لیکن میری "رافضیت" جھنڈے پر چڑھ گئی ــــ اور پیش خیمہ بن گئی میرے تنسیخ نکاح کے مقدمے کا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

لکھنؤ کا پہلا سفر

لکھنو جانے کے واسطے جب ہم شب ملیح آباد اسٹیشن پہنچے۔ ریلوے کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر دوڑا آیا، میرے باپ کو، جھک کر سلام کیا، ویٹنگ روم نہیں تھا، پلیٹ فارم پر کرسیاں، بنچیں، اور اسٹول رکھ دیئے گئے۔ اور ہم سب، حسبِ مرتبہ، اُن پر بیٹھ کر، ریل کا انتظار کرنے لگے۔[2]

گاڑی کا انتظار، الامان والحفیظ۔ ایک ایک دقیقے میں، لاکھوں صدیوں کا فشار، اعصاب میں، رہ رہ کر، اینٹھن سی ہو رہی تھی، کوئی مٹھے ڈال رہا تھا کلیجے کو۔ جدھر سے گاڑی آنے والی تھی، اُدھر گھبرا گھبرا کر دیکھتا، بار بار مُشیر احمد خاں سے پوچھتا اب گاڑی کب آئے گی،، اور وہ، ہر بار، مُسکرا کر، جواب دیتے کہ بس اب آہی رہی ہے۔ میں ابھی اوبھ ہی رہا تھا کہ ریلوے کے ایک بنگالی ملازم نے ٹن، ٹن، ٹن، ٹن، گھنٹی بجا کر نعرہ مارا کہ "رحیم[3] آباد سے گاڑی چھوڑا ـــــ میں نے مشیر خاں سے پوچھا یہ "گاڑی چھوڑا" کیا کہہ رہا ہے، انھوں نے ہنس کر، کہا، یہ آدمی بنگالی ہے، بنگالی اسی طرح بولتے ہیں ـــ میں نے دریافت کیا، اب گاڑی میں کتنی دیر ہے، انھوں نے کہا بس پانچ منٹ کی دیر ہے۔ میرا دل، بلّیوں

---

[1] میرے باپ کے ہم سفر تھے، مشیر احمد خاں رام پوری، عبد الغفور خاں، صفدر حسین خاں، نبی احمد خاں، محمد مقیم خاں، داروغہ شیخ امید علی۔ سپاہیوں میں محمد شیر خاں۔ صالح محمد خاں، میرزا ایوب بیگ، ابو خاں، بجو خاں، دو تین خدمتگار اور ایک باورچی [2] پرانے لوگ، ریل کے وقت سے آدھ گھنٹے پیشتر ہی اسٹیشن آجایا کرتے تھے [3] ملیح آباد اور سندیلے کے درمیان، کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک اسٹیشن ہے۔

اُچھلنے لگا۔

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گاڑی، کمر لچکاتی اور دھواں اڑاتی گھرہ گھرہ، گھرہ گھرہ چلی آرہی ہے، مجھے اس کے دھوئیں میں گلستاں سے ناچتے نظر آنے لگے ــــ اور جب وہ عین پلیٹ فارم سے، دُھن دُھن، دھڑا، دھڑ دھڑا دھڑ کرتی، گزُرنے لگی، تو پلیٹ فارم تھرآنے لگا، پلیٹ فارم کی تھرتھراہٹ میرے خون میں دوڑنے لگی، اِردگرد کے ذرّے اُچھلنے کودنے لگے، اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم سب، اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے، گارڈ نے جھنڈی ہلائی، اس کی جھنڈی دیکھ کر میری اُمنگیں کہروا ناچنے لگیں۔ جھنڈی ہلاکر، گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ہائے کیا سُریلی سیٹی تھی۔ اس کے جواب میں انجن نے سیٹی دی۔ چوں چوں کے ساتھ، پہیوں کو حرکت ہوئی، اور گاڑی، بڑے ٹھسّے کے ساتھ، چلنے لگی چھک، چھک، چھک، چھک ــــ اور دل سے آواز آنے لگی بھک، بھک، بھک، بھک ــــ اور جب گاڑی کی رفتار میں تیزی آگئی تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے چہرے سے یوں ٹکرانے لگے کہ میرے دل میں، ایک انوکھا سرور، سرسرانے لگا، اور جب رفتار اور بھی تیز ہوگئی، تو پٹری کے کھمبے اور آموں کے باغ گھومنے جھومنے اور ناچنے لگے۔ اور، پٹری کے نیچے کی نالی، اس قدر تیزی کے ساتھ، دوڑنے لگی گویا ریل سے ریس کررہی ہے ــــ یہ سماں دیکھ کر، میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی" میں، زیرِ لب، گنگنانے لگا،" چھک۔ چھک۔ چھک۔ چھک۔ گانے دو۔ گانے دو۔ گانے دو، چھک، چھک، چھک، چھک جانے دو، جانے دو ابھی جانے دو۔ آہاہاہا گانے دو، اوہو، اوہو، جانے دو"[1]

اور جب، گاڑی، کاکوری کے پُل سے، گُڑم گُڑم، گُڑم کرتی گزرنے لگی تو، میرے دانتوں کے نیچے، دوالی کی مٹھائی کے کھلونے ٹوٹنے لگے کُڑم، کُڑم، کُڑم ــــ ملیح آباد اور لکھنؤ کے مابین فاصلہ، ہی کیا ہے، لے دے کر، صرف تیرہ میل اور اس قرب کی بنا پر، ہماری گاڑی سیکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطاروں کے درمیان سے، گھڑم، گھڑم، شائیں شائیں، کرتی، اور صدہا، لائن بدلنے والی، اِتصالی پٹریوں کو، چچ چچ چچاک، کھچ کھچ کھچاک، اور

---

[1] وہ میرے آغازِ شاعری کا لمحۂ اوّلین تھا۔

کُٹ، کُٹ کٹاٹ، کاٹتی اور تراشتی ہوئی، کوئی تیس منٹ کے اندر ہی، چار باغ (لکھنؤ جنکشن) پہنچ گئی ——

الامان والحفیظ! — چار باغ کی، طوفاں بدوش وقیامت در آغوش ہلچل، گھما گھمی، دھکا پیل، افراتفری، نفسی نفسی، چیخ پکار، گاؤں گہار، الالاہٹیں، گھبراہٹیں، ریل پیل، شائیں شائیں، غائیں غائیں، دھڑام دھڑام، اور ڈھوم ڈھوم، ڈھائیں ڈھائیں —— پھر اُس پر، دوڑتے ٹھیلوں کی جگر خراش، گھڑگھڑاہٹیں، قلیوں کی، "قلی قلی" کے نعروں کے ساتھ، لنگوری جستیں، بدحواس مسافروں کے اُڑانٹے، خوانچے والوں کا شور وغوغا۔ ٹکٹ چیکروں، پولیس والوں، ریلوے افسروں، بوجھ اُٹھائے قلیوں، اور بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے، بدحواس مسافروں کے مابین دھکم دھکا۔ شنٹنگ کے دھماکے، ہزاروں سیٹیوں کی آوازیں، دھوئیں کے لچھے لچھوں میں اُلجھے ہوئے تر بتر پرزوں اور جلے ہوئے تیل کی بدبو، فرنگیوں کے، چھچھوتے غرور میں ڈھلے ہوئے، روکھے پھیکے، چنگیزی چہرے، اور میموں کی، سایۂ شاخِ گل میں پلی ہوئی، چھلاسی کمریں —— میں تو دیوانہ ہو گیا پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی، فرنگیوں کی اکڑفوں دیکھتا تھا، تو میری پٹھونی کی زبان پر موٹی سی گالی آجاتی تھی، اور میموں کی طرف نگاہ اُٹھاتا تھا، تو میرے ننھے سے شاعر کے منہ سے "ہائے جانی[1]" نکل جاتا تھا۔

اور جب اسٹیشن کا شور وغل، حواس پر دباؤ ڈالتا تھا، تو میموں کی کمریں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں، اور دہشت میرا احاطہ کر لیتی تھی۔ اور میرا عالم "کہ یاراں فراموش کردند عشق" کا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں ابھی اس شیر افگن شور وغوغا، اور اس جرأت شکن بھیڑ بھاڑ میں گھرا ہوا کھڑا تھا کہ مشیر احمد خاں نے، دوڑ کر، میری انگلی پکڑ لی —— اور ہمارا قافلہ، اپنے سپاہیوں کے سنگین حلقے میں، باہر جانے کے واسطے رینگنے لگا۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ حامد علی[2] خاں، بیرسٹر، دوڑ کر، میرے باپ سے ہم آغوش ہو گئے —— اتنے میں، ایک نہایت چمکیلے سائین

---

[1] تعجب نہ فرمائیں قاری صاحب کہ یہ سن اور "ہائے جانی" کا ولولہ۔ جی ہاں خاکسار مادر زاد عاشق تھا۔
[2] امروہے کے باشندے ہونے کے باوجود، ایک مخلص انسان تھے۔

بوڑھے نے میری آنکھوں میں زنجیر ڈال دی ، میں ، نظر جماکر اسے دیکھنے لگا ، باپ سے کہا میاں ہم کو یہ بوتل لے دیجئے ـــــ میاں انگریزی نہیں جانتے تھے ، انھوں نے حامد علی خاں سے پوچھا یہ کس چیز کا اشتہار ہے ، انھوں نے ، زور سے قہقہہ مار کر کہا ، ہونہار بروا کے ، چکنے چکنے پات" مبارک ہو خاں صاحب کہ صاحب زادے ، بفضلِ خدا ، ابھی سے شراب کی بوتل مانگ رہے ہیں[1]

اَلغرض ، بصد ہزار دشواری ، ہم باہر آئے ، ہم لوگ ، متعدد گھوڑا گاڑیوں ، اور ملازمین اکّوں میں ، اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہوگئے ــــــ میاں کی گاڑی میں مشیر احمد خاں تھے ، اور میں ، میاں سامنے کی سیٹ پر اور ہم دونوں ، کوچ وان کی طرف کی سیٹ پر بیٹھ گئے میاں کا بھرا حقہ ان کے سامنے ، اور پانی کا ، کٹورے سے ڈھکا ہوا لوٹا ، نیچے رکھ دیا گیا ۔

چلم کی آگ سے مجھے تکلیف پہنچ رہی تھی ، مگر لکھنو آنے کی خوشی کی اس قدر فراوانی تھی کہ مجھ کو اس تکلیف میں بھی مزا آرہا تھا ۔ اور جب ، سڑک کے نشیب و فراز سے ، لوٹے پر ڈھکا ہوا کٹورا کھن کھنا تا تھا ، تو میرے دل میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے

جب ، ہماری گاڑی عیش باغ کے موڑ سے گزرنے لگی تو ، سامنے کے ایک بہت بڑے تالاب کو دیکھ کر میں نے پوچھا ، میاں اگر ہم اس میں کود پڑیں ، تو کیا ڈوب جائیں[2] گے ؟ یہ سنتا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ ، ہلدی کا سا ہوگیا ۔ اور فرمایا بیٹا بدشگونی کی بات کبھی زبان پر نہ لانا چاہیے ، اللہ تمھاری عمر دراز[3] کرے اب ہماری گاڑی اکبری دروازے[4] کے سامنے جاکر

---

[1] اور کیوں نہ مانگتا ۔ مجھے دیکھ کر ، کہتی تھی ، میری دایا ۔ یہ لڑکا قدح خوار پیدا ہوا ہے ۔ ہائے کم بخت حافظ نے کیا خوب کہا ہے :-

دوش دیدم کہ ملایک ، درِ مے خانہ زدند گلِ آدم بسرشتند و بپیمانہ زدند

[2] اس بدشگونی کے باعث میرے سر سے صدقہ اتارا گیا تھا ۔ [3] میاں ، کاش آپ کی دعا قبول نہ ہوتی ، اور میں جوانی ہی میں رخصت ہوجاتا ۔ آپ خوش قسمت تھے کہ آپ کو جوانی میں موت آگئی ، میں بدنصیب ہوں کہ بوڑھا ہوکر ، بے شمار دوستوں اور یاروں کا ڈسا ، اور زندگی کے تپتے ریگستان میں پڑا ، ایک مدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں ، اور میری ناقدر شناس قوم ، میرے احاطۂ وجود کے گرد ، اصحاب فیل کے مانند ، گھیرا ڈالے پڑی ہوئی ہے (لیکن اے قوت و حیات کے مالک ، میرے " اصحاب فیل " کو ، حملۂ ابابیل سے محفوظ رکھنا کہ یہ سراسر نادان ہیں) ۔ [4] چوک کے ایک دروازے کا نام

کھڑی ہو گئی۔ اور ہمارا سامان "بانس والی سرائے" [1] میں جانے لگا۔ اور ارباب لکھنؤ ہمارے افغانی خط و خال، ہمارے قد و قامت، ہمارے سپاہیوں کی سج دھج، اُن کے بڑے بڑے پگڑ، ان کے موٹے موٹے لٹھ، دیکھنے کے لئے، ٹھٹ لگا کر، ہمارے گرد و پیش جمع ہو گئے۔

میں نے اکبری دروازے میں، جیسے ہی قدم رکھا تو یہ دیکھا اس چوڑے چکلے دروازے کے داہنے بائیں، لکڑی کے تختوں پر مٹی کے اس قدر سجل حسین، سبک اور نازک کھلونے اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں کہ باید و شاید ــــ انھیں دیکھ کر یہ خیال ہونے لگا کہ قریب جاؤں گا تو ہر کھلونا پلکیں جھپکانے اور باتیں کرنے لگے گا، اور گُجریا بھاؤ بتانے لگے گی۔ اور سقّوں کو اگر ذرا سا بھی چھو لیا، تو ان کی بھری مشکوں سے، دھل دھل، پانی بہنے لگے گا۔ [2]

کھلونے خرید کر، جب میں نے چوک میں قدم رکھا، عود، اگر، اور لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کٹنے کی، نپی تلی کھٹا کھٹ نے، میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ مُرتّب و مُنظّم کھٹا کھٹ ایسی معلوم ہوئی، گویا طبلے پر بول کٹ رہے ہیں۔ پھر ہار والے کی سُریلی آواز آئی "ہار ــ بیلے کے، پھول، چمپا کے" وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبولیوں کی وہ جھلجھلاتی تِتری کُلاہیں، وہ دُپلّی ٹوپیاں، وہ شربتی انگرکھے، وہ گھٹنے گھٹنے پیٹے ــــ وہ چوڑی دار پائجامے شانوں پر وہ ریشمی، بڑے بڑے رومال۔ آڑی ترچھی مانگیں۔ گلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں۔ ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ، خوش بو دار تمباکو کے حقے، حقوں پر

---

[1] وہ سرائے، جواب ڈھادی جا چکی ہے۔ لکھنؤ کی درجہ اول کی پختہ اور صاف ستھری سرائے تھی۔ جس کے تین بالائی کمروں کو میرے باپ نے مستقل کرائے پر ریزرو کر لیا، اور وہاں ایک چوکیدار کو مامور فرما دیا تھا۔ اس وقت تک لکھنؤ میں "برلنگٹن" اور "امپیریل ہوٹل" کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں۔ اور چوں کہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی، اور سور کی چربی کا کھانا کھایا جاتا ہے" اس بنا پر، قرب و جوار کے تمام شرفا، کی طرح، میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی، نہیں دیکھتے تھے۔
اب رہا احباب کے وہاں قیام کا مسئلہ، سو میرے باپ کے ساتھ چوں کہ ایک لاؤ لشکر لکھنؤ آیا کرتا تھا، اس لئے وہ کسی دوست پر اس قدر بار ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

[2] اب نہ وہ قدر دان ہیں نہ وہ کاری گر، اور نہ وہ کھلونے۔ لٹ گئی ساری بہار۔

وہ لپٹے ہار، ہاروں سے، پانی کے قطروں کا وہ ترشح، وہ بجتے کٹورے، وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے، وہ گمکتے ہوئے طبلے۔ بالاخانوں کے چھجوں سے، وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی۔ اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آب شار، کوٹھے والیوں میں کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی۔ خد و خال اس قدر باریک گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے۔ کوئی کڑیل جوان، کوئی نوجوان۔ اور کوئی ان دونوں کے درمیان۔ گویا ہمکتی ہوئی اٹھان، کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان۔ کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا۔ تماشائیوں کا ہجوم، شانے سے شانے چھلتے ریلے، اور کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ دست بستہ عذر خواہیاں میں ابھی اس دریائے طلسم میں غوطے کھا رہا تھا کہ مشیر خاں نے میرا ہات پکڑ کر، اپنی طرف کھینچا، میں ساحل پر آگیا۔ سارا طلسم ٹوٹ گیا، اور میں سب کے ساتھ، میاں کے پیچھے پیچھے، سر جھکا کر سرائے آگیا۔ سرائے میں قدم رکھتے ہی دم سا گھٹنے لگا، میں نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا، میاں۔ ہم سپاہیوں کو ساتھ لے کر، نیچے گھوم آئیں؟ مشیر خاں مسکرائے، اور میاں نے بڑی خوف آمیز سنجیدگی سے کہا، چوک، بچوں کے ٹہلنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

اتنے میں صالح محمد خاں، ڈھورئے[1] کو ساتھ لئے آگئے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی قُفلیوں کو دونوں ہاتوں کی ہتیلیوں میں بڑے ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آب خوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے چمچے بھی سامنے رکھ دیئے۔ کیا بتاؤں ان قُفلیوں اور ان آب خوروں کی لذت و ملائمیت زبان نے اس سے پیش تر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی، اُن کے مزے کو بیان کروں تو کیونکر، اور تشبیہہ دوں تو کس چیز سے۔ اور ملائمیت کا تو یہ عالم تھا کہ، اُن کو صرف ہونٹوں اور تالو سے کھایا اور نظر کی حرارت سے پگھلایا جا سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی، ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ۔ عبداللہ کی دکان

---

[1] لکھنؤ کا سب سے بہتر قفلی والا، جو لفٹیننٹ گورنر تک کی پارٹیوں میں بلایا جاتا تھا۔

کی پوریاں کچوریاں، احمد کی باقر خوانیاں، سعادت کی شیر مالیں، شبراتی کے، اُٹھارہ اُٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، چھمّن رکاب دار کے بھُنے ہوئے مرغ، شاہد کا بٹیروں کا پلاؤ، حیدر حسین خاں کے پھاٹک کی گلی کا، اَمناس کا مُزعفر، غلام حسین خاں کے پُل کے کباب، کپتان کے کنویں کی پستے بادام کی مٹھائی، اور حسین آباد کی بالائی، اور نہ جانے اور کیا کیا نعمتیں، ہمارے دسترخوان پر چُن دی گئیں ــــ اور میں کھا پی کر سو رہا۔

بھور درشن کی چاٹ تو پڑ ہی چکی تھی۔ میں سب سے پہلے بیدار ہو کر، بالاخانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ صبح کا استقبال کرنے کو جب آسمان کی طرف نظر اُٹھائی، شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کے باعث طلوع کی رنگینی دُور دُور بھی نظر نہیں آئی۔ آنکھیں مُرجھا گئیں میں نے دیکھا، پَو تو ضرور پھٹ رہی ہے، اور مرغ بھی بانگ دے رہے ہیں۔ لیکن پو پھٹنے میں سُہانا پن ہے اور نہ مرغوں کی بانگ میں توانائی ــــ زمین سے آسمان تک ایک پھیکا پن چھایا ہوا ہے سانس لیتا ہوں تو دھانس بھری، موٹی موٹی ہوا۔ سینے کو کھرچ، اور دل پر بوجھ ڈال رہی ہے۔ نسیم صُبح چل رہی ہے، مگر اس کے جھونکوں میں بالکل دھار ہی نہیں ہے۔ عروس قدرت کے پاؤں میں نہ چاندی کے گھنگرو ہیں نہ سر پر چھپکا۔ میرے ولولے، ایسی ملگجی ملگجی کھوئی کھوئی، پھیکی پھیکی، اُبلی اُبلی سیٹھی سیٹھی، ڈرڑھی ڈرڑھی، اندھی اندھی، گونگی گونگی بھنچی بھنچی، اور بجھی بجھی صبح کو دیکھ کر، گُل ہو گئے اور دھواں دینے لگے ــــ اور میں، اس نامراد عاشق کی طرح جس کا معشوق اس کو دغا دے کر غائب ہو گیا ہو، بھاری دل کے ساتھ نیچے آیا اور منہ ہات دھونے لگا ــــ مُنہ پر بار بار چھپکے مارے دل کی کلی نہیں کھلی۔

اتنے میں ناشتہ آگیا۔ روغنی روٹی، انڈوں کے ستارے، بالائی، شیر مال اور نمش کا ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو میرے باپ نے دو سپاہیوں اور مشیر خاں کو ساتھ کر کے مجھے لکھنؤ کی سیر کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

میں نے لکھنؤ کے ہفتے عشرے کے قیام میں، مندرجہ ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی، اس کا کلاک ٹاور، حسین آباد کا امام باڑہ، اس کی بھُول بھلّیاں، آصف الدولہ کا امام باڑہ، رومی دروازہ، حضرت عبّاس کی درگاہ، نجف اشرف، تال کٹورے اور

بھول کٹورے کی کربلائیں، بیلی گارڈ[1]، عجائب خانہ، شاہ پیر محمد کے، ٹیلے کی مسجد، شاہ مینا کا مزار اور موتی محل، حضرت گنج، چنیا بازار، امین آباد[2]، گومتی، ٹھنڈی سڑک، لوہے کا پل، لال باغ، سکندر باغ، بندریا باغ، وکٹوریہ باغ اور بنارس باغ، اور چھتر منزل[3] کا فقط وہ حصہ جو سڑکوں سے نظر آتا ہے۔ ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں، یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے ــــ لیکن ان تمام عجیب مقامات سے، بمراحل عجیب تر نظر آئے، لکھنؤ کے وہ رؤساء، علماء، ادباء، شرفاء اور شعراء، جو میرے باپ کے پاس آتے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ، وہ ان کے لچکیلے سلام، وہ ان کی نشست و برخواست کے پاکیزہ انداز، وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی وضع و قطع، وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائلِ علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ، وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں، وہ حسبِ مفہومِ شعر ان کی آنکھوں کا رنگ، اور ان کے چہروں کا اُتار چڑھاو، وہ قہقہوں سے دامن کش، ان کا ہلکا ہلکا تبسّم، وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار، اور باوجودِ کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بدیوار ہو کر رہ گیا ــــ وہ تمام لوگ، اس قدر شائستہ، شستہ، اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرۂ خاک کے نہیں، کسی کرۂ نور کے باشندے ہیں۔

انھیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے شائستگی سیکھی، ادب اور زبان میں نظر پیدا کی اور یہ ذرا سی شُدبُد جو آج مجھے ادب و زبان پر حاصل ہے، یہ انھیں کی صحبت کا اثر ہے

اب وہ لکھنؤ ہے نہ لکھنؤ والے ــــ ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک کے نیچے، کھا گئی مٹی ان کے جوہروں کو۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک رباعی کہی تھی:

جلتی ہوئی شمعوں کے بجھانے والے ــــ جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاشِ دہلی پہ، لکھنؤ نے یہ کہا ــــ اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

---

[1] وہ عمارت جس میں بیلی صاحب نے پناہ لی تھی، اور ۱۸۵۷ء کی سپاہ نے اس کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔
[2] اس وقت امین آباد کا پارک معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔
[3] ہندوستانیوں کو وہاں داخلے کی اجازت نہیں تھی

سو، جو میں نے کہا تھا وہی ہو گیا۔ گزشتہ سال جب لکھنؤ گیا تو لکھنؤ کی اُداسی دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں ــــ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آئی۔ اور ان کی جگہ یہ دیکھا کہ، ناتراشیدہ کندوں کے سے کھُردُرے، اور اوربکونے پہروں کے وحشی افراد بار بار اپنے اُلجھے ہوئے بال کھجاتے اور دائیں بائیں تھوکتے چلے جا رہے ہیں ــ نہ وہ شان دار نشینیں ہیں، نہ عمدہ قسم کی بند گھوڑا گاڑیاں، نہ اعلےٰ درجے کے تانگے ــــ لے دے کر چند گھٹیا قسم کے اِکّے اور بے رنگ و روغن کے، چوں چوں کرتے تانگے ہیں، جن میں گھوڑوں کے عوض چوہے جُتے ہوئے ہیں اور چند کھڑ کھڑ کرتی رکشائیں ہیں، جن کو نہ جانے کس سرزمین کے نُوش لونڈے چلا رہے ہیں۔ اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندرِ اعظم تک کو بٹھا دیا جائے، تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے۔

سہ پہر کے وقت نخّاس گیا۔ نخّاس کی وہ سڑک جو لکھنوی تہذیب کا گہوارہ تھی، اداس اداس نظر آئی۔ حکیم صاحبِ عالم کے مطب کے بالاخانے کی طرف نگاہ اٹھائی، جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا، ایک ایک کر کے وہ تمام یارانِ جشن آنکھوں سے گزرنے لگے ــــ جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھومیں مچائی تھیں ــــ اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحبِ عالم، مجاز، حکیم مخمور اور عطا حسین قزلباش کفن اوڑھے زینے سے اُترتے چلے آ رہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، آنسو پونچھتا، بانس والی سرائے کی جانب مڑا ــــ پرانی یادیں سر پیٹنے لگیں، اور جب اس نئی سڑک سے گزر کر، جو سرائے کو شہید کر کے اس کی قبر پر بنائی گئی ہے، چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

کوتاہ اندیش معلمانِ اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے سلام کیا۔ ہائے وہ چوک جو شبستانِ رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں کالے دیوؤں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے۔ جو فضا، سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی، اب اس پر "اے بائی (اے بھائی) جلندھر سنگھا" اور

لہ حقیقی لکھنؤ نخّاس تک ہے، امین آباد اور حضرت گنج والوں کو بیرونی سمجھا جاتا ہے۔

"اے ہا پج (حافظ) گھدائی بکس (خدابخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ ہائے جن پہ مچھوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں، وہاں داڑھے پھٹکارے جا رہے ہیں، جہاں طبلے گمکتے تھے وہاں خارشیے کتے بھونک رہے ہیں۔ اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسادی گئی ہے۔

ایک جملۂ معترضہ:- اس کج اندیش دور میں، ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ نکال دو شہر سے طوائفوں کو، مسمار کر ڈالو مے خانوں کو اور اُجاڑ کر رکھ دو شبستانوں کو — اور یہ فتنہ اٹھایا ہوا ہے مہاتما گاندھی کا، بے شک گاندھی جی میں بے شمار خوبیاں تھیں، وہ ہندوستان کے عظیم محسن اور سب سے بڑے دوست تھے — لیکن، اسی کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔

انھوں نے جب بازارِ حسن و خراباتِ مغاں کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی، اور انسانی مسرت کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی تو لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر دوڑ پڑے ان کی آواز پر وہ تمام گزیدگانِ اخلاق، مخنثینِ کرام جو قطعی طور پر توفیقِ گناہ سے یک سر محروم تھے اور جن کے دلوں میں اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ وہ "صالحین" کا روپ بھر بھر کر گاندھی جی کو رِجھائیں، جاہل عوام کے ووٹ اُڑائیں، اقتدار کی گدیوں پر براجمان ہو جائیں، اور دولت کے دریا میں غوطے لگائیں۔

"نیک نفس" مہاتما اور ان کے ہوس پرور چیلوں کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ مسرت کی تمنا اور حسن کی آرزو، نوعِ انسانی کی جبلت میں داخل ہے۔ اور فطرت نے، تولید و تناسل کا سلسلہ قائم رکھنے کے واسطے انسانی کی جوانی کو مست و سرشار رہنے اور بوس و کنار کی موجوں میں بہنے پر اس استحکام کے ساتھ مامور و مجبور کر دیا ہے کہ اگر تمام قوائے کائنات خم ٹھونک کر اس کے سامنے آجائیں تو وہ لنگڑی مار کر انھیں چاروں خانے چت گرتا ہوا، آگے بڑھ جائے۔

نوعِ انسانی کے اس جبلّی میلانِ مُسکرات و مستورات کے ہونکتے ہوئے طوفانی دریا پر بندھ

باندھنے کے ارادے سے، اس دنیا میں کتنے اولیا اور اوصیاء، اقطاب، ابدال، امام، اوتار اور انبیاء — کتنے مُعلم، مُجدد، مُفسر، مُجتہد، مُقنّن، مُبلّغ، مُحتسب، مُصلح اور مُلّا، اور کتنے پادری، پاپا، پوپ، پروہت، پنڈت، پانڈے، یوگی، پیر اور پیغام بر — ازل سے لے کر آج تک آچکے ہیں۔ لیکن تاریخِ انسانی شہادت دے رہی ہے کہ جس نے بھی انسان کے اس بے پایاں تُند و شدید ولولے سے ٹکر لی ہے، خود اس کا ماتھا لہولہان ہو کر رہ گیا ہے۔ آسمان کی ڈاٹ کے نیچے یہ آواز بڑے طنطنے کے ساتھ آج بھی گونج رہی ہے کہ۔

ہاں، سلسلۂ جام و سبُو جاری ہے — اب تک وہی شغلِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی — ادیان کے ماتھے سے لہو جاری ہے

اور تمام مصلحین کرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان آج بھی یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ ے

مُرا، مہرِ سیہ چشماں، زِ سر، بیروں نہ خواہد شد — قضائے آسمان است ایں و دیگرگوں نہ خواہد شد

اور جب یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ اس جذبۂ قوی کا فنا کر دینا، انسانی طاقت سے باہر ہے، اور کیوں نہ باہر ہو جب کہ حامیانِ ادیان سے لے کر، مسجد کے نابینا حافظ جی تک بفضلہٖ، اسی "چوں بخلوت می روند" کے کاروبار میں، ازل کے دن سے آج تک مشغول ہیں — تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے، یا اس پر چند قیود عائد کر دیئے جائیں، چوں کہ آدمی ابھی تک، حیوانی سطح سے فقط ایک بالشت بلند ہوا ہے، اس لئے ہم اپنے کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ جب تک نوعِ انسانی بالغ نہ ہو جائے، اس جذبے پر چند قیود ضرور عائد کر دیئے جائیں، لیکن وہ اس قدر سخت نہ ہوں کہ آدمی[1] بلبلا اُٹھے۔

---

[1] ہر چند اسلام نے، زانی کے واسطے، سنگ ساری کی سی انتہائی سزا مقرر کر دی ہے، لیکن اس ناقابلِ برداشت جنسی ہیجان کے، ساتھ بڑی حکیمانہ رعایت اور بڑی شریفانہ مُروت سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی دیگر جرائم کا انحصار صرف دو گواہوں پر کیا گیا ہے، لیکن اس معاملے میں چار گواہوں کی شرط لگا دی ہے۔ پچاس فیصد رعایت تو پہلے ہی قدم پر کر دی گئی ہے، اور مجرم کو اشتباہ کا فائدہ پہنچانے کی خاطر اس پچاس فی صد رعایت کے حدود کو وسیع کر کے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اگر گواہ یہ کہیں کہ انھوں نے مرد کو اوپر، اور عورت کو نیچے دیکھا تھا، تو اس شہادت سے زنا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر وہ یہ شہادت بھی دیں گے کہ ہم نے مرد کی کمر کے متواتر حرکات کو بھی دیکھا تھا، پھر بھی زنا ثابت نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ یہ شہادت

بقیہ صفحہ ۱۰۷ پر

وہ قیود اور ان کے حدود سرِدست کیا ہوں ۔ اور آگے چل کر ان کو کس رفتار کے ساتھ ختم کیا جائے ۔ اس سلسلے میں اگر چند بنیادی حقائق زبان پر لے آؤں تو ہر طرف تھپڑی بجنے لگے اور میں، دیکھتے ہی دیکھتے نکّو بن کر رہ جاؤں ۔

میں، جس ماحول میں زندہ رہنے کا ارتکاب کر رہا ہوں، وہاں حقائق سے دامن بچانے اور حقائق سے آنکھیں چرانے ہی میں، ایمان کی خیر سمجھی جاتی ہے اور نجات کے خواب دیکھے جاتے ہیں، میرے معاشرے کو آج تک یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے عقائد و مسلّمات، ہمارے آبائی اقوال و روایات، ہمارے خیر و شر کے تصوّرات، ہمارے مرغوبات و مکروہات اور ہمارے ذہنی تعصبات، فکری ہیں کہ سماجی، نیز جس ماحول کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ پاکی و ناپاکی گناہ گاری و اطاعت شعاری، جواز و عدمِ جواز اور حرام و حلال کی، دقت نوازیدہ، اصطلاحیں، معقولات نے وضع کی ہیں یا منقولات نے ؟ یا مُردوں کی پاکیزگی و پارسائی کے ضوابط، عورتوں کی عصمت و عفت کے قواعد، جنسی تعلقات کی حد بندی، اور ازدواج کا رواج قدرت کا عطیہ ہے، یا بنچوں کی ایجاد ہے ؟ ایسے ماحول میں چہرۂ حقائق سے پردہ اٹھانے والے کو نکّو بن کر رہ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے ۔ اس لئے اب میرے واسطے صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ امورِ گفتنی کو ناگفتنی کے زمرے میں لے آؤں اور سے

افسوس، بے شمار سخن ہائے گفتنی ۔۔۔ خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

پر نگاہ کر کے، میں اپنے دَور کی ذہنی سطح پر آجاؤں، سب کی ہاں میں ہاں ملاؤں اور کوچۂ بتاں و کوئے مغاں دونوں کو، بد اخلاقی کا مرکز ٹھہراؤں ۔

بہت اچھا، تسلیم کر لیا میں نے ان دونوں اداروں کو بد اخلاقی کا مرکز لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ ادارے جو اتنے ہی قدیم ہیں، جتنی کہ انسانی تمدّن کی تاریخ ۔۔۔ معرضِ وجود میں آئے ہیں،

دیں گے کہ ہم نے یہ دیکھا تھا کہ مرد و زن کے مابین سلائی اور سُرمے دانی کا سا معاملہ ہو رہا تھا ۔ تب جا کر زنا ثابت ہوگا ؛ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں گے ایک ایسے مزاج کا زانی، جو ایک کو نہیں چار چار آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھے اور اس کے باوجود وہ عورت سے فوراً جدا ہو جانے کے بدلے، اس سے چمٹا رہے ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ، اپنے جسمانی حرکات کی وساطت سے اس کا بھی موقع دے کہ چاروں گواہ فریقین کی برہنگی کا تفصیلی مطالعہ کر کے، اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیں کہ ایک کی سلائی دوسرے کی سُرمہ دانی میں آ جاتی ہے۔ کیا دانش مند کہا جائے گا ؟ اور کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ سنگ ساری کی سزا زنا کی نہیں، حماقت کی سزا ہے۔

آسودگیِ تمنا کی بازی گاہ دنیا میں، ان اداروں کو (جنھیں یخ بستہ پیرانِ فرتوت، مادرزاد پژمردہ شکستہ جوانانِ صالح اور گرگانِ باراں دیدہ سیاسی افراد، بد اخلاقی کے اڈے کہہ کر اپنا جی خوش کرتے ہیں) معرضِ وجود میں لایا ہے، نوعِ انسانی کا پیدائشی ذوقِ مُسکرات[1] و مَستورات۔ کیوں کر؟ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس مطالبہ وُرسد، اور تمنّا و اور یہ ہیجانی ذوق برانگیختہ کیا ہوا ہے۔ اس ناقابلِ مقابلہ تُند اور شدید حیوانی جبلّت کا، جو انسان کو اُکسا کر وجد میں لاتی اور اس کی نسل بڑھاتی ہے، اور جس کی ناقابلِ فسخ شدّت کا یہ عالم ہے کہ تاریخِ تمدّن سے لے کر آج تک ہزاروں ارضی و سماوی طاقتوں کے دانت کھٹّے کر کے اور کسی مادّی یا روحانی طاقت کو اپنی پشت پر کاٹھی رکھنے کی اجازت نہ دے کر، مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔

اور جب نگاہ کرتا ہوں اس جذبۂ گرم کی صلابت و حرارت پر تو یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ آج کل کے ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپلٹیوں، اور کارپوریشنوں کے اُن ووٹوں کی بھیک پر جینے والے بوَنے اور اوچھے ارکان پر، جو اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ وہ ان "بداخلاقی" کے اداروں کو بند فرمادیں گے۔ نیولے، ڈھال تلوار باندھ کر، نامِ خدا، شیر کا شکار کرنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

پرانے زمانے کو چھوڑیئے، اس دَور میں بھی، پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں میں طوائفوں کے اڈوں کو ڈھایا اور مے خانوں کے دروازں میں قفل لگایا جاچکا ہے پھر بھی طوائفیں معدوم اور مے خوار مفقود نہیں ہوسکے ہیں۔ کوچۂ خوباں و کوئے مغاں کو ایک محلّے سے نکال کر دوسرے محلّے میں آباد کرنا بالکل اسی نوعیت کی حماقت ہے کہ کہنی کے پھوڑے کو گھٹنے پر منتقل فرما کر، اس بات کا یقین کرلیا جائے کہ پھوڑا باقی نہیں رہا ہے۔

---

[1] لوگ مسکرات کو شراب وغیرہ سے مختص کیے ہوئے ہیں، حالاں کہ مُسکر کے دائرے میں دنیا کی ہر وہ چیز داخل ہے جو خون میں ہیجان اور دل میں نشاط کا طوفان برپا کرتی ہے۔ بچّے کو پیار کرنا، چاندنی سے لطف اٹھانا، پھول سونگھنا، پیٹ بھر کر کھانا کھانا، حسینوں کو آغوش میں لینا، یاروں کی صحبت میں بیٹھنا، مختلف کھیل کھیلنا۔ عبادت کرنا، وظیفہ پڑھنا، گانا سُننا، تماشے دیکھنا، صحائف پڑھ کر جھومنا، اور رو دینا۔ یہ بھی مُسکر ہی کی شاخیں ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ذوقِ سُکر ہمارے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور مُسکر کے بغیر دردرسیدہ انسان کا زندہ رہنا امکان سے باہر ہے۔

اس لئے دانش مندی اور انسانی فلاح اسی میں نظر آتی ہے کہ جہاں تک بازارِ حُسن کا تعلق ہے۔ ماہر دس رسیدہ ڈاکٹروں کے ہفتہ وار معاینے کی وساطت سے اس ادارے کی تہذیب و تطہیر کا سائنٹیفک بندوست کر دیا جائے۔ اور ایسے ضابطے وضع کئے جائیں کہ امنِ عامّہ اور صحتِ جسمانی میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔

اب رہا مُسکرات کا مسئلہ، سو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی، اور پختہ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم۔ اور ایسے افراد کے نام اجازت نامے جاری کردے جو صحتِ جسمانی، سلامتیٔ عقل، اور شرافتِ نفس کی بناء پر بادہ خواری کی اہلیّت رکھتے ہیں۔

اگر اس برسوں کے سوچے سمجھے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تو یاد رکھئے، اور کان کھول کر سُن لیجئے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھے گی، گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جائیں گی، اور اناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی کچّی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر اُتر آئینگے اور دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے۔

اور دوسری طرف، جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیئے جائیں گے تو ان کے پاؤں کی زنجیر کھل جائے گی اور وہ اڈّے شہر کا رُخ کر کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے، شہر کا ہر مکان بازارِ حُسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ اور شہر کی ہر شریف زادی، خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی، اور عصمت فروشی کا پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گا، کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائے گا۔

فرنگی سے نفرت

ایک روز میں لکھنؤ کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی "بڑی بی" کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتہً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا اور زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا — یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی — انھوں نے روتے ہوئے کہا "بیٹا! مُوا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق — ہائے، ہمارے جانِ عالم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا، ان کو دودھ، جلیبی اور ملائی کھلائی جاتی تھی، جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے ان غازی مَردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے — بیٹا یہ غازی مرد کس قطار شمار میں ہیں، ان بندروں کا جب سے دَور دَورا ہوا ہے بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرنے لگے ہیں۔" انھوں نے یہ کہتے کہتے اپنے بے بوٹی کے کھتل سینے پر ہاتھ مار کر کہا "ہائے ہمارے جان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے۔" بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہوگئی۔ اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔

میری مونچھوں کے کونڈے ¹، الحفیظ والامان ـــ ہائے جوانی کا وہ عاصیانہ ریعان ـــ پیرانہ سر خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان ـــ وہ، ہر طرف سے، اَے میں صدقے، میں قربان ـــ وہ رنگوں کے بہ ہیم کھلتے سینکڑوں نشان ـــ وہ کلّ یوم ھو فی الشان۔ وہ جھکتی زمین، جھلجھلاتا آسمان ـــ وہ مُشک، وہ زعفران ـــ وہ عود وہ لوبان ـــ وہ ریحان وہ رمّان وہ عطر پھول اور پان ـــ وہ امنگوں کی، پور پور کی گلگتی جنجان ـــ وہ ترنگوں کے، رگ رگ میں گُنتے دھان ـــ وہ جھولتی گلیاں، وہ جھومتے میدان ـــ وہ، امرتیوں کی کجریاں، وہ برکھا کے بکوان ـــ وہ "پی ہو" "کوکو" سے دلوں کے شیشوں کی دَرکان ـــ وہ گھپ راتیں، وہ گل اوسان وہ، گوکل بن کے جھٹپٹے، وہ بانسری کے سُریلے بان ـــ وہ رادھا جی کی مُسکان ـــ وہ ہلالوں کا بازار، وہ خنجروں کی دُکان ـــ گاہے گُل پوش، گاہے لہولہان ـــ وہ کاہ پر قدم، کاہکشاں برگریبان ـــ وہ عشوؤں کے گرداب، وہ عربدوں کے طوفان ـــ وہ نرالے ہانکے انوکھے بچان ـــ وہ جھوٹے وعدے، سچے پیمان ـــ وہ پہاڑوں کی تول، پلکوں کی میزان ـــ وہ، کانٹوں کے حِصار پھولوں کے ایوان ـــ وہ شیشوں کے دَر، وہ پتھر کے دربان ـــ وہ ادھر سے سوال، ہے کوئی اِمکان ـــ وہ اُدھر سے جواب، اِلّا بالسُّلطان ـــ وہ تواترِ خطا و نسیان ـــ وہ تسلسلِ عُدوان ـــ وہ سلسلۂ انتقام بالاحسان ـــ وہ تلزمِ حُسن و عشق کا طغیان، وہ بَیْنَہُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانْ ـــ وہ بیاہیاں طرّار، وہ کنواریاں نادان ـــ وہ لبوں کی مُرکیاں، وہ بولوں کی لچکان ـــ وہ انکھڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان ـــ وہ حورانی مقصوراتِ فی الخیام کی شرمیلی آن بان ـــ وہ صراحی دار گردنوں کے ڈوروں کی لچک میں، ارجن کمان ـــ وہ بوجھل پپوٹے وہ نیندوں کے بھتان ـــ وہ یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ـــ وہ چاہوں باہنوں کا مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانْ ـــ وہ رامش و رنگ کے بوستان، وہ فِیْهِمَا عَیْنَانِ تَجْرِیَانْ وہ ہر الھڑ حور، وہ ہر اَمرَد غلمان ـــ کا فرزلفوں کی چھاؤں میں وہ مُکھڑوں کے قرآن ـــ اور

¹ میرے اودھ میں یہ رسم جاری تھی کہ جب لڑکوں کی مسیں بھیگنے لگتی تھیں تو مٹی کے کورے کونڈوں میں چوٹی دار جلیبیاں بھر کر حضرت یوسف کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

کانوں میں رہ رہ کر وہ نعرہ" فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانْ !!!

اب ذرا میری مونچھوں کے کونڈوں کا دھوم دھڑکا بھی دیکھ لیجئے ـــــ اُدھر زنانے مکان کے چوڑے چوڑے دروں اور اونچی اونچی محرابوں کے طویل و عریض دالان میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے، دیوار گیریاں، اِکّے اور گیس کے ہَنڈے جل رہے ہیں ـــــ خواتین گاؤتکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ اِدھر اُدھر فرشی اُگال دان، اور بڑے بڑے چاندی کے پان دان رکھے ہوئے ہیں، اور ان کے بالمقابل ڈومنیاں، ڈھاریں، سرودنیاں اور میراثنیں نقلیں کر رہی ہیں، اور نقلوں کے بعد، ڈھولک پر گانا ہو رہا ہے اور گانے والیوں کو بیل[1] دی جا رہی ہے۔

اِدھر مردانے صحن میں دَل بادل شامیانہ لگا ہوا ہے۔ شامیانے کے گرد نوکر، چاکر وغیرہ پَرے جمائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے بڑے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ مشعلچی مشعلیں اُٹھائے ہمہ تن انتظار بنے بیچ میں کھڑے ہوئے ہیں ـــــ شامیانے کے نیچے شرکائے جشن، اونچے اونچے گاؤتکیوں پر کہنیاں ٹیکے بڑے وقار کے ساتھ قالینوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھئے، اپنے کاشمیریوں کے طائفے کے ساتھ پندرہ سولہ برس کا خوبرو اور شیریں حرکات علی جانؔ[2] جس کے حسین چہرے کی شکر پر ہلکا سا نمک چھڑکا ہوا ہے۔ چلا آ رہا ہے، بڑی لٹک کے ساتھ، چھم چھم کرتا ہوا۔ شامیانے میں قدم رکھتے ہی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ، فرشی سلام کیا ارباب محفل کو ـــــ سلام کرنے میں اس کی کلائی اس قدر لچکی کہ ڈر لگنے لگا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اور مظہر کا مصرعہ ع

آہ مظہر، خمِ سلام کسے

---

[1] اس انعام کو "بیل" کہتے ہیں جو شادی میں بالخصوص اور دیگر تقریبات میں بالعموم گانے والیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی خاتون اُن کو انعام دیتی تھی تو ڈھولک بجانے والی اس کے عطا کردہ روپوں کو ڈھولک کے حاشیے پر تین بار کھنکھناتی، اور اس خاتون کے شوہر کا نام لے کر باوازِ بلند کہتی "فلاں خاں صاحب کی بیل (یعنی اگر انعام دینے والی کے شوہر کا نام نواب احمد خاں ہوتا تھا تو ڈومنی پکار کر کہتی تھی "نواب احمد خاں کی بیل)

[2] یہ عجیب اتفاق ہے کہ جان علی حجام نے میرا ختنہ اور علی جان کاشمیری نے میرے ختنے کے جشن میں مجرا کیا۔ جان علی نے خون بہایا اور علی جان نے رنگینیوں کے دریا بہا دیئے

یاد آگیا۔ سلام کرکے وہ اپنے سازندوں کے آگے ایسے دل فریب گھماؤ سے بیٹھ گیا، جیسے اُڑتا ہوا کبوتر اپنی چھتری پر آکر بیٹھ جاتا ہے ۔ اس کے بیٹھتے ہی ۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کُھل گیا

کی طرح سازندے اپنے اپنے ساز مِلانے لگے ۔ سازوں کا مِلایا جانا ایک صبر آزما عمل ہوتا ہے ۔ یعنی ؎

ہر چند سُریلے نغموں سے جذبات جگائے جاتے ہیں
اس وقت کی تلخی یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں

لیکن کاشمیریوں (بھانڈوں) نے اپنی اچھل کود، اپنے تُو، اؤ، اؤ، اؤ کے نعروں اور اپنی، پیٹ میں بَل ڈال ڈال دینے والی نقلوں سے اس تلخی کو ڈھانپ لیا اور اس قدر ہنسایا کہ لوگ لوٹنے لگے ۔ اور جب ساز مِل گئے اور ہنسی کے دونگرے مُرک گئے ۔ تو علی جان پُھرہری لے کر یوں کھڑا ہو گیا بھاؤ بتانے، جیسے پہلی کرن پھوٹتے ہی، دریا سانس لے کر مچلنے لگتا ہے ۔ پل بھر میں، اچھی طرح مِلے ہوئے ساز بجنے لگے ۔ سارنگی کی روں روں ۔ جوڑی کی دوں دوں اور مجیرے کی کھُن کھُن کی نَپی تُلی اور گھُلی مِلی آوازوں کے پُرفسوں دائرے میں علی جان نے بھاؤ بتانے کے واسطے جب اپنے لچکیلے ہات، یعنی چپّو اُٹھائے، اپنے چھریرے جسم کی کشتی کھینے کے لئے تو کاشمیریوں نے اسے حلقے میں لے لیا ۔ اور بڑی سُریلی آواز میں کہنے لگے یہ ادھر دیکھو خوش وقتی، ادھر دیکھو خوش وقتی ۔ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ خاں صاحب بہادر کی ڈیوڑھی پر، علی جان کا طائفہ آیا ۔ وہ محفل ویران، جہاں بھانڈ نہ باشد ۔ اس پر بڑا قہقہہ پڑا ۔

اس کے بعد سازوں کی منظم گونج میں علی جان کاشمیریوں کا حلقہ توڑ کر، یوں اپنا چہرہ سامنے لایا، گویا کالی بدلی کو پھاڑ کر، چاند نکل آیا ۔ سامنے آتے ہی، اس چھلاوے نے فرش پر یوں چھم سے پاؤں مارا کہ اُبل پڑا زمین سے رقص کا فوّارہ ۔ اور داہنے بائیں کھڑے ہوئے کاشمیریوں نے اس کے رقص کے ہر سَم پر تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع کر دیا "تا تا تا تا تھئی تھئی تھئی تھئی ۔ آ ۔ تا تا تا تا تھئی ۔ اور جب اس کے ناچ میں تیزی آئی تو کاشمیریوں نے

آہاہاہاہا — اَے بڑھ کے، اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ ہاں بڑھ کے بیٹا بڑھ کے تھئی تھئی تھئی تھئی، تاتا تا، کے نعرے لگانا شروع کر دیئے اور بھاؤ بتانے اور ناچنے کے بعد جب اس نے "بن پانی کا، چلا جارے بجرا"¹ گانا شروع کر دیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بجرا ہے اور فرش پر ہچکولے کھا کھا کر بہتا چلا جا رہا ہے، اور ساز اس کے بولوں سے اس قدر دست و گریباں اور ہم آہنگ ہیں، گویا سونے کی اُڑتی ہوئی سوئیوں میں جھلجھلاتے مقیش کے ڈورے پروئے جا رہے ہیں۔

علی جان کے دل نشیں مجرے کے بعد، شامیانے پر ایک سناٹا، ایک کھنکھناتا سناٹا چھا گیا — اس کے بعد، چار طوائفیں، تابڑتوڑ آئیں، لیکن ان کے مجرے کا رنگ جما ہی نہیں — اور ایسا لگا جیسے حافظ شیرازی کے کلام کے بعد ذوق کی غزل پڑھی جا رہی ہو۔ یا شراب کے بغیر خالی سوڈا پیا جا رہا ہے، یا لیلیٰ کی محمل کے بغیر بلبلاتا اونٹ، شتر غمزے کرتا پھر رہا ہے نجد کے میدان میں۔

خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر، کوئی چودہ برس کی، پانچویں طوائف آئی مجرے کے واسطے العظمتہ للّٰہ، اس کا چمپئی مکھڑا، گویا، سرِ کوہ سار آغازِ بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے — اور اس کے شربتی رخساروں کی سُرخ و کاغذی جِلد کے نیچے سے، یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویا غُرفے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی ہے — جب اس قتالۂ عالم نے رقص کرنے کے لئے اپنے ترشے ہوئے کولھے کے دِل فریب کٹاؤ پر، بایاں ہات رکھ کر چھلّا سی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا گویا رقص کی دیوی کی سنہری رَتھ کا دُھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے — اور کرۂ ارض کی گردش اس کا طواف کر رہی ہے۔ یا مصر کے بازار میں یوسف کا بانکپن دیکھ کر زلیخا کے غرور کی کمان ٹوٹی جا رہی ہے۔

اور ہنگامِ رقص، جب اس کافر نے، ایک قیامت انگیز جھانولی کے ساتھ اپنی آنکھوں کے پٹ آدھے بھیڑ لیئے تو ایسا معلوم ہوا، گویا خرابات کی انگنائی میں، دفعتہً جھٹپٹا ہو گیا اور رطلِ گراں پر ہلکا سا دُھواں مچلنے لگا — اور جب اس ظالم نے، اپنی گردن

---

¹ اے بے پانی کے بجرے چلا جا (جلتارہ)

کے باریک ڈورے کو، راگنی کے بہاؤ کی طرف موڑ کر ذرا سی جنبش دی تو ایسا محسوس ہوا، گویا نسیمِ سحر کی مضراب خیطِ ابیض کو بجا رہی ہے۔

اس کی جوانی کا سیب، ہنوز پال سے باہر نکالا نہیں گیا تھا۔ اس کے مکھڑے پر جوانی اور بالک پن، گلے مل رہے تھے ۔۔ اس کا وجود ایک ایسا جھٹپٹا تھا، جس کی چھاؤں میں دھندلکا ہمک رہا تھا ۔۔ اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا ہنڈا ابھی تک کورا ہے۔ اور سینے پر، اس کے آبی آنچل کے نیچے گویا ایک بُلوا سا ہو رہا تھا۔

وہ بہت کم سن تھی اور موسیقی میں خام ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں پتّی لگتی تھی۔ لیکن اس کی نیم پختہ جوانی کی، وحشی آنکھوں کے شربتی ڈوروں میں وہ انوکھی راگنی چھڑی ہوئی تھی، جس کو دنیا کے کسی ساز پر بجایا ہی نہیں جا سکتا، اور جس کو کانوں سے نہیں، آنکھوں سے سُنا جا سکتا ہے۔

اور آخر کار ڈوبتے ستاروں کی چھاؤں میں، اس دُخترِ قمر نے جب یہ غزل بھیرویں میں چھیڑی۔

نسیم، جاگو، کمر کو باندھو، اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

تو راگنی کی چلت پھرت، اس کے نیم رواں، اور کچے گلے میں یوں گھومنے لگی، گویا پُروا کے ملائم جھونکوں میں پیٹے سے کٹا ہوا چاند تارا فضا میں پتّا رہا ہے۔

اور جب ناچتے ناچتے، انعام کی خاطر، وہ ہچکولے کھاتی، کشتی کے مانند، آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی تو میرا گلا رُندھنے سا لگا۔ میری گردن کے ہاروں کی خوش بو تیز ہو گئی۔ اور جب وہ ایک گھٹنا ٹیک کر چھم سے میرے سامنے بیٹھ گئی، تو اس کے کم سنی کے انفاس کی خوش بو، کچھ سے میرے سینے میں چُبھ گئی۔ اور اس کی پیشواز کا سرا، جب میرے ہات کی پشت سے مس ہو گیا تو میرے بدن میں پُوسی پھٹنے لگی۔

میری زندگی کے اٹھارہ معاشقوں میں وہ میرا، مبہم سا معاشقۂ اوّلیں تھا ۔۔ جو عالمِ خواب میں شبنم کے مانند مجھ پر گرا، اور میرے تن بدن میں جذب ہو کر، گم ہو گیا۔

لہ پتنگ بازی کے ایک پیچ کا نام۔ تہ ایک قسم کا پتنگ

اب اگر وہ زندہ بھی ہوگی تو میری ہی طرح بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے ـــ ہائے ظالم وقت کا دھارا کتنے چاندوں کو غرق کر چکا ہے۔

لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے بعد بھی جب اس مجرے کی یاد آجاتی ہے تو، میرے جھرّیوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پشواز کا دامن سرسرانے اور گرد ڈھیں سی لینے لگتا ہے۔

ہائے کیا کروں میرے اللہ!

کانوں سے سُنا تھا کہ پشتِ رسالت پر مُہرِ نبوّت ثبت ہوا کرتی ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشتِ دست پر اُس پیشواز کی مہرِ لمس آج تک دمک رہی ہے۔

میرا، آگرے کا پہلا سفر:۔

آگرے سے نانا جان کا دعوت نامہ آیا، میری ماں کی باچھیں کھِل گئیں ـــ سفر کی طیاریاں شروع ہوگئیں۔ اور پورے ایک ہفتے کے بعد جب رختِ سفر طیار ہوگیا تو لکھنؤ آدمی بھیج کر تین کمپارٹ منٹ یعنی ایک فرسٹ، ایک سیکنڈ اور ملازموں کے واسطے ایک تھرڈ کلاس کی بوگی ریزرو ہو کر چوبیس گھنٹے پیش تر ملیح آباد اسٹیشن آگئی، اور وہ تینوں ڈبے مال گودام کے پلیٹ فارم پر لگا دیئے گئے۔

پردے کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ زنانے کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی سے بند کر دی گئیں اور صرف یہی نہیں، ان پر کو کا کیلوں سے ٹھوک ٹھونک، اندر سے چادریں بھی جڑ دی گئیں۔ دن بھر اُن میں سامان لادا جاتا رہا۔ اور رات کو پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ہماری گاڑی صبح نو بجے جانے والی تھی، گھر بھر میں تڑکے سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور باقی سامان بھی اسٹیشن پہنچا دیا گیا ـــ گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے، حیدری خانم قرآن کو ہاتوں پر بلند کر کے، انگنائی کے کنوئیں کی جگت پر جا کر کھڑی ہوگئیں، جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے ماماؤں، اصیلوں نے "دہی مچھلی[1]" کی آوازیں بلند کیں، اور ہم سب اسٹیشن کی جانب،

---

[1] اس کو آغازِ سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا، یعنی جس طرح دہی اور مچھلی میں سازگاری ہوتی ہے، ویسی ہی سفر میں شاملِ حال رہے۔

تاج محل کو جب قریب سے دیکھا تو یہ کُلیّہ ٹوٹ گیا اور قریب سے وہ اس قدر حسین نظر آیا کہ جی چاہا اس رِدالی کے سفید کھلونے کو، دانتوں کے نیچے، کُرم کُرم چبا کر کھا جاؤں۔

اللہ اکبر، تاج محل کا پھاٹک ___ آسمان سے باتیں کرتا پھاٹک ___ جب خُدامِ تاج میں سے کسی نے، اس کی محراب کے نیچے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا تو محراب میں ایک ایسی عظیم گونج پیدا ہو گئی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ گونج دیر تک باقی رہی ___ اور ایسا معلوم ہوا کہ گوشِ رسالت میں وحی کی جھنکار گونج رہی ہے۔

اُس اُلوہی جھنکار میں ڈوبا ہوا جب اندر گیا اور تاج پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خواب میں جنّت دیکھ رہا ہوں ___ فوّاروں کی کھنک، سبزے کی لہک اور تاج کی چمک دمک نے دیوانہ کر دیا ___ میں یہ سوچنے لگا کہ وہ کیسے بنچے تُلے، چوم لینے کے قابل ہات ہوں گے، جن کی فن کاری نے خیطِ ابیض، خوابِ زلیخا، تابِ مرمر، سپیدۂ سحری اور جلوۂ کنعان کو چاندی کی دیگ میں ڈال کر ستاروں کے انگاروں پر پگھلایا ___ موسمِ بہار کے سرشار جھونکوں میں سُکھایا اور ہیرے کی نازک نازک چھینیوں سے تراش تراش کر در و بام کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

خدا کی قسم، بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاڑ ڈالوں گریبان جبہ سے، اور ناچنے لگوں تھرک تھرک ___ لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا، ڈر کے مارے کلیجہ مسوس کر رہ گیا کہ ناچوں گا تو باپ اس طرح عاق کر دیں گے، جس طرح میرے پر دادا نے اپنے ایک لڑکے کو، جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، یہ سُن کر عاق کر دیا تھا کہ وہ گاتا اور بھاؤ بتاتا ہے۔

اپنے ولولۂ رقص کا گلا گھونٹ کر جب میں نے، تاج کے دوسرے تماشائیوں کی طرف نگاہ اُٹھائی تو یہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی، بڑی سنجیدگی کے ساتھ بثباتِ عقل و ہوش تاج کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ نہیں رہا ہے تو میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب کیا پتھر کے بنے ہوئے ہیں، یا یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

گاڑیوں اور فینسوں میں روانہ ہوگئے ـــ زنانے ڈبے کے تینوں طرف قناتیں کھڑی کردی گئیں خواتین اپنے اپنے درجے میں اور ہم سب اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

لکھنؤ اور کان پور ہوتی ہوئی، جب ہماری گاڑی ٹونڈلہ جنکشن پہنچی تو "دودھ گرام ـــ دودھ گرام ـــ پوڑی کاچوڑی (دودھ گرم، پوری کچوری) کے نعروں نے بوکھلا دیا۔ اور کانوں کو اُن بگڑے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اُودھ سے بہت دُور آچکا ہے۔

وہاں، ہمارے ڈبے کاٹ کر آگرے جانے والی گاڑی کے بریک کے پیچھے جوڑ دیئے گئے۔ گاڑی، آگے بڑھ کر جب آگرے کی طرف مڑنے لگی تو میرے باپ نے اشارہ کرکے بتایا "دیکھو یہ تاج محل ہے"۔ میں نے اُدھر نگاہ اٹھائی تو حیران ہو کر رہ گیا۔ جلال و جمال کی ایسی متناسب ہم آہنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا، پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا ـــ یہاں تک کہ گاڑی ایک طرف مڑ گئی۔ تاج اوجھل ہوگیا ـــ اور گویا دودھ ساگیس کا ہنڈا چٹ سے ٹوٹ گیا۔ آگرہ فورٹ اسٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ ماموں نے جھپٹ کر، مجھے گلے لگالیا، زنانے ڈبے کے گرد قناتیں کھینچ دی گئیں ـــ اور ہم سب، گڑھی منصور خاں کی طرف، جہاں نانا رہتے تھے، روانہ ہوگئے۔ میں نے، اپنے نانا جان کے محل کو، جسے کسی فرانسیسی رئیس نے بنوایا تھا، اپنے آبائی محلوں سے مختلف پایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے محل دو منزلہ ہیں، یہ سہ منزلہ ہے۔ اُن میں بڑے بڑے در اور دالان ہیں، یہ ایک دوسرے سے پیوستہ کمروں کا مجموعہ ہے۔ اُن میں فقط روشن دان ہیں۔ اِس میں جابجا کھڑکیاں ہیں۔ اُن کے صحن کشادہ ہیں۔ اس کا صحن، نسبتہً چھوٹا ہے۔ اُن میں سو، ڈیڑھ سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ اس میں چھ سات سو آدمیوں کی گنجائش ہے۔ اور ہرچند، یہ گڑھی منصور خاں کی ڈھال پہ واقع ہے۔ مگر اس قدر بلند ہے کہ گرد و پیش کے تمام مکان اس کے آگے پست دکھائی دیتے ہیں اور اس کی مہتابی سے تاج محل نظر آتا ہے۔

تاج محل کا قریب سے دیدار

ہر مادّی و ذہنی چیز میں، بُعد اضافہ، اور قُرب خفت پیدا کرتا ہے ـــ بُعد اجمال ہوتا ہے اور قُرب تفصیل، اور اجمال تفصیل سے زیادہ حسین ہوتی ہے ـــ لیکن

خداکو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت میں اپنے باپ کے ساتھ نہ ہوتا تو گریباں کے پُرزے اُڑا کر ایسا ایسا اُچھلتا، کودتا، ناچتا، قلابازیاں کھاتا، شلنگیں بھرتا، اور ایسے ایسے شَندے اور دیوانے چارے کرتا کہ فوراً آگرے کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا، اور وہاں جب کوئی پوچھتا یہ تونے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، تو اچک کر کسی درخت پہ چڑھ جاتا اور اُس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر یہ نعرہ لگاتا ہے

باخُسنش، ایں جُنوں کہ تو بینی _ تحمل است
ناصح، ملامتے مَکُن، ایں ناشکیب را !!

ولولۂ تعلیم

میرے ولولۂ تعلیم نے میرے باپ کے دل کے ساتھ وہ سلوک کیا، جو بجلی خرمن سے کرتی ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ کو جاہل رکھنا چاہتے تھے۔ مگر سارا کھیل بگاڑے ہوئے تھی، ان کی غیر معمولی محبت بے حد و حساب محبت۔ وہ دل سے چاہتے تھے ــ کہ میں پڑھوں تو ضرور مگر ان کی آنکھوں سے پل بھر کے لئے بھی جدا نہ ہونے پاؤں ـــ اور اس بے کراں محبت کی بناء پر، جب میں، دانت نکال نکال کر اُن کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ "میاں مجھ کو پڑھنے کے لئے کہیں باہر بھیج دیجئے، میں گھر پہ نہیں پڑھ سکوں گا، مولوی اُلٹے مجھ سے ڈرتے ہیں ــ ڈرنے والے مولوی پڑھا نہیں سکتے۔" تو ان کے چہرے پر ایک شدید قسم کے کرب کا رنگ دوڑ جایا کرتا تھا۔ تنگ آکر میں نے گھر کی تمام دیواریں، کوئلے سے "تعلیم کا بھوکا شبیر" لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالیں۔ میاں نوکروں سے اُن تحریروں کو مٹوا دیتے تھے، اور میں پھر لکھ دیتا تھا۔

آخر کار میں نے اپنے پھپی زاد بھائی، اور تعلیم کے شیدائی صفدر حسین خاں کو پکڑا کہ آپ میاں سے میری سفارش کر دیں ـــ صفدر بھائی "مُسَدَّسِ حالی" کی نسل میں سے تھے، انھوں نے میری اِمداد کا وعدہ کر لیا۔ ان کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ کہ انھوں نے میری تعلیم کے بارے میں میرے باپ سے بار بار کہا اور بڑے اصرار کے ساتھ کہا، لیکن میاں نے اِس کان سے سُنا، اس کان سے اُڑا دیا۔

لیکن صفدر بھائی دُھن کے پکّے تھے، ہمت نہیں ہارے۔ اور ایک روز شام کے وقت میاں کو بڑے اچھے موڈ میں پاکر انھوں نے، بڑی جسارت کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ۔ "ماموں، اب زمانہ بدل چُکا ہے ـــ جو بچّہ گھر کے رئیسانہ ماحول سے باہر نکل کر نہیں پڑھے گا. وہ "شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے" کے زمرے میں آکر تباہ ہو جائے گا، ماموں آپ خاندان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے لِکھے اور عقل مند آدمی ہیں۔ اور پھر بھی تعلیم سے اس قدر غفلت برت رہے ہیں۔

یہ سُن کر میاں بگڑ گئے، اور ارشاد فرمایا "صفدر ـــ ایک چھوڑ چار چار مُعلّم اس کو پڑھا رہے ہیں، یہ اس عمر میں گلُستاں، بُوستاں، سکندر نامہ اور دیوانِ حافظ چاٹ چکا ہے، اور گومتی پرشاد سے انگریزی بھی پڑھ رہا ہے کیا اسی کا نام ہے تعلیم سے غفلت؟" ـــ صفدر بھائی نے ہات جوڑ کر کہا " میں سر جھکائے لیتا ہوں، آپ چاہیں تو مجھ کو مار لیں، مگر اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ چار کیا، دس اُستاد بھی اس ماحول میں بے کار ہیں، ماموں، رئیسوں کے بچّے مولویوں سے نہیں ڈر سکتے، بلکہ اُلٹے مولوی ان سے خوف کھاتے ہیں، ماموں ـــ یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے کہ نسیم نانا کے ایک بچّے کو باہر سے آئے ہوئے ایک اُستاد نے، جب ایک ہلکا سا تھپّڑ مار دیا تھا تو انھوں نے اس کا ہات فوراً تڑوا ڈالا تھا ـــ اس دن سے یہاں کے تمام اُستاد اور بھی ڈر گئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو گھُرکی تک دینے کی جرأت نہیں کرتے" یہ سُن کر میاں کچھ سوچنے لگے۔ صفدر بھائی نے، اِشارے سے بتایا کہ آثار اچھے ہیں ـــ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میاں نے کہا "صفدر یہ تو بتاؤ شبیر کو بھیجوں تو کہاں بھیجوں، لکھنؤ، ہر چند قریب ہے، مگر وہاں کے رنگین ماحول[1] میں یہ

[1] میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مردِ صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں، وہ "بگڑے" بغیر مانے ہی گا نہیں۔ اور اس کو اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں "اخلاقِ جلالی" کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی۔ پھر بھی یہ شبیر اس گنبد اور اُن زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں و بارگاہِ مغاں میں پہنچ جائے گا۔
کاش میاں ہی کو نہیں، دنیا کے تمام باپوں کو یہ معلوم ہوتا کہ اپنے بیٹے اور اس کے فطری میلان کے بیچ میں آکر کوئی باپ تا دیر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام نیچا نہیں دکھا سکتے۔ اگر کروروں انبیاء پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی جانب بہنے لگے، پانی ان کا حکم نہیں مانے گا۔ اور نشیب

(باقی اگلے صفحے پر)

بگڑ جائے گا۔ صفدر بھائی نے کہا "ماموں یہ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ان کی تعلیم لکھنؤ میں ہو میں اپنے بیٹے اسرار حسن کو سیتاپور میں پڑھا رہا ہوں، آپ شبیر میاں کو سیتاپور بھیج دیں۔ وہاں ملیح آباد کے بہت سے لڑکے یعنی عبد الباری، عبد العزیز، فخر الحسن پڑھ رہے ہیں۔ اور شبیر میاں کا لنگوٹیا یار ابرار بھی وہیں تعلیم پا رہا ہے۔

میاں نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "اچھا صفدر — ایک مہینے کے بعد شبیر کو سیتاپور لے جانا، میں اس ایک مہینے میں اپنے دل کو بھی سمجھا لوں گا۔" یہ سنتے ہی میرا دل تلکاریاں مارنے لگا۔

لیکن جب پورا مہینہ گزر جانے کے باوجود، میاں کا وعدہ ایفاء نہیں ہوا تو میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اُسی اثناء میں جب لفٹننٹ گورنر سے ملنے کے لئے میاں لکھنؤ جانے لگے، میں بھی ساتھ ہو لیا، اور جب وہ لاٹ صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے — تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لاٹ صاحب نے میرے باپ سے پوچھا "آپ کا لڑکا رو کیوں رہا ہے؟" تو میں نے ان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ لاٹ صاحب نے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، اور میرے باپ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں جو کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ "خاں صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں، ایسے علم کے شوقین لڑکے تو ولایت میں بھی نہیں ہیں، آپ اس کو ایک مہینے کے اندر اندر کسی اسکول میں داخل کر کے مجھے مطلع کر دیں۔" اتنا کہہ کر اُس نے بڑے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور کہا "اگر خاں صاحب نے میری بات نہیں مانی، تو میں سرکاری وظیفہ دِلا کر تم کو تعلیم کے واسطے لندن بھیج دوں گا۔"

گورنمنٹ ہاؤس سے نکل کر، جب میاں گاڑی میں بیٹھے تو برس پڑے مجھ پر، فرمایا

(پچھلے صفحے کا بقیہ)

کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سن کر کوئی انسان کے ذی شعور، اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات کرے گا، تو غور کرنے کے بعد، اس کو پتا چل جائے گا کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جبلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

"مردود تونے لفٹنٹ گورنر سے میری شکایت کی، اور وہ بھی میرے منہ پر۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اس لال منہ والے بندر سے ڈر جاؤں گا، خوب کان کھول کر سن لے کہ اگر لفٹنٹ گورنر کے باپ بھی کہیں گے، پھر بھی میں تجھ کو گھر سے باہر بھیج کر نہیں پڑھانے کا۔ ایسی تیسی لاٹ صاحب کی" یہ سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ہچکیاں بندھ گئیں، روتے روتے ۔۔۔ اور دورانِ گریہ فرطِ تلق سے میری سانس میرے گلے میں گھوم کر کچھ ایسے زبردست جھٹکے سے نکلی کہ میرے عاشق باپ کا منھ فق ہوگیا۔ فرطِ محبت سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔ انھوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور انتہائی عُجلت کے ساتھ کہا "تیرے سر کی قسم ایک مہینے کے اندر میں تجھ کو سیتاپور بھیج دوں گا" ۔۔۔ میری سانس ٹھہر گئی، ہچکیاں رک گئیں۔ آنسو تھم گئے ۔۔ میرے باپ نے، مجھ کو بہت غور سے دیکھ کر پوچھا "بیٹا اب طبیعت کیسی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا "اچھا ہوں میاں" ان کے چہرے پر بحالی آگئی۔ اور میں دل ہی دل میں، سیتاپور جانے کے دن گننے لگا۔

ملیح آباد آتے ہی میاں نے صفدر بھائی کو بُلا بھیجا اور کہا "صفدر تم شبیر کو جمعہ کے دن سیتاپور لے جاؤ" میرا دل خوشی کے مارے اُچھلنے لگا۔

دو دن کے اندر اندر، میرے ساتھ جانے والے باورچی کا، جس کو سیّد کے نام سے پُکارا جاتا تھا، تقرر کر دیا گیا، اور صفدر بھائی نے چار پانچ دن کے اندر اندر میرے تمام زرّیں اور بھڑکیلے کپڑے نظری کر کے سادہ جوڑے سلوا دیئے۔

خدا خدا کر کے جمعہ آیا۔ میرا تمام سامان گاڑی پر رکھوا دیا گیا۔ لیکن بڑی بی، دادی، ماں اور سب سے زیادہ میرے باپ کے رخصتی آنسوؤں میں گاڑی کا وقت بہہ گیا۔ اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

دوسرا جمعہ آیا۔ میں گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے پیش تر ہی طیار ہوگیا۔ دادی اور ماں نے میرے بازو پر امام ضامن باندھے۔ سب نے یکے بعد دیگرے مجھے گلے لگایا۔ بڑی بی نے بھی مجھ کو سینے سے چمٹا لیا۔ میاں نے اس قدر بھینچ کر مجھے سینے سے لگایا کہ میری

پسلیاں لچک گئیں، اور میرے سینے پر ان کے دھڑکتے دل کی ضربیں پڑنے لگیں ــــ آنگن میں پہنچ کر جب، حسبِ دستور، قرآن کے نیچے سے نکلنے لگا تو میاں نے بھرّائی آواز میں حکم دیا کہ، اِدھر آؤ بیٹا، میں ان کے پاس پہنچا، انھوں نے ارشاد فرمایا "تھوڑی دیر کے واسطے بیٹھ جاؤ۔ اور دو چار منٹ کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر جمائی اور فرطِ اضطراب سے کسمسانے لگا تو میاں نے بڑی درد بھری آواز میں فرمایا ؎

ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد　　　　می روئی وگریہ می آید مرا

اتنے میں صفدر بھائی آگئے، اور ہات جوڑ کر کہا، ماموں گاڑی چھوٹ جائے گی" میاں نے میرے چہرے پر نگاہیں جمادیں، اور پھر اشارے سے مجھ کو رخصت کی اجازت دے کر سر جھکا لیا۔ میاں کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو جھک جھک کر سلام کیا۔ اور، جب باہر جانے کے واسطے، ڈیوڑھی سے گزرنے لگا تو ہچکیاں میرا تعاقب کرنے لگیں ــــ اور میاں کی آواز سنائی دی۔

سختِ بے مہری کہ بے ما می روی　　　　سروِ سیمینا، بصحرا می روی

الغرض گھر سے باہر اس طرح آیا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

تھرڈ کلاس اور اُسکے کا پہلا تجربہ۔

صفدر بھائی نے، اسٹیشن جاتے ہوئے مجھ کو ایک لمبا لکچر پلایا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "اب زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ امیری کی بو اپنے سر سے نکال دو، ماموں نے مجھ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا ہے، مگر میں تم کو لے جاؤں گا تھرڈ کلاس میں ــــ منظور ہے تمہیں"؟ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تھرڈ کے مسافروں کو کن کن بلاؤں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ میں نے ان کی تجویز منظور کرلی۔

لیکن تھرڈ کلاس میں قدم رکھا تو جی سن سے ہو کے رہ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سب سے پہلے اُس ڈبے کی اُس بدبو نے میرے دل پر گھونسا مارا، جس سے میں کبھی دو چار ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ڈبہ اوندھا اوندھا سا ہے ــــ اور بے گدوں کی کھُردری ذلیل بنچیں میرا منھ چڑھا رہی ہیں۔ اور ایک بنچ پر چند گنوار، بچھو مارکہ

تنباکو کی چلمیں پی پی کر، بُری طرح ــ کھانس رہے ہیں۔ ناک میں ڈنک مارنے لگی، گزاکو کی بدبو ــ مرتا کیا نہ کرتا، سر جھکا کر کھتری سیٹ پر بیٹھ گیا، سیٹ چُبھنے لگی ــ سانس میرے سینے میں اُلجھ گئی اور امام ضامن گرم ہو کر میرے بازو پر چرکے لگانے لگے۔ اور میں کھڑکی سے مُنھ نکال کر بیٹھ گیا ــ اور چار باغ سے نکل کر صفدر بھائی نے دو خبیث اِکّے والوں کو اِشارے سے بلایا ــ اور دو دو کوڑی کے ذلیل اکّے۔ اپنے گدھوں کے سے افیونی گھوڑوں کے ساتھ، چوں چوں کرتے جب میری طرف رینگنے لگے تو مجھے ایسا لگا جیسے منھ کالا کر کے مجھے گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے، صفدر بھائی نے میری حالت کا اندازہ لگا کر قہقہہ مارا اور ان کا وہ قہقہہ اضافۂ اہانت، بر جراحت کی طرح مجھے بہت ہی بُرا لگا ــ انھوں نے مجھ کو جز بز دیکھ کر کہا "شبیر میاں، یہ آپریشن بہت مفید ہے، اس سے تمہارے دل میں جو غرور کا مادّۂ فاسد ہے۔ وہ خارج ہو جائے گا" میں چُپ ہو گیا۔

اِکّا میرے قریب آیا تو میں نے کہا "صفدر بھائی اس پر بیٹھوں کیوں کر" انھوں نے میری بغلوں میں ہات دے کر مجھے بہزار دقّت بٹھا دیا، اور دوسرے اِکّے پر سیّد باورچی سامان سمیت سوار ہو گیا۔

اِکّے کے چکٹے گدّے کی بُو سے مجھے متلی ہونے لگی۔ اور یاد آ گیا حافظ کا یہ مصرع۔

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

اب چار باغ سے ہمارے ذلیل اِکّے آغا میر کی ڈیوڑھی[1] کی طرف رسان رسان رینگنے لگے۔

جب ہمارا اِکّا جھاؤ لال کے پُل سے گزرنے لگا تو میری نظروں کے سامنے سے اپنے پردادا کا محلہ گزرنے لگا، جس کے نکڑ کے پتھر پر "احاطۂ فقیر محمد خاں" جلی حروف میں کندہ تھا۔ اس بورڈ کو دیکھ کر میرے تمام رونگٹے جھن سے ہو گئے، خیال آیا کہ ادھر سے دادا جان ہاتی پر گزرتے اور ان کی سواری کے آگے نقیب بولا کرتے تھے، آج اسی طرف سے، ان کا پوتا، ایک حقیر طوطہ بنا ہوا اِکّے میں بیٹھا، ٹرخ ٹوں، ٹرخ ٹوں

---

[1] اس زمانے میں، سیتاپور جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے واسطے سٹی اسٹیشن جانا پڑتا تھا۔ جو آغا میر کی ڈیوڑھی میں واقع تھا۔

گزر رہا ہے۔ شرم کے مارے میں نے اپنا منھ چھپا لیا۔

الغرض بہزار کوفت و ذلّت سیتاپور پہنچ گیا۔ ملیح آباد کے تمام لڑکے نہال ہو گئے، اور ابرار نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دوسرے ہی دن میرا نام برانچ اسکول میں لکھا دیا گیا۔ صفدر بھائی نے ہائی اسکول کے فرشتہ سیرت ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال اور بورڈنگ کے ہنس مکھ انچارج گھوش بابو سے بھی مجھے ملا دیا اور میں ہزاروں ولولوں کے ساتھ باقاعدہ اسکول آنے جانے اور جی لگا کر لکھنے پڑھنے میں سرگرم ہو گیا۔

ابھی سیتاپور آئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے ہوں۔ ایک روز شام کے وقت کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے داروغہ شیخ اُمید علی چلے آرہے ہیں۔ شیخ صاحب کو دیکھ کر میں سمجھا کہ میاں سیتاپور تشریف لے آئے ہیں، لیکن جب داروغہ صاحب نے میاں کا خط دکھایا تو معلوم ہوا کہ میاں نے فقط دو روز کے لئے ملیح آباد بلایا ہے —— دو دن کی چھٹی لے کر جب رات کی گیارہ بجے والی گاڑی سے ملیح آباد آیا اور اپنے مکان کی گلی میں پہنچا تو یہ دیکھا کہ میاں، ڈاکٹر عبدالکریم اور چند سپاہیوں کو لئے خلافِ معمول، اچکن اور ٹوپی کے بغیر پھاٹک سے برآمد ہو رہے ہیں —— اور جیسے ہی مجھ پر اُن کی نظر پڑی "ہائے میرا بیٹا" کہہ کر وہ جھپٹ پڑے اور مجھ کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نے کہا "خاں صاحب آپ خوش ہونے کے عوض رو رہے ہیں" میرے باپ نے ارشاد فرمایا "ڈاکٹر صاحب، کاکوری کے پُل سے گزرتے ہی، یہ ایک سنّتِ جاریہ ہے کہ ریل ہمیشہ سیٹی دیتی ہے، لیکن آج اس نے سیٹی نہیں دی، اور میں یہ خیال کر کے دیوانہ ہو گیا کہ کہیں خدانخواستہ پُل تو نہیں ٹوٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس کا بیٹا ریل میں آ رہا ہو، اس کے جی سے پوچھئے کہ وقت مقررہ پر ریل کا سیٹی نہ دینا۔ کتنے واہموں کو برانگیختہ کر سکتا ہے" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ خاں صاحب سچ کہا ہے کسی نے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

سیتاپور میں میری تعلیم کا سلسلہ سال ڈیڑھ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اور میری مفارقت کی تاب نہ لاکر، غالباً ۱۹۰۸ء میں میرے باپ نے مجھ کو لکھنؤ طلب فرما کر حسین آباد ہائی اسکول[1] میں داخل کرا دیا۔ اور میرے قیام کے واسطے نخاس (چڑیا بازار) میں سید اعجاز حسین صاحب کے مکان کا بالائی اور کشادہ حِصّہ کرائے پر لے لیا گیا۔ میرے مکان کے نیچے ایک مُنشی واحد علی کی نوادر کی دُکان تھی، ان کی دُکان کے سامنے، کسی بزرگ کا مزار تھا، جس پر ہر جمعہ رات کو چراغاں ہوا کرتا، اور اس کے اطراف میں، ہر اتوار کو چڑیوں کا بازار لگا کرتا تھا۔ اور میرے مکان[2] کے عین سامنے حضرت ریاضؔ خیرآبادی رہتے تھے۔

میں اس واقعے کو، آج تک بھول نہیں سکا ہوں کہ جس روز میں نے اس مکان کے چوڑے چکلے زینے میں، جس کے دونوں طرف نیچے سے اوپر تک بڑے شاداب گملے رکھے ہوئے تھے، پہلا قدم رکھا تھا، تو ہوائے سرد کے ایک تیز اور معطر جھونکے نے، میرا اس دل نوازی کے ساتھ استقبال کیا تھا کہ میرے سینے کی تمام کھڑکیاں تڑاتڑ کھل گئی تھیں اور جگر میں ایک ایسی نشہ آور خنکی محسوس ہوئی تھی کہ میں جھومنے لگا تھا۔

خدا گواہ کہ ہوائے سرد و شکریں کا، وہ پھولوں میں بسا، باریک دھار والا جھونکا، میرے سال خوردہ اور گرم و سرد کشیدہ سینے میں، آج کی تاریخ تک محفوظ اور رسا بسا ہوا ہے، اور میرے تھکے ہوئے پھیپھڑے اس کی تازگی کو اس تحریر کے وقت تک فراموش

---

[1] اس اسکول میں، آغائی صاحب کے پوتے اور میرے ساتھ، میرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کے حکم سے یہ امتیازی برتاؤ کیا گیا تھا کہ تمام لڑکے تو بنچوں پر بٹھائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو کلاس ٹیچر کی میز کے داہنے بائیں، کرسیوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور وہیں میں چھٹے اور ساتویں درجے کا ڈبل امتحان دے کر آٹھویں درجے میں آگیا تھا سید محمد جواد صاحب، ہمارے دینیات کے معلّم تھے، ہر چند مجھے دینیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر سید صاحب کے کلاس میں بڑے شوق کے ساتھ جاتا اور ان کی عربی و فارسی کی غیر معمولی قابلیت سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ میرزا حبیب حسین صاحب اور سید محمد جواد صاحب کی شخصیتوں اور شفقتوں کو میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔ اور اللہ جنت نصیب کرے، مجھ میں اگر معصومیت ہوتی تو میں ان دونوں بزرگوں کے واسطے تمام عمر بھی دعا کرتا رہتا

[2] وہ مکان شہید کر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر، ایک نیا مکان تعمیر کرا کے اب وہاں ایک مطہر رہنے لگی ہے۔" آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد"

نہیں کر سکے ہیں ۔ اور اب بھی جب کبھی پاکستان سے لکھنؤ جاتا، اور اپنے وطن میں ایک پردیسی کے مانند گھومتا ہوا جب نخاس کی طرف نکل جاتا ہوں تو وہ سب سے پہلا جھونکا جڑیا گھر کے درختوں سے اُتر کر نیچے آتا، اور "ہائے میرے شبیر" کا دردناک نعرہ لگا کر، میری گردن میں باہیں ڈال دیتا اور ہچکیوں پر ہچکیاں لینے لگتا ہے ۔ جرنیلی ٹوپی اور سونے کے دُرکا وہ "لڑکا" جو وہاں سے حسین آباد اسکول جایا کرتا تھا، میرے وجود کے احاطے سے نکل کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور بڑی رقّت کے ساتھ پوچھتا ہے "کیا میں اب یہ ہو کر رہ گیا ہوں ۔ اور اسی لمحے کے اندر میرا محبوب عطا حسین قزلباش، جو اَب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا، سیاہ شیروانی پہنے اور آنکھوں میں آنسو بھرے اُس درد انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آنکھیں اُٹھا کر، اپنا سر جھکا لیتا ہے، جس مسکراہٹ کی دھاریوں میں، کروڑوں نوحے کروٹیں لیتے رہتے ہیں ۔ ہائے کھائے جا رہی ہیں مجھ کو پرانی یادیں، دل پھٹا جا رہا ہے میرا، اے میرے اللہ!

اس زمانے میں، میرے مکان کے سامنے اور حضرت ریاض خیرآبادی کے مکان کی دیوار کے نیچے، دور تک گھوڑا گاڑیوں کا اڈّہ تھا، جہاں پچیس تیس گاڑی والے رہتے تھے اور ہر روز، بلاناغہ، صبح کے چار پانچ بجے، ایک صاحب وکٹوریہ روڈ کی طرف سے، "مولا علی، امام علی، مرتضیٰ علی" گاتے ہوئے جیسے ہی میرے مکان کے سامنے سے گزرتے تھے تو گاڑی والے ٹھُکی دار آواز میں نعرہ لگایا کرتے تھے "نواب صاحب، بجا حاضر ہے" اور وہ "نواب صاحب" ان کو گالیوں پر دھر لیا کرتے تھے ۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی فحش لفظ زبان پر آجائے ۔

جیسے ہی گاڑی والوں کی آواز بلند ہوتی تھی کہ "نواب صاحب بجا حاضر ہے" ویسے ہی وہ بڑی سُریلی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہنے لگتے تھے "اے آلِ رسول کے دشمنو، اَے معاویہ کے ٹٹوؤ، اَے ابن زیاد کے اونٹو، تم پر لعنت، تم پر آخ تھو، اے یزید کے پِلّو، اَے ابنِ ملجم کے بوکڑو، اے ہندۂ جگر خوار کے پڑدو، تم پر لعنت، ہزار بار لعنت اے کنواریوں کے جنو، لعنت ۔ لعنت، ہزار بار لعنت، آخ تھو، آخ تھو، آخ تھو" اور ان

گالیوں پر، گاڑی والوں کے قہقہے بلند ہو جاتے تھے اور جب وہ گالیاں دیتے ہوئے، گڑھے والی سرائے[1] کی طرف مڑنے لگتے تھے تو گاڑی والوں کی آواز پھر بلند ہو جاتی "نواب صاحب بجرا حاضر ہے — نواب صاحب، بجرا حاضر ہے" اور وہ اُسی نوع کی گالیاں دیتے ہوئے مڑ جایا کرتے تھے۔ اور اس طرف میرے گونڈے کے باشندے، میاں نوروز باورچی کا بھی یہ معمول تھا کہ جب وہ "نواب صاحب بجرا حاضر ہے" کی آوازیں سنتے تھے — تو چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور بڑبڑانے لگتے تھے کہ "ان سالے گاڑی والن (والوں) پر نالت (لعنت) روج روج (روز روز) بجرا حاجر، بجرا حاجر (حاضر) چیکھا کرت ہیں (چیخا کرتے ہیں) یو (یہ) کا (کیا) واے ہات (واہیات) پنا (پن) ہے۔ سالے سویرے سویرے اللہ رسول کا نام تو لیت (لیتے) ناہیں (نہیں) بجرا حاجر، بجرا حاجر کا گُل (غل) مچائے رہت (رہتے) ہیں۔ تھوک ہے ان کی ادکات (اوقات) پر۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اس 'نواب صاحب، بجرا حاضر ہے' کے ہنگامے سے، کوئی گھنٹے دو گھنٹے بیش تر، میں اپنا سبق یاد کرنے کے بعد، دیوانِ حافظ کے مطالعے میں غرق تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، تارے جھلملا رہے تھے کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے سے، بھیرویں میں ڈھلی، ایک تان لرزتی آئی۔

سحر، با باد می گفتم، حدیثِ آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو، بالطافِ خداوندی

اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بات تھی کہ میں بھی اس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا۔ صبح کا سہانا وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے — دھندلکے میں طلسمی شان اور اس پر، یہ درد بھری تان — میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی۔

ابھی میرا تمام بدن گنگنا رہا تھا کہ اسی لوچ کے ساتھ دوسری تان سنی۔

دعائے صبح و آہِ شب، کلیدِ گنجِ مقصود است
بایں راہ و رَوِش می رو، کہ بادِل دار پیوندی

---

[1] دراصل وہ سرائے نہیں تھی بلکہ ٹکھائیوں کا چھوٹا سا محلہ تھا، جو اَب سڑک میں آ چکا ہے۔

اب، مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین تین سیڑھیاں طے کرتا سڑک پر آگیا۔ اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے، سفید داڑھی کے دراز قامت بزرگ میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف مُنھ کیے دھیمے سُروں میں گا رہے ہیں۔

بایں راہ وروش می رو کہ بادل دار پیوندی

نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ان بزرگ نے بڑی حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا۔ اور زیرِ لب کہا "اللہ اللہ، یہ عمر اور اس قدر درد مندی ــ میاں صاحب زادے تم کون ہو؟" ــ میں نے کہا "طالب علم ہوں" وہ میرے قریب آگئے اور کہا "صاحب زادے، زرا اِدھر سڑک کی روشنی کے نیچے تو آجاؤ" میں روشنی کے کھمبے کے نیچے آگیا۔ انھوں نے، مجھے بڑے غور سے دیکھا، بار بار دیکھا ــ اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز آنکھ جاتی ہے ــ اور، پھر، کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا، "صاحب زادے تم کون ہو؟" ــ میں نے پھر وہی کہا "طالب علم ہوں" انھوں نے یہ سُن کر، آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھائیں اور بڑی آہستگی کے ساتھ کہا "صاحب زادے، تم طالب علم نہیں، مطلوبِ علم ہو" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ــ

درخراباتِ مغاں، نورِ خدا می بینم
ویں عجب بیں کہ چہ نورے، زکجا می بینم

کہتے ہوئے۔ کٹرۂ ابو تراب خاں کی ڈھال کی جانب مُڑ گئے ــ اور میں، تادیر، اس طرح مبہوت کھڑا رہا گویا میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور اس وقت بھی جب کہ میں اس واقعے کو قلم بند کر رہا ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں، اور وہ چاندنی رات مجھ پر چھائی ہوئی ہے، اور اُن بزرگ کی آواز، کٹرۂ ابو تراب خاں کے موڑ سے اس وقت بھی میرے کانوں میں آرہی ہے۔

ویں عجب بیں کہ چہ نورے زکجا می بینم !!

میرا نِکاح

میرا نکاح، ایسا ویسا نہیں، بڑی ضدّم ضدّا، اور بڑی چوٹم چاٹا کا نِکاح تھا۔ اس صورتِ حال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سُن لیجئے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے، مختلف البطن بھائی تھے، نواب محمد نسیم خاں ــــ اُن دونوں بھائیوں کے مابین، حسبِ دستورِ خاندان، بنی اُمیّہ اور بنی ہاشم کے مانند، بڑی اَن بَن اور بڑی تُن بھُن رہا کرتی تھی۔ میرے خُسر، نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے تھے، اور میں، نواب محمد احمد خاں کا پوتا تھا۔ اس لئے میرے خُسر کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرا نکاح ہو۔ لیکن چوں کہ میرے خُسر اور میرے باپ کے درمیان، دستورِ خاندان کے خلاف، بڑی گہری محبت تھی، اس لئے میرے باپ نے جب میرا پیام دیا تو انھوں نے منظور فرمالیا، اور ان کی منظوری سے، میرے خُسر کا تمام قبیلہ بگڑ گیا اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ملال ہوا ــــ اور اس بناء پر میرے نکاح کے موقع پر، میرے نکاح کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خُسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑکا ــــ بڑی دھوم سے مُجرے ہوئے، دعوتیں ہوئیں اور عین نکاح کے دن "دشمنوں" کو جلانے اور تپانے کے لئے، اس قدر زور زور سے ڈھول پیٹے گئے، اس قدر شدّت کے ساتھ تاشے بجائے گئے، اور اتنے بڑے بڑے ہَود زَر گولے

لے اس وقت میری عمر ہوگی مشکل سے، گیارہ بارہ برس کی

چھوڑے گئے کہ ان کی دون دون، دُنا دُن دُنا دُن سے، دُور دور تک زمین ہلنے لگی۔ ہائے پٹھانوں کا مزاج!

لیکن یہ نکاح، آگے چل کر، کیا رنگ لایا، کتنا بڑا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد۔ اور میرے سہرے کے پھولوں نے کتنے کانٹے بو دیئے میرے باپ کی رہ گزارِ حیات میں، آگے اس کا ذکر آئے گا۔

یوں تو. نو برس کی عمر ہی سے، شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر، مجھ سے شعر کہلانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر جب شاعری سے میرا انہماک بڑھنے لگا، تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی، میرے باپ کے کان کھڑے ہوگئے۔ اور انھوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "خبردار اب اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔" اور اس کے ساتھ انھوں نے، زنانے میں بوا گُل زار، اور مردانے میں داروغہ امید علی کو مامور فرمایا کہ وہ جب مجھے شعر کہتے دیکھیں تو ان کی جناب میں رپورٹ کر دیں۔ باپ کے اس حکمِ اِمتناعی اور زنانہ و مردانہ خفیہ پولیس کے تقرر نے مجھ کو بوکھلا دیا۔

مشیّت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ

لہ میری نو برس کی جان، اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمایئے۔ ذرا سوچئے تو کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو، دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں، بڑی پھپی، بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو، جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو، جس کی دادی میرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اُردو فارسی کے اشعار برمحل سُناتی رہتی ہو، جس کی انّا خالص لکھنوی ہو، اور رات کے وقت "کھلی ہے کُنجِ قفس میں مری زبان صیاد" کی لوری دے دے کر، اس کو سُلاتی ہو، جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعر آتے جاتے اور ہر تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعراء کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا؟ — لہ بوا گُل زار، اور داروغہ امید علی، جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر التجا کرتا تھا کہ "خدا کے لئے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔" لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت و بے درد تھے کہ میری رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔ بوا گُل زار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور داروغہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا، اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔ شاعری نے مجھ کو تو برباد کر ڈالا۔ مگر میرے مخبروں کے گھر بھر دیئے ؎

آپ کو سوختت، غیر کو لذت — یہ مزا ہم کباب میں دیکھا

پھنک ۔ میں اس کشمکش پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں، کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں ۔

سوچنے لگا، میں اپنی ذات سے جُدا کیوں کر ہو جاؤں ۔ شعر کہتا ہوں تو باپ بگڑتے ہیں، نہیں کہتا تو دل پہ بگاڑ آتے ہیں ۔ اُدھر باپ کا حکم واجب الاذعان، اُدھر فطرت کا ناقابلِ تسخیر میلان ــــ اُدھر منشائے پدر، اِدھر تقاضائے قضا و قدر ۔ کیا کروں، کیا نہ کروں ؟ شعر کہوں تو باپ ڈانٹ پلائیں، اپنے دسترخوان پر کھانا نہ کھلائیں، اور شعر نہ کہوں تو دماغ کے پرَ خچے اُڑ کر رہ جائیں ۔

میری حالت آدم و ابلیس کی سی ہوگئی ــــ آدم کو ممانعت کی گئی تھی کہ خبردار شجرِ ممنوع کے قریب بھی نہ پھٹکنا، لیکن مشیّت کا تقاضیٰ تھا کہ اے آدم لُوٹ، جی بھر کے مزے لُوٹ شجرِ ممنوع کے، اور ابلیس کو حکم دیا گیا تھا کہ جھک جا سجدے میں، آدم کے روبرو۔ لیکن مشیّت نے آنکھ دکھادی تھی کہ ابے اگر سجدہ کردیا تو ناک کاٹ ڈالی جائے گی جڑسے ۔

سو جس طرح آدم و ابلیس ممانعت و حکم سے روگردانی کرکے مشیّت کے سامنے جُھک گئے (اور مجال نہیں تھی کہ نہ جُھکتے) اسی طرح میں حکمِ پدر سے روگردانی کرکے، فرمانِ قضا و قدر کے آستاں پر سربسجود ہو گیا ۔

اس لئے میں شاعری ترک نہیں کرسکا ۔ لیکن چوری چھپے شعر کہتا، اور، اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، کسی گوشے میں جاکر ان کو لکھتا اور پرچے اپنے صندوقچے کے اندر مقفل کر دیتا اور قاچاقیوں (اسمگلروں) کی طرح، اس صندوقچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا کہ وہ اس کو چھپا کر رکھ دیں ۔ میری ماں کو میری اس حالت پر بڑا ترس آتا تھا ۔ مگر وہ اُداس ہوجانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھیں ۔

لیکن اس قدر مجرموں کی سی احتیاط کے باوجود، میں اندر اور باہر کئی بار، عین موقع پر شعر کہتا پکڑا گیا ۔ میرا جیب خرچ بند ہوا، باپ نے اپنے ساتھ کھانا کھلانا ترک کردیا، اور اکثر تھپڑ بھی مارے ۔ اپنی ہر ذلّت کے بعد میں نے بارہا اپنے کان پکڑ پکڑ کر قسمیں کھائیں کہ اب کبھی شعر نہیں کہوں گا ۔ اب کھائی سو کھائی، اب کھاؤں تو رام دُہائی ۔ لیکن

جیسے ہی کہ میرے دل میں شاعری کی گُدگُداہٹ ہونے لگتی تھی، میری تمام قسمیں چور چور ہو کر رہ جایا کرتی تھیں۔ اور حضرتِ وحشت کا یہ شعر مجھ پر صادق آجایا کرتا تھا۔

مجالِ ترکِ محبت، نہ ایک بار ہوئی　　　خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

شعر گوئی کی اجازت:۔

ایک بار میں اپنے صندوقچے میں، جیب سے پُرزے نکال نکال کر رکھ رہا تھا کہ بوا گُل زار نے دیکھ لیا، وہ بھانپ گئیں ۔ میاں کو خبر کر دی۔ میاں آئے، میری ماں سے کہا "شبیر کا صندوقچہ کہاں ہے؟" میری ماں کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا، میاں کا خوف اس قدر تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکیں اور میرا صندوقچہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ میاں نے مجھ سے کُنجی مانگی، کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے کُنجی دے دی، انھوں نے صندوقچہ کھولا، میرے پُرزے، ایک ایک کرکے نکالے ۔ میں اپنے باپ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے گائے اپنے بچھڑے کو، چُھری کے نیچے دیکھ کر کانپنے لگتی ہے۔ اور جب انھوں نے میرے تمام پُرزے پُرزے پُرزے پھاڑ کر پھینک دیئے، میرے مُنھ سے ایک بڑی دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میری ماں دیوانہ وار مجھ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ میاں کے حواس اُڑ گئے، دادی جان نے آکر میرے باپ کو ڈانٹا کہ کیا بچے کو مار ڈالے گا؟

ڈاکٹر عبدالکریم کو میرے بے ہوش ہو جانے کی خبر کی گئی، وہ فوراً آ گئے، انھوں نے میری نبض دیکھی، کہا "خاں صاحب گھبرایئے نہیں، میں دوا ساتھ لایا ہوں۔" انھوں نے میرا منھ چیر کر دوا پلائی، رئیس کی انّا نے مُنھ پر چھینٹے مارے اور دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہوش آگیا ۔ مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھ کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ "بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی ۔ میں تجھے خود اصلاح دیا کروں گا۔ اِدھر آکر، دم بھر کے لئے اس پلنگڑی پر لیٹ جا۔" میں لیٹ گیا تو میرا جی بہلانے کے لئے انھوں نے مجھ سے کہا "بیٹا! اس شعر کے معنی بیان کر ۔

وہ جلد آئیں گے، یا دیر میں شبِ وعدہ
میں گُل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

اب شعر کی اجازت مل جانے کے بعد، میری طبیعت بحال ہو چکی تھی، میں نے ذرا

اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا۔ اب شاعر اس شش و پنج میں ہے کہ میں گُل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کِھلے ہوئے پھول، اور اگر دیر میں آنے والا ہے تو میں بے کھلی کلیاں بچھا دوں۔"

میاں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب معنی صحیح بیان کئے ہیں شبیر نے ؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا "اس سے زیادہ صحیح معنی بیان ہی نہیں کئے جا سکتے۔ میاں نے کہا " مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن طرز بیان میں اس نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا " صاحب زادے پھر تشریح کر دیجئے" میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "میرے نزدیک تو صاحب زادے نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے۔" میاں نے ہنس کر کہا " آپ لاکھ سخن سنج اور حالی کے ہم وطن سہی، پھر بھی جائے استاد خالیست۔ سنئے اس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس نے "کھِلے ہوئے پھول" کہا ہے، کلی جب چٹک کر کھل جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے، کھِلاوٹ تو پھول کی عینِ ذات ہے اس لئے " کھِلے ہوئے پھول" کہنا حشو و زوائد میں داخل ہے، اور دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے کلی کے متعلق "بے کھلی کلیاں" کہا ہے، حالاں کہ کلی کو تو اسی لئے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہے اور بے کِھلا پن اس کی عینِ ذات ہے۔ اس لئے "بے کھلی کلیاں" کہنا صرف اسرافِ الفاظ ہی نہیں ایک مہمل سی بات بھی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا " بے شک آپ کا خیال درست ہے، پھول اور کلی کے ساتھ ان توصیفی سابقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد میاں نے ارشاد فرمایا " اچھا ایک اور شعر کے بھی معنی بتا دو تو میں تمہاری شعر فہمی کو مان جاؤں گا۔"

آرہے ہیں، لاش کے وہ ساتھ ساتھ   اب ہماری قبر کتنی دور ہے

یہ شعر سُن کر میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آیا اور سوچنے لگا، اور دس پندرہ منٹ سوچنے کے بعد میں خوشی سے اچھل گیا، بستر سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا " شاعر کے جنازے کے جلوس میں اس کا دوست شریک ہے۔ شاعر کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اس کے دوست کو پیدل چلنے میں تکلیف ہو رہی ہوگی، اس لئے وہ

سا غور کر کے عرض کیا "میاں یہ شعر تو بہت آسان ہے ـــــــــــ شاعر سے اُکتا کر پوچھ رہا ہے کہ اب ہماری قبر کس قدر فاصلے پر رہ گئی ہے "۔ میاں نے جھک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو بہت داد دی، اور اس امر کا اعتراف کر لیا کہ ان کو یہ شعر مہمل معلوم ہو رہا تھا۔ میاں نے مجھ سے کہا "تمہیں اس شعر میں فن کے نقطۂ نظر سے کوئی عیب تو نظر نہیں آرہا ہے"، میں بے چارہ فن سے واقف ہی کب تھا، میں نے کہا "کوئی عیب نہیں ہے"۔ میاں نے فرمایا "اس کے پہلے مصرع میں تعقید ہے" اور پھر مثالیں دے کر سمجھایا کہ تعقید کیا چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "خاں صاحب آپ صاحب زادے کو شاعری سے باز تو نہیں رکھ سکتے، لیکن یہ بات ضرور سمجھا دیجئے کہ تکمیلِ تعلیم سے پیش تر، اس مشغلے پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے"۔

میاں نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب میں تعلیم سے بھی آگے کی بات سوچ رہا ہوں ـــ یعنی شاعری وہ چیز ہے جو شاعر کو اس امر کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ شعر کہنے اور شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ، دنیا کا کوئی اور کام بھی کر سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ بدبلا ہے کہ شاعر کے دل میں دولت کو اس قدر حقیر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ مفلسی کا صیدِ زبوں ہو کر رہ جاتا ہے ـــ ڈاکٹر صاحب، جی باوا[1] کے پاس جس قدر جائے داد اور دولت تھی، وہ میرے پاس نہیں ہے، اور میرے پاس جو جائے داد اور دولت ہے، وہ میرے بعد اس کے سات بھائی بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس جائے داد کا جو حصّہ آئے گا۔ وہ اس قدر بڑا حصّہ نہیں ہوگا کہ شاعر کی بے نیازی کو تا دیر برداشت کر سکے"۔ اتنا کہہ کر اُن کی آنکھوں میں، آنسو بھر آئے۔ انھوں نے میری طرف نگاہ کر کے دعا کے لئے ہاتھ بلند فرما دیئے کہ "اے اللہ میرے شبیر کو تباہی[2] سے بچانا، اور اس پر ایسی کرم کی نگاہ رکھنا کہ معاش کی خاطر اس کو

---

[1] میرے باپ اپنے دادا یعنی حضرتِ گویا کو "جی باوا" کہتے تھے ـــ [2] میاں، آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی، آپ نے دعا مانگی ہی تھی اس بارگاہ میں، جہاں عمرِ خضر کی درازی کے علاوہ کوئی اور دعا قبول ہی نہیں فرمائی جاتی ـــ آپ کو خبر نہیں کہ آپ کی آنکھوں کا تارا شبیر ایک کثیر العیال و فقید المعاش بوڑھے کی صورت سے دادِ غربت میں

باقی صفحہ ۱۳۹ پر

دوسروں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

ٹھوکریں کھا رہا ہے، وہ پاکستان آکر ایک معمولی سی تنخواہ پر زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن اس جرم پر ملازمت اور دیگر وسائلِ معاش سے محروم کر دیا گیا ہے کہ وہ (۱) عزتِ نفس کے مرض میں مبتلا ہے۔ (۲) کسی کے اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ (۳) وہ اپنے ضمیر اور قلم کو فروخت نہیں کرتا۔ (۴) اسے اپنے آبائی وطن سے نفرت نہیں ہے۔ (۵) اور اس کا سب سے بڑا قصور، جس سے بغاوت کی بو آتی ہے، یہ ہے کہ وہ فقط پاکستانیوں اور ہندوستانیوں ہی کو نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو وحدت کی زنجیر میں جکڑ کر ایک مستحکم اکائی اور ایک آفاقی ریاست بنانے کے "شیطانی خواب" دیکھتا رہتا ہے۔

میاں، کاش میں آپ کی زندگی ہی میں مرجاتا اور آپ میرا جنازہ اٹھاتے، اور مجھ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر کیا کیا جائے قضا و قدر کی ستم ظریفی کو ؎

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل   آرد بزیرِ تیغ و شہیدش نمی کند

پہلا مشاعرہ

یہ غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں، حضرت مولانا رضا فرنگی محلی کے مُشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوا اور دنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

آیئے، میں آپ کو مشاعرے میں لے چلوں، تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفّاف چاندنی بچھی ہوئی ہے، چاندنی پر قالین ہیں، گاؤ تکیئے، دیواروں سے لگے ہوئے ہیں ــــ اِدھر اُدھر صاف ستھرے اُگالدان، نیچوں میں ہار لپٹے حُقّے، شال باف سے منڈھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوری ہانڈیاں، ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور الائچی دانے، تمباکو، اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں، شعراء زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے، دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں، سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔ سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں، گلوریاں کھائی اور حُقّے پیئے جا رہے ہیں ــــ اور جو شاعر، مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے وہ حاضرین کو جُھک جُھک کر، غیرِ ملفوظ سلام کر رہا ہے حاضرین، اس کے حسبِ مرتبہ، نیم قد، یا سرو قد، جوابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں ــــ لیجئے، اب میرِ مُشاعرہ کے سامنے شمع آگئی ہے۔ اور مولانا رضاؔ کی غزل سے حسبِ دستورِ مُشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے ــــ اور داد سے چھت گونجنے لگی ہے۔ کس کی یہ مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے، حقہ پی لے، پان کھالے، آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی اِدھر سے اُٹھ کر اُدھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

میر مشاعرہ کے بعد، اب شمع گردش کر رہی ہے نومشق نوجوانوں کی صفوں میں۔ اور کمی بیشی کے ساتھ سب کو داد مل رہی ہے اور معمولی اشعار کے سَروں پر بھی "ماشاء اللہ" کے سہرے باندھے جا رہے ہیں، لیجیئے نومشقوں میں اب میری باری آ گئی۔ ارے غضب ہوگیا، شمع سامنے رکھی ہوئی ہے۔ رعبِ محفل سے میں کانپ رہا ہوں۔ شعرا کی صفوں سے آوازیں آ رہی ہیں" بسم اللہ، صاحب زادے بسم اللہ "۔ لیکن صاحب زادے کا دَم نکلا ہوا ہے۔ کیا مجال کہ منہ سے ایک حرف بھی نکل سکے ـــــ اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں، پڑھتے کیوں نہیں، پٹھان کا بیٹا تو بارہ برس کی عمر ہی سے رن میں تلوار چلانے لگتا ہے ـــ اور ایک تم ہو کہ تم سے غزل نہیں پڑھی جا رہی ہے "۔ اب میرزا محمد ہادی صاحب رسوا، اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پہلو میں آ گئے ہیں، اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں " صاحب زادے، آپ تو شاعر، شاعر کے بیٹے، شاعر کے پوتے، اور شاعر کے پَرپوتے ہیں، پڑھیئے اور گرج کر پڑھیئے ـــ اب بڑی ہمت کر کے، میں مطلع پڑھ رہا ہوں، مطلع پر داد مل رہی ہے! اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں۔

اے نسیمِ صبح کے جھونکو، یہ تم نے کیا کیا
میرے مستِ خواب کی زلفیں پریشاں ہوگئیں

اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پا رہا ہوں ـــ اور، ولولے کے ساتھ دوسرا شعر سُنا رہا ہوں ؎

میری آنکھیں، جانتی ہیں، کربِ افراطِ خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہوگئیں

اب داد کا غُلغلہ زیادہ بلند ہو رہا ہے۔ اور " سبحان اللہ، ماشاء اللہ " سے مشاعرہ گونج رہا ہے۔ اور میرزا محمد ہادی رسوا، حضرتِ صفؔی سے کہہ رہے ہیں " مولانا، دیکھئے آپ نے اس شعر کے تیور، یہ عمر اور اتنی گہری بات ـــــ اور اب میں آخری شعر پڑھ رہا ہوں۔

ہائے میری مشکلو، تم نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دل جمعی کا عالم تھا کہ آساں ہوگئیں

دیکھئے چھتیں اُڑ رہی ہیں اور ڈھویع پار ہو رہے ہیں اس شعر کی داد سے ـــــ اور

اساتذہ فرما رہے ہیں" اللہ نظرِ بد سے بچائے "۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا، گھر آیا، خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی ـــ اور سو گیا تو خواب میں رات بھر یہ دیکھتا رہا کہ پریاں، بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

غُسل مجھ پر واجب ہو گیا ـ صبح اُٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر، جب اپنے باپ کی خواب گاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا، تو باپ کی آواز آئی "اِدھر آیئے جنابؔ[1] " دَم نکل گیا اس آوازِ غضب سے ـــ اور جب، لرزتا ہوا ـــ ان کی خواب گاہ میں گیا تو انھوں نے، بڑی بھاری آواز میں، ارشاد فرمایا " دیکھئے صاحب! یہ میری دِلی تمنّا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں، پھُولیں، عمرِ مسیح و خضر پائیں، آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے، آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گُنا فزوں ہو جائے، آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے ـــ مگر کان کھول کر سُن لیجئے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری[2] میں بھی بڑھ جائیں ـ رات کے مُشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی، اب آپ کا، میرے ساتھ مشاعرے جانا بند ـــ قطعیً بند ـــ غضب خدا کا، باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے، میں یہ اُلٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے گا ـ سُنا خاں صاحب آپ نے ؟؟

میرے باپ میرؔ کو غالبؔ پر ترجیح دیتے، ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے، اور داغؔ کے اس شعر پر عامل تھے

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو   جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں اپنی ایک غزل اِصلاح کے واسطے پیش کی ـ جس میں جا بجا فارسی ترکیبیں تھیں ـ اور ایک مصرع تھا۔

" ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے "

انھوں نے، تیوریوں پر ڈال کر ارشاد فرمایا کہ " سبحان اللہ ' یعنی وفائے رازداں تک

---

[1] غصّے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جایا کرتا تھا۔ [2] غالباً سچ کہا گیا ہے کہ ART IS SELFISH

ہے، اس "یعنی" کی داد نہیں دی جا سکتی ــــ مجھے اس بات کا شدید خوف ہے کہ تم کچھ دن میں ـــ "شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا" تک آ جاؤ گے۔ ناصاحب میں تمہیں اصلاح نہیں دوں گا۔ اور تمھیں عزیز صاحب کے سپرد کر دوں گا۔ وہ بھی "یعنی و فائے راز داں" اور "شمارِ سبحہ" کے برتنے والوں میں سے ہیں۔ دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا ــــ یہ فرما کر، انھوں نے عزیز صاحب کو بلا کر، مجھے ان کا شاگرد بنا دیا ــــ اور یہ سلسلۂ تلمذ پانچ چھ برس کے اندر ہی منقطع ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرتِ عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے ــ اور جہاں تک کہ زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے، ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور اور ہم دونوں کی تخئیل ایک ہی سمت سفر نہیں کر رہی ہے۔ اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور اُبھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو میں نے اِصلاح لینا ترک کر دیا۔

لیکن اس سے میرے اور ان کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پا سکی۔ میں ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکاتا، اور وہ ہمیشہ میرے سر پہ ہات پھیرتے رہے۔

ایک دن جب کہ میں بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ میری ماں نے بڑے درد بھرے لہجے میں مجھ سے ارشاد فرمایا "ننھے، تمہارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، میں سوتیا ڈاہ سہ نہیں سکوں گی، مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو، ورنہ میں سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی" ماں کی یہ بات سُن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ "اماں آپ گھبرائیں نہیں، میں آپ کو چھ سات دن کے اندر ہی نانا جان کے وہاں پہنچا دوں گا۔

اس کے بعد میں نے اپنے بڑے بھائی شفیع احمد خاں اور ابرار حسن سے مشورہ کیا اور ہات بٹانے کو کہا ــــ وہ دونوں آمادہ ہو گئے ــــ لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے اور وہ بھی ریزرو کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ہم دو روز تک یہی سوچتے رہے کہ روپیہ کیونکر فراہم کیا جائے، لیکن کوئی صورت

سمجھ میں نہیں آئی۔ تیسرے دن ابرار آئے اور کہنے لگے "کیا کہیں گے آپ بھی، روپے کی ایسی تدبیر سوچ کر آیا ہوں کہ پٹ ہی نہیں پڑ سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں (میرے باپ) اور محمد علی چچا کے درمیان آج کل اَن بَن ہے، آپ اسی وقت ان کے پاس چلے جائیں اور ساری داستان سُنائیں، اور مجھ کو یقین ہے کہ بشیر ماموں کی دل آزاری کے واسطے، وہ کھٹ سے ڈیڑھ دو ہزار روپے دے دیں گے۔

مجھے ابرار کی یہ تدبیر پسند آئی، اور جی کڑا کر کے، محمد علی چچا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور جب ان کی کوٹھی کے لکڑی کے زینے کو طے کر کے اوپر پہنچا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک جڑاؤ سوفے پر بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں، اور ان کے پہلو میں ایک بلا کی نوخیز طوائف بیٹھی گنگنا رہی ہے اور سامنے کے سوفے پر چچا کے مصاحب سکندر میرزا صاحب اس کے گلے کی داد دینے میں سرگرم ہیں۔

یہ سوچ کر کہ بے موقع آ گیا ہوں، میرا دل چاہا کہ اُلٹے پاؤں چلا جاؤں۔ لیکن اس نوخیز طوائف کی صورت اور اس کی آواز نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ اور میں نظر جمائے اور طاقتِ سماعت کو حاضر کیے، اس کی صورت دیکھنے اور اس کا ترنّم سننے لگا کہ، اتنے میں چچا نے حقّے کا ایک لمبا سا کش لے کر، دروازے کی جانب نظر اُٹھائی تو دیکھا میں کھڑا ہوا ہوں، اور حیرت و شرم کے ساتھ، بے ساختہ ان کے مُنھ سے نکل گیا "ارے غلام شبیر[1]" میں نے سلام کیا۔

وہ طوائف اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور میرے دل پر شہابِ ثاقب کی سی لکیر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور سکندر میرزا صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے گئے۔

چچا سے میں نے تمام ماجرا بیان کر کے دو ہزار طلب کیے۔ انھوں نے زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہا، اٹھے اور الماری سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میرے حوالے کر دیے۔ میں نے چچا کو جھک کر سلام کیا، اور اس طوائف کو پھر ایک نظر دیکھ لینے کی

---

[1] میرا پہلا نام غلام شبیر تھا، پھر شبیر احمد ہو گیا، اور بعد کو میں نے اسے شبیر حسن میں تبدیل کر دیا، لیکن چچا مجھ کو ہمیشہ میرے پہلے ہی نام غلام شبیر سے پکارتے رہے۔

تمنا لئے ہوئے گھر آگیا۔

روپیہ آگیا تو ابرار کو لکھنؤ روانہ کر کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹ منٹ کو ریزرو کرا کے ، ملیح آباد منگالیا ، اور شام ہوتے ہی ، مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر ، ہم سب اپنے کمپارٹ منٹ میں آگئے ، اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر کے ، روشنی گل کر دی۔

تھوڑی دیر میں لکھنؤ جانے والی گاڑی آگئی ، اور ہمارا درجہ بریک کے پیچھے لگا دیا گیا۔

ابھی گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ پلیٹ فارم پر میرے باپ کی آواز گونج اٹھی "اسٹیشن ماسٹر صاحب ، کیا اس گاڑی سے میرے لڑکے سفر کر رہے ہیں ؟"

اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دے کر ہم اپنا چکے تھے ، اس نے کہا "خاں صاحب آپکے صاحب زادوں میں سے اس گاڑی میں کوئی سفر نہیں کر رہا ہے"

میرے باپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر سے فرمایا "دو چار منٹ گاڑی رکوا لیجئے ، تاکہ میرے آدمی ایک ایک درجے کو دیکھ لیں ، ممکن ہے آپ کی نظر نہ پڑی ہو"
گاڑی رکوا دی گئی — اور نوکر چاکر اور اقرباء نے پوری گاڑی کھنگال ڈالی ، ہم نہیں ملے ہم تو اندھیرے درجے میں بریک کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کسی ڈھونڈنے والے اور خود میاں نے بھی ، ہمارے ڈبے کی طرف اس خیال سے نظر بھی نہیں اٹھائی کہ ، وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔

گاڑی تقریباً پانچ چھ منٹ تک ملیح آباد اسٹیشن پر کھڑی رہی ، اور ان چند لمحوں کے اندر ہزاروں صدیوں کا مجموعی خوف ہمارا احاطہ کئے رہا — ہم سب اتنی دیر تک سولی پر لٹکے رہے ، میاں کی آواز بجلی کی طرح ہمارے دلوں پر گر رہی تھی ، اور میں اندر سے بھنچی لگی کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب ٹوٹیں ، اب ٹوٹیں۔ مجھ کو اپنے انفاس کی آمد و شد سے ڈر لگ رہا تھا ، پسینے پر پسینے آ رہے تھے ، تمام جسم برابر بھیگتا چلا جا رہا تھا. اور دل یوں کھٹ ، کھٹ ، کھٹ ، کھٹ ، دھڑک رہا تھا کہ ہر بار یہ گمان ہوتا تھ کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا

لہ خدا جانے کس نے مخبری کر دی تھی ، یہ بات آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔

خدا کی قسم، اس وقت اگر ڈائن موت، جبڑا کھول کر سامنے آجاتی کہ میرے جبڑوں میں آؤ گے یا باپ کے قبضے میں جاؤ گے تو میں فوراً اس کے جبڑوں میں گھس جاتا، کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی، سیٹی کی آواز سے دل دہل گیا، پہیوں میں چوں چوں شروع ہوئی گاڑی رینگنے لگی، اوپر کی سانس نیچے آئی، کھڑے رونگٹے بیٹھنے لگے، سانس کا نظام درست ہونے لگا، اور جب کاکوری کے پل پر گاڑی پہنچ گئی تو میں نے جیسے ہی درجے کی روشنی کھولی تو یہ دیکھا کہ میری ماں سجدے میں ہیں، عباسی خانم مغلانی فرش پر اوندھی پڑی ہوئی، آہستہ آہستہ "نادِ علی" پڑھ رہی ہیں۔ اور ابرار اور بڑے بھائی، سیٹوں کے نیچے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی، ابرار نے قہقہہ لگایا، اور بھائی صاحب کے تیوروں پر بل پڑ گئے ـــ اماں، میری بلائیں لینے لگیں ـــ لیکن عباسی خانم، بدستور اوندھی پڑی رہیں ـــ یہاں تک کہ چارباغ آگیا۔

ٹونڈلہ جنکشن پر گاڑی رُکی تو ایک لمبے تڑنگے، بڑی بڑی گچھے دار مونچھوں کے تھانہ دار صاحب، آٹھ دس پولیس والوں کے ساتھ آئے اور بڑے تحکمانہ انداز سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟" ـــ میں نے بگڑ کر کہا "رستمِ دوراں شبیر حسن خاں" سر سے لے کر پاؤں تک اس نے مجھ کو دیکھا اور کہا "میں آپ سب کو یہاں اُتار لینے کے واسطے آیا ہوں" میں نے بھنا کر جواب دیا "کس کی مجال ہے کہ ہم کو اُتارے!" اس نے حکم دیا سپاہیوں کو کہ ان کا سامان اُتار لو، میں، میرے بھائی اور ابرار ڈنڈے لے کر پلیٹ فارم پر کود پڑے، اور میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر کہا "خبردار ہمارے درجے میں قدم نہ رکھنا" اتنے میں ہمارے درجے کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ تھانہ دار نے انگلی بلند کر کے کہا "میں اسباب اتروائے بغیر نہیں مانوں گا" میں نے ڈنڈا زمین پر مار کر کہا "اگر ہمت ہے تو سامان اُتار کر دیکھ لو" تھانہ دار نے کہا "آپ نہیں مانیں گے" میں نے کہا "جب تک زندہ ہوں نہیں مانوں گا" لوگوں کا ہجوم اور ہماری آوازوں کا زور شور اسٹیشن کے انگریز سپرنٹنڈنٹ کو ہمارے درجے کی طرف کھینچ لایا۔ آتے ہی اس نے تھانہ دار سے، انگریزی میں پوچھا "معاملہ کیا ہے ـــ؟"

تھانہ دار نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا کہ "میں ان لڑکوں کے باپ اور نانا کا ملنے والا ہوں، ان کے باپ نے مجھے تار دیا ہے کہ وہ دوسری گاڑی سے یہاں آرہے ہیں، میں ان کے خاندان کو یہاں اُتار لوں۔" ریلوے سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا "گرفتاری کا وارنٹ آپ کے پاس ہے؟" تھانہ دار نے جھینپ اور ڈر کر جواب دیا کہ "یہ باپ اور بیٹوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس میں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے بگڑ کر کہا "آپ قانون کی گرفت میں آچکے ہیں، پولیس افسر ہو کر آپ ایسی خلافِ قانون بات کر رہے ہیں اور وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے سے پبلک مقام پر ــــ آیئے میرے دفتر میں۔"

اس کے بعد، ہمارا درجہ آگرے جانے والی گاڑی میں جوڑ دیا گیا۔ اور ہم آگرے، اور آگرے سے دھول پور پہنچ گئے، اور نانا جان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ ہماری داستان سُن کر میری سوتیلی نانی نے نانا جان سے کہا تم بشیر احمد کے غصّے کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا غضب ناک پٹھان ہے، اسی وقت مہاراجہ کے پاس جاؤ، اور ان سے پورا حال کہہ کے حویلی کے چاروں طرف پولیس کا پہرا بٹھوا دو۔ نانا جان اسی وقت مہاراجہ کے پاس گئے اور حویلی کے گرد پولیس کا پہرا بٹھا دیا گیا۔

دوسری گاڑی سے میرے باپ دھول پور آگئے، لیکن انتہائی دانش مندی کی بناء پر ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے اور اپنے بہنوئی نواب احمد خاں کو جو میرے بڑے بھائی کے خُسر تھے، نانا جان کی حویلی سُن گُن لینے کے لئے روانہ کر دیا۔

نواب پُھپّا نے آکر جب پہرے چوکی کا حال بتایا تو میرے باپ نے نواب پُھپّا سے کہا، میں آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں، گاڑی کو باہر روک لوں گا۔ آپ نواب صاحب کے پاس جائیں۔ میرا سلام کہیں، اگر وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر کوئی دشواری ہی نہیں ہوگی، میرے بُلانے سے اِباء کریں تو آپ حویلی سے نکل کر، ڈیوڑھی کے چبوترے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی نوکر سے یہ کہیں کہ نواب صاحب نے اپنے داماد کو بلایا ہے، وہ پھاٹک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں، انھیں بُلا لاؤ ــــ یہ جادو چل گیا، میرے باپ، نانا کی حویلی میں، پہرے داروں کا سلام لیتے ہوئے داخل ہو گئے۔

نانا جان سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے کہ کھلے ہوئے زینے سے میرے باپ کی پیشانی نمودار ہوئی، نانی نے چیخ مار کر کہا "ارے بشیر احمد، نانا، نانی کی چیخ سُن کر گھبرا گئے ہات لگا تو حُقّہ گر گیا اور چلم ٹوٹ گئی۔ ہم سب لوگ گدّ گدّا کر بھاگ کھڑے ہوئے، اور سامنے کے سنگین کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کُنڈیاں لگا لیں۔ حواس غائب ہو گئے، اور عبّاسی خانم کے پاس سے کھراہند کے بھبکے آنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر میاں نے نانا جان کو جُھک کر سلام کیا، اور اُن کا ہات سینے سے لگا کر روتے ہوئے یہ کہا کہ "بابا آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے عقدِ ثانی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کس نے کان بھر دیئے کہ یہ لوگ مجھ سے بگڑ کر یہاں آ گئے، میں اپنے والدِ مرحوم کی روح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر عقدِ ثانی نہیں کروں گا۔ اور سچّے دل سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کی صاحب زادی اور اپنے بچّوں سے مجھے یہ شکایت مطلق نہیں ہے کہ وہ سب یہاں کیوں چلے آئے۔ اگر ایسی افواہ سُن کر وہ اپنی ماں کی مدد نہ کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ پہنچا دیتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا اور یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے وفادار نہیں، وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں۔"

یہ سُن کر نانا کا چہرہ بحال ہو گیا، میری ماں کو آواز دی کہ اپنے بچّوں کو لے کر یہاں آ جا۔ ہم آئے تو میاں نے ہم سب کو گلے لگا لیا اور فرمایا "میرے گھر کے ڈوبے آفتاب یہاں بل گئے۔ خدا کی قسم میں تم سے ناخوش نہیں ہوں، اور تم نے اپنی ماں کو ریز روگاڑی میں لا کر میری لاج رکھ لی۔ اگر خدانخواستہ عام درجے میں لاتے تو میں زندگی بھر کسی کو مُنھ نہ دکھا سکتا۔

جب ہم سب ملیح آباد آ گئے تو میرے باپ نے میری ماں سے کہا آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے یہ بڑے صاحب زادے یہاں کس شرط پر تشریف لائے ہیں۔ میری ماں نے پوچھا کس شرط پر! میرے باپ نے فرمایا "اس شرط پر کہ میں امانی گنج کا پورا باغ ان کے نام لکھ دوں" میری ماں نے چھاتی پیٹ کر کہا "ہے ہے شفیع احمد، شریف بیٹے باپ سے یہی برتاؤ کرتے ہیں۔"

میرے باپ، قول کے دھنی تھے، دوسرے ہی روز امانی گنج کا باغ بھائی صاحب کے نام لکھ دیا، اور فرمایا "شبیر کل اس کے جواب میں بڑا باغ، جو اس سے آٹھ گُنا بڑا ہے، تیرے نام لکھ دوں گا" میں نے کہا "میاں آپ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام نہیں، اماں کے نام لکھ دیجئے۔ میاں نے میری پیٹ ٹھونک کر کہا "شاباش شاباش تو بڑے دِل کا آدمی ہے ـــ اور دوسرے دن بڑا باغ، میری ماں کے نام لکھ دیا۔[1]

---

[1] میاں کے انتقال کے بعد، جب میری ماں بڑا باغ میرے نام منتقل کرنے لگیں تو میں نے کہا اماں رئیس احمد کو بھی شریک کر لیجئے۔ میری ماں نے ہم دونوں کے نام باغ لکھ دیا، اور ہم کو ہماری نیت کا پھل مل گیا۔

علی گڈھ میں

ایم ۔ اے[2] ۔ او ۔ کالج میں میرا داخلہ

میرا غالباً ۱۹۱۲ء میں وہاں کے اسکول میں داخلہ ہوا تھا ، اور مجھے " ممتاز ہاؤس کے نمبر ۲۴ کمرے میں جگہ دی گئی تھی ۔ اس کمرے میں ، کاکوری کے دو سگے بھائی ثابت علی اور

---

[2] یعنی " محمڈن اینگلو اورینٹل کالج " ۔ یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا ، غلامانہ انگریزی نام ، اس کالج کے بانی ، اُن سید احمد نے رجن کے کاسۂ سر میں " سَر " کے خطاب کا ، ہندوستان شکار عقاب ، اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس تیشۂ زبوں سے تراشا تھا ، جس سے حُبِ وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے جاتے ، اور " عشرت کدۂ پرویز " کی جانب " جوئے شیر " لائی جاتی ہے ۔ اور یہ ، خدا بخشے انھیں خویش دشمن و بیگانہ دوست بزرگ کا موروثی اثر ہے جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے ۔ اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود ، آج بھی اپنے سرکاری محکموں ، تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو ۔ پی ، آئی ، ڈی سی ۔ رائٹرز گلڈ ۔ اور پی ، ای ، سی ، ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر فخر محسوس کر رہے ہیں ۔ اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی ، پی ، عبداللہ ــ اے ، ڈی ، اظہر ــ وائی ، ایف ، مجیب ــ اور ڈبلو ، ڈبلو رحمٰن ۔ کے گندے ٹوکرے لاد لاد کر اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ، ہم غلطوں کو ، فرنگی ۔ یا کم سے کم ' کرسٹان ' ، ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹوئیت پر انگلستان کا گورا پن چھا جائے ۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے ، اس امر پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی جائے کہ مسلمان کا دِل حُبِ وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعیً آلودہ نہیں ہے ۔ (۲) مسلمان کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو یا ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے ۔ (۳) اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی ہی میں خواب دیکھے ۔ (۴) وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ اپنی معاشرت ، اپنی زبان ، اپنے ادب ، اپنے روایات ، اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے لگے ہیں ۔ (۵) اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو کہ حکومتِ برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاجِ روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر ، اور اس نقصان سے ، کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے ۔ لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد " میزان کل " کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہت کم اور گھاٹا بہت زیادہ ہوا ــ اور قلیل سود کا کثیر زیاں احاطہ کئے ہوئے ہے ۔

ثامن علی، پہلے سے موجود تھے۔ اور میرے قیام سے تثلیث پیدا ہوگئی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد، رام پور کے دو سگے بھائی برکت اللہ خان، اور محسن اللہ خاں میرے کمرے میں آگئے — ہمارا وہ " دو سگے بھائیوں اور ایک، دوسرے خاندان کے طالب علم والا" کمرہ، بورڈنگ ہاؤس کے سب پراکٹر مظہر علیم صاحب، فرید آبادی کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ہر چند مظہر علیم صاحب مہربان استاد تھے۔ مگر ایک ناگفتنی علت کی بناء پر ہمارے مابین رقابت پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہ محسن اللہ خاں، عبدالجلیل خاں اور مجھ سے ناخوش رہا کرتے تھے۔

میرے زمانے میں قدیم وضع داری کے مکمل علم بردار نواب وقار الملک سکریٹری، سید احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے، میر ولایت حسین صاحب پراکٹر جن کا تمام کالج احترام کرتا تھا اور جن کی شفقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا سب کے دلوں پر۔

ہمارے دور میں کالج کے ڈاکٹر تھے شفاعت اللہ صاحب، جن کو ہماری شریر پارٹی نے یہ دھمکی دے کر ہموار کر لیا تھا کہ اگر آپ ہم لوگوں کو ہمارے مطالبے پر فرضی بیماری کی چھٹیاں نہیں دلائیں گے اور ہماری فرضی بیماری کے مواقع پر ہمارے پرہیزی کھانوں میں کباب، پراٹھے اور مرغ مسلم، تجویز نہیں کریں گے تو ہم آپ کا نام "ہلاکت اللہ" رکھ کر اس نام کو اس قدر شہرت دیں گے کہ معائنے کے ہنگام آپ جس بورڈنگ ہاؤس میں بھی داخل ہوں گے، وہاں کے در و دیوار " ہلاکت اللہ، ہلاکت اللہ" کے نعروں سے گونجنے لگیں گے۔

اسی طرح ہماری مضبوط پارٹی نے ڈاک خانے والوں کو بھی اس قدر ڈرا دیا تھا کہ جب ہم علی گڑھ سے باہر سیر کرنے جانا چاہتے تھے تو وہ ہمارے گھروں سے بلاوے کے فرضی تار، ہمارے نام بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبدالجلیل صاحب مراد آبادی واجد علی صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے، وہ جب کسی حسین طالب علم کو، ڈھیلے ہات سے تھپڑ مارتے تو اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ ہات پھسلا کر، دونوں آنکھیں میچ لیا کرتے تھے، انھیں

کی فرمائش پر میں نے ایک انگریزی نظم "لارڈ یولنس ڈاٹر" کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ میری غالباً پہلی یا دوسری نظم تھی، جو تلف ہو چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے معلم قاضی صاحب بلا کے ظریف انسان تھے۔ اور ان کا یہ مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان، اُردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ اور ابتدا میں ایک بوڑھا انگریز تھا جو اردو بولنے والوں کے الفاظ، اپنے لہجے میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اور اس کی وہی بیاض انگریزی زبان کا سرمایہ بن گئی۔

وہ کہتے تھے، یہ ڈاٹر، فادر، مدر، سَرنڈر، اور ڈیکوریشن، کے الفاظ دراصل دُختر، پدر، مادر، سَراَندر، اور دیکھو رے شان، سے بنائے گئے ہیں، جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور انگریزی میں طوائف کے لئے جو "پراسٹی ٹیوٹ" کا لفظ ہے، وہ ہماری اردو کے "پرائے واسطے کی" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

میرے دَور کا علی گڑھ، ایسا نہیں تھا، جیسا کہ آج کل کا علی گڑھ ہے۔ اس زمانے کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا، نہ پنجابی، بنگالی تھا، نہ بہاری۔ صوبوں کے تعصُّبات کی کسی کو خبر ہی نہیں تھی اور جتنے بچّے تھے وہ سارے ایم اے او کالج کے بچے، اور آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے مابین اس قدر مضبوط اتحاد تھا کہ سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی ہماری۔ اور یہاں تک پولیس بھی لرزہ براندام رہتی تھی ہم سے۔ اور اگر کسی لڑکے پر کوئی آنچ آجاتی تھی تو سارا کالج دوڑ پڑتا تھا اس کی امداد کے واسطے۔

اپنی پارٹی کے تمام ارکان کے نام مجھ کو یاد نہیں رہے ہیں۔ پٹنے کے سیّد عباس علی سیّد مبارک علی رام پور کے، محسن اللہ خاں جوار علی گڑھ کے، عبدالجلیل خاں کے نام فراموش نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی حافظے میں محفوظ ہے کہ اس پندرہ بیس لڑکوں کی ٹولی کے سردار تھے عبدالجلیل خاں، اور اُن کے نائب تھے محسن اللہ خاں۔

ایک بار، جب ہم پانچوں لڑکے، یعنی عباس علی، مبارک علی، محسن اللہ، عبدالجلیل، اور میں، سالانہ امتحان میں پاس ہو گئے تو ہم لوگوں میں یہ مسکوٹ ہوئی کہ پاس ہونے کی خوشی میں، آگرے جا کر دِوالی دیکھیں۔

لیکن اس عیّاشی کے واسطے روپیہ کہاں سے آئے ؛ اور چھٹی کیونکر ملے ؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ عباس علی نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب اپنے اپنے باپوں کو خط لکھ لکھ کر اپنے اپنے پاس ہو جانے کی خوش خبری سُنائیں اور نئے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست بھیج بھیج کر اپنے اپنے گھروں سے پان پان سو روپے منگائیں — یہ تجویز بچوں نے بہت ہی پسند کی۔ سب نے اپنے اپنے باپوں کو اسی مضمون کے خط بھیجے، میں نے بھی اپنے باپ کی خدمت میں اپنا خط روانہ کر دیا۔

مجھے خط لکھے جب چھ سات روز ہو گئے، تو ایک دن دیکھا کہ داروغہ اُمید علی چلے آرہے ہیں، انھیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ، ہو نہ ہو دال میں کچھ کالا ضرور ہے داروغہ صاحب، کمرے میں آئے، میں نے سلام کیا، سب کی خیریت پوچھی اور ان کے آنے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے کہا "خاں صاحب منی آرڈر کر رہے تھے، مگر بڑے بھیا (میرے برادرِ بزرگ) نے کہا کہ تم کسی کے ہات براہِ راست ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیج دی جائے میں سَن سے ہو کر رہ گیا، لیکن چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ اور محسن اللہ کے پاس جا کر، جو اس وقت جلیل کے کمرے میں گئے ہوئے تھے، سارا ماجرا بیان کر دیا محسن، تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد، آئینہ دیکھنے لگے، میں نے کہا ماشاء اللہ میں مصیبت میں گھرا ہوا ہوں اور تم آئینہ دیکھ رہے ہو"۔ انھوں نے مسکرا کر کہا "تمہاری مشکل حل کرنے کے لئے ہی آئینہ دیکھ رہا ہوں"۔ میں نے کہا "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"۔ انھوں نے کہا "تم تو چُغد ہو، میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ میں آئینے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کی طرح خوب گورا چٹا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی سے میری آنکھیں بھی انگریزوں کی طرح کرنجی ہیں"۔ میں نے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو؛ کیا گھانس کھا چکے ہو؟" انھوں نے کہا "تم بھی کتنی موٹی عقل کے آدمی ہو — جاؤ کمرے سے میرا کالا سوٹ، میرا بوٹ، ٹائی اور ہیٹ لے آؤ، مگر اس طرح کہ کوئی نہ دیکھنے پائے"۔ میں نے ان سے پوچھا "کیوں؟" انھوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "خاموش، وقت ضائع نہ کرو، اور جو چیزیں میں نے کہی ہیں جلدی سے لا دو"۔ میں ان کا سب سامان لے آیا۔ انھوں نے جلدی جلدی سوٹ پہنا

اور سر پر ہیٹ لگا کر کہا "آؤ میرے ساتھ۔" میں سٹپٹا گیا گیا، اور ان کے ساتھ ہو لیا۔۔ وہ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برآمدے میں داخل ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر کے چپراسی سے کہا "ہم اس وقت ایک مذاق کرنے آئے ہیں، ابھی ہیڈ ماسٹر کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے، تم مجھ کو اجازت دے دو کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ جاؤں اور جب شبیر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر یہاں آئیں تو اس کو دروازے پر روک کر میرے پاس آؤ اور پھر کمرے سے نکل کر اس آدمی سے کہو، چلئے صاحب بہادر کے پاس۔" یہ کہہ کر محسن نے چپراسی کے ہات پر پانچ روپے رکھ دیئے۔ چپراسی نے بات مان لی اور محسن ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ اور میں دوڑتا ہوا ممتاز ہاؤس گیا اور داروغہ صاحب کو لے کر آگیا، چپراسی نے حسبِ ہدایت اندر جا کر اطلاع کی، اور باہر نکل کر داروغہ صاحب سے کہا "چلئے صاحب بہادر کے پاس۔"

داروغہ صاحب نے ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا، اور جیب سے میری فرستادہ فہرستِ کتب اور پان سو کے نوٹ نکال کر ہیڈ ماسٹر کی میز پر رکھ دیئے اور پوچھا "حضور اس رقم میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہو گی؟۔" "ہیڈ ماسٹر" صاحب نے کہا "وِل یہ رُکم (رقم) ایک دم (بالکل) برابر (صحیح) ہے، اچھا، کھان صاحب سے ہمارا سلام بولنا۔۔۔ اَب آپ جائیے۔"

داروغہ امید علی، سلام کر کے میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ اور جیسے ہی میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اُترنے لگا تو یہ دیکھا کہ سچ مچ کا ہیڈ ماسٹر، تیز تیز قدم رکھتا چلا آرہا ہے اور جھوٹا ہیڈ ماسٹر غسل خانے کے دروازے سے نکل کر، منہ رومال سے ڈھانکے، انتہائی بزدلی کے ساتھ دوسری طرف بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ تڑاتڑ، تڑاتڑ۔

ہماری چند گفتنی شرارتیں بھی سُن لیجئے ورنہ ناگفتنی شرارتیں لکھ دوں تو کتاب ہی ضبط ہو جائے

(۱) ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوجھی کہ، چھت کے روشن دان سے، مظہر علیم صاحب کے منہ پر پیشاب کیا جائے۔ چناں چہ، رات کے بارہ بجے، ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے، اُن کے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا، ہم نے جب یہ دیکھا کہ عین روشندان

کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے، تو ہم دونوں نے بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے اپنے پائے جامے کھولے اور نشانہ باندھ کر، شر شر اُن کے منہ پر دھاریں مارنے لگے۔ سوتے میں ان کے منہ پر جب گرما گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں، وہ چیخ مار کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور روشن دان کی طرف سر اُٹھا کر چیخنے لگے "ارے یہ کون بدمعاش ہے ارے یہ کون بدمعاش ہے — چوکی دار، چوکی دار، چوکی دار" وہ دروازہ کھول کر باہر آگئے اور پھر اُسی طرح چیخنے لگے۔ "چوکی دار، چوکی دار، چوکی دار" چوکی دار دوڑا آیا، تو اُنھوں نے کہا "یہ کون بدمعاش چھت پر چڑھا ہوا ہے — جاؤ اُوپر جاکر دیکھو" یہ شور سُن کر ہم دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر، برآمدے میں آگئے، اور اپنے صیدِ زبوں سے بڑی معصومیت کے ساتھ ہم نے پوچھا "کیا ہوا ماسٹر صاحب؟" انھوں نے دانت پیس کر کہا "اس 'کیا ہوا' کا صبح کو مزا چکھادوں گا۔"

صبح، سید ولایت حسین صاحب، پراکٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی۔ پراکٹر صاحب نے، خشونت کے ساتھ بید اُٹھا کر پوچھا "صاف صاف بتادو یہ حرکت تم نے کی تھی؟ یا کسی اور نے، اگر جھوٹ بولے تو کھال کھینچ لوں گا" محسن نے کہا "خدا کی قسم ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرارت تھی کس کی۔ ہم دونوں بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ شور ہوا تو ہماری آنکھ کھل گئی باہر آکر ماسٹر صاحب سے پوچھا، کیا ہوا؟ تو وہ، خواہ مخواہ، اُلٹے ہم پر برس پڑے، آپ ہم کو چاہیں تو ماریں، آپ ہمارے باپ کے برابر ہیں، مگر قصور ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ سب پراکٹر صاحب ہم پر مُفت کا اِلزام لگا کر ہم کو پٹوانا چاہ رہے ہیں۔"

میر صاحب بڑی کشمکش میں پڑ گئے، سر جھکا کر سوچنے لگے، اور کہا "اچھا تم دونوں جاؤ، میں پوری تحقیقات کر دوں گا۔ اور اگر تمہاری خطا ثابت ہو جائے گی تو اس قدر ماروں گا کہ تم دونوں عمر بھر یاد رکھو گے" اور ہم دونوں دل ہی دل میں "رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گزشت" کہتے اپنے کمرے میں آئے، اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب ہنسے — یہ خبرِ مسرت اثر سُن کر، شام کو جلیل ہمارے کمرے میں آئے، ہم دونوں کو مبارک باد دی — ہم سے کہا "تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ" ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو

انھوں نے، ہماری کرسیوں کے عین نیچے لوبان سُلگاکر ہماری گردنوں میں ہار ڈال دیئے۔ اور "ہپ ہپ ہُرا" کہنے لگے۔

(۲) ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کے وقت، ہم لوگوں کو بُلانے کے واسطے، ڈائیننگ ہال کے دروازے پر گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ ایک روز، جب رات کے آٹھ بج گئے اور ڈائیننگ ہال کا گھنٹہ نہیں بجا تو تمام لڑکے پریشان ہو گئے اور ڈائیننگ ہال کے برآمدے اور صحن میں جمع ہو کر شور مچانے، اور عرب لڑکے" روتی، روتی، روتی، (روٹی، روٹی، روٹی) کے نعرے لگانے لگے۔

اس ہنگامے کو سُن کر ہمارے اور درمیانی گوشے کے دونوں سب پراکٹر مظہر علیم صاحب اور فصیح الدین صاحب بھی وہاں آگئے اور چوکی دار سے پوچھنے لگے" گھنٹہ کہاں ہے۔؟" چوکی دار نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا" صاحب یہاں گھنٹہ لٹکا رہتا تھا، نہ جانے کون اُڑا لے گیا" اس پر فصیح الدین صاحب نے مظہر علیم صاحب سے کہا" یا مظہر العجائب گھنٹہ غائب"

مظہر علیم صاحب نے چونک کر کہا" جلیل کہاں ہے؟" ہر طرف جلیل، جلیل، جلیل، کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ جلیل ہوتے تو بولتے۔ مظہر علیم صاحب نے چوکی دار کو حکم دیا کہ جلیل کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

چوکی دار نے آکر کہا" وہ تو نماز کے ہال میں بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں" مظہر علیم اور فصیح الدین حیدر صاحب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جلیل سجدے میں پڑے ہوئے ہیں، اور اسی عالم میں کوئی چیز، اپنے کمبل میں لپیٹ رہے ہیں۔ مظہر علیم نے کمبل کا سرا پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا، اور گھنٹہ بڑی جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا، یہ دیکھتے ہی مظہر علیم نے سر بسجود جلیل کے سر پر تڑاق سے ایک ٹیپ مار کر کہا" اُٹھ کھڑا ہو مردود" جلیل نے، دفعتہً کھڑے ہو کر چیخ ماری کہ یہ ہے اسلامی اسکول، جہاں عین سجدے کے وقت نمازی لڑکوں کے سر پر ٹیپیں ماری جاتی ہیں" یہ سنتے ہی مظہر علیم چانٹا تان کر جلیل کی طرف جھپٹے اور عرب لڑکے بھی آگئے مارنے کے واسطے جلیل نے یہ رنگ دیکھا تو

اِلا اللہ کہہ کر ایک لانبی جست لگائی اور چکارے کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہال سے ، اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے کہ انھیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکا۔

(۳) علی گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ ایک رات کو جب ہم پیشاوری پراٹھے کباب اور خورجے کی چٹنی کھا کر نکلے تو ہماری چنڈال چوکڑی ایک، چاکو چھری بیچنے والے دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی ـــ نمائش کی تیز روشنی میں چھریاں اور چاکو ایسے جگمگ جگمگ ہو رہے تھے کہ میرا جی چاہا کہ میں انھیں بڑھ کر سینے سے لگالوں ۔ میں نے پٹھان دکان دار سے پوچھا تو اس نے کہا "ایک رُپیا، چار آنا" محسن نے کہا "نہیں ، دس آنا" پٹھان نے کہا "نائیں ، ایک رُپیا ، چار آنا، خوشی چاہے ٹیک (TAKE) خوشی چاہے تو نہ ٹیک (TAKE)"

ان آوازوں کو سُن کر، کالج کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرف آگئے ، اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ، دُکان کے سامنے ـــ محسن نے پھر کہا "دس آنا ، دس آنا" پٹھان نے پھر وہی جواب دیا "نائیں نائیں ، ایک رُپیا چار آنا، ایک رُپیا چار آنا، خوشی چاہے ٹیک ، خوشی چاہے نہ ٹیک" یہ سُن کر محسن برافروختہ ہو گئے ، تمام لڑکوں سے اشارہ کر کے کہا غازیو ، بڑھو ، ٹوٹ پڑو اور لوٹ لو مالِ غنیمت کو" یہ دعوتِ عام سُن کر ٹوٹ پڑے تمام لڑکے چھریوں چاکوؤں پر، پٹھان جھپٹا ، لڑکوں نے اسے دبوچ لیا ، اور لٹنے لگی دُکان دھڑا دھڑ۔ پٹھان نے پولیس پولیس، پولیس کے نعرے لگانے شروع کر دیئے ـــ پولیس والے جھپٹ پڑے ۔ ہم نے چھریاں تان لیں ، وہ ٹھٹک گئے ۔ اتنے میں ایک شامت کا مارا انگریز پولیس افسر، موٹر سائیکل پر بیٹھا اُدھر آ گیا ـــ اور جب اس نے ، موٹر سائیکل سے ایک پاؤں اُتار کر ہم کو ڈانٹنا شروع کر دیا تو ٹوٹ پڑے ہم سب اس پر اور اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا ـــ اور ہم سب کے سب مالِ غنیمت لئے اور "خوشی چاہے ٹیک ، خوشی چاہے نہ ٹیک" کے نعرے لگاتے وہاں سے بھاگ کر کالج آگئے۔

(۴) ایک روز میرے ایک لکھنوی دوست اور میرے دوست پرنس میرزا عالم گیر قدر

کا بھائی جہاں گیر قدر ہمارے پاس آیا فریادی بن کر، اور کہنے لگا۔" شبیر، ایک فرسٹ ایئر فول لڑکا فضل الٰہی ہے، وہ سالا اپنے حُسن پر اس قدر مغرور ہے کہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا، پیٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا، تمہاری پارٹی ماشاء اللہ بڑی تگڑی ہے، اس کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارا غلام ہو جاؤں۔"

ہماری پارٹی، لنگر لنگوٹ کس کر جہاں گیر قدر کی مدد کے واسطے آمادہ ہو گئی۔ اتوار کے دن جہاں گیر قدر کو دولھا بنا کر، اور ہار پھول، ڈوپٹہ مصنوعی داڑھی اور ڈھولک لے کر ہم دس پندرہ لڑکے براتیوں کی طرح، یکّی پارک پہنچ کر، فضلِ الٰہی کے کمرے میں مبارک باد، مبارک باد کے نعروں کے ساتھ درّانہ گھس پڑے، فضلِ الٰہی نے ۔ جس کے متعلق 'ساری دنیا اِک طرف، فضلِ الٰہی اک طرف' کا غلغلہ ہر طرف بلند تھا۔ تیوریوں پر بَل ڈال کر کہا۔" میں نے تو آپ لوگوں کو نہیں بُلایا تھا؟" ___ جلیل نے کہا۔" دُلھنیں بھی کسی کو بُلایا کرتی ہیں جَنیا، ہم جہاں گیر قدر دولھا سے تمہارا نکاح پڑھانے آئے ہیں۔

اس لڑکے نے کوشش کی بھاگ نکلنے کی، ہمارے ساتھیوں نے اسے پکڑ لیا، ڈوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا، جہاں گیر قدر کو ہار پھول پہنائے، جلیل نے جیب سے مصنوعی داڑھی نکال کر منہ پر لگالی اور قاضی بن کر اس لونڈے کا جہاں گیر قدر سے نکاح پڑھا دیا، اور اور نکاح پڑھا دینے کے بعد، ساتھیوں نے ڈھولک بجا بجا کر نیچے سروں میں شادیانے گانا شروع کر دیئے۔ برآمدے میں لڑکوں کا میلا لگ گیا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔

اتنے میں کسی نے یہ دیکھ کر کہ ہیڈ ماسٹر راؤنڈ لگاتا چلا آرہا ہے، ہم کو آگاہ کر دیا ہم سب خوف زدہ ہرنوں کے مانند بھاگ کھڑے ہوئے ___ اور دولھا میاں ابھی اُٹھ ہی رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر سر پر آپہنچا ___ فضلِ الٰہی نے اُس سے فریاد کی۔ اس نے جہاں گیر قدر سے پوچھا" تم کون ہو؟" ___ جہاں گیر قدر کی زبان سے گھبراہٹ میں نکل گیا" SIR I AM BRIDE GROOM " (جناب میں دولھا میاں ہوں) ___ ___ ہیڈ ماسٹر نے" دِل مسٹر برائڈ گردم، دِل مسٹر برائڈ گردم" کہہ کہہ کر بید وں پر دُھر لیا۔

براتی تو صاف بچ کر نکل گئے، اور بے چارے برائڈ گرڈم[1] صاحب پٹ گئے — اور اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر، ہم تینوں لڑکوں، یعنی محسن اللہ خاں، عبدالجلیل خاں اور آگے چل کر حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خاں کو بھی اسکول سے نکال دیا گیا ع

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

لہ میرزا جہاں گیر قدر کراچی میں رہتے تھے، صد حیف کہ دو مہینے ہوئے کہ بچاسی چھیاسی برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اِس کم بخت دنیا میں دولہا بھی مرجاتے ہیں اور دُلھنیں بھی سدھار جایا کرتی ہیں۔

لکھنؤ میں دوبارہ آمد

علی گڑھ سے نکلا تو پھر لکھنؤ آگیا۔ ہاتھ ٹوٹتی ہے تو گلے میں آتی ہے۔ لکھنؤ آکر ابرار اور رئیس کی معیّت حاصل ہو گئی۔ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہو گیا، وہاں سے چرچ مشن اسکول اور چرچ مشن اسکول سے نکل کر، ریڈ کرسچین کالجیئیٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔

کچھ روز تک تو ہم لوگ، لاٹوش روڈ کے اس دو منزلہ مکان میں رہے، جس کو "بڑھیا والا مکان" کہا جاتا تھا۔ پھر چلے گئے راجہ ابوجعفر صاحب کی کوئینس روڈ والی کوٹھی میں اور وہاں سے منتقل ہو کر پھر پہنچ گئے کھجوے[1] کے باغ کی کوٹھی میں۔

کھجوے کے قیام سے مجھے بہت فائدہ پہنچا، ایک طرف تو نارنگی کے باغ میں دوڑ لگاتے رہنے سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی، دوسری طرف مولانا سیّد ناصر حسین صاحب قبلہ، اور اسکول آتے جاتے حضرت پیارے صاحب رشید کی صحبت سے نہایت علمی و ادبی فائدہ پہنچا، اور تیسری طرف میرزا محمد ہادی صاحب رُسوا لکھنوی (صاحب امراؤ جان اُدا) سے میں نے، باقاعدہ فارسی و عربی پڑھنا شروع کر دی، عربی تو آنہ سکی، لیکن

---

[1] کھجوے میں آغائی صاحب کا ایک بہت بڑا نارنگیوں کا باغ تھا۔ اس میں قدیم وضع کی دو کوٹھیاں تھیں ایک کوٹھی میں ہم لوگ رہتے تھے، دوسری کوٹھی میں ناصر حسین صاحب قبلہ کا وسیع کتب خانہ تھا اور ہماری کوٹھی کے نیچے کے حصے میں آغائی صاحب کی لاش رکھی ہوئی تھی جو ایک معیّن مدت کے بعد کربلا بھیجی جانے والی تھی۔

فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہوگئی اور اسی کے ساتھ ساتھ، میری اُردو بھی خوب منجھ گئی۔

اور لکھنؤ آکر میرا بچھڑا محبوب عطا حسین قزل باش بھی مجھ کو دوبارہ مل گیا۔ عطا حسین کی صحبت میں، میری دادی نے جو شیعت کے نقوش میرے دل پر بنائے تھے، وہ اور بھی اُبھر گئے اور جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے بھی میری شیعت میں پختگی پیدا کر دی۔

اب میں برابر مجلسوں میں جانے اور ماتم کرنے لگا ـــ اور میرے خاندان کی اصطلاح میں میری "رافضیت" مُسلّم ہوگئی۔ پھر بھی میرے باپ نے مجھ سے ناخوشی کا مطلق اظہار نہیں فرمایا۔

میرے تبرائی شیعہ ہونے کا تیقن :-

لیکن جب میرے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی کہ میں مقبرۂ جناب عالیہ[۱] کے "جشنِ تبرا" میں بھی شریک ہوا تھا، تو یہ بات ان کو نہایت ناگوار گزری، انھوں نے میرے پھپی زاد بھائی امیر حسن خاں کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ میں تبرا ترک کردوں، انھوں نے کہا "ماموں نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں تک حُبِ آلِ رسول کا تعلق ہے، میں اُس کو جزوِ ایمان ہی نہیں، اصل ایمان سمجھتا اور رسول اللہ کے بعد، حضرت علی کو سب سے افضل مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اصحابِ ثلاثہ پر سبّ وشتم کو برداشت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اس فعلِ بد سے فقط خلفاء ہی کی توہین نہیں ہوتی بلکہ رسالت مآب کے فیضانِ صحبت پر بھی آنچ آتی ہے۔ اور جب میں تبرّے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا تو میرے باپ نے وصیّت نامے کی رُو سے، مجھ کو جائے داد سے محروم فرما کر، فقط سَو روپے ماہانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔

اتنی بڑی جائے داد سے محروم ہو جانے کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور اس کے برعکس میں نے یہ سوچا کہ ناخوش ہو جانے کے بعد بھی میرے باپ نے

---

[۱] یہ مقبرہ گولا گنج میں ہے جہاں تبرّہ بازی کا ایک سالانہ جشن کیا جاتا ہے۔ اور اکابرِ لکھنؤ شریک ہوتے ہیں

میرے نام سو روپے ماہانہ لکھ دیئے، اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ میں کس قدر شفقت کا جوہر ہے۔

سچا خواب یا میرے تحتِ شعور کا فعال اضطراب :-

اس محروم الارث ہو جانے کے کوئی چھ سات مہینے کے بعد، ایک روز دوپہر کے وقت جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی، اور میں کٹرہ ابوتراب خاں (لکھنؤ) کے مکان کے ایک ٹھنڈے کمرے میں لیٹا ہوا تھا، میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں، میں نے کہا "سنتا ہوں کہ اے اللہ میاں جب کوئی تمہاری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو تم اس کی جانب سو قدم بڑھ آتے ہو، لیکن میرے ساتھ تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے، میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے ہو، تمہیں خوش کرنے کے لئے میں نے اپنے باپ کو ناخوش کر لیا، جائے داد سے محروم ہو گیا۔ اور تم مجھ سے یہ بتاتے ہی نہیں ہو کہ میں راہِ راست پر ہوں یا گم راہ ہو گیا ہوں ارے اللہ میاں کچھ تو منھ سے بولو سر سے کھیلو" — دل ہی دل میں یہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

سوتے ہی خواب دیکھا کہ صبح کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی ہے، آسمان سے سونا برس رہا ہے۔ اور میں کسی سواری پر بیٹھا ایسی راہ سے گزر رہا ہوں، جس کے دونوں طرف بڑے گھنے اور شاداب درخت، نسیمِ سحر سے جھوم رہے ہیں اور ہزاروں چڑیاں ان کی شاخوں پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں۔ کہ مشرق کی طرف سے ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نمودار ہوا — میری نظریں، اُس جلوس پر جم کر رہ گئیں — اور جب وہ قریب آگیا تو رئیسِ جلوس کے چہرے کی تاب ناکی دیکھ کر میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں اپنی سواری سے کود پڑا اور جھک کر سلام کیا — رئیسِ جلوس نے میری طرف آنکھیں اُٹھائیں، اُن کی آنکھوں سے کرنیں قطار در قطار نکلیں جو میرے دل میں پیوست ہو گئیں، اور وہ مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک سمت مڑ گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیسی غیر معمولی مقناطیسی شخصیت تھی کہ بے جانے پہچانے مجھ کو اُس نے

اس قدر متاثر کر دیا ــ کہ اتنے میں ایک دوسرا جلوس نمودار ہوا، اور اس عجیب صاحب جلوس کا بھی مجھ پر ویسا ہی اثر پڑا اور وہ بھی میرے سلام کا مسکرا کر جواب دیتا ہوا، اُسی طرف روانہ ہو گیا، جس طرف پہلا جلوس مڑ گیا تھا۔

جب دونوں جلوس نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں یہ بات سوچنے لگا کہ میں ان سے متعارف کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور کیوں نہ اُدھر مڑ جاؤں جدھر یہ دونوں جلوس مڑ گئے ہیں، کہ دفعتہً میری پشت پر کسی نے ہات مارا، میں اُچھل گیا۔ اور مڑ کر دیکھا کہ ایک نورانی چہرے کے بزرگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، میں نے پوچھا " آپ کون ہیں؟" ــ انھوں نے کہا " ابوذر غفاری " میں نے سلام کر کے ان کے ہات چوم لئے اور ان کے روبرو سر جھکا لیا۔ انھوں نے کہا " سر اُٹھاؤ، یہ سر جھکنے کے لئے نہیں بنا ہے میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم کو سرورِ کونین محمد رسول اللہ اور ان کے جانشین مشکل کُشا علی ابن ابو طالب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

یہ سُن کر میرے دل میں فخر کے فوّارے چھوٹنے لگے اور آنکھوں سے مسرّت کے آنسو برسنے لگے اور میں نے پوچھا " میں اپنے رسول اور اِمام کو ڈھونڈنے کدھر جاؤں؟" اُنھوں نے درختوں کے ایک جُھنڈ کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا " دیکھو وہ جو مسجد کا منارہ نظر آ رہا ہے، اسی طرف چلے جاؤ، اللہ کا جواب تمھارا انتظار کر رہا ہے " یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ، اُدھر روانہ ہو گیا۔ اور جب مسجد کے دروازے کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چبوترے کے کنارے آستینیں چڑھائے بیٹھے اور علی مرتضےٰؑ پانی کا ظرف ان کے پاس رکھ رہے ہیں۔ میری آہٹ سُن کر رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے کچھ ارشاد فرمایا۔ (جسے میں سُن نہیں سکا)۔ رسالت مآب کا ارشاد سُن کر وہ میری طرف اس طرح چلے جیسے کوئی مژدہ سُنانے والا چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے، وہ میرے پاس تشریف لائے اور میرے سر پر ہات پھیر کر ارشاد فرمایا " جو ہم سے محبت کرتا ہے، نہ تو اس کی دنیا ہی خراب ہوتی ہے نہ عقبیٰ۔ جاؤ بلندیاں تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔"

یہ خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور دل ، بلیّوں اُچھلنے لگا ۔ کہ بُوالحاظن نے آکر کہا " منجھلے بھیّا ، میاں بلا رہے ہیں " میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اُٹھا ۔ جلدی جلدی مُنہ دھویا اور اپنے باپ کے روبرو جاکر کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ کچھ لکھنے میں مشغول تھے ، قلم روک کر انھوں نے میری طرف نگاہ اُٹھائی ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے ۔ مجھ سے ارشاد فرمایا " بیٹھ جاؤ " میں بیٹھ گیا ، اور وہ پھر لکھنے لگے ۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے ؟ ان کا قلم بڑی تیزی اور انتہائی ولولے کے ساتھ دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا ، اور جب عبارت مکمل ہو گئی تو ، اُنھوں نے ارشاد فرمایا کہ " بیٹا ، یہ جائے داد ایسی کم بخت چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے بھائی بھائی کا گلا کاٹ کر رکھ دیتا ہے ۔ میں نے تجھ کو جائے داد سے محروم کر دیا اور میں نے دیکھا کہ تیرے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی ، اور تیری اطاعت شعاری میں بھی یک سرِ مو فرق نہیں آیا ۔ لے یہ دوسرا وصیّت نامہ ہے جس کی رو سے میری جائے داد میں تجھ کو تیرا پورا حق مل جائے گا ۔ تو بڑے کردار کا آدمی ہے ، اس کردار کا آدمی اگر یہودی یا مجوسی بھی ہو جائے پھر بھی وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے ۔" یہ کہہ کر میرے باپ پر رقّت طاری ہو گئی ، اور رُندھی آواز میں فرمایا " بیٹا ، میں تیرے کردار کے سامنے سر جھکاتا ہوں ۔" یہ کہتے ہی میرے انسان باپ نے ، میرے سامنے سر جھکا دیا ۔ میرے مُنہ سے دفعتاً چیخ نکل گئی ، ارے میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے ، اور جھپٹ کر میں نے ان کے دونوں جوتے اُٹھا کر سر پر رکھ لئے ، سر سے اُتار کر سینے سے لگا لئے ، پھر باپ کے قدموں سے منہ رگڑنے لگا اور میرے باپ نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگے

میرے نکاح کی تنسیخ کا مُقدمہ :-

جب میری شیعیت ، یا یوں کہیئے کہ میری " رافضیت " کا غلغلہ بلند ہو گیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے ، جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا ، اپنے چھوٹے بھائی ، یعنی میرے خُسر کو طلب فرما کر کہا ۔

"غلام شبیرؔ پکّا رافضی بن چکا ہے ۔ تم نکاح کی تنسیخ دعویٰ دائر کر دو ، میں تمھارا پورا پورا ساتھ دوں گا" اور میرے حقیقی چچا نواب محمد اسحٰق خاں نے بھی میرے خسر سے کہا "دیکھو مقیم ، اب پانی سر سے گزر چکا ہے ۔ جب شبیر نے ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنا رکوا دیا تھا اسی دن میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ آج نہیں تو کل وہ ضرور رافضی ہو جائے گا ، اور اب تو وہ کھلّم کھلّا رافضی ہو چکا ہے ، تم تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دو ، میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

میرے خُسر بھولے بھالے پٹھان تھے ، آ گئے بھڑی میں اور دائر کر دیا مقدمہ دَن سے ۔ مقدمہ دائر ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی ۔ اور ملیح آباد سے لے کر ، لکھنؤ تک گونجنے لگا اُس کے چرچوں سے ۔ میرے باپ نے اپنی سُنّتِ جاریہ پر عمل کرتے ہوئے ، پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجۂ اوّل کے وکلا ، یعنی شیخ علی عبّاس ، ظہور احمد ، میرزا سمیع اللہ بیگ ، سَر وزیر حسن ، اور الٰہ آباد کے سَر تیج بہادر سپرو ، اور سر جان جیکسن ، کو پہلے ہی سے اپنا لیا ، تاکہ فریقِ ثانی کو درجۂ اوّل کا کوئی وکیل میسّر نہ آ سکے ۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک ، مسٹر شرغا ، منصفِ شمالی کے اِجلاس پر بڑے زور و شور کے ساتھ چلتا رہا ۔ میرے خُسر کی جانب سے علمائے اہلِ سُنّت کے فتوے پیش کئے گئے تھے کہ "رافضی کافر ہوتا ہے ' اس لئے کسی مسلمان لڑکی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلافِ شریعت ۔

ہماری طرف سے اس کی نظیریں پیش کی گئی تھیں کہ زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک سینکڑوں شیعہ لڑکوں کے سُنّی لڑکیوں کے ساتھ نکاح ہو چکے ہیں ۔ اور اُن کی اولادیں ورثہ پا چکی ہیں ۔ اور کیا اُن تمام شیعہ لڑکوں اور سُنّی لڑکیوں کے سابق نکاحوں کو ناجائز قرار دے کر ، آج یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اُس نوعیت کے نکاحوں سے جو بچے پیدا ہو کر اپنے اپنے باپوں کی وراثت پا چکے ہیں ان کو اولادِ ناجائز ٹھہرا کر ، وراثت سے محروم کر دیا جائے ، اور ان سابق نکاحوں کے مواقع پر علمائے اہلِ سُنّت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت بالکل خاموش رہے اور اس نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ دائر

لے چچا مجھے شبیر حسن کے بجائے ہمیشہ "غلام شبیر" کہا کرتے تھے ۔ اس لئے کہ وہی میرا پہلا نام تھا ۔

ہوتے ہی اسلامی شریعت میں وہ کیا بنیادی انقلاب آگیا ہے کہ آج اس کے خلاف فتوے جاری کئے جا رہے ہیں ؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالشکور صاحب نے سُنیوں اور شیعوں کے درمیان جو منافرت پیدا کرنے کی تحریک چلائی ہے ، یہ تمام غلط فتوے اسی تحریک کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں ۔ ؟؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ ، تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے بھی ان فتوؤں کی تصدیق فرمادی تھی ــــ لیکن ، میں ، آج تک شکر گزار ہوں کہ مولانا عبدالباری صاحب کے چچا شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب ، اور نامی پریس لکھنؤ کے مالک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے میری موافقت میں گواہی دی تھی ۔

جس روز میرے مقدمے کی پیشی ہوتی تھی ، تمام لکھنؤ ٹوٹ پڑتا تھا ، سُننے کے واسطے ــــ اور میرے باپ اور میرے خُسر کے ہمراہ جو تین تین ، چار چار سو جاں نثاروں حامیوں اور گواہوں کا لشکر آتا تھا ، اس سے عدالت کے برآمدے اور صحن میں ایک میلہ سا لگ جاتا چاروں طرف سے خوانچے اور قلفی والے ٹوٹ پڑا کرتے تھے ، اور ہر پیشی پر تقریباً دو تین سو روپے چرندم خورندم پر اُٹھ جایا کرتے تھے ۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز میرے باپ عدالت میں بیان دینے کے واسطے ، اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے تھے ، فریقِ مخالف کے وکیل بشیشر ناتھ صاحب نے عدالت سے کہا تھا کہ "خاں صاحب کے بیان سے پیش تر ، میں یہ بات عدالت کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان کا قدیم نیاز مند ہوں ، اس لئے مجھ کو معلوم ہے کہ وہ اس قدر شیریں بیان آدمی ہیں ، کہ سُننے والے پر جادو کر دیتے ہیں ۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ عدالت ان کی جادو بیانی سے متاثر نہ ہو ، اور وہ تاثر قانون پر حاوی نہ ہونے پائے ۔" یہ سُن کر شرغا صاحب ہنس پڑے تھے ، اور یہ کہا تھا کہ "اب تو میں بڑے شوق سے خاں صاحب کا بیان سنوں گا ۔" اور میرے باپ کے بیان کے اختتام کے بعد شرغا صاحب کے چہرے سے جو تاثرات نمودار ہوئے تھے ،

ان کو دیکھ کر بشیشر ناتھ صاحب نے میرے خُسر کے کان میں کہا تھا "خاں صاحب، اب آپ مقدمہ ہار جائیں گے، بہتر ہے کہ صلح کر لیجئے۔"

مجھے پتا نہیں کہ میرے خُسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا، لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپے صرف ہو گئے تھے

سینٹ پیٹرز کالج آگرہ

ابھی وہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میرے ریڈ کرسچین کالج کے ہیڈ ماسٹر نے یہ مشورہ دیا کہ میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو جاؤں، وہاں سے سینیئر کیمبرج پاس کروں اور سیدھا لندن چلا جاؤں۔

یہ بات میرے دل میں ترازو ہو گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں حساب اور جغرافیہ میں کم زور ہوں ہو یہاں پنپ نہیں پاؤں گا۔ اس لئے سینئر کیمبرج کا پاس کر لینا میرے لئے آسان ہو گا، اور ولایت جانے کا راستہ نکل آئے گا۔

رئیس اور ابرار نے بھی اس مشورے کو پسند کیا، اور کہا ہم بھی آپ کے ساتھ آگرے چلیں گے۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو ابرار نے کہا "بشیر ماموں کے پاس چلنے سے پیش تر، آیئے اس سامنے والی جنّات کی کوٹھری میں چل کر دعا مانگیں کہ بشیر ماموں ہم کو آگرے بھیجنے پر طیّار ہو جائیں۔

جُوتے اُتار اُتار کر، آگے آگے ابرار اور پیچھے پیچھے میں اور رئیس اُس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ ابرار نے کہا "میں دعا مانگوں گا، آپ لوگ "آمین" کہیں گے"۔ اس کے بعد، ابرار نے دونوں ہات اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ، ہم سب کے اچھے اللہ، میں اور شبیر حسن خاں اب تک جو جو گناہ کر چکے ہیں، ان سب کو معاف کر، ہم تیرے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ ابرار نے یہ کہہ کر اپنے مُنھ پر، اور ان کو دیکھ کر ہم دونوں بھی اپنے اپنے منھ پر، تڑاتڑ، تڑاتڑ تھپڑ مارنے لگے۔ اور تھپڑ مار چکنے کے بعد، ابرار نے بڑی لجاجت سے کہا، اے میرے معاف کر دینے والے اللہ، بشیر

ماموں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ ہم تینوں کو آگرے بھیج دیں"۔ ہم دونوں نے "آمین آمین" کے نعرے لگائے۔ اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرے اور پہنچ گئے میاں کے کمرے میں۔ میاں علیل تھے، بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے، ابرار کی طرف آنکھیں اٹھا کر فرمایا "گرُو گھنٹال، کیا کہنے آئے ہو؟"۔ ابرار نے، ہات جوڑ کر سینٹ پیٹرز کالج کے تمام محاسن اور وہاں کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد اس کے تمام مفید نتائج اور پھر ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آنے کے درخشاں امکانات پر دل نشیں تقریر کر کے کہا، یہ ہماری آخری درخواست ہے، اسے مان لیجئے اور ہم کو آگرے بھیج دیجئے ــــ قوان[1] مجید کی قسم، جب ہم بیرسٹر بن کر آئیں گے، آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔

ہماری خوش قسمتی کہ میاں نے یہ درخواست فوراً قبول فرما لی، اور ہماری آگرے کی طیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن دو چار دن کے بعد، جب یہ معلوم ہوا کہ وہ خالصتہً فرنگی کالج ہے، جہاں ہندوستانیوں کو داخلہ نہیں ملتا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور ہم سب حامد علی خاں بیرسٹر کے پاس پہنچے کہ شاید وہ کوئی تدبیر نکال دیں۔ حامد علی خاں نے کہا، اگر ہمارا لفٹیننٹ گورنر سفارش کر دے تو وہاں داخلہ ہو جائے گا۔

میاں نے لفٹیننٹ گورنر سے سفارشی خط لے کر ہم تینوں کو آگرے بھیج دیا، اور ہمارے ساتھ انھیں گونڈے والے نوروز کو باورچی اور علی شیر خاں کو سپاہی کے طور پر ہمارے ساتھ کر دیا۔

آگرے پہنچتے ہی کالج میں ہمارا داخلہ ہو گیا ـــ نانا کا محل چوں کہ کالج سے بہت دور تھا اس لئے "محلہ گھیٹا اعظم خاں" میں ہم نے ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔ اور جی لگا کر پڑھنے لگے۔ ہمارے کورس میں شکسپیر کا ڈرامہ "جولیس سیزر" داخل تھا۔ اور میں اس ڈرامے پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ میرا پروفیسر، یوروپین طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ یہ لڑکا ہندوستانی ہو کر "جولیس سیزر" کے مطالب کو تم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے، اور جب، اس کے متعلق میں اس سے کوئی سوال

---

[1] ابرار کی زبان سے قرآن مجید کے عوض، ہمیشہ "قوان مجید" نکلا کرتا تھا۔

کرتا ہوں تو یہ اس کی ایسی اچھی شرح کرتا ہے گویا اس کے سینے میں شیکسپیئر کا دِل دھڑک رہا ہے۔ اس کالج کے ایک بوڑھے انگریز پروفیسر مسٹر گرین وڈ کو میں نے پرائیوٹ ٹیوٹر کے طور پر رکھ لیا تھا، جو ہر شام کو بیٹھے بیٹھے پی کر آتے، اور دو گھنٹے تک اس خوبی اور ایسی دل چسپی کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے کہ ان کا ایک ایک حرف میرے دماغ کا جزو بن جایا کرتا تھا۔

اُس دَور کی ایک بات پر مجھ کو آج تک حیرت ہے، اور وہ عجیب بات یہ ہے کہ مجھ پر اُس زمانے میں وہ چیز طاری ہوگئی تھی، جس کو دینی اِصطلاح میں "نیک چلنی" اور شاعرانہ اصطلاح میں "بدچلنی" کہا جاتا ہے۔ اور تو اور، میں سینما تک سے مجتنب ہوگیا تھا۔

میرا یہ معمول ہوگیا تھا کہ طلوع سے پیش تر اپنے پڑوس کے ایڈورڈ پارک میں جاتا، موذّن کے حجرے سے اپنے مگدر نکالتا، دیر تک انھیں ہلاتا، اور دیر تک دوڑ لگاتا رہتا۔

اس پارک میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی چھریری انگریز لڑکی بھی آیا کرتی، اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی، اور اکثر پگڈنڈی کے موڑوں پر اس طرح اُدبدا کر دوڑ لگاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جایا کرتے تھے، لیکن میں اس قدر پارسا ہوچکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی — تو وہ زاہدِ خبیث، جس نے میرے دل پر قبضہ کرکے میرے شاعرِ جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا — میری پیٹھ ٹھونکنے لگتا تھا۔

ؔ ان کے منھ سے۔ پڑھانے وقت جب ہلکی شراب کی خوش بو آتی تھی میری طبیعت بگڑ جایا کرتی تھی، اور یہ اُسی کا آج تک اثر ہے کہ بادہ خواری کے وقت جب کوئی بے توفیق میرے پاس آتا ہے، تو منھ اس سے دُور رہتا اور منھ قریب لاکر بات نہیں کرتا — ؔ میرا یہ بدچلنی کا دَور جب ڈیڑھ برس کے بعد ختم ہوگیا، تو میرے شاعر نے واپس آکر اور میرے منھ پر طمانچے مار کر یہ کہا تھا کہ "اے مردود، تو نے جس لڑکی کا دل توڑا تھا، حشر کے دن اس کا ہات ہوگا اور تیرا گریبان"

ایک خوف ناک پیش بینی :-

اس اثناء میں میرے باپ جب ہم لوگوں کو دیکھنے آگرے تشریف لائے اور تین چار دن قیام فرما کر لکھنؤ جانے لگے تو ہم لوگ آگرہ سٹی تک اُنھیں رخصت کرنے گئے ، اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی رینگنے لگی تو دفعتہً میرے دل سے یہ صدا آئی کہ میاں کو جی بھر کے دیکھ لو کہ اب انھیں کبھی نہیں دیکھ سکو گے — یہ خیال آتے ہی میرا سر چکرانے لگا ، اور دل تھام کر ایک قریب کی بنچ پر بیٹھ گیا — رئیس و ابرار گھبرا گئے — نوروز دوڑتا گیا اور پانی لے آیا ۔ میں نے پانی کے دو گھونٹ پیے ، 'اُچھو' لگ گیا ، ابرار نے میری پیٹ پر گھونسے مارے اور رئیس میرا سینہ اور گلا سہلانے لگے ۔ 'اُچھو' سے تو نجات مل گئی ، لیکن اس خیال نے جو کانٹا چبھو دیا تھا دل سے نہیں نکلا ۔ رئیس و ابرار نے پوچھا ، یہ کیا ماجرا ہے ، میں نے اصلی بات نہیں بتائی ، ٹال دیا ۔

اس واقعے کے بعد میں اُداس اُداس رہنے لگا — اور اس کے چھ سات دن کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے باپ[۱] کی لاش محمد علی چچا کی موٹر میں لکھنؤ سے ملیح آباد جا رہی ہے ۔

میرا دل ، اس قدر زور سے دھڑکا کہ آنکھ کھل گئی ، آنسوؤں سے لب ریز آنکھوں سے میں نے گھڑی دیکھی ۔ صبح کے چار بج رہے تھے ۔ میں نیچے آیا ، ابرار اور رئیس کو جگایا ، ابرار سے کہا ، تم پہلی ہی گاڑی سے لکھنؤ چلے جاؤ ، اور میاں کی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کرو ۔

میرے باپ کا انتقال[۲] :-

دوسرے دن تار آ گیا میرے باپ کے انتقال کا — تار بجلی کی طرح مجھ پر گرا — چیخیں مار مار کر میں رونے لگا — رئیس نیچے سے دوڑا آیا ، پوچھا "کیا ہوا ؟" میں نے تار کی طرف اشارہ کر دیا ۔ اس نے فرش پر سے تار اٹھایا ۔ ہم دونوں بھائی لپٹ کر ،

---

[۱] بعد کو پتا چلا کہ بالکل یہی صورتِ حال پیش آئی تھی — [۲] میرے باپ کا انتقال ، بیالیس سال کی عمر میں ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا ۔

دیوانہ وار رونے لگے اور پہلی گاڑی سے ملیح آباد روانہ ہو گئے ـــــ راستے بھر ہمارا کیا عالم رہا، کس کی مجال ہے کہ اسے بیان کر سکے، کان پور اسٹیشن پر جب ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ مانگا، اس وقت پتا چلا کہ فرطِ سراسیمگی میں ہم نے ٹکٹ لیا ہی نہیں، اور پاؤں کی طرف نظر جھکی تو معلوم ہوا کہ ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں میں جوتہ بھی نہیں ہے۔ ٹکٹ چیکر نے ہم کو، سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، اور کہا "صورتوں سے تو آپ لوگ شریف معلوم ہو رہے ہیں، لیکن ....." میں نے اس کی بات کاٹ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ کسی اچھے خاندان کا آدمی تھا، اُس نے کہا "کوئی بات نہیں، آپ لکھنؤ چل کر کیا ٹکٹ کے دام دے دیں گے؟" میں نے کہا "یقیناً" ـــــ لکھنؤ پہنچ کر ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہو لیا ـــــ میں سیدھا اپنے مقدمے کے وکیل ظہور احمد صاحب کے پاس پہنچا، اُنھوں نے ٹکٹ کے دام دے دیئے۔ ٹکٹ چیکر نے رسید دیئے بغیر دام اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اور ظہور احمد صاحب سے مزید دس روپے قرض لے کر ہم رات کی گاڑی سے ملیح آباد روانہ ہو گئے۔

برہنہ پا یتیموں کی مانند

اللہ اکبر، وہ رات ، وہ نالوں سے گونجتی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات — وہ صاحبِ خانہ کے سِدھار جانے کے بعد کی سَرپٹختی رات ۔ وہ ایک لُٹے ہوئے قافلے کی بے قافلہ سالار رات !!

جب اپنے گھر کے اُداس پھاٹک پر نظر پڑی ، اور ، ہر آن شادیانوں سے گونجتے ہوئے صحن سے ، جب نالہ دشیون کی ملی جلی آوازیں سنیں ، دل پر گھَن چلنے لگے — اور جب اس صحن میں ، کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ قدم رکھا ، جہاں شفقتِ پدری کی گھنیری چھاؤں میں میرا بچپن کھیلا کرتا تھا ، تو ایک بہت بڑے کہرام نے میری پیشوائی کی ——
داروغہ امید علی دوڑتے اور چیختے آئے اور مجھ سے چمٹ کر رونے لگے — اور ہماری چیخوں نے بام ودَر میں زلزلہ پیدا کردیا ۔ مکان کے اندر سے بھی ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں — دادی جان کی آواز آئی "بشیر جاگ اُٹھ ، تیرے بچّے آگرے سے آئے ہیں سلام کرنے کو" دادی کی یہ آواز سُن کر ، ایسا محسوس ہوا گویا ذرّوں سے

ے کر تاروں تک ایک عظیم ماتم برپا ہے۔ اور اس کرۂ ارض کے تمام پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیئے گئے ہیں، اور اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے تمام دنیا کے رونے والوں کے آنسو میری آنکھوں میں بھر دیئے گئے ہیں۔ اتنے میں رئیس کی انا دوڑی آئیں، ہم دونوں کو سہارا دے کر گھر لے گئیں۔ دادی اور ماں کی سوگ واری دیکھ کر، دل پر ایسا ناقابلِ برداشت وزن پڑا کہ میں زمین پر گر پڑا، ایڑیاں رگڑنے لگا، گریبان پھاڑ دیا۔ اور چیخ چیخ کر ہائے میاں، ہائے میاں، ہائے میاں، ارے میں کیا کروں، کدھر چلا جاؤں؟ ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھ پر ترس کھائے اور مجھ کو میرے میاں کی قبر میں لے جاکر دفن کر دے ۔ یہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا

میرے مقدمۂ تنسیخِ نکاح کا فیصلہ:-

میرے باپ کی موت کے غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اور میرے نکاح کو جائز قرار دیتے ہوئے عدالت نے مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ 'میں

لہ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ لیکن میرے باپ کی رحلت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن میرا زخمِ دل مُندمل نہیں ہو سکا ہے۔ شر مزاج زندگی کے شدائد و مکروہات کی یورشِ پیہم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس غم کو بھول چکا ہوں، لیکن جب کبھی عمیق تنہائیاں میرے سینے پر زور سے ہات رکھ دیتی ہیں تو میں درد سے تڑپ جاتا ہوں اور سینے کے زخم کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔

کئی مہینے کی بات ہے کہ اخبار نے بتایا تھا کہ فلاں مقام پر ایک سو ساٹھ برس کا کوئی آدمی موجود ہے، اُس وقت، میں نے دل ہی دل میں کہا تھا، کاش میاں کو بھی ایسی ہی طویل زندگی ملتی اور وہ اپنے گودوں کے پالے ہوئے اس بچے کو بوڑھا بھی دیکھ لیتے۔ اگر مسیح مل جائیں تو میں، بچوں کی طرح بلک بلک کر ان سے کہوں، اے میرے اچھے حضرتِ مسیح میرے باپ کو زندہ کر دیجئے:

اگر آں طائرِ قدسی، زِ درم باز آید عمرِ بگزشتہ، بہ پیرانہ سرم باز آید

ارے کوئی نہیں بتاتا، کہ یہ کون ہے جو محبت کے رشتوں میں جکڑے ہوئے بے چارے انسانوں پر موت کو مسلط فرما کر، اور ہمارے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح پرو پرو کر اپنی گردن میں ہار ڈال رہا ہے۔ لاکھوں گھروں کے چراغ بُجھا کر جشنِ چراغاں منا رہا ہے ۔ اور ہماری آہوں کو مضراب بنا کر اپنا ستار بجا رہا ہے؟

بزمِ ترا، شمع و گُل۔ خستگیٔ بوتراب
سازِ ترا، زیر و بم۔ واقعۂ کربلا

چاہوں تو اپنے خسر اور ان کے گواہوں پر حلف دروغی کا مقدمہ بھی چلا سکتا ہوں۔

فیصلہ سُنانے کے وقت، عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، یہی نہیں کہ ہم لوگ ہی آب دیدہ تھے۔ میرے مخالفین اور خود میرے خسر بھی بے حد مغموم و پریشان نظر آرہے تھے۔

مسٹر شرغا حکم سُنانے بیٹھے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے "خاں صاحب کو اس مقدمے کے جیتنے کی بڑی تمنا تھی، کاش میں ان کی زندگی میں ہی فیصلہ سُنا دیتا"۔ یہ سُن کر اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے —— اور مجھ نامراد کو اپنی یہ فتح مندی لاکھوں شکستوں کے پہاڑوں کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہونے لگی میں نے لاکھ لاکھ ضبط کرنا چاہا، مگر ایک دردناک چیخ، میرے منہ سے نکل گئی —— میرے خسر نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگا لیا، اور عدالت کا کمرہ مجلسِ عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

میری شادی، بعد از خانہ بربادی

اس فیصلے کے دوسرے دن حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ، فرنگی محلی، میرے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ "مجھ کو آپ کے والد گرامی کی ناوقت موت کا بے حد افسوس ہے اور اس بات کا بھی ملال ہے کہ میں نے مقدمے میں آپ کی مخالفت کی تھی، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فرنگی محل پر آپ کے جدِ امجد نواب فقیر محمد خاں بہادر کے جو احسانات ہیں، میں انھیں بھول گیا ہوں"۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ محمد مقیم خاں (میرے خسر) اور ان کے گواہوں پر، مقدمہ چلائیں گے کہ نہیں —— میں نے کہا "مولانا اس دن کے لئے خدا مجھ کو نہ رکھے کہ میں مقیم چچا اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلا کر، انھیں جیل بھیجنے کی سعیٔ کروں"۔ مولانا میری یہ بات سُن کر خوش ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا "آپ کی شرافت سے مجھے اسی جواب کی اُمید تھی"۔ —— اس کے بعد بڑی بزرگانہ ملائمیت کے ساتھ مسکرا کر انھوں نے یہ فرمایا کہ "آپ کیا یہ وعدہ بھی کریں گے کہ اپنی بیوی کو شیعہ نہیں بنائیں گے"۔ میں نے کہا "مولانا دین میں اکراہ کو

دخل نہیں ہے ، میں کبھی اُن کو شیعہ ہو جانے پر مجبور نہیں کروں گا ۔[1]

چاہیئے تو یہ تھا کہ باپ کی موت پر میں کم سے کم پانچ برس تک سوگ مناتا — لیکن حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور اس قدر عجلت طلب تھی کہ مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ جلد سے جلد رخصت کی رسم ادا کردی جائے ۔ اس لئے دسمبر ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ۔

میرا سا بدبخت و بدنصیب دولھا کون ہوگا ۔ شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا ، جب کہ میرے باپ کا کفن ابھی میلا بھی نہیں ہوا تھا ۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں — میرے پھاٹک کی شہنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے — میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے ، میرے دل کا خون اُبل رہا تھا — تاشوں کی جھنکار کفِ افسوس مل رہی تھی ، اور مجھ نامراد کی شادی کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا ۔

میں جب ہاتی پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اپنی سسرال کی جانب روانہ ہوا تو یہ دیکھا کہ میرے باپ سامنے کھڑے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں "بیٹا شادی مبارک ہو ، میں نے جان دے کر ، تیرا سہرا دیکھا ہے " اس وقت میں نے اس طرح ہچکیاں روکیں کہ میری پسلیوں میں درد ہونے لگا اور دل سے آواز آنے لگی " ہائے میرے باپ ، ہائے میرے باپ " اور میرے سہرے کی مہکیں میرے سینے پر ڈنک مارنے لگیں ۔

اے متاعِ درد ، در بازارِ جاں انداختہ   گوہرِ ہر سود ، در جیب زیاں انداختہ

تقسیم جائے داد ۔

میری اس تجویز سے میرے بڑے اور چھوٹے بھائی نے اتفاق کیا کہ سرکاری طور پر نہیں ، نجی طریقے سے جائے داد تقسیم کر لی جائے ۔ اور ماتا دین پٹواری کو

---

[1] میری بیوی آج تک سُنّی ہیں ، اور میں نہ شیعہ رہا نہ سُنّی ، اور اب مسلمان بھی ہوں کہ نہیں ، اس کا فیصلہ کون کرے !!

حکم دیا گیا کہ وہ مساوی قسم کی تین چٹھیاں بنا دے جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پٹواری وہ چٹھیاں لے کر آیا، اور ان کو تہ کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا۔ اور ہم تینوں بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے، ایک ایک چٹھی اُٹھالی۔

میں نے اپنی چٹھی کھولی، سمجھ میں نہیں آئی، ابرار کے حوالے کر دی، اور جب اُنھوں نے وہ چٹھی پڑھی تو خوشی سے اُچھل کر کہنے لگے "مبارک ہو شبیر حسن خاں، آپ کی چٹھی سب سے بڑھیا ہے۔" میں نے پوچھا "کس اعتبار سے؟" انھوں نے کہا "آپ کے حصّے میں قلمی باغ آیا ہے۔" میں نے پوچھا "میری چٹھی میں تھانہ بھی ہے؟" ابرار نے کہا "ارے یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اس باغ کی ایک ایک پتّی پر ہزاروں تھانے قربان کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں، باغ کی فصل دس دس بیس بیس ہزار روپے کی، ہر سال فروخت ہوتی ہے۔ تھانے میں رکھّا ہی کیا ہے، اس کی سالانہ مرمت میں اُلٹے آپ کی جیب سے ہر سال پانچ چھ سو روپے جایا کریں گے۔" میں نے کہا "ارے تھانے کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس کی چھت سے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی وجد کرنے لگے۔" یہ سُن کر بڑے بھائی صاحب نے کہا "میں تم کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔ اپنا دل میلا نہ کرو، تھانہ میری چٹھی میں آیا ہے، لو بدل لو۔" یہ سُن کر ابرار نے چیخ مار کر کہا "شبیر حسن خاں، ارے ایسا غضب نہ کر بیٹھیے گا، قرآن مجید کی قسم بڑا غضب ناک قسم کا دھوکا کھا جایئے گا۔" اس بات پر، بڑے بھائی صاحب نے ابرار سے ڈانٹ کر کہا، تم کون ہوتے ہو، ہم بھائیوں کے درمیان ٹانگ اَڑانے والے۔" یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنی چٹھی میری چٹھی سے بدل لی۔ اور ابرار غصے کے مارے وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔

تھڑی تھڑی مچ گئی ملیح آباد بھر میں میری اس حماقت کی۔ لوگوں نے آکر کہا، ارے ہزاروں کی سالانہ آمدنی پر لات مار کر، سالے تھانے کو ترجیح دی، تم کیسے آدمی ہو،" میں نے کہا "بھائی صاحب باغ لے کر نہال ہو گئے اور میں تھانے کے مناظر پاکر باغ باغ ہو گیا۔ ان کو باغ کی چاندی ملی، اور مناظر کا سونا میرے ہات لگا۔"

جب میری یہ بات سُنی تو میرے ایک قرابت دار محمد غنی خاں نے جل کر، جواب دیا کہ، "بھائی شبیر حسن خاں، شعر وٹیر میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم مہاتما تسم کے چوتیے ہو۔"[1]

سرکاری ملازمت کی پیش کش :-

یوپی کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے، انھوں نے ان کے انتقال کی خبر سُنی تو، تار بھیج کر، مجھ کو نینی تال[2] بُلا بھیجا۔ اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا "میں آپ کو بی اے سے مستثنیٰ کر کے، سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا اسپیشل منیجر کورٹ آف وارڈ؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گیا۔ بٹلر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا "وقت کم ہے آپ جلدی انتخاب کریں۔" میں نے کہا "آپ میرے باپ کے دوست ہیں، اس لیے میرے چچا ہیں، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ کو نوکری دینا چاہتے ہیں، مگر میں کوئی سرکاری نوکری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔" بٹلر صاحب نے کہا "آپ سینئر کیمبرج تک پڑھے ہوئے ہیں انگریزی اچھی بولتے اور جانتے ہیں، آپ اس کی پروا نہ کریں آپ بخوبی کام چلا سکتے ہیں۔ جلدی بتائیے آپ ان دو پیش کشوں میں کس کو ترجیح دیتے ہیں۔" میں نے کہا "جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں، میں آپ کی پیش کش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا، مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے، اس لئے میں، آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔" میرا یہ فقرہ سُن کر، بٹلر کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ تن تنا کر کھڑے ہو گئے، اور مجھ سے کہا "باہر آیئے۔" میں سمجھا کہ باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے اور حملہ کیا تو میں پٹھان ہوں ڈروں گا نہیں، تُرکی بتُرکی جواب دوں گا۔

کمرے سے نکل کر وہ مجھے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا "دیکھئے یہ یونین جیک جو اس چھت پر لہرا رہا ہے، جب اس پھریرے کے اوپر سے خون کا دھارا گزر جائے

---

[1] اس "شعر ویر میں تو خیر" کی داد نہیں دی جاسکتی۔ خدا بخشے محمد غنی خاں نے کتنی سچی بات کہی تھی۔
[2] یوپی کے موسم گرما کا پائے تخت

گا، اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا۔" میں نے کہا "جناب والا کو میں اپنا چچا سمجھتا ہوں، اگر گستاخی نہ سمجھئے تو جواب دوں۔" بٹلر نے کہا "دیجئے جواب" میں نے کہا "ہندوستان کی رگوں میں اس قدر خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں فقط ایک ضلع کا خون اس پہریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔

یہ سُن کر وہ اور بھی سُرخ ہوگئے اور کہا "آپ میرے دوست کے لڑکے، اور نوجوان آدمی ہیں۔ اس لئے میں آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں برت سکتا، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کی قوم کا ہر فرد ایک جنسِ فروختنی ہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں پل بھر میں خرید لیتے ہیں،، میں نے کہا میں اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔" انھوں نے غصّے میں آکر، میرے صوبے کے تین نہایت مقتدر آدمیوں کے نام لے کر، مجھ سے کہا کہ ہم آپ کی قوم کے ان تین بڑے آدمیوں کو خرید چکے ہیں۔ آپ ہیں کس خیال میں؟"

ان تین اکابر کے نام سُن کر، مجھ کو پسینہ آگیا، میں گھبرا گیا کہ اب کیا کہوں، لیکن پھر سنبھل کر یہ جواب دیا کہ "کم سے کم مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔ بٹلر یہ سُن کر غصّے میں بھرے، اور مجھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے، اور میں ان سے رخصت ہوئے بغیر گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

گم نام خطوں کی بھر مار:۔

نینی تال سے میں سیدھا ملیح آباد گیا۔ اپنی اور رئیس احمد کی جائے داد — بھائی صاحب کی سُپردگی میں دے کر، رئیس و ابرار سمیت پھر آگرے چلا گیا کہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد، گم نام خطوں کا تانتا بندھ گیا، کہ آپ نے اپنی جائیداد اپنے بھائی کے سُپرد کر کے بڑی خطرناک غلطی کی ہے، وہ آپ کی جائے داد کو خُرد بُرد کر رہے ہیں، آپ کے حصّے کے درخت کٹوا کر اپنے کام میں لا رہے ہیں اور آپ کے اچھے اچھے کاشت کاروں کو اپنے "مُحال" میں بسا رہے ہیں۔ اور آپ کی

آمدنی جو اُن کے پاس ، بطورِ امانت جمع ہو رہی ہے ، اس سے ہات اٹھا لیجئے ، وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گی ۔ اوّل اوّل تو میں نے اُن خطوں کو کوئی اہمیت نہیں دی ، اور یہ سمجھتا رہا کہ جیسی ملیح آباد کے پٹھانوں کی عادت ہے ، وہ ہم بھائیوں کو لڑا کر اپنا اُتو سیدھا کرنا چاہ رہے ہیں ۔

لیکن مقیم چچا نے بھی ، جب اسی نوعیت کا خط لکھ کر ، ان گم نام خطوں کی تصدیق کر دی ، تو مجھ کو بڑی تشویش پیدا ہو گئی ۔ اور مقیم چچا کے خط کے ساتھ ، تمام گم نام خط بھی ابرار کو دکھا دیئے ۔

خطوں کو پڑھ کر ابرار نے کہا " قرآن مجید کی قسم ان خطوں کا ایک ایک حرف صحیح ہے " اتنا کہہ کر ابرار اپنے منھ پر طمانچے مارنے لگے ۔ میں نے پوچھا " یہ کیا کر رہے ہو ؟ " انھوں نے کہا اپنے پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ جب آپ شفیع احمد خاں کے سپرد اپنی جائے داد کر رہے تھے ۔ اس وقت نہ جانے میرا جی کس کوٹھے میں تھا ، اور میری عقل کس بھٹکی میں بند ہو گئی تھی کہ میں نے اس وقت آپ کو اس فعل سے نہیں روکا "

اپنی اس کوتاہی پر مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی ۔ سنتے ہیں کوئی طوائف کسی شادی کی محفل میں گا رہی تھی کہ ؎

مجھ کو جنگل میں ، اکیلا چھوڑ کر قافلہ ، مضطر ، روانہ ہو گیا

تو یہ شعر سُن کر ایک ہینگ بیچنے والا کابلی پٹھان دھاڑیں مار مار کر رونے اور رو رو کر یہ کہنے لگا کہ جب یہ عورت اتنا زیور پہنے جنگل میں اکیلا رہ گیا تھا اس وخت ہم کہاں جا کر مر گیا تھا کہ اس عورت کو لوٹ نہیں سکا ۔

ملیح آباد کا قیام اور جائے داد کا انتظام ۔

اس کے بعد میں ، رئیس و ابرار سمیت ملیح آباد آ گیا ۔ رئیس و ابرار نے پڑھنے لکھنے کی طرف پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا ۔ رئیس موسیقی میں غرق ہو گئے ، ابرار کورٹ آف وارڈ کے منیجر ہو گئے ۔ میں نے ابرار کے بڑے بھائی خواجہ حسن خاں کو ضلع دار بنا کر اپنی جائے داد ان کی نگرانی میں دے دی ۔ مولانا قدرت اللہ بیگ سے دوبارہ فارسی

پڑھنا شروع کردی، اور شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بطورِ خود مطالعہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں ایک روز میرے برادرِ بزرگ تشریف لائے اور تین دستاویزوں پر مجھ سے دستخط کر دینے کی فرمائش کی۔ میں نے ان پر بے پڑھے دستخط کر دیئے تاکہ بھائی صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز یہ معلوم کرکے، حیرت و عبرت نے میرا احاطہ کرلیا کہ ان دستاویزوں میں دو رسیدیں تھیں اور ایک ہبہ نامہ۔ پہلی رسید تھی میری جائے داد کے ان باون ہزار روپیوں کی جو اُن کے پاس جمع اور ان کے ذمے واجب الادا تھے۔ دوسری رسید تھی ان بہتر ہزار روپیوں کی جو میرے باپ نے لالہ مادھو پور کو بطورِ قرض دیئے اور لالہ صاحب ان کو ادا کرکے، بھائی صاحب سے رسیدے چکے تھے۔ اور تیسری چیز وہ ہبہ نامہ تھا جس کی رؤ سے میں نے تقریباً آدھی جائے داد بھائی صاحب کے نام لکھ دی تھی۔

مقیم چچا اور ابرار نے جب یہ ہَول ناک خبر سُنی ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لکھنؤ چلے گئے اور جب وکیلوں سے مشورہ کرکے آئے تو اُنھوں نے کہا "تم یہ حلف نامہ لگاکر، کہ بڑے بھائی کی مروّت کے دباؤ میں آکر تم نے ان رسیدوں اور اس ہبہ نامے پر، انھیں پڑھے بغیر دست خط کر دیئے تھے، مقدمہ دائر کر دو، اور مادھو پور کو بھی نوٹس دو کہ انھوں نے کُل روپیہ بھائی صاحب کے حوالے کیوں کر دیا جب کہ وہ صرف ایک تہائی کے حق دار تھے — میں نے مقیم چچا اور ابرار کو، ہر چند ٹکا سا جواب تو نہیں دیا، لیکن اس قدر ٹال مٹول کی کہ آخر کار وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں اس اقدام پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

"قصرِ سحر" کی تعمیر[۲]۔

اپنے سوتیلے چچا آصف خاں سے میں نے ؛ ماٹی گنج کے میدان میں، غالباً دو

---

[۱] بھائی صاحب میری فطرت سے واقف تھے کہ میں فرطِ سعادت مندی اور اظہارِ عقیدت میں، آنکھیں بند کرکے دست خط کر دوں گا — [۲] صد حیف کہ میری نادان بیٹی نے اس کوٹھی کو شہید کراکے میرے دل کے ایوان کو ڈھا دیا، میری ایک بہت بڑی یادگار مٹوا ڈالی، اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں، اور اپنے عنفوانِ شباب کی داردوں کو کس جتن سے جگاؤں۔ اے میری بیٹی سعیدہ تو نے میرے دل کو تباہ کرڈالا ع   کرم کردی الہی زندہ باشی !!

بیگھے زمین خرید کر، ایک نہایت خوب صورت دو منزلہ کوٹھی بنوالی، چوں کہ یہ کوٹھی صرف اس لئے بنوائی گئی تھی کہ اس سے طلوعِ سحر کا جمال دیکھوں، اس لئے اس کا نام "قصرِ سحر" رکھ دیا۔

وہ کوٹھی، ملیح آباد اسٹیشن کے قریب تھی، اس کے بائیں طرف، ایک بڑا خوب صورت تالاب تھا۔ اور داہنے طرف ذرا سا ہٹ کر ریلوے لائن تھی۔

میرے تقشّف کا آغاز:-

یہ دنیا ہفت عجائب سے زیادہ، حیرت ناک اور اس کم بخت کے امکانات کا دائرہ کائنات کے دائرے سے بھی وسیع تر ہے۔

ارے ذرا خیال تو کیجئے کہ غالباً ۱۹۲۰ء میں "قصرِ سحر" آتے ہی، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سے مادر زاد معصیّت کار پر دورہ پڑ گیا اور اس چیز کا جس کو نادان "تقویٰ" اور دانا بزدلی کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس تقوے کا ہلکا سا دورہ سینٹ پیٹرز کالج میں بھی پڑا تھا، لیکن اس مرتبہ تو اس میں اس قدر شدّت پیدا ہو گئی کہ میں، بڑی سختی کے ساتھ، نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا۔

نمازوں کے وقت میں کمرہ بند کر کے عود اور اگر سُلگاتا اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا کہ قُرونِ اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے لگتی تھی۔

اور پرہیز گاری کی یہ لے یہاں تک بڑھ گئی کہ قیمتی لباس ترک کر کے، موٹے جھوٹے کپڑے پہننے لگا۔ گوشت کھانا اور چارپائی پر سونا ترک کر دیا اور مجھ پر اس حد تک خدا کا قہر نازل ہوا کہ میں نے داڑھی کی سی چیز بھی رکھ لی، اور بالکل مولوی خدا بخش نظر آنے لگا۔

قیامت ہے کہ سُن، لیلیٰ کا، دشتِ قیس میں آنا
کہا حیرت سے اس نے، یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

ارے کس بے پایاں حیرت کی یہ بات تھی کہ میرا سا دیوانہ کاکل و رخسار، اور سُبحہ و سجادہ

میں گرفتار۔ میرا سا فریفتۂ چنگ وعود اور مشقِ رکوع و سجود ـــ مجھ سا مردِ خوش اوقات اور گرفتارِ صوم وصلوٰۃ۔ میرا سا امیرِ کاخ وکو، اور اسیرِ مسواک و وضو!! تُفو بَرتُو اے چرخِ گرداں تفو۔

کس قدر سچ کہا ہے، میر تقی میر نے ؎

دیر سے اُٹھ کے، کعبے آیا میرؔ جس کو چاہے خدا خراب کرے

میں اس زمانے میں پو پھٹنے سے بہت پہلے بیدار ہوا کرتا، حافظ کا دیوان گُنگُن گنگنا کر پڑھتا، پھر نمازِ فجر ادا کرتا، اور تاروں کی سہاتی چھاؤں میں نکل جاتا امانی گنج[1] کے لق و دق میدان میں، وہاں پہنچ کر چکاروں کی طرح چٹختا، چھلانگیں مارتا، صدر پور[2] کے پودوں کو گلے لگاتا۔ حافظ کے اشعار گنگناتا، درختوں پر چڑھ جاتا، اور پھر ان سے یہ کہہ کر اُتر آتا کہ معاف کرنا، میں نے بڑی تکلیف پہنچائی تم کو۔ اور اسی عالم میں گل رنگ آسمان کی جانب جب نظر اُٹھاتا تو کیا دیکھتا کہ بڑی لانبی لانبی داڑھیوں کے فرشتے، میرے سر پر منڈلا منڈلا کر "سلام علیکم، یا لسان الصباح۔ سلام علیکم، یا لسان الصباح" کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اور فرشتے جب سلام کر کر کے، بلندیوں کی طرف اُڑنے لگتے تھے تو عجیب قسم کی گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چاروں طرف، اور فضا میں تیرنے لگتی تھی یہ آواز ؎

دعائے صبح و آہِ شب، کلیدِ گنجِ مقصود است

بایں راہ و روش می رو کہ با دِل دار پیوندی!

بَیعَت:

اسی زمانے میں کاکوری کے فرشتہ صورت سجادہ نشین حضرت حبیب[3] حیدر شاہ کے ہات پر میں نے بیعت بھی کر لی تھی ـــ سالانہ عُرس کے زمانے میں وہاں بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ دُور دُور سے مُرید اور قوال آتے تھے۔ اور کنھیّا قوال جب

---

[1] اور یہ رسم اب بھی جاری۔ [2] ایک محلہ، جو میرے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔
[3] شاہ صاحب آلِ رسول کے علاوہ اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

گاتا تھا تو در و دیوار جھومنے لگتے تھے ۔ اور تاروں کی ہلکی روشنی اور رات کی چھنتی ہوئی تاریکی میں، جس وقت "آزادوں[1]" کی ٹولی، اونچی اونچی ٹوپیاں اور لانبی عبائیں پہنے، حضرت تراب علی شاہ کے مزار کے روبرو، صفیں باندھ کر حضرت علی کی منقبت میں

اَے بادشاہِ اولیاء مستاں، سلامت می کُنند

گانا شروع کر دیتے تھے تو ایسا نظر آتا تھا کہ حُجتہ الوداع کے موقع پر، رسالت مآب حضرت علیؑ کی مولائی کا اعلان فرما رہے ہیں ۔

---

[1] فقراء کا ایک گروہ جو تمام قیود سے آزاد رہ کر مستانہ زندگی بسر کرتا ہے ۔

روحِ ادب

اُسی دَورِ تصوّف و تقشّف میں، میری سب سے پہلی، سترہ تصویروں والی، مُصوّر تصنیف "روحِ ادب"[1] غالباً میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ سے رفیع احمد خاں کے مقدمے، اور اور حضرتِ اکبر کی رائے کے ساتھ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہو گئی تھی۔

"روح ادب" پر سب سے پہلے تعریفی تبصرہ کیا تھا میرے اُس دَور کے اجنبی اور اِس دَور کے دوست اسرائیل احمد خاں، اور میرے اُس دَور کے مدّاح اور اس دَور کے معترض، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے ـــــ اور سب سے پہلے اعتراض کیا تھا سجّاد انصاری مرحوم نے۔ اس وقت "مسٹر" عبدالماجد "مولانا" عبدالماجد، کی جانب سفر کر رہے تھے اور کفر سے منھ سے موڑ کر، اسلام کی جانب آچکے تھے۔ اور سجّاد انصاری[2] حلقۂ اسلام سے بھاگ کر، کفر کی جانب، اُفتاں و خیزاں چلے جا رہے تھے۔ اور فریقین کے مابین یہ غیر تحریری و غیرِ ملفوظی معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لکھیں، اور ایک دوسرے کے ممدوح پر سب و شتم کریں گے۔

اور چوں کہ مولانا عبدالماجد نے، اپنی محبت کی بناء پر مجھ کو غالب و ٹیگور کی صف

---

[1] اس کتاب پر لاگت آئی تھی چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی تھی تین روپے فی جلد۔ میں نئی قسم کا تھا بیوپاری۔

[2] میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں، حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اور زندہ رہتے تو اردو کے فکری ادب میں بہت اچھا اضافہ ہو جاتا۔

میں بٹھا دیا تھا، اس لئے سجاد انصاری پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ مجھے شیاطین کے زمرے میں شامل کر دیں۔

اُسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرتِ اقبالؔ نے بھی، ایک طویل خط لکھ کر، میری شاعری کی مدح سرائی فرمائی اور دِل کھول کر داد دی تھی۔ اور پنجاب یونی ورسٹی سے "روحِ ادب" کے تین سو نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا ــــ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ، ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ اُنھیں، دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی، اس لئے مجھ کو چاہیئے کہ میں حافظؔ اور ٹیگورؔ کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آجاؤں، اور حافظؔ و خیّامؔ کی طرح تھپک تھپک کر سُلانے کے عوض، انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں"۔

لیکن اس وقت میری تخیئل کا دھارا، بڑے زور و شور سے تصوّف کی پُراسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا، ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ لیکن "شنیدہ اثرے دارد" کے طور پر اُن کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے، مجھ پر اثر کرتی رہی، اور جب چند ماہ و سال کے بعد، میری طبیعت "روحِ ادب" کے مزاج سے مختلف ہونے لگی، تصوّف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا، اور سیاست سے مڑ کر، جس وقت میری شاعری تجسس و تشکّک کی جانب گام زن ہو گئی تو، میرے ناصح حضرتِ اقبالؔ کی شاعری اقوال، روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی ــ اور یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جس تصوّف اور مابعدالطبیعات سے انھوں نے مجھے روکا تھا، اس پر "حرزِ" کا لیبل لگا کر وہ خود اُسی طرف چلے گئے۔ اور عقل کو "بولہب" اور عشق کو "مصطفیٰ" کا خطاب دینے، اور ع

السلام اے عشقِ خوش سودائے ما

کے نعرے لگانے لگے۔

چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے، اور بلا کے ذہین انسان تھے، اس لئے

شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انھوں نے، نٹشے کے "مافوق البشر" کو مشرف باسلام کرکے "شاہین بچہ" بنا دیا۔ قرآن کے مردود لفظِ "عشق" کو آسمان پر چڑھاکر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظِ "عقل" کو خاک میں ملاکر، اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا۔ اور میں چیخ اٹھا۔

چیست، یارانِ طریقت، بعد ازیں تدبیرِ ما؟

میرے تقشّف کا انجام:-

میں نے تقشّف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ مُلّا کی طرح سنیں گے تو مجھ پر ہزاروں صلواتیں بھیجنے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست آدمی کی طرح سنیں گے تو مجھے اُمید ہے کہ کم سے کم، میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر ضرور مجبور ہو جائیں گے۔

وہ ماجرا سُن کر، آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی رَو میں بہہ کر، اور "مصلحتِ خداوندی" پر نگاہ نہ کرکے، میں نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی، پرائے شگون پر ناک کٹائی اور اپنی عاقبت خراب کرلی ہے، لیکن اگر آپ کے سینے میں دل، اور دل میں دردمند انسانوں کی محبت ہے تو آپ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کرسکیں گے کہ ترکِ عبادت میں میری نیت کا فتور یا میرے عدوان کا مادّہ کارفرما تھا۔ اب وہ ماجرا سنیئے۔

میں ایک روز حسبِ معمول امانی گنج کے میدان میں ٹہل رہا تھا۔۔۔ دسمبر کی برفانی ہوائیں، اونی واسکٹ کو توڑ کر سینے میں چبھ رہی تھیں۔ فضا، اپنی کالی کملی کو اوڑھ لینے کے واسطے جھٹک رہی تھی، تھکی ماندی چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں دُور دُور تک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور آفتاب کے ڈوب جانے کی کراہ فضا پر تھرتھرا رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک کوزہ پشت بڑی بی، لکڑی ٹیکتی اور ریلوے لائن کو عبور کرتی ہوئی، انتہائی دردمندی کے ساتھ میری طرف رینگتی چلی آرہی ہیں۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔۔۔ سوچنے لگا کہ یہ چلنے کے

جاڑے، یہ برف میں جُھلا جُھٹپٹا، یہ ہڈیوں کو تراشنے والی ٹھنڈی ہوا، یہ اونگھتا چٹیل میدان اور یہ ضعیفہ؟ — آخر کیا بپتا پڑی ہے ان پر کہ یہ اس وقت گرم سفر ہیں۔ اس وقت تو کتے بھی گھر سے باہر نکلنے کی جراءت نہیں کرتے۔ تیز تیز قدم رکھتا، میں قریب گیا تو یہ دیکھا کہ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہی ہیں اس پر اُن کا ہات کانپ رہا ہے اور ان کے ہات کی لٹکتی ہوئی کھال چلنے میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا "بڑی بی سلام"۔ انھوں نے میرا اسلام سُن کر جُھکے جُھکے "جیتے رہو بیٹا" کہا، اور بڑی دشواری کے ساتھ کمر سیدھی، کرکے پوچھا "بیٹا تم کون ہو؟" میں نے اپنا نام بتایا۔ انھوں نے میرے نام کو اپنے حافظے میں ٹٹول کر، پھر پوچھا "بیٹا، اپنے باپ کا نام بتاؤ؟" اور جیسے ہی میں نے اپنے باپ کا نام بتایا، ان کی بے نور و خشک آنکھوں میں دفعتہً نمی آگئی۔ انھوں نے اپنے دونوں کانپتے ہاتوں کی اُنگلیاں اپنے ماتھے پر چٹخا کر، دُور سے میری بلائیں لیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اور میں نے دردناک آواز میں پوچھا "آپ رونے کیوں لگیں؟" انھوں نے کہا "بیٹا، کیسے نہ روؤں۔ اللہ بخشے میرے خاوند تمھاری ڈیوڑھی کے سپاہی تھے —— اللہ کرے خاں صاحب بہادر (میرے باپ) کی کروٹ کروٹ حوریں ہوں، ان کی سرکار سے عید بقرعید اور شبرات کے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ، جڑاول کے نام سے اِتنا مل جاتا تھا کہ ہم سب چین سے رہتے تھے، ہائے خاں صاحب بہادر کے چھ مہینے کے بعد میرے سرتاج بھی سدھار گئے اور لے دے کر ایک جوان جہان بیٹا تھا سو وہ بھی 'خالی' کے مہینے میں دغا دے گیا"۔ بڑی بی سینے پر ہات رکھ کر رونے لگیں، اور ان کے چہرے کی جُھرّیوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

میں نے کہا "بڑی بی آپ میرے گھر چلیں، مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا آپ کی خدمت کروں گا، اور ہر مہینے خدمت کرتا رہوں گا"۔ انھوں نے کہا "نہیں بیٹا، بختیار نگر[1] میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے، وہ ہر مہینے مجھے سات روپے دیتی ہے، ان روپوں میں میرا

---

[1] ملیح آباد کے ایک محلے کا نام

خرچ پانی چل جاتا ہے ، ایک بوڑھی جان کا پالنا ہی کیا ؛ وہ غیور بڑی بی ، جب ، کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر دور چلی گئیں ، تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں ، اور یہ سوچ کر کہ یہ ہڈیوں کی مالا بڑھیا ، فقط سات رُپلیوں کی خاطر ، ہر مہینے ، ڈگ ڈگ کرتی بختیار نگر جاتی ہے ــ میری سانس گلے میں اُلجھنے لگی ۔ اور اسی درد انگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اس طرف کہ اللہ کے کروڑوں بندے دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ، بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ، یتیم بچے ایک ایک کا منھ دیکھتے رہتے ، بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازے اُٹھاتے ، کم سن بیواؤں کو رنڈسالے پہنائے جاتے ، بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان اور کماؤ بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ، سانپ انسانوں کو ڈستے ؛ درندے ان کی ہڈیاں بھنبھوڑتے ، سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے ، قحط کی شدّت سے مائیں اپنے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں ، وبائیں سیکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں ، زلزلوں کی کروٹوں میں ہزاروں شہر دب دب کر رہ جاتے ، اور آتش فشاں پہاڑ ، بے شمار آبادیوں کو راکھ میں تبدیل کر کے رکھ دیا کرتے ہیں ۔ اور پھر یہ خیال آکر ، میرا سر چکرانے لگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا کا یہ عالم ہے کہ یہاں قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ ناطاقتی کو کچل ڈالے ۔ میری چشم تصور نے یکایک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید ، شمر ، نادر ، نیرو ، چنگیز ، ہلاکو ، مسولینی اور ہٹلر خونِ انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں ، فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں ۔ جواں مرد احتیاط سے تنگ آکر ، بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں ۔ اور بڑے بڑے اکابر ، کوَدن سلاطین کے درباروں میں پیٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں ۔ اور جاہلوں کے دروازوں پر بڑے بڑے علماء کھڑے بھیک مانگ رہے ہیں ــ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا ہے ۔ مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے ــ محمدؐ کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے ۔ اور محمدؐ کے نواسے حسینؑ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا لٹا کر پیاسا ذبح کیا جا رہا ہے ــ اور یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں اس

خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے ــــ جو عادل ہے، حکیم ہے، رحیم ہے، رؤف ہے، رب ہے اور رزاق ہے ــــ اور جو اپنے بندوں سے، ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے ــــ اور اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، اور ٹُک ٹُک دیدم، دَم نکشیدم کے فشار میں گرفتار ہے ـــــــــــــــــ ؟؟ ــ اور ان تمام باتوں پر، ایک سانس میں غور کرنے کے بعد، زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزّاق ہونے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہوگئی۔ اور جھوٹ کیوں بولوں، مجھ کو خدا پر اس قدر غصّہ بھی آگیا کہ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ اگر آس پاس کوئی مسجد ہو تو اُسے آگ لگا دوں ــــ مسجد وہاں تھی ہی نہیں ریلوے لائن کے شوالے پر نظر پڑگئی، میں غصّے میں بھرا، اُدھر گیا، اور شوالے کے دروازے پر کھڑے ہوکر اُول فول بکنے لگا۔

اسی عالم میں گھر آیا، نمازِ مغرب کا وقت قضا ہوچکا تھا۔ نماز کی عادت نے دل میں انگڑائی لی، میں نے کہنی مار کر اس کی انگڑائی توڑ دی۔ اتنے میں باپ کا ایمان لاٹھی چارج کرنے لگا۔ بُرے جی سے وضو کیا، مُصلّے پر نظر ڈالی، دل نے کہا، اٹھا کر پھینک دے اس کو، اب باپ اور دادا دونوں مل کر مجھ پر لاٹھی چارج کرنے لگے ــــ میں نے بادِلِ ناخواستہ نماز شروع کردی، رکوع میں خم ہوا تو وہ کوزہ پُشت بڑھیا سامنے آکر کھڑی ہوگئی، اب خوفِ خدا نے ڈانٹ پلائی کہ جھک جا مردود ــ میں جھک گیا اور جوں توں کر کے کر کے، بوجھل دل کے ساتھ آسمان کو دیکھنے لگا۔

کیا، میرا دماغ کفر کی جانب پرواز کر رہا ہے؟ یہ سوچ کر میں لرز گیا۔ پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا، کیا میں نعوذ باللہ، خدا کے وجود سے انکار کرسکتا ہوں؟ دل نے کہا، نہیں ہرگز نہیں۔

اسی کشمکش کے عالم میں کئی مہینے تک اپنے دل و دماغ کو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ڈنڈے مار مار کر نمازیں پڑھتا، لیکن ع "حالتے رفت کہ محراب، بفریاد آمد" کی سی

کیفیت مفقود ہوگئی۔

بندوں کی درد مندی اور اللہ کی بے مہری کا تصوّر قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا۔ اور اسی تناسب سے میری نمازیں بے لطف، بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ اور میرے ایمان میں اس طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیرگی، مُنھ اندھیرے کی روشنی میں آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس عالم میں جب نماز پڑھتا تھا تو بے شمار انسانوں کی آہیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آوازیں آنے لگتی تھیں۔

کیا وہ نمرود کی خُدائی تھی
بندگی میں، مرا بھلا نہ ہوا

با خداوند، کارے افتادست
کہ سرِ بندہ پروریدن نیست

زندگی اپنی جو اس طور سے گزرے غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایں مپرسید کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت؛
می تُواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

کفن بیاورد تابوت و جامۂ نیلی کُن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

مرا، زمانۂ طنّاز، دست بستہ و تیغ
زند بفرقم و گوید کہ "ہاں سرے می خار"

رونا تو اپنی آنکھوں کا دستور ہوگیا
حق نے تو دی تھی آنکھ، یہ ناسور ہوگیا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتوں مر چلے

چنداں کہ خدا غنیست ، ما محتاجیم

اور ہر بار میرا جی چاہتا تھا ، احتجاج کے طور پر نماز توڑ دوں ــــ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی ۔ آخر کار ، کہاں تک اپنے سے لڑتا ــــ ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا ــــ ایسی نمازیں ، جن میں لب پر آئتیں ہوں اور دل میں شکائیں ، کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں ۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل میں ، دھائیں سے ۔ میری کھوپڑی میں ایک چناخا پیدا ہوا ۔ میری عقل ، میرے سر سے نکل پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو چو یخ دکھانے لگی ــــ اور میں نے جٹ سے نماز توڑ ڈالی ۔ حجرۂ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا ۔ حجّام کو فوراً بلایا ، داڑھی منڈوا دی ۔ موٹے جھوٹے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے ، اچھا لباس پہن لیا ، ٹمٹم منگائی ، آدھ گھنٹے میں لکھنؤ پہنچ گیا ۔ لکھنؤ پہنچتے ہی ، دن دہاڑے ، ایک نازنین کے کمرے پر چڑھ گیا اور گانا سُننے لگا ۔ گانا سُن کر کھانا کھایا ــــ ٹُنڈے کبابی کے کباب نوش فرمائے ، وہیں پڑ کر سو گیا ــــ شام کے قریب ، حمّام کیا ، گویا عقل کا غسلِ صحت ہو گیا ــــ اور آسمان کی طرف ، آنکھیں اُٹھا کر کہا ۔

لو بندگی ، کہ چھوٹ گئے ، بندگی سے ہم

اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گُدگُدی مسہری پر لیٹا تو وہ کُجّو داڑھی کا لبیں ترشا مُلّا جو میرے حجلۂ دل میں آ کر بس گیا تھا ، اپنا مُصلّے اور اپنے وضو کا بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے " تجھ پر خدا کی مار ، اَے مردود " کہتا ہوا چلا گیا ۔ اور اس مُلّا کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر ــ

پس از مدّت ، گزر افتاد ، بر ما ، کاروانے را

کے مانند ہنستا ہوا در آیا ، آتے ہی اس نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں ، اور گانے لگا ــ

مژدہ اے دِل کہ مسیحا نَفَسے می آید   کہ ز انفاسِ خوشش ، بوئے کسے می آید

آغازِ بادہ خواری

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں کہ لڑکپن ہی سے

مجھ کو اُن سے شدید نفرت تھی ۔ ایک تو ، ان میں سے تھی بادہ خواری اور دوسری تھی دروغ گفتاری ۔ دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے، لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا ہوں۔

اس سے پیش تر کہ میں اپنے آغازِ بادہ خواری کا ماجرا بیان کروں ، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادہ خواری و دروغ گفتاری کے باب میں چند نکات پیش کر دوں تاکہ آپ کو میرے نظریات کا علم ہو جائے ۔

جہاں تک کہ بادہ خواری کا تعلق ہے ، میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر چند ، بادہ خواری اب میری زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے ۔ لیکن اگر بدقسمتی سے میں کسی ریاست کا آمر ہو جاؤں ، تو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر شراب کا ساجوہرِ ناب عوام کے لئے زہر اور خواص ، اور وہ بھی دیوتا قسم کے خواص کے واسطے ابِ حیات ہے ، میں اس پر اسلحہ کے لائسنس کے مانند یہ کڑی شرط عائد کر دوں کہ جب تک درخواست گزار — (۱) اس نوعیت کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش نہ کر دے کہ اس کی صحت میں اس قدر دَم خم ہے کہ وہ شراب کی ایک مقدارِ معین کے بار کا متحمل ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی ماہرِ نفسیات کا ، اس مضمون کا صداقت نامہ بھی حاصل نہ کرے کہ درخواست گزار کے مزاج میں تہوّکا اور ، حد سے متجاوز ہو جانے کا میلان نہیں ہے ، اور وہ اس قدر دانا ، پاکیزہ نفس ، اور شریف انسان ہے کہ پینے کے بعد وہ صحت کی پائے داری اپنی اخلاقی و معاشی حالت کی اُستواری ، اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری ، اپنے ذہن کی سالمیت کی بیداری ، اپنے حقوقِ نفس (مع حقوقِ عباد) کی آب یاری ، اور اپنے معاشرے کی پُرسکون ہمواری کو ، باحسن الوُجوہ ، قائم رکھنے کی بدرجۂ اُتم صلاحیت رکھتا ہے ، اس وقت تک اس کے نام بادہ خواری کا لائسنس منظور نہ کیا جائے ۔

اب رہی دروغ گفتاری سو اس کے باپ میں بڑی جسارت سے کام لے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ حقیقتِ کذب سے واقف نہیں ، وہ "ہر خلافِ واقعہ بیان" پر کذب کا لیبل لگا دیا کرتے ہیں ۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانا انسان کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو گا کہ "ہر خلافِ

واقعہ بیان کو جھوٹ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور کلماتِ حکمت آمیز کو، حرفِ دروغ کا خطاب دینا انسانیت پر بڑا ظلم ڈھانا ہے۔ میرے نزدیک جھوٹ فقط اسے کہا جائے گا، جو سامعین کو دھوکا دے کر، کسی شخصیت یا جماعت کو بے جا نقصان، یا اپنے ناروا فائدہ پہنچانے یا زیٹ کا مزا اُڑانے کے واسطے، بولا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایسے خلافِ واقعہ بیانات پر ہم دروغ گفتاری کا لیبل چسپاں کر دیں گے۔ جو بڑی احتیاط آمیز نیک نیتی اور انتہائی جذبۂ حبِ انسانی کے ساتھ اس غرض سے زبان پر لائے جاتے ہیں کہ (۱) نادان اور ضدّی بیماروں کو موت کے چنگل سے بچا لیں ـــــ (۲) فتنوں کا سدّباب کر دیں ـــ (۳) گم راہ فرد یا معاشرے کو صراطِ مستقیم پر لے آئیں۔ اور (۴) کسی معصوم کے دل کو ٹوٹنے سے بچا لیں۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تمام محسنانِ انسانیت اور تمام مصلحینِ عالم کے تمام عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیں گے، اور یہ ایک ایسی خطا ہو گی جس کو خیر کی تاریخ اور مصلحین و مبلغین کی روح کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

سو، اگر میری جھوٹ کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایک بار بھی دروغ بافی کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔

اور اگر غیرِ مفکر عوام میں، جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے، اس کو مان لیا جائے تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے اٹھارہ معاشقوں کے دورِ متلاطم میں اپنی بیوی کے دل کو ٹوٹ جانے سے بچا لینے کی خاطر میں نے اپنے سر پر قرآن رکھ رکھ کر، ایک بار نہیں اٹھارہ ہزار مرتبہ "جھوٹ" بولا، اور بڑے دھڑلّے کے ساتھ بولا ہے۔

اور لوگوں کے معمولی اشعار پر "سبحان اللہ"۔ "ماشاءاللہ"۔ "کیا خوب فرمایا ہے آپ نے"۔ کے نعرے لگا لگا کر، اور احباب کی مروّت کے دباؤ میں ان کے کلام پر مبالغہ آمیز تبصرے لکھ لکھ کر بڑے زنّاٹے کے ساتھ آج بھی "جھوٹ" بولتا رہتا ہوں۔

ہاں تو اس توضیحی عبارت، یا اس جملۂ معترضہ کے بعد، اب سنیئے کہ، میری

بادہ خواری کا آغاز کیوں کر ہوا ؟ ـــ یہ واقعہ غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ہے کہ میں، اپنی نانہال 'دھول پور گیا ہوا تھا اور وہاں میرے ایک دوست سردار مہابیر سنگھ نے میری دعوت کی تھی اور کہا تھا کہ میں چراغ میں بتی پڑتے ہی ان کے وہاں پہنچ جاؤں۔

وقتِ مقررہ پر میں وہاں پہنچ گیا، اپنے دوست سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن کو وہاں موجود پایا۔ میرے آتے ہی بوتل کھول دی گئی اور پیمانے بھر بھر کے سب کے سامنے رکھ دیئے گئے۔

چوں کہ مجھ نافہم کو شراب سے سخت نفرت تھی، میں پیمانے کی میز سے اٹھ کر، سوفے پر جا بیٹھا۔ سب نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور سوفے پر جا کر بیٹھ جانے کی علت دریافت کی۔ میں نے کہا "میں شراب نہیں پیتا۔ تینوں دوستوں کے منھ سے، بیک ساعت، ایک طویل، "ارے" کی آواز نکل گئی۔ رن بیر نے کہا "ارے، شاعر ہو کر تم شراب نہیں پیتے"۔ میں نے کہا "شاعر کے واسطے شراب پینا کوئی لازمی امر نہیں"۔ میرے اس جواب سے، سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

روپ سنگھ نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر کہا "میری جان تم کو یہ بھی آج تک خبر نہیں کہ دیوتاؤں نے سمندروں کو متھ کر یہ سوم رس نکالا تھا، فقط کویوں (شاعروں) کے لئے۔ ارے کوی ہو کر شراب نہ پینا پاپ، بلکہ مہا پاپ ہے۔ تم کو پینا پڑے گی"۔ میں انکار اور وہ تینوں اصرار کرنے لگے، بڑی دیر تک جھک جھک رہی۔ شور رہا، منتیں رہیں، ہات جوڑے گئے، لیکن جب میں پینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو، میرے میزبان مہابیر سنگھ نے جلدی جلدی، بڑے بڑے چار یا پانچ گھونٹ پی کر، سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن سے کہا تم لوگ شبیر کی چوتیا پنتھی میں وقت برباد نہ کرو، اٹھاؤ اپنے اپنے جام، میں ابھی ان کو کی مہاراج کا تیا پانچا کئے دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا، اور، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، بڑی دھمکی سے پوچھا "کیوں چھوٹے کوی صاحب نہیں پیوگے"؟ میں نے کہا "مہابیر تیرے سر کی قسم، مر جاؤں گا، پیوں گا نہیں"۔ انھوں نے بڑے زعم کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دے کر

کہا "اچھا بچّا جی، ابھی مزا چکھائے دیتا ہوں تم کو ـــــ یہ کہا، اور کسی بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ وہ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے، سامنے کے کمرے میں داخل ہو گئے ـــــ ان کے جانے کے بعد روپ سنگھ نے میری طرف اشارہ کرکے تارا چرن سے کہا "پارٹنر[1]، دیکھو گاڈ دی ایسے ہی ہوتے ہیں" میں نے ان کو گالی دی، وہ ہنسنے لگے۔

کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد مہا بیر کمرے سے نکلے۔ انھوں نے لپک کر دو جام بنائے، ایک جام آدھا ختم کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے، اور جب، چھم کی آواز سُنی تو اُنھوں نے پردہ اٹھا دیا۔ اور ایک سیکنڈ کے اندر، پردے کے تانے بانے سے ایک روشنی سی پھوٹنے لگی اور، دوسرے سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ پیکرِ انسانی میں ڈھلی ہوئی ایک کڑکتی بجلی، ہزاروں انوٹوں کے ساتھ، چھم چھم کرتی اور پتلی کمریا لچکاتی چلی آ رہی ہے ـــــ اور میرے دل میں "یُسبِّحُ الرعد بِحمدہٖ کی صدا گونج رہی ہے۔

اُف ـــــ وہ سولہ سترہ برس کا سن، وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن۔ وہ چھلاّ سی کمر، وہ صراحی دار گردن۔ وہ کسمساتا بدن، وہ گُدبُداتا جوبن ـــــ وہ سینے کا پاپی اُبھار، وہ ریشمی پلّو کی سطح ناہموار۔ گالوں کی وہ کندنی کا غذی جلد، جلد کے نیچے سے چھنتا اور چھلکتا ہوا گلابی رنگ، وہ سُتواں ناک، بِجلی نقشہ ـــــ دمکتی پیشانی، مہکتی پیشانی پر وہ بولتا قشقہ ـــــ نکلتا قد، چہچہاتا پنڈا ـــــ سُرخ انکھڑیوں سے وہ اٹھتی رنگین گھٹائیں۔ لانبی نکیلی پلکوں کی جھپک میں وہ کجری کے کٹیلے بول ـــــ سُرمے کے دُنبالے میں وہ کجلائی ہوئی دھنک ـــــ سانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی ـــــ بکھری زُلفوں میں، وہ جھولتی ہوئی، بندرابن کی، برکھا راتیں ـــــ ہیرے کے باریک قلم سے ترشے ہوئے لب لبوں میں وہ چُوم لئے جانے کی تمنا کا اُبھار ـــــ اور جھل جھل کرتی چُست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیرِ تعمیر تاج محل کی ہمکار ـــــ ارے دہائی گُنبدِ گردوں کے پروردگار ـــــ اس کو دیکھ کر زلزلہ آگیا میرے دیارِ وجود میں ـــــ خون کی گردش میں ایسا جوار بھاٹا آیا کہ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ بھاپ سی اُٹھنے لگی میرے مسامات سے، اور

---

[1] تاش کے رفیق

سر پر آواز منڈلانے لگی "اڑ بھنیری، ساون آیا ـــــ اڑ بھنیری، ساون آیا"

اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی۔ پتلی پتلی اور لانبی لانبی سُرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اُٹھایا، ایسا معلوم ہوا، گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قمقمہ روشن ہو گیا۔ ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے۔

پیمانے سے منھ لگا کر اس نے دو چار گھونٹ پیئے اور اس کے بعد اس نے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی مدبھری انکھڑیاں میرے سینے کو توڑ کر، میرے دل میں تیر گئیں۔ اور ایسا لگا جیسے کوئی چیز، میرے گلے سے اتر رہی ہے۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں، میرے دل میں دونوں وقت گلے ملنے لگے۔ اس نے اپنا ساغر خالی کر کے، دوسرا ساغر لب ریز کر لیا، اس لب ریز ساغر سے چند قطرے پیئے۔ کن انکھیوں سے مجھ کو آنکا، آنک کر، شکاری کی نظر سے دیکھا اور پیمانہ ہات میں اُٹھا کر بڑھنے لگی میری طرف، اور بجنے لگے اس کے قدم میرے سینے میں ـــ میرے دل میں "ٹن ٹن" خطرے کی گھنٹی بجی، اور آواز آئی، ارے بڑا زبردست طوفان آرہا ہے ـــ خاں صاحب ہوش یار" سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے، اس نے گانا بھی شروع کر دیا۔

"اری میں تو لُٹ گئی، بیچ بجار ـــ ترکوا[لے] نے لوٹ لیا" اس کے گاتے ہی تاراچرن نے ستار چھیڑ دیا "جھنن جھنن، جھن جھان" عود کی لپٹوں، ستار کے جھالوں اور اس فتنۂ دوراں کی تانوں سے در و دیوار جھومنے لگے اور وہ ظالم مجھ سے قریب سے قریب ہونے لگی، یہاں تک کہ جھالوں اور تانوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اس قدر قریب آگئی کہ اس کی اُبلتی جوانی کی آنچ مجھ کو چھونے لگی، اور اس کی کچّی عمر کی مہکتی سانس میرے سینے میں چُبھنے لگی ـــ میرے دل سے پھر آواز آئی "خاں صاحب ـــ ہوشیار، ہوشیار دشمن سر پہ آپہنچا، بغلی ڈوب جاؤ" میرے ہات پیر سنسنانے لگے، چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں کہ یکایک وہ ظالم چھم سے میرے زانو پر

لے۔ ارے میں تو بازار کے بیچوں بیچ لُٹ گئی۔ ترک نے لوٹ لیا (مسلمان کو ترک کہا جاتا، پھر یہ لفظ معشوق کے معنی میں مستعمل ہو گیا)

آکر بیٹھ گئی — ستار پر اور بھی تیزی کے ساتھ، جھالا بجنے لگا، اور اس نے اپنی جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر کے، پھر گانا شروع کر دیا۔ "ارے پی لے، تُرکوا شراب، میری جھوٹی شراب، میری جھوٹی شراب، میری جھوٹی شراب۔" اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اِلّا اللہ کا نعرہ لگا کر، پورا گلاس، ایک سانس میں خالی کر دیا۔ میرے ہات سے گلاس لے کر چوما اور پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور اپنے لب میرے لب سے چپاں کر کے اس طرح اُلٹی سانسیں لینے لگی، گویا وہ میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

جھر، جھر، جھر، جھر، تالیاں بجانے لگے تارا چرن، روپ سنگھ اور مہابیر سنگھ ——— "ہپ ہپ ہُرا" کرتے سب میری طرف دوڑ پڑے۔ رن بیر نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب بہادر آداب، بس رہ گئی ساری شیخی۔" اور پھر دَور شروع ہو گیا، ستار کے جھالوں میں۔

بالا بلند، سرو قدے، سروِ نازِ من
کوتاہ کرد، قصّۂ زہدِ درازِ من!

میرے عنفوانِ شباب تک کا ہندوستان

میرے حالات کے ساتھ ساتھ میرے اُس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سُن لیجئے، جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان دوراہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا، کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت "خالص مشرقی" "نیم مشرقی" اور "مغربی" ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کی اکثریت تھی، نیم مشرقی گروہ کی تعداد کم تھی، اور مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانبی یا خشخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے، بُتوں پر عمامے، دستاریں، شملے یا دوپلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھتلے یا نیم شاہی جوتے۔ بڑے پائنچوں کے پاجامے یا اوریبی گھٹنے۔ عبائیں قبائیں، انگرکھے، دگلے

شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال، چکن کے کرتے، روئی کی صدریاں اور ہاتوں میں خاکِ شفا کی تسبیحیں، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں۔ ہولا، اور شام لگی جریبیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا، شیروانیاں، چست پائے جامے، پمپ جوتے، استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا، جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خاں اپنے اپنے چیلی چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کی سعی کر رہے تھے، لیکن اس وقت تک مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہرچند ابھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، مگر قوی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔ اور سوٹ پہننے والوں کو "پلپلی صاحب" کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل، یعنی گُلّی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچلی، کبڈّی آنکھ مچولی، ست گھڑا، گیّل، گولیاں، اندھا مرغا، للّی گھوڑی، شطرنج اور چوسر —— تیراکی، بانک، بنوٹ، پٹا، کشتی، ڈنڈ اور مگدر، —— مرغ بازی اور بٹیر بازی اور تیتر بازی کا عام رواج تھا۔ اور فٹ بال، ہاکی، ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منھ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیوں، پالکیوں، نالکیوں، فنسوں، میانوں، ہواداروں، گھوڑوں بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتیوں کی سواریوں کے آگے لینڈویں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں غیر ثقہ سواریاں سمجھی جاتی تھیں۔ مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں —— ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس، شمعیں اور اِکّے روشن کر دیئے جاتے۔ عود سلگتا، عطردان کھلتے، خاص دانوں میں گلوریاں آتیں، چاندی سونے کی چمٹیوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے

جاتے، معطر حقے اور شکیں گڑ گڑاتیں ــــ علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

اُدھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے، بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی، پیانو بجتا، گراموفون کھڑکھڑاتا، سگرٹوں کی بو اُڑتی ــــ کالی بلی ٹھمس سکورا" یا "مسز پیجر" مغربی دھنوں میں شوروغوغا کیا کرتیں اور جب بیرڈ سے بیڑو رگڑواتا ڈانس شروع ہوتا تو بینڈ چیخنے لگتا تھا۔ اور عمدہ بجانے والوں کو زور زور سے تالیاں بجاکر داد دی جاتی تھی اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے، لونڈے گھرے بن جایا کرتے تھے۔ اِدھر، فرش یا چوکیوں پر دسترخوان بچھاکر ہاتوں سے۔ اور اُدھر میزوں پر، کانٹے چھری رکھ کر، چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا۔ چوں کہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پرستوں تک کو بھی ہضم نہیں ہوسکی تھی، اس لئے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گاہ گاہ وہ آلاتِ خوراک تڑ سے فرش پر گر بھی جایا کرتے تھے۔ یا، بے گلی، مرغ کی ٹانگ اُڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کے کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ اِدھر کے کھانے تھے (۱) قورمہ، قلیہ، کوفتے، شامی کباب، سیخ کباب، بوٹی کباب، لگن کباب، آنت کباب، مچھلی کباب دم پخت کباب، نرگسی کباب، ران کباب، مرغ تیتر، کبوتر، بٹیر، شب دیگ، کلّے پائے، کھیری، سری، بھیجا، کلیجی، گردے، دم پخت بکرے، قیمہ، قیمہ بھرے کریلے، دھوئی ماش کی دال، کھڑے مسور کی دال، خاگینہ، چلّے، ستارے، کھٹی رائیں، بریانی، پلاؤ، مرغ پلاؤ، تیتر پلاؤ، بٹیر پلاؤ، بوٹ پلاؤ اور حلیمی پلاؤ وغیرہ۔

(۲) مٹھائیوں میں، حبشی حلوا سوہن، پپڑی حلوہ سوہن، زردہ، انار کا زردہ، پستے بادام کا زردہ، مزعفر، کھیر، شیر خرما، پھِٹے، بالائی، میٹھے سموسے، تقلیاں، بالائی کے آب خورے، نمش، پینڈیاں، رساول، گُرمبا، پیوسی، برفی، جلیبیاں، امرتیاں، لڈو، باجرے کا ملیدہ، تلاقند، گلاب جامن، پیڑے، پیٹھا، اندرسے،

لے انگریز ہندوستانیوں کے کلبوں میں آنا توہین سمجھتے، اور اپنے کلبوں میں ہندوستانیوں کے داخلے کو خلافِ شان خیال کرتے تھے۔ اس لئے دیسی انگریزوں کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں۔

دندان مصری، شکر پارے، لوز، چنیاں اور مربعے۔ (۳) دہی، رائتا، پھلکیاں، دھی، دہی بڑے، تلی دالیں ——— چلے، تکونے، سموسے، مُہال، پاپڑ، نمک پارے، کھچڑیاں، دال موٹ، سیو، تلی اروی، بھرتے، ساگ، تہری، تنبولی خشکہ گوجھے، منگچیاں اور رکھوٹے۔ (چپاتی، ورقی چپاتی، دہری چپاتی، پھلکے، گردے، خمیری، شیرمال، دو سے لے کر اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، روغنی روٹی، بیسنی روٹی، باقرخوانی۔

اور اُدھر کا کھانا تھا۔ سوپ، چاپ، کٹلٹ، اُبلی مچھلی، اُبلا مرغ، اُبلے آلو، اُبلا مٹر، اُبلی ترکاریاں، ڈبل روٹی، مکھن، پڈنگ، پیسٹری، آئس کریم، جیلی، ساس اور کیک۔ بس اللہ اللہ خیر سلّا۔

ہرچند سر سید گزیدہ انگریزی خوانوں میں، فرنگی کی نقالی اور پرستاری کا ذوق روبترقی تھا۔ مگر ان کی عورتیں ٹھیٹ ہندوستانی تھیں اور موئے کالا پانی پینے والوں[1] سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ وہی پرانے زمانے کی مسہریاں وہی چھپرکھٹ، وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے، چوکوں پر مسندیں، قالین، چاندنیاں، گاؤتکیے، میر فرش، اُگالدان، الائچی دان، پاندان اور خاص دان، لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی۔ وہی پانچوں کے کلی دار پاجامے، جن کے گوشے چلتے وقت خادمائیں اُٹھالیتی تھیں، وہی انگیا، وہی کرتی، وہی انگیاؤں کی چڑیاں، وہی شلوکے، وہی دوپٹے، وہی دلائیاں اور وہی رضائیاں، وہی پرانا تیل پھلیل تھا، وہی کاجل، وہی مسّی، وہی سرمہ، وہی مہندی اور وہی افشاں چلی آرہی تھی ـــ صابون کا رواج بہت کم تھا، کھلی بیسن اور اُبٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنواریوں کو، بے کلیوں کے سیدھے پاجامے پہنائے جاتے تھے۔ ان کی ناک میں، ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی، یا نیم کا تنکا۔ اور ان کو پان کھانے، مسّی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور مانگ نکالنے کے بدلے،

---

[1] شراب کو عورتیں کالا پانی کہتی تھیں۔

ان کے سروں پر مینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں (جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔
اس دور کے زیوروں کے نام بھی سُن لیجئے۔

(۱) سر پر، چھپکا۔ (۲) ماتھے پر، سراسری، ٹیکا سمیت۔(۳) کانوں میں پتے، بالیاں، جھمکے، بالے، بجلی، مگر، بندے، جھالے، انتیاں، اور کرن پھول۔ (۴) ناک میں، نتھنی، بُلاق، اور کیل۔ (۵) گلے میں، طوق، گلوبند، بدھی، زنجیر چنن ہار، دُھکدُکی، چمپا کلی اور ہیکل۔(۶) بانہوں میں، جوشن، نونگے، بازوبند، اکا، اور چھوٹا سا عطر دان۔ (۷) کلائیوں میں، کڑے، چوہے، دُتیاں، بانکیں، چوڑیاں، کریلیاں، پہنچیاں، سُمرنیں، کنگن، اور جہاں گیریاں۔ (۸) انگلیوں میں چھلے، انگوٹھیاں، آرسی، اور علی بند (جس میں سونے چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں)۔(۹) پاؤں میں، چھاگل، جھانجنیں، رام جھول، بچھوے، کڑے، چھڑے، پچھے اور بازیب۔(۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں، چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (BETTER HALF) دونوں بڑی سختی کے ساتھ، پردے کی پابند تھیں۔ ڈولی اور پالکی کے سوا، کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اور تو اور، عورتوں کی آوازیں اور ان کا ذہن بھی پردہ نشیں تھا، یعنی کوئی بی بی اس قدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جا سکے، اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سل، پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ اور بیبیاں تو بیبیاں، مامائیں، اصیلیں اور لونڈیاں باندیاں تک پردے کی پابند تھیں۔
زنانے میں آنے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب کہ وہ دس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے، پردہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اور مشکوک چال چلن کی عورتوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ اور تو اور، باپ، دادا، نانا، چچا اور پھوپا کے سامنے بھی عورتیں، سروں پر پلّو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اپنے بزرگوں

کی موجودگی میں، اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

زنانے مکان کی فضا کو مقدس رکھنے کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ۔ کسی ترکاری والی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ لانبی لانبی ترکاریوں، مثلاً لوکی، ترئی، کریلے، بھینڈے وغیرہ کو، ٹکڑے ٹکڑے کئے بغیر سالم حالت میں اندر لے جائے، اس لئے کہ صورت کے لحاظ سے ان ترکاریوں کو "فحش ترکاری" خیال کیا جاتا تھا۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ملیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی شادی میں ناچ ہو رہا تھا کہ بالاخانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبانِ محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق مار دی، صاحبِ خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ انھوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دوڑے ہوئے محفل میں آئے۔ گولی مارنے والے خاں صاحب نے ان سے کہا "بھائی، آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی، مجھ سے یہ بے حیائی برداشت نہیں ہوئی میں نے گولی ماردی" صاحبِ خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "بہت اچھا کیا آپ نے" اور فوراً اندر چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا "بھائیو دیکھ لیجئے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان، دونوں چیزیں بچالیں۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی، رات کے دو یا تین بجے کا وقت تھا۔ لوگوں کی اکثریت خراٹے لے رہی تھی۔ کچھ بستروں پر پڑے کروٹیں لے اور کنمنا رہے تھے اور، بہت تھوڑے لوگ، تلک اور گوکھلے کے گرشن کر بیدار ہو گئے اور دھیمے سُروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے۔ اور بھارت ماتا چونکنا ہو کر اور اِدھر اُدھر دیکھ کر، دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ع

از کجا می آید ایں آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ لیکن اس کا غرور کہہ رہا تھا کہ

یہ ہوا، میرے چراغوں کو بُجھا سکتی نہیں

لیکن مہاتما گاندھی، جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پَو پھٹ گئی۔ اور ہر طرف سے یہ آوازیں لگیں کہ تخت یا تختہ ــــ آزادی یا موت ــــ یا ایوانِ فرنگی مسمار، یا تختۂ دار۔

گاندھی کی آندھی نے حکومت کے اوسان اُڑا دیئے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ مَلنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے، اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ، پانی کی طرح بہادیا، وہ بے کار گیا، اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آگئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے۔ کیا تدارک کیا جائے اس فتنۂ عظیم کا؟

آخر کار حکومت نے ایک منصوبہ طیار کر لیا ــــ پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ لاٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اور دوسری طرف، بجِڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں، یعنی مہامہوپدھیاؤں، اور شمس العلماؤں کو، جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کرا دینے کے لئے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مِل رہے تھے، اور بری طرح پھٹکارا گیا ان کو، کہ انھوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا۔

اور، اس کے ساتھ ساتھ، پکارا گیا ان تمام نوابوں، رائٹ آنریبلوں، خان بہادروں، رائے بہادروں۔ رئیسوں، تاجروں سیٹھوں، سود خواروں، زمین داروں، جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہریاروں کو، جن کو حکومت سانڈوں کی طرح پالے تھی ــــ کہ اے بھوؤ کانگریس کی طرف، اپنی توپوں کے مُنھ موڑ دو، اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا، ہر طرف بجِڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں، سولیاں کھڑی کر دی گئیں۔ اور ہر جانب سے غُلغلے بلند ہونے لگے کہ خاک میں ملا کر

رکھ دو انگریز بہادر کے غداروں کو ۔ یہاں تک کہ آگے چل کر جلیان والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی، اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبانِ وطن کی، اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں۔

کسے نہ ماند کہ اور ابتیغ نازکشی
مگر کہ زندہ کنی خلق راو بازکشی

قومی تحریک سے وابستگی

یہ واقعہ، غالباً ۱۹۱۸ء کا ہے کہ، سب سے پہلے محمد مستقیم[1] نے، مجھ کو، گاندھی جی کی شخصیت اور تحریکِ آزادی کی اہمیت سے آگاہ کرکے، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے واسطے احمد آباد بھیجا تھا۔ شام کے وقت احمد[2] آباد پہنچا۔ ایک خیمے میں جاکر ٹھہر گیا۔ تھکا ماندہ تھا۔ کھانا کھاکر سوگیا۔ پچھلے پہر یہ خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ میں تختِ سلیماں پر بیٹھا اُڑ رہا ہوں کہ میرا خیمہ تانوں سے گونجنے لگا، آنکھ کھل گئی، گھڑی دیکھی، سوا چار کا وقت تھا۔ خیمے کا پردہ اُلٹ کر باہر آگیا۔

باہر آتے ہی دیکھا کہ میرے خیموں کے شہر پر، سلونی سی گلابی روشنی برس رہی ہے، اور سینکڑوں زہرہ جمال گجراتی لڑکیاں، پتلی پتلی کمروں میں سُرخ سُرخ پٹیاں باندھے اور ہاتوں میں شمعیں اٹھائے قومی ترانے گا رہی ہیں، اور پوری دنیا چھما چھم ناچ رہی ہے۔

چہ مبارک سحرے بود وچہ فرخندہ شبے

میں صبح ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچا، ان کے ساتھ چائے پی، انھوں نے ہنس کر کہا، ملیح آباد میں آپ نے جو لطیفہ[3] آپ نے سنایا تھا، آج تک اس کا مزا لے رہا ہوں۔

---

[1] وہ نسلی اعتبار سے انگریز، دینی اعتبار سے مسلمان۔ آگرے میں میرے سوتیلے ماموں کے ٹیوٹر، اور بعد کو میرے بھائی محمد یوسف خاں کے سکریٹری کی حیثیت سے ملیح آباد آگئے تھے۔ [2] اس سفر میں مشیر احمد خاں رام پوری، چھوٹے دادا، اور جگنو خدمت گار میرے ساتھ تھا۔ [3] وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ایرانی ہندوستان کے آم کھاکر جب شیراز پہنچا اور اس نے وہاں جاکر جب آموں کی تعریف کے پل باندھ دیے تو اہل شیراز نے پوچھا "کیا وہ پھل انگور و سیب سے بھی اچھا ہے؟" اور اس ایرانی نے کہا بمراحل بہتر، تو لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا مزا بتاؤ۔ مزا بتانے کی چیز ہی کب ہے کہ وہ بتاتا، تقاضوں سے تنگ آکر اس نے کہا "آم اس قدر لذیذ تھے کہ کھاتے وقت یہ محسوس ہوتا تھا، گویا علی مرتضیٰ ہیں کہ زبان سے گلے میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔" نعرۂ صلوٰۃ بر محمد و آلِ محمد۔

مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات :۔

مولانا آزاد کے ساتھ، گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے، میرے ذوقِ جمالیات کے منہ پر، تڑاق سے تھپڑ مار دیا۔۔۔ اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی، دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے۔۔۔ ہندوستان کی آزادی اور گاندھی ؟ یہ مُنھ اور مسور کی دال ؟؟ مایوسی نے مجھ کو ڈھانک لیا۔

لیکن جب مختلف مسائل پر انھوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت، اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلا دیا کہ ہندوستان کو جس مردِ میدان کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔ اب ہمارے دن بُہر جائیں گے۔ گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحب زادی، وجے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔۔۔ اس وقت تک میں نے حسنِ مغموم دیکھا نہیں تھا، میرا دل کانپ اٹھا۔ اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آجاتی ہم سب چُھٹ بھیئے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہم کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے بھنبوڑتے رہیں گے۔

اتنے میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت نہرو آگئے نہرو نے مجھ کو گلے لگا لیا، اور مجھ کو وہ زمانہ یاد آگیا جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ، ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔

اس کے بعد ہم سب پنڈال جانے کے لئے باہر آئے۔۔۔ اللہ اللہ وہ ہندو مُسلم اتحاد کا جوش و خروش، وہ کوثر و گنگا کی موجیں دوش بدوش۔۔۔ آنکھوں میں عزائم کے وہ ہونکتے گرداب، وہ سورماؤں کے گرجتے شباب۔ وہ گجراتی والنیٹر لڑکیوں کے جوشیلے گیت، گیتوں میں وہ پیت کی رِیت۔۔۔ وہ اُمنگوں کا زور، وہ ترنگوں کا شور۔۔۔ وہ جیالوں کی سج دھج، وہ نعروں کی گونج گرج۔۔۔ وہ تمنّاؤں کے

طوفان ــ وہ لودیتے ارمان ــ وہ گونجتے یمین و یسار ، وہ ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان کی زمین آسمانوں کی طرف ہمک رہی ہے۔ ہر طرف ایک بجلی ہے کہ لپک رہی ہے۔ فرنگی کھڑے سینے کوٹ رہے ہیں، غرورِ حکومت کے شیشے چھناچھن ٹوٹ رہے ہیں۔ طوفان بن کر آرہا ہے سوراج ، اور ہندوستان کے سر برہنہ جاں بازوں کے قدموں کی طرف بہتا چلا آرہا ہے برطانیہ کا تاج۔

بکوئے مے کدہ، یارب، سحر چہ مشغلہ بود
کہ شورِ شاہد و ساقی و شمع مشغلہ بود
حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست
بنالۂ دف و نے ، در خروش و ولولہ بود
مباحثے کہ در آں حلقۂ جنوں می رفت
ورائے مدرسہ و قال و قیل مسئلہ بود

گانگریس پنڈال میں قدم رکھا، حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھا اور خون میرے بدن میں تین کروڑ میل فی لمحہ کی رفتار سے گردش کرنے لگا۔

اور، تھوڑی دیر میں، ہندو مسلم فساد کے سرکاری ایجنٹ مدن موہن مالویہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو تمام پنڈال بپھر گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں، نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس:۔

رات کے وقت، جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہو کر پنڈال کی پشت سے گزرنے لگا، (جہاں روشنی اور آمد و رفت بہت کم تھی) تو میں نے ایک والنٹیر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا، اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی: "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ"

میں نے اس نعرے کو بہت اچھا شگون سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خلافت کے

پنڈال میں گیا، دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی کے درمیان بڑی رسہ کشی ہو رہی ہے، ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مُصر ہیں کہ سرِدست برٹش تاج کے زیرِ سایہ آزادی طلب کی جائے اور دوسری طرف فقط مولانا حسرت موہانی ہیں۔ جو آزادی کا بِل کا ریزولیشن پاس کرانا چاہ رہے ہیں۔

حضرت حسرت موہانی کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا، لیکن وہ نہیں مانے، اور سیدھے اسٹیج کی طرف روانہ ہو گئے اپنا آزادی کا بِل کا ریزولیشن لے کر ـــــ اسٹیج اونچا تھا اور حسرت پستہ قد آدمی تھے، میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھا دیا اور جب انھوں نے آزادی کا بِل کا ریزولیشن پیش کیا تو پنڈال میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور میں اس ہنگامے سے اُکتا کر، اس والنٹیر لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ جو پنڈال کی پشت پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں احمد آباد سے روانہ ہونے لگا تو چھوٹے دادا نے (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہا، بھائی شبیر حسن خاں مجھ کو اجمیر شریف کی زیارت کرادو، ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ میں نے ان کی بات منظور کر لی ـــــ اجمیر سے دو چار اسٹیشن پہلے ہی، ڈسٹنٹ سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حُسن نے مجبور کر دیا کہ اس کو پاس سے جا کر دیکھوں۔ میں گاڑی سے اُتر کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور اس قدر مبہوت و مسحور ہو گیا کہ گاڑی رینگنے لگی، چھوٹے دادا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دی۔

میں نے پکار کر کہا "آپ جائیں، اجمیر کے ویٹنگ روم میں ٹھہر جائیں۔ میں دوسری[1] گاڑی سے آجاؤں گا۔" دوسری گاڑی سے شام کے وقت اجمیر پہنچ گیا۔ اور جب کھانا کھا کر لیٹنے لگا تو چھوٹے دادا نے کہا، بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کرآئیں ـــــ میں نے کہا، آپ جائیں۔ میں خواجہ صاحب کا میہمان ہوں ـــــ اور

---

[1] میری نظم "جنگل کی شاہزادی" اُسی رومانی سفر کی یادگار ہے۔ (وہ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہے اُف رے سفاک وقت)

جب تک خود میزبان بلانے نہیں آئیں گے، میں نہیں جاؤں گا۔" چھوٹے دادا نے مجھ کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کفر بک رہا ہوں، اور منہ بنا کر درگاہ چلے گئے۔

حسبِ دستور کوئی چار بجے میری آنکھ کھلی۔ نہا دھو کر میں نے شیروانی پہنی اور چاہا کہ جگنو کو جگا کر ٹہلنے کے لئے نکل جاؤں ــــ لیکن، خلافِ دستور نیند کا ایک ایسا گہرا جھونکا آیا کہ جوتہ اور شیروانی اتارے بغیر میں چارپائی پر دراز ہو کر سو گیا ــــ اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا کہ ایک مردِ بزرگ، میرے سرہانے کھڑے بڑی دل داری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کا اسم گرامی انھوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا۔ میرا نام ہے معین الدین، اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلانے آیا ہوں، شرط آپ کی پوری ہو گئی، اب تو آیئے گا، نا؟"

میری آنکھ کھل گئی، چھوٹے دادا کو جگا کر خواب سنایا، ان کو حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے، بھائی شبیر حسن خاں آپ تو چھپے رستم نکلے" ــــ اس کے بعد ہم دونوں درگاہ چلے گئے۔

اجمیر سے پلٹ کر جب لکھنؤ پہنچا، غلغلہ سنا کہ ٹیگور آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے گیا۔ انھوں نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا "کیا یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں؟" میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا "شاید"۔ انھوں نے میرا نام پوچھا ــــ جب میں نے اپنا تخلص بتایا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجنی نائیڈو نے آپ کی ایک نظم "طلوعِ سحر" کا ترجمہ سنایا تھا۔ اور آج آپ سے ملاقات ہو گئی، آپ کی نظم لاجواب ہے اور اس کے سننے کے بعد میں آپ کو فرزندِ سحرگاہ کہہ سکتا ہوں"۔

اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے اسکالر تھے، اور دیوانِ حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ شانتی نکیتن آکر کچھ روز کے لئے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی اسپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کر دیں ؛ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ، ان کی دعوت قبول کر لی، اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا ــــ اور مطالعے کے لئے، بہت سی کتابیں بھی ساتھ لےلیں۔

ٹیگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی، اور اپنے ایک طالب علم برنی صاحب کے کمرے میں مجھ کو ٹھہرا دیا۔

وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی، لیکن گوشت وہاں نہیں کھایا جا سکتا تھا ــ اس کی تکلیف ضرور تھی پھر بھی جگنو چوری چھپے گوشت کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

صبح کی منشی، دونوں وقت کا غسل، صبح وشام کی موسیقی اور گھنے درختوں کے سائے میں تدریس وہاں کی زندگی کے اجزائے لاینفک تھے۔

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں ٹیگور کس قدر وسیع القلب تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک روز کسی بوڑھے پروفیسر نے آکر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مابین، حدود سے متجاوز تعلقات کی جب شکایت کی تو انھوں نے اس سے پوچھا "یہ صورت جبر یا تراضیٔ طرفین سے پیدا ہوئی تھی ؟ اور جب اس پروفیسر نے یہ بتایا کہ اس صورت حال میں جبر کا کوئی دخل نہیں تھا تو ٹیگور نے قہقہہ مار کر کہا "تو پھر اس میں اعتراض کی بات ہی کیا ہے، قدرتی تقاضوں کے دھاروں پر بند باندھنا فطرتِ انسانی کے خلاف ناانصافی ہی نہیں، بغاوت بھی ہے۔ آپ شاید بھول گئے، لیکن مجھ کو اب تک یاد ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں نوجوان تھا" (یہ بات سن کر میں بھی لڑکیوں سے کھل کر ملنے جلنے لگا)۔

ہرچند میں تصوّف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا، مگر ٹیگور کی شاعری اس کے باوجود مجھ کو بے حد متاثر کیا کرتی تھی۔ اور میں ان کے ترجمے پڑھ پڑھ کر سر دُھنا کرتا تھا۔ اور اب بھی میرے دل میں یہ چور

ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری پر میں وجد کرنے لگتا ہوں۔ اور اس کی شاید یہ علت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھُردرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی ترجموں کی وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آب گینہ ہے اور ترجمہ گھن۔ شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر۔ شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ و گل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلۂ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ ہو سکتا ہے۔ لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا، جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معانی سے جُدا کر کے، استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک پرت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صد ہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں۔ جہاں مختلف النسل لفظوں کے نقطہ ہائے اتصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے۔ جہاں طوافِ حرم کو رقص اور رقص کو طوافِ حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، جہاں اکائی کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں دو دو مل کر چار نہیں ایک ہو جاتے ہیں۔ جہاں دوشِ نفی پر علمِ اثبات لہرایا جاتا ہے۔ جہاں تلوار کی دھار سے مرہم ٹپکتا ہے۔ جہاں نشتروں کی نوک سے زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں سُبو کے دستے سے کعبے کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جہاں کانٹے گنگناتے اور پھول کراہتے ہیں۔ جہاں

موتیوں سے آنسو اور آنسوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں۔ جہاں نازک حبابوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بولوں کے گھاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں — جہاں ادلوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں — جہاں ڈوب جانے کے بعد سفینے ابھرتے ہیں۔ جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں — جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں۔ جہاں ٹکوروں سے، فولاد برمایا جاتا ہے۔ جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے۔ جہاں فکر کے پروں پر ذات وصفات کو اُساپا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی بوندوں میں الاؤ روشن کیے جاتے ہیں۔ جہاں، آنچ کی لہروں میں زہرا کی کمر لچکتی ہے۔ جہاں بوئے گل، گیت بن جاتی ہے اور گیت زہرہ جبینوں کے مکھڑے بن جاتے ہیں۔ جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تتلیوں کی دھاریوں پر کرۂ ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر کروڑوں صدیاں تھرکتی نظر آتی ہیں، اور جہاں جزویت اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج کج کر کے آفاق کو اپنے جوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرۂ رقصاں کی جانب نگاہ اٹھاتا ہے، تو اس کے الفاظ کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، اس کی تخیئل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں، اور اس کے وجود کا ڈورا چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پرائز کے اربابِ حل وعقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن ناشناسو، اور اے قدامت پرست اندھو، اگر تم ادب کے قدر دان ہو تو شاعر کے کلام کو اس کی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کر دو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمھیں آخر یہ کون سا دماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتناء نہیں کرتے اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش

ہیں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو تم کلیجے سے لگا لیتے ہو۔ اے جسم بیزار، لاش نواز لوگو، ادب کی دیوی تمھاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، خیالات کے دھارے کبھی یوں بھی بہنے لگتے ہیں۔ اب پھر آجایئے ٹیگور کی طرف اور چند کلمات ان کی شخصیت کے بارے میں بھی سماعت فرما لیجئے۔

جس طرح بنگالی سے ناآشنا ہونے کی بناء پر میں ان کی شاعری کے باب میں ایک مستند نقاد کے مانند کوئی جامع تبصرہ نہیں کر سکتا، اسی طرح میں ان کی شخصیت کے بارے میں بھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا ـــ جناب والا، ٹیگور یا کسی اور کا تو ذکر ہی کیا، مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تُو اپنے کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے، تو میں یہ جواب دونگا کہ ہر چند بچپن سے لے کر اس پیرانہ سالی تک میں علی الاتصال و بہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں، لیکن قطعیت کے ساتھ یہ کہہ نہیں سکتا کہ درحقیقت میں ہوں کیا

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے
بسا اوقات، جب ہم خود، غلط اندازہ کرتے ہیں

اور پھر میں ٹیگور کے ساتھ رہا بھی کتنا۔ صرف چھ مہینے، اس لئے عرض ہی کیا کر سکتا ہوں۔ البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ہی وسیع المشرب، نہایت زندہ دل، بے حد شریف، حد سے زیادہ بے تکلف، حساس اور جمال پرست انسان تھے۔

لیکن ایک چیز اُن میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی۔ اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو بُری نظر سے دیکھا کہ جب کوئی غیر ملکی، انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا۔ تو اس کے آنے سے پیشتر، وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے۔ عود اُن کی پشت

پر سُلگا دیا جاتا تھا۔ اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد وپیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ میں کسی پر اسرار دیوتا کو دیکھ رہا ہوں ـــ

بیوی، میری مفارقت برداشت نہیں کر سکیں۔ شانتی نکیتن ایک تار بھیجا کہ میں ایک ہفتے کے واسطے ملیح آباد چلا آؤں، اس لئے میں وہاں اپنا سارا سامان اور ساری کتابیں چھوڑ کر آگیا ملیح آباد آگیا اور، بیوی نے پھر اسی بُری طرح گھیرا کہ میں دوبارہ شانتی نکیتن جا ہی نہ سکا۔ اور میرا وہ تمام سامان پھر مجھے کبھی نہیں ملا۔

ایک خواب

یہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت، جب میں "قصرِ سحر" میں بیٹھا ہوا، سامنے کی پھولی ہوئی شفق کی رنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا، دن رات تمھیں اِنھیں باتوں کی دھن لگی رہتی ہے، بھُولے سے بھی اپنے گاؤں گراؤں کی خبر نہیں لیتے ـــــ خواجہ حسن کو تم نے ضلع دار بنا دیا ہے، وہ ایسا اُدھم مچائے ہوئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں تمھاری رعایا کو، ہر طرف مادھو لوٹ مچی ہوئی ہے، گاؤں گراؤں کا نہ حساب ہے نہ کتاب۔ اور جب تم حساب مانگتے ہو وہ باتوں کے طوطے اُڑانے لگتے ہیں، اور زبانی حساب بتا کر اُلٹے کچھ روپے تمہارے ہی ذمے نکال دیتے ہیں۔ تم کو دس ہزار دے کر بیس ہزار اپنے ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ کاغذ کی ناؤ آخر چلے گی کب تک ؟" میں نے کہا " اچھا اشرف جہاں، اب میں خود ہی کام کروں گا۔ انھوں نے تِنک کر کہا " ارے تم اس قابل ہوتے تو پھر یہ رونا کیوں ہوتا، تم تو اپنی جائے داد کا ایک بڑا حصّہ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، آنکھیں بند کر کے۔ اپنے بڑے بھیّا کی نذر کر چکے ہو۔ اور جو کچھ بچا کھچا رہ گیا ہے اس کو بھی کسی کی بھینٹ چڑھا دوگے۔ ڈھاک کے تین پات رہ جائیں گے ـــــ نہ لڑکی کا بیاہ ہو سکے گا، نہ لڑکے کی پڑھائی۔

میں نے کہا " اشرف جہاں اتنا دِل چھوٹا نہ کرو، میرے پاس جو کچھ بچ رہا ہے۔

وہ بھی خدا کے فضل سے اس قدر ہے کہ ہم تم بڑے آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بگڑ کر کہا سدا اپنے ہی بارے میں سوچتے ہو، ارے یہ بھی تو سوچو کہ ہمارے بچّوں کا حشر کیا ہوگا؟ میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے بچے اپنے باپ دادا کا بھرم قائم رکھ سکیں گے؟

بیوی کی یہ باتیں سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ دل نے کہا کہتی تو ٹھیک ہیں۔ اور وہ پہلا دن تھا کہ عقلِ معاش میرے سینے میں کسمسائی اور سوچنے لگا، اپنی آمدنی اور اپنی جائے دادکیوں کر بڑھاؤں اور جب خاک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دل اداس ہوگیا اور چہرے پر بڑی بے کسی برسنے لگی۔

بیوی نے مجھے اداس دیکھا، ان کے دل پر چھری چل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں، تم گھبراؤ نہیں — تم جانتے ہو کہ باوا کو اپنے ہات سے کھانا پکانے کا کس قدر شوق ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ماماَئیں ہیں، اصیلیں ہیں، باورچنیں ہیں، مگر جب تک وہ اپنے ہات سے کوئی نہ کوئی چیز خود نہیں پکا لیتے، انھیں چین نہیں پڑتا، انھیں دیکھ دیکھ کر مجھے اس قدر اچھا پکانا آگیا ہے کہ میں لکھنؤ میں کھانے کا ایک ہوٹل کھول دوں گی، اور اس سے اتنا پیدا کر کے دِکھا دوں گی کہ پُشتوں تک کاٹے نہیں کٹے گا۔ ہمارے تمھارے بزرگ، خالی ایک تلوار لے کر یہاں آئے تھے اور اس تلوار کے زور سے اتنے بڑے بڑے محل کھڑے کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوا دیا اور میں، اللہ نے چاہا تو کف گیر سے سونا اُگلوا دوں گی۔

بیوی نے ڈھارس بندھائی — میرا دل اور بھی مغموم ہوگیا۔ اور دوسرے کمرے میں آکر اپنے بچوں کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں خدا جانے یکایک کیا لہر آئی کہ میں نعت کہنے لگا۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا، رقصِ بتانِ آذری

نعت کہہ کر کھانا کھایا، اور بستر پر دراز ہو کر لحاف اوڑھ لیا۔ نعت سر میں گونجنے لگی، بیوی کے خرّاٹوں نے میرے پوٹے بوجھل کر دیئے، فاران کی ہواؤں نے لوری دی۔ اور دو چار کروٹیں بدل کر سو گیا۔

سو گیا، تو پچھلے پہر ایک انوکھا خواب دیکھا۔ سچا خواب یا میرے تصورات کا گرداب، میں کیا فیصلہ کروں۔ یہ دنیا بڑی حیرت ناک و پر اسرار ہے۔

ہاں تو، یہ خواب دیکھا کہ ایک تابناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور چاند ان کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آنکھوں میں خیرگی آئی، بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں، حافظہ جگمگا اٹھا، میں پہچان کر اُن کے قدموں پر گر گیا اور منہ ملنے لگا، ان کے نعلین پر۔ انھوں نے ہاتوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھا لیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ وہی میرے رسول ہیں، جنھوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں[لہ] مجھے دکھایا تھا؟ یہ سن کر وہ مسکرائے اور ارشاد فرمایا، ہاں میں وہی تمھارے پہلے خواب کا محمدؐ ہوں۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں پر گر کر اور ان کے نعلین سے منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

میرے محمدؐ نے فرمایا " اُٹھ کھڑے ہو"۔ میں ہات باندھ کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے کہا " تم ہنسنے کے لئے بنے ہو، روتے کیوں ہو" اور یہ کہتے ہی میری بائیں کی جانب اشارہ کر کے حکم دیا کہ تم اِس شخص کے پاس چلے جاؤ" میں نے اُدھر نگاہ اُٹھائی تو یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا " اے میرے رسول، یہ کون ہے؟" انھوں نے ارشاد فرمایا " یہ نظامِ دکن ہے، تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے۔

یہ سن کر میرا دل یکایک اس طرح دھڑکنے لگا کہ اس کے ضربات پیہم سے میری آنکھ کھل گئی اور روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

لہ ایک اسی قبیلے کا خواب پہلے بھی دیکھ چکا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

جی بھر کے رو چکا تو بستر سے اٹھا۔ منھ ہات دھونے لگا، منھ پر دو چار چھپکے، زور زور سے مارے تو حواس بجا ہوگئے، اور حواس بجا ہوتے ہی ایک بے پایاں حیرت نے میرے تمام وجود کا احاطہ کرلیا۔ اور سر پکڑ کر میں یہ سوچنے لگا کہ میں نے ایسی اوسر زمین پر مکان بنایا ہے جہاں دور تک کوئی باغ نہیں ہے۔ اور ابھی تک میں نے اپنے مکان کے گرد چمن بندی بھی نہیں کی ہے، نہ گھانس ہی لگائی ہے نہ خوشبودار پودے ہی نصب کئے ہیں! اور تو اور ابھی تک اس مکان کو ، پھولوں کے گملوں سے بھی نہیں سجایا ہے اور اس کے باوجود ایک نرالی خوشبو میرا احاطہ کئے ہوئے ہے ـــــ اور خوشبو بھی ایسی کہ عطر اور پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آخر یہ طلسم ہے کیا؟ کیا یہ خواب کے اثر کا جادو ہے، یا سچ مچ کی خوشبو ہے، یہ خیال کر کے مین نے بیوی کو جگایا کہ دیکھوں وہ بھی خوش بو محسوس کرتی ہیں کہ نہیں۔

بیوی، آنکھیں مَلتی اُٹھیں، پوچھا ٹہلنے جا رہے ہو؟ میں نے کہا" اور کیا، نوکر ہی اس لئے[1] بات کے ہیں۔ جلدی سے گلوریاں بنادو"۔ بیوی نے اُٹھ کر کُلّیاں کیں، پاندان کھولا، اور جیسے ہی انھوں نے چونے کی چمچی اٹھائی۔ بگڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا "سچ سچ بتاؤ، یہ رات کو مجھے سوتا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے کہ ایسے مہکے مہکائے اور پھولوں میں بسے چلے آرہے ہو۔ میں نے کہا اللہ اللہ کرو اشرف جہاں، اس چٹیل میدان میں کہاں جاؤں گا، لکھنؤ ہوتا تو بات بھی تھی۔ اور میں لکھنؤ میں بھی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ کہنے لگیں، اللہ ری ڈھٹائی، جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے جارہے ہو۔ تمہارے پاس سے خوشبو کی لپٹیں چلی آرہی ہیں، میں نے تو تمہارے کپڑوں میں عطر نہیں لگایا تھا۔ پھر یہ نگوڑی خوش بو کیوں آرہی ہے؟ یہ کس غیبانی کی، خاک میں ملی سیج کی خوش بو ہے؟

میں نے کہا" تمھیں جگا کر تو میں گناہ گار بن گیا ـــــ آؤ اور سونگھ کر دیکھ لو میرے کپڑوں کو، اگر میرے کپڑوں میں خوش بو ہو تو میں گناہ گار ٹھہر جاؤں گا"

---

[1] ظہور علی خاں کی کہانی کا ایک بار بار دہرایا ہوا فقرہ، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

وہ میرے کپڑے سونگھنے کو اٹھیں، اور سونگھ کر کہا "تمھارے کپڑوں سے برابر خوش بو آرہی ہے، اب بھی انکار کردگے ؟" ــــ میں نے کہا دوسرے کمرے میں چل کر میرے کپڑے سونگھو۔ تب ٹھیک ٹھیک پتا چل جائے گا تم کو ــــ انھوں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو ؟ میں نے کہا چلی تو چلو دوسرے کمرے میں، پھر میں سارا ماجرا بیان کردوں گا ــــ دوسرے کمرے میں جاکر انھوں نے خوب زور زور میرے کپڑے سونگھے، بار بار سونگھے، اور کہنے لگیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا طلسم ہے، وہاں تمہارے کپڑوں میں خوشبو تھی یہاں بالکل نہیں ہے، کیا تم نے کوئی جنتر منتر سیکھ لیا ہے؟ اس کے بعد میں نے ان سے اپنا سارا خواب بیان کرکے کہا کہ یہ اس خواب کا کرشمہ ہے۔ انھوں نے پہلے تو اپنے منہ پر تھپیڑ مار مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی، اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اس خوشبو کو نگوڑی کہا تھا۔ اور پھر مجھ سے کہا۔ تم کو بڑی بشارت ہوئی ہے، میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں ــــ میں نے ان سے کہا، تم کچھ نہ بولنا، میں گلابو کو اوپر بلاتا ہوں، دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ میں نے گلابو کو آواز دی، وہ اوپر آئی، میں نے کہا حقّہ بھر لاؤ۔ وہ تنباکو نکالنے کے لئے الماری کی طرف بڑھی، اور دو قدم چل کر اس نے ایک لانبی سانس لے کر پوچھا، بی بی یہ کھس بو (خوش بو) کیسی آرہی ہے ؟ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا وہ بھوچکّا ہوکر مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں نیچے سے چھوٹے دادا کی آواز آئی ــــــ بھائی شبیر حسن خاں آج ٹہلنے کے لئے نہیں چلئے گا، میں نے کہا اوپر آجایئے، حقّے کے دو ایک کش لے کر چلیں گے۔ چھوٹے دادا، حسب عادت قہقہے مارتے اوپر آئے، اپنی ٹوپی تڑ سے تخت پر پھینک دی اور کان کھڑے کرکے، گہری گہری سانسیں لینے لگے اور پوچھا، بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی، آج تم نے یہ کیسا عطر لگایا ہے کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک پھریری ہمیں بھی دے دو، الغرض، کوئی آدھ گھنٹے تک وہ خوشبو میرے کمرے کے اندر مچلتی رہی۔

وہ خواب و خوش بو کا امتزاج آج تک ایک ایسا معما بنا ہوا ہے، جس کو

میں ,قطعیت کے ساتھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب اور اس کے بعد کی وہ خوشبو میرے آبائی عقائد کی ایک محسوس کیفیت، یا میرے شاعرانہ تصورات کی ایک حیرت ناک خلاقی ہو۔ ایسی خلاقی جو حواس کو فریب دے سکتی ہے، یا جناب والا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے اس ابتدائی دور کے تمام قیاسات اور اب تک کے تمام سائنسی انکشافات سے قطعاً مختلف کوئی اور ہی چیز ہو۔۔۔ بابا اس عالم" امکان" میں وہ کیا ہے جو ہو نہیں سکتا۔ ہماری اس دنیا کا یہ" ہو سکنا پن" اور اس کی یہ" امکانیت" ایک ایسا بے کراں میدان ہے جس کی حد بندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ؎

ہر کس، نہ شناسندۂ راز است دگرنہ
ایں ہا، ہمہ راز ست کہ "معلوم عوام" است

سریرِ اَمارت سے
حصیرِ ملازمت کی جانب

اس خواب کے بعد میری

ضعیف الاعتقاد بیوی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم کو رسول اللہ نے حکم دیا ہے دکھن جانے کا " جاؤ اور جلدی جاؤ۔

بیوی بے چاری کو تو میں نے کھٹ سے "ضعیف الاعتقاد" کہہ دیا — لیکن "اپنے گریبان میں مُنھ ڈال کر، یہ بات نہیں سوچی کہ اس وقت میں بھی کون سا بقراطِ اعظم تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں تقشف کو ترک کر چکا۔ اور انسان کی دردمندی کو دیکھ کر، خدا کی شفقت و رافت سے بھی بدگمان ہو چکا تھا، لیکن، اُن دو بُرجوں کے گر جانے سے ہوتا کیا ہے، دین کی پوری عمارت تو مسمار ہو کر نہیں رہ گئی تھی — اس لئے میں بھی، اس بشارت کے امتحان کی خاطر، حیدرآباد جانا چاہتا تھا۔ یعنی بیوی ہی کے دل میں نہیں، میرے دل میں بھی چور تھا، جو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفرِ دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا، بلکہ میری ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی، جو حیدرآباد جائے بغیر، کھُل ہی نہیں سکتی تھی۔

لے حیدرآباد پہنچ کر میں نے "تیرے لئے" کی سرخی سے ایک نظم بھی کہی تھی، جس کے یہ دو تین شعر پڑھ کر آپ کو میرے اُس رومان کا پتہ چل جائے گا۔

دیکھو کیوں کر جی رہا ہوں دل رُبا تیرے لئے
ہر نفس ہے، اک حدیثِ کربلا، تیرے لئے

پھیر لیں آنکھیں، مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے، تیرے واسطے
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے

(مطبوعہ "نقش و نگار" ۱۹۳۶ء)

ہر چند، حیدر آباد جانے کی بات، میرے دل میں ٹھن چکی تھی، مگر سوچتا تھا کہ وہاں مجھے پوچھے گا کون۔ نہ ایم اے ہوں نہ صدر الافاضل۔ لے دے کر میری صرف ایک کتاب "روح ادب"، چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے، مگر ایک تھرڈ ڈل ٹوں کتاب سے ہوتا ہی کیا ہے ــــ ایک کتاب ــــ ایک کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے کہیں شخصیت بنا کرتی ہے۔ شخصیت تو بنتی ہے ایک جگ بیت جانے سے، اور سالہا سال خون جگر شکو کرنے کے بعد۔ اور پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ میرا مزاج بہت ہی نازک، نوکری کا ننگ برداشت ہوگا کیوں کر۔ اور، اقربا، و احباب بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ اس خبط سے دست بردار ہو جاؤ، اور اگر ایک مہینے کے اندر اندر نظامِ دکن کو گالیاں دے کر واپس نہ آ جاؤ تو چوچور کی سزا ہے۔ وہ ہماری یہ تمام باتیں سچائی کے عنصر سے خالی نہیں تھیں ــــ لیکن میری بیوی اور خود میرا دل حکم دے رہا تھا کہ حیدر آباد جائے بغیر دم نہ لے۔

الغرض، عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم سے خط و کتابت کرکے، اور، مہاراجہ کشن پرشاد کے نام، حضرت اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی، حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی سے، سفارشی خط حاصل کر کے میں ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچ گیا۔[1]

---

[1] میرا رختِ سفر، جب گھر سے باہر جانے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ عزت آباد کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اور میری ماں نے جب یہ بین کیا کہ اے میرے قبر میں سونے والے سرتاج آؤ اور دیکھو کہ تمھارا نازوں کا پلا بچہ، نوکری کرنے باہر جا رہا ہے تو گھر بھر میں پٹس پڑ گئی اور، جب، آہ و فغاں کے شور میں، سب سے گلے مل مل کر، میں رخصت ہونے لگا، اور آداب خاندان کے جبر سے۔ بیوی کو گلے نہ لگا سکا، تو ان کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھ سے کہا، ہم سے گلے نہیں ملے، میں نے۔ اداسی کے ساتھ، آنکھیں جھکا لیں۔ اور جب اپنے دھڑکتے دل پر قدم رکھتا باہر آیا تو تمام نوکر چاکر بھی رونے لگے۔ اور جب ملیح آباد سے ریل چلی، باپ کی زندگی ہوتی آواز آئی۔ اے میرے لاڈے بیٹے، اللہ تیرا نگاہ بان، ہائے کیا کروں، موت نے بےکس کر دیا ہے۔ تجھ کو روک نہیں سکتا، اور اُسی کے ساتھ ساتھ، میرے دادا کے باغوں نے، جھک جھک کر مجھے سلام کیا، اور، سرزمینِ وطن نے۔ گریباں پھاڑ کر، خدا حافظ و ناصر کا نعرہ لگایا اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اور حزیں کا یہ شعر، زبان پر جاری ہو گیا۔

بنو مید، حزیں، از کوئے او، بارِ سفر بستم ــــ خدا صبرے کند روزی، دلِ اُمید دارم را

(میں نے ایک نظم، اسی زمانے میں "الوداع"، کے نام سے کہی تھی، جو "نقش و نگار"، میں موجود ہے، اُسے پڑھ کر میری اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے)

حیدر آباد[1] میں، سب سے پہلے، مہاراجہ کشن پرشاد سے ملا، مجھے دیکھتے ہی، انھوں نے کہا جوشؔ صاحب آپ کا مجموعۂ کلام "روحِ ادب"، دیکھ کر میں نے تمنا کی تھی کہ اللہ اس درویش صفت رئیس زادے سے ملائے، سو میری وہ تمنا آج پوری ہوگئی ۔ میں نے وہ سفارشی خط پیش کئے، انھیں پڑھ کر، وہ کچھ سوچنے لگے، اور، تخلیئے میں لے جاکر، مجھ سے کہا، جوشؔ صاحب یہ بات اپنے تک رکھیئے گا کہ میں آج کل سرکار کا معتوب ہو چکا ہوں، اگر آپ میرے زمانے میں تشریف لاتے تو میں اسی دن آپ کا انتظام کر دیتا۔ بہر حال میں فنانس منسٹر اکبر حیدری کے نام ابھی خط لکھے دیتا ہوں، وہ مجھے بہت مانتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ یہ کہتے ہی، کوئی تین صفحوں کا لمبا چوڑا خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور فون کر کے اسی وقت انھوں نے حیدری سے میری زبردست سفارش بھی کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ، سر راس مسعود کو بھی فون پر ہدایت کر دی کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جاکر، حیدری سے ملا دیں۔ راس مسعود مجھے حیدری کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ ہماری قوم کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ آپ کے دوست حضرت اقبال نے بھی ان کی بڑی زبردست سفارش کی ہے، اور مہاراجہ نے بھی یہ خط آپ کو بھیجا ہے ــــ حیدری صاحب نے خط پڑھ کر کہا ان کے متعلق مہاراجہ مجھ کو فون بھی کر چکے ہیں ــ اور پھر میری طرف منہ کر کے، حیدری صاحب نے کہا آپ آئندہ جمعرات کے دن، صبح دس بجے میرے پاس آجائیے گا میں آپ کو سرکار سے ملا دوں گا[2]۔

---

[1] حسنِ اتفاق سے اس وقت مہاراجہ کے دربار میں سید محمد حسین صاحب، صدر محاسب، نواب بہادر جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب قادر نواز جنگ، نواب مہدی یار جنگ، اور سر امین جنگ موجود تھے ۔جو۔ آگے چل کر میرے بہت گہرے دوست بن گئے تھے اور میرے بہت کام آئے۔

[2] ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدہ سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، مگر وہ جو کہاوت ہے کہ بکری نے دودھ دیا، سو وہ بھی مینگنی بھرا، مجھے ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ "میں" کے لفظ کو، بکسرۂ میم، ادا کر کے، بکریوں کی طرح "میں" "میں" کر رہے تھے، اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ نے میری گشود کار کی صورت نکالی تو، مگر ایک بکری کی معرفت ۔خوب جانتا ہوں کہ درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ برے، ان کا اچھا یا برا لگنا، مبنی ہوتا ہے کانوں کی موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ، بچپن سے، جس

ابھی جمعرات میں دو دن باقی تھے کہ حیدری صاحب نے مجھے بُلا بھیجا، راس مسعود بھی وہاں موجود تھے نہایت نفیس چائے پلائی، اور، اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انھوں نے مجھ کو اُن قطعات کا ایک بنڈل دیا، جو شاعروں نے اُن کے خطاب "سر" کی مبارکباد کے طور پر کہہ کر، ان کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ میں وہ قطعات پڑھ چکا تو حیدری نے کہا، جوشؔ صاحب آپ بھی ایک "کتا" (قطعہ) کر دیں۔

ایک طرف تو لفظِ "قطعہ" کو "کتا" سن کر، میں بھنّا گیا، اور دوسری طرف، چوں کہ میں فرنگی حکومت سے بیزار تھا، میرے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا ـــــ

حیدری صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ یکایک اس قدر سیریس (SERIOUS) سنجیدہ کیوں ہو گئے۔ میں نے کہا آپ بُرا نہ مانیں تو کہوں کہ فرنگی جس شخص کو خطاب دیتا ہے اُس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے ـــ یہ سُن کر راس مسعود اور حیدری چراغ پا ہو کر کھڑے ہو گئے، مجھ کو تنہا چھوڑ کر، دوسرے کمرے میں چلے گئے، اور میں اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔[1]

جب یہ بات سُنی تو نواب مہدی یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کو اپنے

طور پر سنتے آتے ہیں، جب وہی لفظ بدلے ہوئے لہجے میں سُنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود، آج بھی جب کوئی شخص لفظِ "اَدب" کی دال کو ساکن کر کے "اَدْب" یا "گاڑی" کو "گڈّی" کہتا ہے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھا کر دے ماروں ـ یہ بات فقط لہجوں تک محدود نہیں، عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہنِ انسانی کے موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں ۔

یہ دنیا ذہن کی بازی گری معلوم ہوتی ہے
یہاں ، جس شے کو جو سمجھو وہی معلوم ہوتی ہے !!

[1] ذرا دیکھئے تو میری دانائی، ارے ملازمت کی خواستگاری اور اُس پر یہ برہنہ گفتاری سچ کہا تھا، خدا بخشے، محمد غنی خاں نے کہ بھائی شبیر حسن خاں، شعر، ویر، میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم، بہاتما قسم کے چوتیے ہو۔

والد نواب عماد الملک کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرے والد، سفارش کے معاملے میں، اس قدر سخت ہیں کہ جب میں کیمبرج سے امتحان پاس کر کے آیا تھا تو انھوں نے میری سفارش تک سے انکار فرما دیا تھا۔ بہرحال میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں، ہر چند، مشکل ہے، دو فی صد امید ہے، لیکن اگر انھوں نے سفارش کر دی تو حیدری صاحب کی لاکھ سفارشوں پہ بھاری ہوگی۔

اُن کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اَسّی، پچّاسی برس کے مَرد بزرگ برآمدے کی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے پر علم و فضل اور مضبوط کردار کا جلال برس رہا ہے۔ مہدی صاحب نے میرا تعارُف کیا؟ اعتنا کی ایک دھاری بھی ان کے چہرے پر نہیں دوڑی، میرے دل پر زبردست چوٹ لگی، لیکن پی گیا۔ میری اہمیت ظاہر کرنے کے لئے، مہدی صاحب نے کہا، اَبّا یہ جوشؔ صاحب حُسامُ الدَّولہ، تہوّر جنگ نوّاب فقیر محمّد خاں، گویاؔ کے پوتے ہیں، یہ سن کر، وہ چونک پڑے، اور کہنے لگے شمالی ہندوستان کا وہ ایسا کون باشندہ ہے جو ان کے دادا کے نام سے واقف نہ ہو۔ لیکن ان کی ذات میں بھی کوئی جوہر ہے؟ مہدی صاحب نے کہا یہ بہت اچھے شاعر ہیں، آپ اجازت دیں تو جوش صاحب کچھ سنائیں۔

انھوں نے کہا اچھا۔ مہدی صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب ارشاد۔

اور جب میں نے اپنے ایک مُسَدَّس کے تین چار بند سنائے۔

تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے اس نوجوان میں تو انیسؔ کی روح بول رہی ہے، یہ عمر، اور اس قدر پختگی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح یہ بھی آئیں بائیں شائیں کہتے ہوں گے مگر ان کے کلام میں تو روانی بھی ہے، اور معانی بھی۔ مہدی خط لکھنے کا کاغذ لاؤ، مہدی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، جلدی سے، اندر جا کاغذ و قلم لے آئے، آرام کرسی کے دونوں ہتّوں پر، ایک تختہ رکھ دیا۔ نواب عماد الملک نے، پورے ایک صفحے کا سفارشی خط لکھّا، اور کہا کہ مہدی تم یہ خط، سَر امین جنگ کے حوالے کر کے، میری طرف سے کہہ دینا کہ سرکار کے روبرو پیش کر دیں۔

نواب عماد الملک کے مکان سے گیسٹ ہاؤس آیا، "چھوٹے دادا" نے تار دیا تار کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ میری بیوی پرسوں شام کی گاڑی سے حیدرآباد آ رہی ہیں میں حیران ہوگیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ملازمت تو درکنار، میں نے ابھی تک تو نظام کو دیکھا بھی نہیں ہے، اور، بیوی ہیں کہ چلی آ رہی ہیں۔

لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ تیسرے دن میری بیوی، دونوں بچوں اور اپنے ماموں کو ساتھ لئے۔ حیدرآباد آ گئیں اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی، آب دیدہ ہوکر، کہنے لگیں کہ میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ تمھارے دونوں بچّے تمھارے حوالے کردوں، اور، خود، اپنی ہیرے کی انگوٹھی، کچل کر، کھالوں، اور اس دنیا سے سدھار جاؤں، یہ سنتے ہی، میرے ہوش اُڑ گئے، اور، گھبرا کر، پوچھا اشرف جہاں، خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔ انھوں نے، روتے ہوئے کہا ماموں کو بلا کر پوچھ لو۔

ماموں نے آکر، جیب سے ایک تار نکالا۔ میں نے تار پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اللہ کے بندے نے ان کے پاس یہ تار بھیجا تھا کہ آپ کے شوہر عقد ثانی کر رہے ہیں، فوراً حیدرآباد پہنچ جائیے۔ میں نے کہا اشرف جہاں یہ تار بالکل جھوٹا ہے۔ بیوی نے کہا کہ اگر یہ تار جھوٹا اور تم سچے ہو، تو اپنے بچوں کے بازو پکڑ کر قسم کھالو کہ تم دوسرا نکاح نہیں کر رہے تھے اور جب میں نے، اپنے بچوں کے دونوں بازو پکڑ کر، بڑے ولولے کے ساتھ، قسم کھالی تو ان کا چہرہ بحال ہوگیا۔

اتنے میں چھوٹے دادا، ہنستے ہوئے آئے، اور، میری بیوی کے دل پر اپنی خیر خواہی کا سکّہ بٹھانے کی خاطر، انھوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی۔ یہ تار میں نے دیا تھا۔ میں نے، بُرا مان کر کہا چھوٹے دادا آپ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے کہا میرے بھائی بُرا نہ مانو، مجھ سے یہ کب ہو سکتا تھا کہ تمھارا گھر بگڑے اور میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہوں۔ میں نے کہا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میرا گھر بگڑ کب رہا تھا۔ اُنھوں نے کہا وہ شوق والی بات یاد کرو۔ جو ایک لڑکی کا پیام لے کر، تمھارے پاس

لہ میں انھیں اور رمضانی باورچی کو، ملیح آباد سے، اپنے ساتھ لایا تھا۔

آئے تھے۔ بیوی نے بگڑ کر مجھے دیکھا اور کہا لو اب تو بات کھُل گئی۔ ہائے تم کیسے باپ ہو کہ تم نے اپنے دونوں بچوں کی بانہیں پکڑ کر جھوٹی قسم کھائی۔

میں نے جھلا کر کہا، اپنے بچوں کی جھوٹی قسم کھانے والے قصائی پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، اب پوری بات مجھ سے سُن لو۔ یہاں ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں، ان کی صاحبزادی نے، خدا جانے مجھے کیوں کر دیکھ لیا کہ مجھ پر عاشق ہو گئیں، اپنی خادمہ کے ہات خط بھیجا اور لکھا کہ میری ماں نے میرے باپ کو اس بات پر طیّار کر لیا ہے کہ وہ آپ سے میری شادی کر دیں، کل ابّا کے مُصاحب شوق صاحب آئیں گے آپ کے پاس۔ چناں چہ، اس کے دوسرے روز ہی شوق صاحب نے اُن جاگیردار صاحب کا نام لے کر مجھ سے آکر کہا کہ اگر آپ ان کی صاحبزادی سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کے والدِ ماجد کو اس بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کر دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ، انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپ کے رہنے کے لیے ایک کوٹھی اور ایک کار کا انتظام کر دیا جائے گا، آپ کے تمام خانگی مصارف جاگیر سے ادا کیے جائیں گے، اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی آپ کو دیا جائے گا۔ بیوی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ، بات کاٹ کر پوچھا اور پھر تم نے کیا جواب دیا، میں نے کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ شوق صاحب، میری شادی ہو چکی ہے، میں دو بچوں کا باپ ہوں، ہم میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بے حد محبت ہے، اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اُن پر سوت لاؤں۔ یہ کہہ کر میں نے، چھوٹے دادا سے کہا کیوں صاحب میں نے آپ سے یہی بات کہی تھی نا یا کچھ اور؟ چھوٹے دادا نے کہا، نہیں یہی بات کہی تھی۔ میں نے کہا جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں سراسر انکار کر چکا ہوں، تو پھر آپ نے میری بیوی کو تار کیوں دے دیا — چھوٹے دادا نے کہا میرے بھائی، آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی، میں نے سوچا کہ تمھاری بیوی کو بلا کر تم پر مسلط کر دوں۔

یہ بات سُن کر، میری بیوی کے دل کا کانٹا نکل گیا۔ کہنے لگیں اُس بھڑوے شوق کو اب کبھی اپنے گھر نہ آنے دینا۔ علی کی تیغ لوٹے اُس نگوڑے پر، میرا لاکھ کا گھر

خاک کرنے آیا تھا مُوا، دوسرے ہی دن بیوی نے، مٹھائی منگا کر، مولا مشکل کُش کی نیاز دلائی۔ اور گھر کا مطلع صاف ہو گیا۔

ایک روز میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ نواب عماد المُلک کے خط کو بھی تقریباً ایک ماہ گزر چکا ہے، لیکن نظام نے اب تک مجھے طلب نہیں کیا ہے، شاید وہ تیر بھی خطا کر گیا کہ پل بھر میں، غم گیں ہونے کے عوض۔ میرے دماغ میں ایک مسخرگی کی لہر دوڑ گئی، اور اس نے کھٹ سے، ایک بازاری سا مطلع کہ کر ما پیش کر دیا۔ اس مطلع پر مجھے، بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں ہنستا ہوا بیوی کے پاس آیا، لو اشرف جہاں، ایک مطلع سُنانے اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اس مطلع کے بعد میرے دل سے برابر یہ آواز آ رہی ہے کہ یا تو نظام آج ہی مجھ کو حیدر آباد سے نکال دیں گے یا آج ہی اپنے پاس بلا لیں گے۔ ان دو باتوں کے سوا، کوئی تیسری بات ہو ہی نہیں سکتی، بیوی نے، مسکرا کر کہا مجھ پر تمھاری درویشی کا سکہ نہیں بیٹھ سکتا۔ تم آئے دن تو "زُلفِ پیچاں" اور "روئے خوباں" بکتے رہتے ہو۔ اور میرے سامنے آئے ہو۔ ولی اللہ بن کر۔ میں نے کہا تم میرے مرتبے سے واقف نہیں۔ حشر کے میدان میں جب تم پوچھو گی کہ ارے یہ کون ہے کہ اللہ میاں کے قدموں کے پاس بیٹھا ہوا، گڑگڑ حقہ پی رہا ہے، تو فرشتے جواب دیں گے کہ یہ اعلیٰ حضرت جوش صاحب قبلہ ہیں، اور، تم بھڑ بھڑا کر، میرے قدموں پر گر پڑو گی۔ وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں، اور خوب ہنس چکیں تو کہا، اچھا وہ شعر تو سناؤ۔ میں نے کہا مطلع کو شعر کہہ رہی ہو، ماشاء اللہ، انھوں نے کہا زیادہ لیاقت نہ بگھارو، اور مطلع سناؤ۔ میں نے کہا لو سُنو۔

دشمن ہوں، اس زمین پہ، شاہ و وزیر کا
لونڈا ہوں، آسماں پہ، جنابِ امیر کا

مطلع سُنتے ہی، توبہ توبہ کر کے اُنھوں نے اپنا مُنھ پیٹ لیا، کہنے لگیں تُم کھڑے دوزخ میں جاؤ گے۔ توبہ، توبہ، ارے کہاں جنابِ امیرؑ اور کہاں یہ باتیں۔ اور پٹھان ہو کر اپنے کو لونڈا کہتے ہوئے تمھیں شرم بھی نہیں آئی۔ میں نے کہا ارے خاک سمجھتی ہو

تم شاعری کی زبان کو۔ اس شعر میں "لونڈے" کے معنی ہیں "روحانی چیلا"، اور "جھینا"۔ تمھیں کیا خبر کہ ہم شعرائے کرام، الفاظ کے معنی یوں بدل دیتے ہیں کہ لغات کا منھ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

بیوی نے کہا بھاڑ میں جائے ایسا مسخرہ پن۔ کہ اُسی آن، دروازے پر موٹر آگئی زن زن۔ اور برآمدے میں تالی[1] بجنے لگی، ٹھن ٹھن۔

باہر آیا تو دیکھا نواب قادر نواز جنگ کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا۔ مبارک ہو، جوش صاحب سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے، ابھی طیار ہو جائیے۔

میں اندر گیا، اور بیوی کے سامنے جھک کر، کہا آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحب، کیا میں نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ یا تو نظام مجھے آج ہی نکال دیں گے، یا آج ہی بلا لیں گے، ؟ دیکھا جو اس درویش نے کہا تھا، وہی ہوا نا، اب نظام نے مجھے بلا بھیجا ہے۔ بیوی نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، کہا بہت شیخی نہ بگھارو، جلدی کپڑے پہنو اور جاؤ۔

کنگ[2] کوٹھی کی، کائی لگی، کالی کالی، دیواروں، اور، اُس کے شاہانہ پھاٹک کے بوسیدہ پردے پر، عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالتا، اور بے پایاں دولت کے پیدا کردہ، بے کراں افلاس پر غور کرتا، جب محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشا دیکھا کہ وہاں سبزے کا فرش ہے۔ نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سرو چنار۔ سوکھا، روڑھا صحن ہے، اور اُس بجھے بجھے صحن میں، ہزاروں چیزیں، نہایت بے قاعدگی کے ساتھ، ادھر اُدھر، بکھری پڑی ہیں۔ سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین سیڑھیوں کا برآمدہ ہے۔ برآمدے میں ایک بے

---

[1] اہل حیدرآباد، تالی بجا کر، اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔

[2] نظام کے محل کا نام۔ اصل میں کوٹھی تھی کسی "کمال خاں" کی، جس نے پتھروں سے کام لے کر، اس کوٹھی کے تمام دروازوں وغیرہ پر "K.K" یعنی "کمال خاں" کھدوا دیا تھا، جب نظام نے قبضہ کر لیا تو اُس "کے کے" دو حروف کو "کنگ کوٹھی" میں تبدیل کر دیا۔ کیا وہ کمال خاں دروازہ پر "ک خ" نہیں کھدوا سکتا تھا۔ ؟ لیکن اس نے اپنے حروف بجائے گریز کر کے، انگریزی کے حروف کو اس لئے انتخاب کیا تھا کہ اُس کو "صاحب بہادر" سمجھا جائے۔ ڈوب مرا اے چڑیا کے غلام

بالش، چھوٹی سی کرسی پر، ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا، دبلا پتلا آدمی، میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے، اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور اس کی بے پھندنے کی بوسیدہ ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل کی ایک چوڑی تہ جمی ہوئی ہے، اور اس کے سامنے، تیس چالیس عمائد شہر اور اعیان ریاست، دستار و بکوس لگائے، اونگھی مرغابیوں کے مانند، دست بستہ و سرنگوں، کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کے پیچھے، بہت سے چیڑ کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں۔

میری نذر قبول کر کے انھوں نے، اپنے دست بستہ حاضرین سے کہا، انھیں پہچانتے دیہچانتے ہو، عماد الملک نے لکھا ہے کہ یہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں۔ اگر اودھ کی سلطنت برباد نہ ہو جاتی، تو یہ دکن کیوں آتے۔ آدھے مسلمانوں کو اودھ سنبھال لیتا، آدھے مسلمانوں کو دکن۔

اس کے بعد نظام نے اپنے استاد، حضرتِ جلیل مانک پوری کو مخاطب کر کے کہا، استاد ان کے خاندان سے تم تو خوب واقف ہو گے۔ استاد نے، ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوندا ان کے والد نواب بشیر احمد خاں نے، اس وقت میری امداد کی تھی، جب کہ میرے استاد، حضرت امیر مینائی کے انتقال کے بعد، کوئی میرا سرپرست باقی نہیں رہا تھا۔ جلیل صاحب کی اس شرافت پر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نظام نے حضرتِ جلیل کا یہ اعترافِ احسان سن کر، اور میری آنکھوں کی نم ناکی کو دیکھ کر، کہا استاد آپ، اور جوش، دونوں بڑے شریف آدمی ہیں، آپ نے، سب کے سامنے، یہ بات، بے جھجک کہہ دی کہ ان کے والد نے تمھاری مدد کی تھی، اور تمھارا یہ اعتراف سن کر، جوش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مجھ کو تم دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر، نظام نے کہا۔ عماد الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود، تمھاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے، اپنی کوئی چیز سناؤ۔

میں نے مطلع سنایا:۔

لہ استاد تک کو "آپ" نہیں "تم" سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ دولت جو چاہے، کرے، کون بول سکتا ہے
لہ ہائے، استاد، اور شاگرد سے ہاتھ جوڑ کر بات کرے۔ لے حکومت کی ریت کیا کہنا تیری شرافت کا۔

ملا جو موقع ، تو روک دوں گا جلال ، روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا ، رحمت کا وہ قصیدہ ، کہ ہنس پڑیگا عتاب تیرا

نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا ، زیرِ لب " واہ " کہا ، اور جب میں نے یہ شعر پڑھا :-

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا ، عرش کانپ اٹھتا
اگر میں ، دل پر نہ روک لیتا ، تمام زورِ شباب تیرا

تو نظام نے ، جھوم کر ، کہا " بہت اچھا ، بہت اچھا ، بہت اچھا ، اور تمام حاضرین ، زور زور سے داد دینے لگے اور میری غزل کے اختتام پر ، نظام نے کہا ، استاد جلیل ، ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ ، بوڑھے ہو کر ، یہ تمھاری " سرہٹی "[1] کے ہو جائیں گے ۔

اس کے بعد ، انھوں نے پوچھا ۔ جوش تمھاری شادی ہو چکی ہے ؟ میں نے کہا میری شادی ہو چکی ہے ، اور میری بیوی یہاں آ بھی چکی ہیں ۔ " یہاں آ چکی ہیں " ، انھوں نے حیرت سے کہا ، اور پھر فرمایا کہ تمھاری ملازمت سے پیش تر ، وہ یہاں کیوں چلی آئیں ، انھوں نے یہ خیال کیوں نہ کیا کہ اگر یہاں تم کو ملازمت نہ مل سکی ، تو ان کا یہاں چلا آنا بیکار ہو جائے گا ۔

میں نے کہا سرکار ، میری بیوی کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ کو یہاں ملازمت نہ ملے ۔

نظام نے پوچھا تمھاری بیوی کو اس بات کا یقین کیوں تھا کہ تم کو یہاں ملازمت ضرور ہی مل جائے گی ۔ یہ سوال سن کر میں چپ ہو گیا ، سوچنے لگا کہ اس خواب کا ماجرا کہوں یا نہ کہوں ۔

میری اس شش و پنج کو دیکھ کر ، نظام نے کہا ۔ بولو جی ، بولتے کیوں نہیں ۔
اس موقع پر نواب مہدی یار جنگ ، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے ، اور چوں کہ میں اُن سے اپنا خواب بیان کر چکا تھا ۔ انھوں نے کہا ، خداوندی کی اجازت ہو تو فدوی اس کی علت

---

[1] درجے کے ، ہم پایہ ، ہم سر ۔

بیان کردے۔ نظام نے کہا بولو۔ بولو۔ اور جب مہدی صاحب نے میرا تمام خواب بیان کردیا۔ تو نظام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے؛ اور کہا تو یہ بولو کہ سرکار دو عالم نے جوش کو میرے سُپرد فرمایا ہے، یہ کہا اور وہ اپنے دونوں ہات۔ سینے پر رکھ کر جھک گئے، اور تمام دربار پر ایک گہرا سکوت چھاگیا۔

اس باریابی کے ایک ہفتے کے بعد، عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ دارالترجمہ کے ناظم، عنایتُ اللہ صاحب نے، جو مولوی ذکاراللہ صاحب دہلوی کے فرزند، اور اکبر حیدری دراس مسعود کے پرستار ہونے کی بنا پر میرے بدخواہ بن چکے تھے۔ مجھے بلاکر کہا جوش صاحب مُبارک ہو، یہ لیجیے شاہی فرمان، سرکار نے، پولیٹیکل اکانومی کے مُترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرّر فرمادیا ہے۔

میں نے اُن سے کہا، پولیٹیکل اکانومی سے میرا کوئی تعلّق نہیں، اُنھوں نے خوش ہوکر، کہا تو پھر آپ انکار لکھ دیں ۔ میں نے، فرمان کے حاشیے پر یہ لکھ دیا کہ سرکارِ والاتبار کلبے حدشکریہ، لیکن چوں کہ پولیٹیکل اکانومی میرا سبجکٹ نہیں رہی ہے، اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو، باحسن الوجوہ، نہیں کرسکوں گا، البتہ اگر انگریزی ادب کے ترجمے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا تو اُسے بڑی خوبی کے ساتھ، انجام دے سکوں گا۔

عنایتُ اللہ نے کہا انگریزی ادب تو انگریزی ہی میں پڑھایا جاتا ہے، اس لئے اس کے ترجمے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے، آپ یہ عبارت قلم زد کردیں۔ میں نے کہا، کیا مضائقہ ہے، رہنے دیجیے، کاٹوں گا تو بدنمائی پیدا ہوجائے گی۔

عنایتُ اللہ نے کہا۔ ناظمِ شعبہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی عبارت کے نیچے، یہ نوٹ لکھ دوں کہ انگریزی ادب براہ راست پڑھایا جاتا ہے، اس کا ترجمہ ایک فعلِ عبث ہوگا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میں نے کہا بڑے شوق سے لکھ دیں آپ۔

اُس کے چوتھے یا پانچویں دن، عنایتُ اللہ خود میرے پاس آئے، اور کہنے لگے، جوش صاحب، مُبارک ہو، سرکار نے، انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا

تقرر فرما دیا ہے۔ یہ لیجیے فرمان، اور لکھ دیجیے اس پر اپنی منظوری۔

میں نے دیکھا کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ، ہر چند اس نئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن سرِ دست جوش ملیح آبادی کا مُترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے، اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے۔ میں نے، شکریے کے ساتھ، اس فرمان پر دستخط کر دیئے۔ اور، عنایت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد، میں نے بیوی کو یہ خوش خبری سنائی، انھوں نے، اپنے دونوں ہاتوں کی انگلیاں، اپنے ماتھے پر چٹکا کر کہا، قربان جاؤں اپنے رسول اللہ کے۔ دیکھی تم نے اُس خواب کی تعبیر، تم نے تو حیدری سے بگاڑ کر، اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی لیکن اللہ نے تمھاری مدد کی۔ عماد الملک تمھاری پُشت پناہی کو کھڑے ہو گئے، میں تو کہتی ہوں پتھر سے پانی نکل آیا۔ اور دوسرے ہی دن، بیوی نے بڑی دھوم سے میلاد کیا اور محلے بھر میں مٹھائی بٹوائی۔

تقرر کے بعد، شکریے کی نذر لے کر، پہنچا، ایک نذر اپنی طرف سے، اور دو نذریں بیوی بچوں کی طرف سے پیش کیں۔ نظام نے کہا ابھی کیا ہے، میں تمھیں اس قدر دوں گا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ کتنی بیویاں ہیں تمھاری؟ میں نے کہا میری تو صرف ایک ہی بیوی ہیں، انھوں نے کہا میں نے سُنا ہے کہ اودھ کے تعلقہ داران کے بہت سے بیویاں ہوتے ہیں۔، میں نے کہا سرکارِ والا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے، بے حد محبت کرتے ہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی بھی، میری ہی طرح، پٹھان نسل کی ہیں، اور اُس پر یہ طُرّہ کہ کئی برس سے وہ بے چاری شدید اختلاج میں مُبتلا ہیں، اگر میں دوسری شادی کر لوں گا تو اُن کی پھٹولی اور ان کا اختلاج، یہ دونوں مل کر، انھیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

نظام نے اختلاج کا حال سُنا تو پوچھا کب سے ہے، میں نے کہا چار، پانچ برس سے ہے، پوچھا کس کس کا علاج کرا چکے ہو، میں نے اُن کے معالجوں کے نام بتا دیئے، پھر سوال کیا اب تک علاج پر کس قدر روپیہ برباد کر چکے ہو۔ میں نے کہا، کم سے کم، پندرہ

بیس ہزار تک برباد کر چکا ہوں، لیکن مرض ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ سن کر، نظام نے، سیدھے ہو کر۔ بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ میں ڈاکٹری اور طب میں اس قدر دست گاہ رکھتا ہوں کہ، ہر چند میں باقاعدہ مطب نہیں کرتا۔ لیکن بڑے بڑے ڈاکٹراں، اور طبیباں کے لباں نہیں کھلتے ہیں، میرے سامنے ـــ یہ کہہ کر، وہ اندر گئے، اور دو چار منٹ کے بعد آکر چوب دار کو آواز دی کہ لے یہ پانچ ٹریاں، عیسیٰ میاں کے بازار کے دواخانے سے، گاؤزبان اور خمیرۂ مروارید لے آ۔ جب دونوں دوائیں آگئیں، تو اُن کو میرے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ دوائیں، صبح و شام اپنی بیوی کو کھلاؤں پلاؤں، کسی دن ناغہ نہ ہونے دوں، اور عین "مرگ"[1]، کے دن آکر بتاؤں کہ اب میری بیوی کیسی ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس دن کے بعد، عین "مرگ" کے دن کنگ کوٹھی گیا۔ دو نذریں پیش کیں، اشرفیوں کو دیکھ کر، ان کے چہرے پر، سُرخی دوڑ گئی، پوچھا یہ دوسری نذر کس کی طرف سے ہے، میں نے کہا یہ میری بیوی کی طرف سے ہے، انھوں نے پوچھا بتاؤ، میری دواؤں کا اثر، میں نے، سفید جھوٹ سے کام لے کر، کہا۔ سرکار کی دواؤں نے تو جادو کا اثر کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کبھی اختلاج تھا ہی نہیں ـــ یہ سنتے ہی، ان کے چہرے اور ان کے تمام بدن میں، خوشی اور مفاخرت کی لہر دوڑ گئی اور چوب دار کو حکم دیا کہ فلاں فلاں "طبیباں"، اور "ڈاکٹراں"، کو فوراً حاضر کردے۔

جب تمام نامی "طبیباں" اور "ڈاکٹراں"، حاضر ہو کر، نذریں پیش کر چکے تو انھوں نے حکم دیا کہ تمام "طبیباں" میرے داہنے طرف، اور تمام ڈاکٹراں، میرے بائیں جانب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔ اور جب حکم کی تعمیل ہو گئی تو کوتوال شہر ونکٹا مار اریڈی کو، اُن صفوں کے درمیان، "مَرَجَ البحرین"، کے طور پر کھڑا کر دیا گیا۔

---

[1] دکن میں، برشگال کے یوم اوّلیں کو مرگ، اور آغاز موسمِ باراں کو، "مرگ لگنا"، کہا جاتا ہے۔

اس واقعۂ عجیب کی شہر بھر میں ڈُگی پٹ گئی کہ جوش صاحب اس قدر بلند اقبال ہیں کہ سرکار نے ان کی بیوی کے علاج کی خاطر، اپنی جیب سے، ایک نہیں، پورے پانچ روپے صرف کر ڈالے۔ اور مہاراجہ کشن پرشاد نے تو اس خوشی میں میری دعوت بھی کر ڈالی اور کہا ممالک محروسۂ سرکار عالی میں آپ وہ پہلے آدمی ہیں، جن پر نظام نے پانچ روپے اپنے جیب سے خرچ کر ڈالے ہیں۔

اور عین اُس وقت، جب کہ حکیم ڈاکٹر، ان کی طرف اس اُمید کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آج ہم سب پر، کوئی نہ کوئی نوازش ضرور کی جائے گی۔ نظام نے کرنل کران سے کہا دیکھو یہ جوش ملیح آبادی، تمھارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں، یہ بے چارے اپنی بیوی کے علاج میں پندرہ بیس ہزار روپیہ تم بے ایمان مسخراں کو چٹا چکے ہیں، لیکن تم اُنھیں تن دُرُست نہیں کر سکے، میں نے دو دوائیں دیں، اور بیس دن کے اندر ان کی بیوی کا مرض غائب ہوگیا۔ اب اے سالو، اگر تم میرے سامنے، حذاقت کا دعویٰ کروگے تو، میں تمھاری ....گا اور فقط یہی نہیں میں تم سب کی .... میں ریل چلا دوں گا اور اس ریل میں بیٹھ کر، ڈھکا ڈھک کرتا، مُمنار ٹک چلا جاؤں گا۔

اپنے آقا کی زبان سے یہ فحش الفاظ سن کر اُن سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اُن کے گل مُچھے لانبی داڑھیاں ہوا میں پھڑپھڑانے لگیں۔ ڈاکٹروں کی مونچھوں کی، کھڑی چونچوں پر بھیروں ناچنے لگا، ذلت کے کوّے، ان کے سروں پر قاؤں قاؤں کرنے لگے، اور اُن کی جُھکی پلکوں کے نیچے، لال لال مُنھ کے بندر، جَست وخیز کرتے نظر آنے لگے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بہت بھاری پتھر، کسی پہاڑی سے ٹوٹ کر، دریا میں آگرا ہے اور ساکن موجوں میں یکایک بھونچال آگیا ہے۔

میں نے بڑی عبرت کے ساتھ دیکھا کہ اُن مُعزز اربابِ فن کی پنڈلیاں کانپ رہی ہیں، ان کی گردنیں پتلی ہو ہو کر، اُن کے سُروں کا وزن اُٹھانے سے انکار کر رہی ہیں، اُن کی آنکھیں بُجھ گئی ہیں، اُن کا جذبۂ غیرت مُنھ پیٹ رہا ہے، اُن کی ناکیں، سُرخ ہو ہو کر، لانبی ہو چکی ہیں اور اُن کی خودداری، اُن کے رخساروں کی دونوں اُبھری ہوئی ہڈیوں پر، اُکڑوں بیٹھی ہوئی، لید کر رہی ہیں۔ ہائے انسان، تیری مجبوریاں[1]

---

[1] اُس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب اُن میں سے کسی نے بھی میری بیوی کا علاج نہیں کیا ہے تو پھر انھیں کیوں ذلیل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب اس کی یہ علّت سمجھ میں آرہی ہے کہ چوں کہ نظام اپنے کو تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دل اس بات پر کُڑھا کرتا تھا کہ اگر میں مطب کرتا تو جو دولت یہ لوگ کما رہے ہیں، میری جیب میں آتی، اور، منصبِ شاہانہ کی مجبوری سے

دارالترجمہ یہ مقام دفتر کم اور دارالتفریح زیادہ تھا۔ ہم تمام لوگ[1] (سید ابوالخیر مودودی کے علاوہ) روز ہاشمی صاحب فرید آبادی کے کمرے میں جمع ہو کر گپیں اڑاتے اور شاعری کیا کرتے تھے میں نے وہاں مترجمِ ادبِ انگریزی[2] کی حیثیت سے۔ تقریباً ڈیڑھ برس کام کیا اور جب علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو پنشن مل گئی۔ تو، اکبر حیدری اور راس مسعود کے علی الرغم نواب اکبر یار جنگ کے مخلصانہ مساعی کی بنا پر، مجھے ترقی مل گئی، میرا عہدہ توڑ دیا گیا، اور میں، علامہ طباطبائی کی جگہ "مشیرِ ادب" کے عہدے پر کام کرنے لگا۔ میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبۂ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا۔ اور، خصوصیت کے ساتھ، علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا کے فیضانِ صحبت نے، مجھ بے سواد آدمی کو، میرے جہل پر مطلع کر کے، مجھ کو ذوقِ مطالعہ پر مامور کر دیا۔ اور صحتِ الفاظ و نجابتِ لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے، میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا۔

چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نااہل مزے اڑا رہے ہیں، کیا ہوا اگر ان میں کوئی جوشؔ کی ہوس کا معالج نہیں رہا ہے، مگر ان کی ہوس کے معالجوں کے یہ لوگ ہم پیشہ اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تو ہیں، وہ معالج میرے ہاتھ نہیں آسکتے تو پھر ان کو ذلیل کر کے، اپنا جی کیوں نہ ٹھنڈا کر لوں؟ ممکن ہے میری یہ رائے غلط اور اس کی علت کچھ اور ہی ہو۔ اس لئے کہ دولت کی، ضرورت سے زیادہ فراوانی اور مسخرے مصاحبوں کی حد سے بڑھی قصیدہ خوانی کے بگاڑے ہوئے دماغوں کی اچھل کود اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ کوئی ذی عقل اسے گرفت میں نہیں لا سکتا۔ اے اللہ! مجھ کو دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی سے محفوظ رکھنا، اس لئے کہ ان دونوں حالتوں میں انسانیت کا دم نکل جایا کرتا ہے۔

[1] یعنی احسان احمد، علامہ عمادی، مولوی فدا علی، محمد ابراہیم، رشید احمد، میرزا لبیب، سنجاجے پوری اور گاہ گاہ قاضی تلمذ حسین، مسعود علی محوی علامہ طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا (صاحب امراؤ جان ادا) بھی شریکِ بزم ہو جایا کرتے تھے۔ [2] میرے ذمے "حیاتِ بیکن" کا ترجمہ تھا۔

میرزا محمد ہادی صاحب، میرے پڑوسی تھے۔ میں دکن آکر، پھر اُن سے پڑھنے لگا، اور اس بار۔ فارسی کے ساتھ، اُن سے انگریزی ادب، اور فلسفے کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ ہر چند ۱۹۱۸ء میں شراب کے لطف سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لئے کبھی کبھی کسی دعوت میں تو پی لیتا تھا، لیکن اپنی تنخواہ سے خرید کر، کبھی نہیں پیتا تھا۔ اور اسی وجہ سے مجھے یہ فرصت حاصل تھی کہ روز رات کے گیارہ بارہ بجے تک اُردو فارسی، انگریزی اَدَب اور فلسفے کا، بلاناغہ مطالعہ کیا کرتا۔

ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اُس وقت میرا حیدرآباد کیا چیز تھا۔ ارزانی اور اُس پر دولت کی فراوانی ۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ اُمرا، کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی۔ آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے، متوسطین تک غرقِ نشاط رہا کرتے تھے، اور اسکاچ وسکی صرف آٹھ روپے میں ملتی، اور پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔

وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی اُبھار اور تہذیبی نکھار۔ وہاں کی رامش و رنگ میں ڈوبی شامیں، پہاڑوں پر تھرکتی صُبحیں، شبستانوں میں، ناچتی گاتی راتیں، بانہوں اور بوسوں کی سوغاتیں، یارانِ دلنشیں کی ترنگیں، اُٹھتی جوانیوں کی اُمنگیں باغ عامہ کی لچکتی ڈالیاں، عثمان ساگر کی، گنگناتی متوالیاں، اونچی اونچی گاتیاں، بہکی بہکی مدھ ماتیاں ۔ وہاں کے میلے ٹھیلے، پریوں کے ریلے، ہر چہرے پر رونق، ہر گوشے میں مُوحق، بجتی گلیاں، تھرکتی رنگ رلیاں، ساحلوں پر راتیں اور وہ خیمہ ہائے جشن کی سنہری تنائیں ۔ وہ، شاہزادۂ مُعظم جاہ کا دربار، گویا مصر کا بازار، وہ، پریاں قطار اندر قطار، وہ گردنوں کو، پیچھے ریلتے ہوئے، سینوں کے اُبھار، وہ جُھمکے، وہ چنن ہار، وہ چٹاخوں کے بیوپار، وہ، طوفانِ گیسوؤ رخسار، وہ پازیبوں کی جھنکار، وہ بلبلے، وہ سِتار وہ گیتوں کی، ہلکی ہلکی پھوار، وہ غزلوں کے گونجتے اشعار، وہ اُبلتے انوار، وہ کھنکتے درودیوار اور وہ چھلکتے شیشہ ہائے سرشار۔

ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں ۔ حافظے کا سَر، سفید ہو چکا ہے۔ اور، پُرانی صحبتیں

کجلا چکی ہیں۔ اب شام کے وقت کراچی میں جب اپنے مکان کے، کھلے ہوئے مغربی چھجے میں، شمالی ناظم آباد کی دُور کی روشنیوں کے سامنے، تنہا بیٹھا ہوں، تو انسان کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر، انگاروں پر لوٹنے والی مشیّت۔ میری زمانۂ ماضی کی سرخوشیوں کی سزا دینے پر کمربستہ ہو کر، میرے بیتے دنوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ، میرا تعاقب کرنے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیدرآباد کی راتوں کی براتوں کے جلوس۔ گُم کردہ لمحوں، اور گہنائے مکھڑوں کے، درد انگیز جلوس۔ دامنِ شفق کو پھاڑ کر، باہر نکل آتے ہیں، اور غلغلے مچانے والے یاروں کے چہرے اور آغوش میں مچلنے والے دل داروں کے مکھڑے، فضا پر، تیرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور میری پیاسی نظریں، جب انھیں پکڑ لینے کے واسطے، دوڑتی ہیں۔ تو وہ دریائے شفق میں غوطہ لگا کر، میری آنکھوں سے، پل بھر میں، اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور ایک، سوگوار دھواں، میرے سر پر منڈلانے لگتا ہے۔

اگر میں، کل، جی بھر کے، ہنسا نہ ہوتا، تو آج، دل تھام کر یوں نہ روتا، سچ کہا ہے انیس نے :۔

روئے خزاں میں وہ، جو ہنسا ہو، بہار میں !!

وُہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں خیر، اور خیر میں شر کا ایک عُنصر ہوتا ہے، وہاں کا دوسرا بھیانک رُخ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

حیدر آباد سے اِخراج

حیدر آباد کے سر پر جاگیرداری اور شہریاری کا گدھ ٹھونگیں مار رہا تھا۔ ہر طرف، درباری سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ نظام کے مصاحب، ہر چند لکھے پڑھے نہیں تھے لیکن اس قدر کڑھے، ایسے درباری مسخرے، موروثی مراثی، خاندانی خوش آمد خورے، مشاق بھانجی مار، جھوٹے قصیدہ خواں، پُختہ دروغ باف، چھٹے تُہمت کار، بولی ٹھولی میں اس قدر طاق و مشّاق، اور نظام کے اس درجہ مزاج شناس تھے کہ اُن کو انگلیوں پر نچاتے، چاپلوسی کے توؤں پر روٹیاں پکاتے، اپنے کو اُبھارتے، حریفوں کو گراتے روز ماں بہن کی گالیاں کھاتے، اور شربت کی طرح پی جاتے، باتوں کے طوطے اُڑاتے، اور اُن طوطوں کو، اپنے آقا کی بھوؤں پر بٹھاتے، اور اُن سے "بنی جی بھیجو" کے نعرے لگواتے تھے۔

جس طرح سانپ والے بانسریوں پر ناگوں کو نچاتے ہیں، اس طرح یہ مسخرے بھی، اپنے ملایم لہجوں کی گاڑیوں میں، اپنی آنکھوں کے، گھومتے ہوئے عیّار ڈھیلوں کے، پہیے لگاتے، اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کر دینے کی خاطر، اپنے سدھے ہوئے چہروں کے مُنھ میں لگام لگا کر، اپنی منزلِ مقصود کی جانب ہنکاتے اور نظام کو اپنے راستوں پر چلاتے تھے، اور بڑے سے بڑے حاکموں اور جاگیرداروں سے اگر بگڑ جاتے، تو، سرِ دربار،

اُن کو پٹوا کر نکلوا دیتے، اور اُن کے گھروں میں جھاڑو پھروا دیا کرتے تھے۔

اُن کی زبانیں۔ ایسی رینگتی ہوئی ناگنیں تھیں، جن سے اور تو اور شاہ زادے تک محفوظ[1] نہیں تھے۔

بہر حال اے حیدر آباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا۔ تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا، تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی، تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا۔ تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا۔ تو نے مجھے کتاب کا کُل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا، کتاب نے میری آگاہی میں اضافہ کیا، کاکلوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا، کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا۔ تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا، علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو وادیٔ حیرت کی جانب موڑ دیا۔

میں نے "غلط بخشی" کے نام سے، نظام کے خلاف ایک نظم کہی تھی (جس کا ذکر آگے

---

[1] یہ بات فقط حیدر آباد ہی سے مختص نہیں، تمام دیسی ریاستوں کا یہی عالم تھا، ہر جگہ مسخرے مصاحبوں کی ریشہ دوانی، اور پاگل ہزہائی نسوں کی حکمرانی تھی۔ مصاحبوں کی زبانیں اُن کی کھیتیاں تھیں، اور والیانِ ریاست کے کان، اُن کھیتوں پر برسنے والے ابر تھے اور چوں کہ اُنھیں کبھی اُن کی غلطیوں پر مطلع نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنے ہر بُرے سے بُرے فعل کو روا سمجھتے تھے، اور چوں کہ وہ شُس مکمل فراغت کے آغوش میں رہتے تھے، اس لئے اُن کے قوائے فکر کو زنگ چاٹ چکا تھا، اور ان کی عقلوں پر چربی چھائی ہوئی تھی، اس لئے وہ خطرناک قسم کے پاگل ہو چکے تھے۔ اور اسی وجہ سے، ذرا ذرا سی بات پر، آبرو داروں کو ذلیل کر دینا، اربابِ علم کے سروں پر ٹھوکریں مارنا، بھانڈوں بھگتیوں کو سر چڑھانا، اور شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر سانڈوں کی طرح چڑھ جانا، اُن کا، آئے دن کا مشغلہ، اور آبائی کھیل تھا۔

اور اُن سانڈوں، اُن دیوانوں اور ان کالے ناگوں کو فرنگی حکومت نے اس لئے قائم رکھا تھا کہ جب کبھی ہندوستان میں آزادی کا طوفان آئے گا۔ یہ لوگ اسے روکنے کے واسطے، فلک پیما بند تعمیر کر دیں گے اور راجہ پورس کے ہاتیوں کے مانند، خود اپنی ہی قوم کو روند کر مار ڈالیں گے۔

آئے گا)، وہی نظم بظاہر میرے اخراج کا سبب بن گئی۔ لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور اسباب بھی کام کر رہے تھے اُن کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی بیان کر دوں۔

مجھ کم بخت "گھر پھونک، تماشا دیکھنے والے" کی یہ اُفتادِ مزاج ہے۔ خواہ اُسے ہنر سمجھا جائے یا عیب۔ کہ میں عامتہُ الناس کے قدموں پر، سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت۔ اور خداوندانِ اقتدار کے تخت کے روبرو، گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں۔ اور میر تقی میر کے مانند:۔

سَر کسو سے، فرو نہیں آتا
حیف بندے ہُوئے، خدا نہ ہُوئے

کا نعرہ لگاتا رہتا ہوں۔

اور اس اُفتاد مزاج کے ساتھ، میں، جس وقت نظام کے روبرو، سراپا انکسار بن کر جاتا، اُن کو "سرکار" کہتا، اور ان کی زبان سے، اپنے متعلق "تُم" سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی، کہ بلبلا اُٹھتا تھا۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے چہرے کا تغیّر، اور، میرے چوٹ کھائے دماغ کی برقی لہریں، نظام کے دل پر، اس طرح اثر کیا کرتی ہیں، جیسے، میدان میں سونے والے پر شبنم گرتی ہے، اور اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرے سَر میں یہ دھمک کیوں ہو رہی ہے

اپنے باش باش غرور کے ساتھ، دربار سے جب گھر آتا تھا تو، بیوی کے سامنے، اپنی اس بے عزتی کا رونا رویا کرتا تھا، اور وہ بھی اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ نوکر چاکر سب سُن لیا کرتے تھے۔

مجھ کو مطلق یہ معلوم نہیں تھا کہ نظام کی خفیہ پولیس کا، گھر گھر میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ کوئی اس کی زد سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتا۔ صرف گھر کے نوکر چاکر یا مامائیں ہی نہیں، سودا بیچنے والیاں تک خفیہ پولیس میں بھرتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا پتا کیوں کر چلا، وہ بھی سن لیجئے۔ ایک روز، نواب قادر نواز

جنگ ، بڑا خوفناک چہرہ بنائے ، میرے پاس آئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے محل میں جس بات کا رونا رویا کرتے ہیں ، سرکارِ والا تک وہ بات پہنچ گئی ہے ۔ اور مجھ کو اس بات کی بڑی خوشی ، اور انتہائی حیرت ہے کہ یہ بات سُن کر ، سرکار نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ جوش بڑا مغرور آدمی ہے ۔ ملازمت کر رہا ہے ، مگر اُس کے سر سے ، بُوئے امارت ابھی تک نہیں نکلی ۔ سُنتا ہوں وہ خُدا سے بھی گُستاخیاں کیا کرتا ہے ۔ لیکن کیا کروں سرورِ کائنات نے اس شخص کو میرے سپرد فرمایا ہے ۔

نظام کی سالگرہ وغیرہ پر تمام شعراء قصائد پیش کیا کرتے تھے ، لیکن میں نے کبھی قصیدہ نہیں کہا ۔ ایک سالگرہ کے موقع پر ، ایک رسالے کے مُدیر نے ، میری ایک بہاریہ نظم ، " قصیدہ " بنا کر شائع کر دی ، جس کا یہ مطلع تھا ۔

اُٹھی وہ گھٹا ، رنگ سامانیاں کر
گہر باریاں کر ، گُل افشانیاں کر

اس نظم میں سالگرہ کی جانب ، کوئی ادنیٰ سا بھی اشارہ ، یا نظام کی مدح میں کوئی ایک شعر بھی نہیں تھا ، لیکن میرے اس مقطع پر ، شاہی عتاب نازل ہو گیا : ۔

کبھی جوشؔ کے جوش کی مدح فرما
کبھی گُل رُخوں کی ثنا خوانیاں کر

نظام اس دھوکے میں پڑ گئے کہ اس قطعے کا رُوئے سُخن اُن کی طرف ہے ۔ اور دوسرے ہی دن فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ جوشؔ نے کسی خاص وقت (ہنگامِ بادہ نوشی) میں کہا ہے ان کو چاہیئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کیا کریں ، اگر آئندہ وہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہو گا ۔

اس واقعے کے ، کوئی دو برس کے بعد ، ایک روز ، نواب مہدی یار جنگ ، بہت گھبرائے ہوئے ، میرے پاس آئے اور کہا بڑا غضب ہو گیا ۔ ہوش بلگرامی نے ، سرکارِ عالی تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ آپ کے ...... شاہ زادی سے بڑے گہرے مراسم ہیں ، اور یہ بھی انھوں نے کہا ہے کہ ...... محل میں ، جس وقت ...... شاہ زادی جوش کو رُک

رہی تھیں اور جوشؔ عُذر کر رہے تھے، اس وقت، میں نے پردے کے پیچھے سے، یہ خود سنا تھا کہ شاہزادی نے بڑے پیار کے لہجے میں ۔ اُن سے فرمایا تھا کہ "اگر تُم اس وقت نہیں رُکو گے تو میں تمھیں مار ڈالوں گی۔"

نظام کے دل میں، یہ مُتذکرہ بالا چاروں خمیر، معلوم و نامعلوم طریقے سے ابھی اُٹھ ہی رہے تھے کہ میں نے وُہ اشتعال انگیز نظم جس کا ذکر کر چکا ہوں، جاگیرداروں اور وزرا کی بھری محفل میں سُنا دی ۔ اور تمام محفل پر ایک دہشت ناک سناٹا چھا گیا ۔ نواب نظامت جنگ، وزیرِ سیاست نے، میرے کان میں کہا ۔ کلہاڑی ماری آپ نے اپنے پاؤں میں ۔ اوّلاً تو آپ کو، ایک مُلازم سرکارِ عالی کی حیثیت سے، ایسی نظم کہنا ہی نہیں چاہیے تھی، اور کہہ بھی دی تھی تو پھر یہ چاہیے تھا کہ اس کو، سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ۔ حد کر دی آپ نے نا عاقبت اندیشی کی، خیر، میں تو اس پر کوئی کارروائی نہیں کروں گا، خُفیہ پولیس والوں نے یہ نظم لکھ لی ہے، یقین رکھیے، کل تک یہ کنگ کوٹھی پہنچ جائے گی ۔ اُس نظم کے چند اشعار یاد ہیں، آپ بھی سماعت فرما لیں (یہ نظم میرے کسی مجموعے میں طبع ہو چکی ہے)۔

الٰہی، اگر ہے، یہی روزگار — کہ سینے رہیں، اہلِ دِل کے فگار
دناءت کو، حاصل ہوں سرداریاں — شرافت کرے کفش برداریاں
بہر بزمِ جہل آئیں، اہلِ نظر — بشکلِ غُلامانِ زرّیں کمر
لئیموں کی ہر شب ہو، غرقِ شباب — بنازِ نگاراں، بصوتِ رباب
رہیں، فضلِ باراں میں بھی تشنہ کام — خرابات کے اولیائے کرام
سرِ محفلِ مُمسکِ بدخصال — کریم آکے پھیلائیں دستِ سوال
ہُنر ہو، اور اس درجہ بے آبرو — تُفو بر تو اے چرخِ گرداں تُفو!!

دوسرے ہی دن، وہ نظم، نظام تک پہنچ گئی ۔ کوئی دوسرا ایسی زبردست گستاخانہ نظم کہتا تو مع بچوں سمیت، کولھو میں پیل دیا جاتا ۔ لیکن اُن کی شرافت دیکھیے کہ انھوں نے، بڑے خُفیہ طور پر، میرے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست آغا جانی، نائب

کوتوال کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ، کنگ کوٹھی لے آئیں۔ آغا نے مجھ سے کہا، مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ ہر چند آپ نے اس قدر سخت نظم کہی ہے۔ پھر بھی سرکار آپ کے خلاف کسی قسم کا اقدام پسند نہیں فرماتے ہیں، اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جوش مجھ سے معافی طلب کر کے، اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے، تو میں انھیں، دل سے معاف کر دوں گا۔ اس لئے ابھی ابھی میرے ساتھ چلیئے، اور اس معاملے کو ”رسیدہ بود بلائے بنا دیجئے“۔ میں نے ان کی بات سن کر، سر جھکا لیا۔ آغا نے کہا، ارے، دیر نہ کیجئے، کپڑے پہنیئے، اور میرے ساتھ ہو لیجئے۔ میں نے کہا، آغا معافی مانگنے پر میں طیار نہیں ہوں، وہ یہ سن کر دنگ ہو گئے، مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ زنانے دروازے پر جا کر آواز دی، بھابی ذرا ایک بات سن جائیے۔ اور جب میری بیوی، پٹ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں تو انھوں نے کہا بھابی، آپ کے شوہر نامدار سرکار سے معافی مانگنے پر طیار نہیں ہیں بیوی نے آغا سے کہا، ذرا انھیں بلا لیجئے، آغا نے مجھے پکارا میں پہنچ گیا، اور بیوی نے بڑے تیہے کے ساتھ، ڈانٹ کر مجھ سے کہا ارے کیا تمھارا دماغ چر گیا ہے۔ آدھی سے زیادہ جائے داد تباہ کر کے یہاں آئے ہو، اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ اس آدھی جائے داد کو بھی ملیح آباد جا کر تین برس کے لئے خواجہ حسن کو ٹھیکے پر دے آئے ہو، اور وہ سارا روپیہ بھی بالا بالا بمبئی جا کر برباد کر آئے ہو۔ معافی نہیں مانگو گے تو کیا جھنجھے جھاڑتے پھرو گے ؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ لڑکی لڑکے کو لکھانا پڑھانا، اور ان کی شادیاں کرنا ہے جاؤ اسی گھڑی جاؤ، اور سرکار سے جا کر معافی مانگ لو۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سن رہے ہو تم ؟

میں نے کہا اشرف جہاں یہ بات سچ ہے کہ ہم تم سے ڈرتے ہیں، مگر، یہ بھی سن لو کہ اس قدر نہیں ڈرتے ہیں کہ بھیگی بلی بنے جائیں اور معافی مانگ آئیں۔ یہ سن کر، بیوی ہکا بکا ہو کر رہ گئیں، دیر تک مجھے گھورا اور پھر آنکھیں جھکا لیں، اور آغا جانی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ جو شخص خودکشی پر تل جائے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

آغا کے چلے جانے کے بعد، میں نے، ڈر کے مارے گھر میں قدم نہیں رکھا اور دوسرے دن جلدی جلدی استعفیٰ لکھ کر اپنے محکمے کے سکریٹری نواب ذوالقدر جنگ کے پاس چلا گیا

ذوالقدر نے کہا جوش صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ جذبات میں نہ بہیئے عقل سے کام لیجئے، جائیے اور سرکار سے معافی مانگ لیجئے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ملازم کی کھال کو موٹا ہونا چاہیئے، سرکار مجھے گالیاں تک دے چکے ہیں، یہ آپ سے کہہ رہا ہوں، لیکن میں پی گیا۔ استعفیٰ نہیں دیا۔ اور آپ کی بات تو قطعی اس کے برعکس ہے، آپ نے خود سرکار پر طعن کی ہے۔ اور اُس کے باوجود، اُلٹے استعفیٰ دے رہے ہیں۔

دیر تک وُہ مجھے سمجھاتے رہے، دیر تک بڑی ردو قدح رہی اور جب میں نہیں مانا تو انھوں نے غصے میں آکر، میرا استعفیٰ کنگ کوٹھی کو روانہ کر دیا۔

میرا استعفیٰ، جنگل کی آگ کے مانند نظام تک پہنچ گیا۔ اور نظام، چیخ چیخ کر، کہنے لگے۔ ''بڑا غضب ہُوا، جوش مجھ سے جیتے جا رہے، جوش مجھ سے جیتے جا رہے ہیں''

نواب سر امین جنگ نے کہا، خداوند سے کون جیت سکتا ہے، کہاں جوش اور کہاں شاد دکن، جوش کی سرعی (مرتبے) کے تو سیکڑوں شاعر، لکھنؤ کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں — نظام نے کہا، امین، تم بات کی نزاکت نہیں سمجھ رہے ہو۔ مزا تو جب تھا کہ اُن کے استعفیٰ سے پیش تر ہی میں ان کو برطرف کر دیتا، لیکن اس عالم میں جب کہ وہ خود مستعفی ہو رہے ہیں، بات الٹ گئی ہے اور میں ہارا جا رہا ہوں۔

نواب امین جنگ نے دست بستہ عرض کیا۔ خداوند اس استعفیٰ کو خانہ زاد کے حوالے فرمادیں، فدوی ابھی معاملے کو پلٹ دے گا۔ نظام نے میرا استعفیٰ اُن کی طرف پھینک دیا امین جنگ نے اسے اٹھا کر، فوراً چاک کر دیا اور ہوا میں اُس کے پرزے اُڑا کر کہا سرکارِ والا اس استعفے کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا ہے۔ اب، سرکار فرمان جاری کر دیں میرے استعفے کے چاک ہو جاتے ہی، نظام کا چہرہ دمک اُٹھا اور کہنے لگے امین تم نے مجھ کو جتا دیا۔ ہمارے سکریٹری کو ایسا ہی قابل (قابل) ہونا چاہیئے۔ لکھو فرمان کہ جوش ملیح آبادی کو ممالکِ محروسۂ سرکارِ عالی سے خارج کیا جاتا ہے، پندرہ دن کے اندر

اندر وہ روانہ ہو جائیں، اور تا حکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔

فرمان لے کر، آغا جانی میرے پاس آئے، اور کہنے لگے، اس فرمان کو سمجھے بھی؟ میں نے کہا اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا میں سرکار والا کا مزاج شناس ہوں اس لیے فرمان کے دو نکتے بتانے آیا ہوں۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ سرکار جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اُسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں، آپ کو چوبیس گھنٹے کے عوض پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے، اور وہ اس مقصد سے کہ آپ، صورتِ حال کو، ٹھنڈے دل سے، سمجھ کر معافی مانگ لیں، اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے، اور، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس میں "تا حکم ثانی،" لکھ کر، آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے۔ دیکھیے اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ابھی میرے ساتھ، سرکار کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لیجیے، اگر اس وقت یہ فرمان منسوخ نہ کر دیا جائے تو میری ناک کاٹ لیجیے گا۔

میں نے آغا جانی کو گلے لگا کر، ان کی پیشانی چوم لی اور کہا آپ واقعی میرے پکے دوست ہیں، لیکن میں کسی طرح معافی طلب نہیں کروں گا۔

آغا نے سر پکڑ کر کہا بھائی راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ تو سنی تھی آج معلوم ہوا کہ چوتھی ہٹ، بھی ہوتی ہے، جس کو "شاعر ہٹ" کہنا چاہیے۔

اندر جا کر میں نے بیوی سے کہا اب رختِ سفر باندھو، ہم یہاں پندرہ دن کیوں پڑے رہیں، تین چار دن ہی میں کیوں نہ چلے جائیں۔ بیوی نے کہا یہ تو سوچو جاؤ گے کیسے، جانے کا دم درود بھی ہے؟ تمھاری بہن بہنوئی، اُن کے بچے، اور پھر ہم لوگ، اور چھوٹے دادا اور دو نوکر اتنے آدمیوں کا کرایہ بھاڑا۔ کہاں سے آئے گا اور پھر تمھاری یہ ضد بھی ہے کہ ہم اپنی موٹر اور اپنے دونوں کُتّے بھی ساتھ لے جائیں گے اور اُن کو یہاں کی گلیوں میں مارا مارا نہیں پھرنے دیں گے، ان سب کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا، اسی دن کے لیے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کو روز شرابیں نہ پلاؤ، اتنے اللّے تلّلے نہ کرو، اب بتاؤ کیا کرو گے۔ اور کیسے جاؤ گے، نہ نو مَن تیل ہوگا، نہ رادھا جی ناچیں گی۔

بیوی کی باتیں سن کر میں چکرا گیا، اور یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ان حالات میں سفر ناممکن ہے۔ میں نے کہا پھر اشرف جہاں کیا کیا جائے؟ انھوں نے کہا جاؤ اور شاہ زادے اور مہاراجہ (کشن پرشاد) سے جاکر قرض مانگو۔ میں نے کہا میں قرض مانگنے نہیں جاؤں گا، یہ تو اُن دونوں کا فرض تھا کہ وہ، کسی کو میرے پاس بھیج کر خود پچھوالتے کہ ہم اس موقع پر کیا امداد کر سکتے ہیں، جب اُنھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، تو میں، بے غیرتی لاد کر ان کے پاس کیوں جاؤں۔ بیوی نے کہا ہاں سچ کہتے ہو، لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اب سُبھتا کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ الغرض، ایک ایک کرکے دن گزرنے لگے۔ اور اخراج کی تاریخ، قریب سے قریب تر آنے لگی۔ اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ اور میرا عالم اس مسافر کا سا ہوگیا جو راستہ بھول کر، جنگل میں سر ٹکراتا اور چیختا پھرتا ہے:-

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند، حالِ ما، سُبک سارانِ ساحل ہا

ایک روز، اُسی ربودگیٔ و بے چارگی کے عالم میں سر جھکائے، بیٹھا تھا کہ حکیم آزاد انصاری نے آکر کہا کچھ خیال بھی ہے کہ یہاں سے جانے میں اب فقط چار دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا۔ آزاد صاحب اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اخراج کے دن، میں بڑے اطمینان سے، اپنے پھاٹک کے سامنے، آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں، اور نظام کی نافرمانی کے جرم میں اپنے کو گرفتار کرا کے جیل چلا جاؤں۔ لیکن میرے بال بچے کیا کریں گے۔؟

آزاد نے کہا گرفتار ہوں آپ کے دشمن، میں ایک ایسی تدبیر نکال کر آیا ہوں، جو چوٹ، پڑہی نہیں سکتی۔ آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ خاندانِ آصفیہ کی یہ ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ شاہی معتوبوں کو تاحیات وظیفہ دیا جاتا ہے۔ آپ بھی معتوب ہیں، اس لئے آپ کو بھی وظیفہ دیا جائے گا۔ اس لئے، آپ، اللہ کا نام لے کر اس مضمون کی درخواست کے ساتھ، اکبر حیدری کے پاس جائیں کہ آپ کو، خزانۂ عامرۂ سرکارِ عالی سے

پانچ ہزار کی رقم ۔ بطورِ قرض دے دی جائے ، اور اُس رقم کو ، وظیفۂ عتاب میں سے ، بالاقساط ، وضع کر لیا جائے ۔

میں نے کہا تدبیر تو آپ نے ایسی نکالی ہے ، جو تیر بہدف ہے ، لیکن کیا منھ لے کر حیدری کے پاس جاؤں ، انھیں تو ان کے خطاب کے معاملے میں ذلیل کر چکا ہوں ۔ آزاد نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے ، آپ حیدری سے تو قرض نہیں مانگ رہے ہیں ۔ آپ کو تو خزانۂ عامرہ سے قرض ملے گا ۔ میں نے کہا بہت اچھا ، میں طیار ہوں ، لیکن درخواست لکھنا تو مجھے آتا نہیں ۔ آزاد نے اپنی جیب سے ٹائپ شدہ درخواست نکال کر ، میرے حوالے کر دی ، اور کہا اسی خیال سے میں آپ کے پاس مسلح ہو کر آیا تھا کہ درخواست لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں ۔

اپنے مزاج کو ، لاکھوں کوڑے مار مار کر ، میں حیدری کے پاس گیا ۔ انھوں نے بڑی نرمی کے ساتھ پوچھا جوش صاحب میں آپ کی کھدمت (خدمت) کر سکتا ہوں ، لفظِ "کھدمت" ، کے زہر کو پی کر ، میں نے ، کہا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے اخراج میں اب صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں ، اور ، خدا کے فضل و کرم سے ، میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں کہ میں سفر کر سکوں ۔ اس صورت میں ، آپ مجھ پر دو عنایتیں کر سکتے ہیں ، پہلی عنایت تو یہ ہوگی کہ آپ میری اس قرض کی درخواست کو منظور فرمالیں ، اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری عنایت کریں کہ مجھ کو ، بجُرمِ سرتابی گرفتار کرا کے جیل بھجوا دیں

انھوں نے میری درخواست ، اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ، یہ کہا ، آپ گرفتاری کی بات نہ کہیں ، اگر آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو لٹریچر کی ہسٹری حیدر آباد کو کبھی "ماف" (معاف) نہیں کر سکے گی ۔

میری درخواست پڑھ کر وہ داڑھی کھجانے لگے ، میں نے کہا حیدری صاحب آپ اپنے دماغ پر بار نہ ڈالیں ، میں ہر مصیبت کے لئے بخوشی طیار ہوں ۔ انھوں نے کہا جوش صاحب یہ فنانس کا "ماملا" (معاملہ) ہے ۔ اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے ۔ میں نے کہا مجھے تو صرف چار دن کی فرصت ہے ۔

یہ سن کر انھوں نے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگے، پھر اپنی خشخشی داڑھی کھجائی، عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی۔ اور، آخرکار، گردن کے ایک فیصلہ کُن جھٹکے کے ساتھ میری درخواست منظور کر کے، اُس پر دستخط کر دیئے۔ اور، دوسرے ہی دن مجھ کو پانچ ہزار مل گئے۔

جاتا ہے، آسماں، لیئے، کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا، درو دیوار دیکھ کر!

ہائے کیسے بتاؤں کہ حیدرآباد سے روانگی کے وقت، میرے دل کا کیا عالم تھا ایک طرف غمِ دوراں تھا، اور ایک طرف غمِ جاناں، میری معاش کی شمع بُجھ کر، دھواں دے رہی تھی، اور میرے معاشقے کا چاند، گہنا کر، اُداسی برسا رہا تھا۔ بیوی ریل کے ڈبے میں اُداس بیٹھی تھیں، اور محبوبہ، اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ اور میرا یہ عالم تھا کہ، بیوی کی نظر بچا بچا کر، بار بار ویٹنگ روم جاتا، محبوبہ کو گلے لگا کر روتا، اور، آنسو پونچھ پونچھ کر، باہر آتا، اور سید علی اختر مرحوم، سید ابوالخیر مودودی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے (جو مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے) باتیں کرنے لگتا تھا۔

میں اسی عالم میں تھا کہ نواب ذوالقدر جنگ آگئے، اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا یہ میرے نام کا شاہی فرمان ہے، اسے پڑھ لیجیے۔ فرمان حرف بحرف یاد نہیں، لیکن اُس کا مفہوم یہ تھا کہ جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جا رہے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ہندوستان جا کر وہ اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں، اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے۔ میں نے کہا نواب صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں میرا شکریہ عرض کر کے یہ کہہ دیجیے کہ میں اُن کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ لیکن معافی طلب کرنے پر آمادہ نہیں ہوں۔ نواب ذوالقدر جنگ نے کہا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سرکارِ والا کو بُرا کہیں، اور سرکارِ والا الٹے آپ سے معافی طلب کریں۔ اتنے میں ریل رینگنے لگی، میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ سب کو سلام کیا، میری محبوبہ ویٹنگ روم سے نکل آئی

اُس نے، آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھے رخصتی سلام کیا، سلام کرکے لڑکھڑا گئی میں نے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گلے لگا لیا، اور گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہر چند اُس عالم پر اب ایک جُگ بیت چکا ہے، لیکن آج بھی جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے، کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں قیامت کے دن ایک متنفس بھی زندہ نہیں رہے گا۔ وہ مجھے دیکھیں کہ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے، اور آج تک زندہ ہوں۔ (لیکن ایسی زندگی بھی کس کام کی کہ جیتا جاگتا آدمی، اپنے کو "مرحوم" لکھنے لگے) ہائے، وہاں سے کوچ کے وقت، زُلفوں سے مہکتی، اور طبلوں سے گمکتی سرشار، راتیں، عثمان ساگر کی سہانی صبحیں، پہاڑوں کی رنگین بدلیاں، سکندرآباد کی البیلی شامیں، اور یارانِ دکن کی چہکتی صحبتیں، میرے سامنے کھڑی ماتم کر رہی تھیں، معظم جاہ کا دربار آنکھوں میں آنسو بھرے، مجھے دیکھ رہا تھا، اور کسی کی حریمِ ناز سے ہائے ہائے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ میں خود اپنے ارادے سے، فردوسِ دکن کو تج دینے پر آمادہ ہو گیا تھا:۔

تجھ سے رخصت کی، وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی، وہ فضائے گریہ ساماں۔ ہائے ہائے
یاں، لبوں پر، جنبشِ آہِ تنک جاں، وانصیب
واں، مژہ میں، لرزشِ اشکِ گریزاں۔ ہائے ہائے
یاں، کفِ پا، چوم لینے کی، بھینچی سی آرزو
واں، بغل گیری کا، شرمایا سا ارماں۔ ہائے ہائے
میں سراپا سازِ عشرت۔ اور وقفِ درد و غم
تو مجسّم نازکی۔ اور بارِ حرماں۔ ہائے ہائے
وہ مرے ہونٹوں میں، کچھ کہنے کی حسرت، وائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

میں اپنے ڈبے میں، سر جھکا کر، بیٹھ گیا۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی پُرشور

موجوں نے، میرے تمام وجود کو ڈھانک لیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ آبائی جائے داد نے پکار پکار کر، مجھ سے کہا جب تک تین برس کا ٹھیکا موجود ہے، مجھ سے کسی فائدے کی اُمید نہ رکھنا۔ پھر اُن احباب کے چہروں پر، تصوری نگاہ ڈالی، جن کی بارہا عقدہ کشائی کر چکا تھا، وہ ہچکچاتے نظر آئے۔ اُقربا کا خیال آیا تو دیکھا کہ وہ میری بربادی پر مسکرا رہے ہیں اور، آخر کار، پھانسی تک آتے آتے میں نے یہ بات طے کرلی کہ اپنے قدر شناس قاضی سَر عزیز الدین کے پاس چلا جاؤں جو دتیا کے وزیر اعظم ہیں۔

دَربدری

جھانسی پہنچ کر میں نے بیوی کو جب اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انھوں نے کہا اچھا یہ بھی کرکے دیکھ لو، وہ بڑی اُداسی کے ساتھ ملیح آباد کی طرف روانہ ہوگئیں اور میں، ریاست دَتیا جانے کے لئے جھانسی اسٹیشن پر اُتر گیا۔

دَتیا پہنچ کر قاضی صاحب کو میں نے اپنی ساری داستان سُنادی، اُنھوں نے کہا جوش صاحب، آپ شخصی حکومت کا بار اُٹھانے کے واسطے بنے ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا جوہر عطا فرمایا ہے، میری رائے ہے کہ آپ آگرے کو اپنا ہڈ کوارٹر بناکر، وہاں سے، ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کردیں، پرچے کا نام رکھیئے ''سلطنت''۔ آگرے میں آپ کو رہنے کی دُشواری اس لئے نہ ہوگی وہاں آپ کے نانا کا عالی شان محل موجود ہے۔

میں نے کہا، قاضی صاحب رائے تو بہت اچھی ہے، مگر کس برِتے پر اخبار نکالوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ ریاست دتیا کے برِتے پر اخبار نکالیں۔ سرِدست، ریاست آپ کو ساڑھے چار سو فی ہفتہ کے حساب سے، سولہ سو روپے ماہانہ دے گی، اور، سالِ آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دُگنی کردی جائے گی۔ منظور ہے آپ کو؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اُن کی اس پیش کش کو، فوراً منظور کرلیا۔ اس کے بعد، انھوں نے کہا آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کردیں، میں دوسری ریاستوں سے بھی آپ کو امداد دلا دوں گا۔ قاضی صاحب کی اس تجویز سے میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ اور، رات کو، مشاغل

سے فرصت پاکر، سوگیا۔ صبح جب اُن کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو انھوں نے کہا جوشؔ صاحب آپکے اخبار کی پالیسی کیا ہوگی۔ میں نے کہا آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا پرو برٹش (فرنگی حکومت کی حمایت)۔ یہ سنتے ہی میرا چہرہ مٹلگجا سا ہو کر رہ گیا، قاضی بھانپ گئے۔ اُنھوں نے، بڑے ولولے کے ساتھ، میز پر، گھونسہ مار کر کہا، جوشؔ صاحب برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ) ایک نعمت ہے، اور بہت بڑی نعمت۔ اگر یہ حکومت خدانخواستہ، باقی نہ رہی، تو میری یہ بات، کان کھول کر، سُن لیجئے، کہ ہندو ہم کو کچا چبا ڈالے گا، سرکاری نوکری تو بڑی بُری چیز ہے، وہ ہم پر عرصۂ حیات تنگ کردے گا۔ گائیں آپ کی کھیتیاں چرلیں گی، اور آپ گائے پر ہات اُٹھائیں گے تو۔ کم سے کم آپ کا ہات توڑ ڈالا جائے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ قتل بھی کر ڈالے جائیں۔ ہندو آپ کے خون سے ہولی کھیلے گا، آپ کے ایم اے لڑکوں پر ہندو میٹرک کو ترجیح دی جائے گی، اور آپ کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ فرمایئے، کیا آپ اس پر طیار ہیں؟ میں نے کہا، قاضی صاحب آپ میرے بزرگ ہیں، اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی اس ہم دردی کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا، لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھ کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے میری بات کاٹ کر انھوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آگئے ہیں۔ دیکھیئے یہ آپ کی روزی، اور تمام مسلمانوں کی فلاح کا سوال ہے، آپ فیصلے میں جلدی نہ کیجئے۔

لیکن جب اُن کے بار بار سمجھانے کے بعد بھی، میں نے فرنگی کی حمایت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انھوں نے مایوس ہو کر کہا۔ اگر آپ برٹش حکومت کی مخالفت کریں گے، تو مجھے افسوس ہے کہ ریاست آپ کا ہات نہیں بٹا سکے گی، اور اگر میں ریاست سے آپ کی امداد کروں گا تو میری پرائم منسٹری ہی ختم ہو جائے گی۔ میں نے کہا قاضی صاحب، میں آپکے آپ کے وعدے سے سُبک دوش کرتا ہوں۔

اور رُخصت ہوتے ہوئے، میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں، آپ نے تو، دل سے، یہ چاہا تھا کہ میری زندگی سُدھر جائے لیکن میرے مزاج کی

اُستاد نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا۔ لیکن میں اس کرم کا بار اٹھا نہیں سکا۔ خطا آپ کی نہیں، میری ہے۔

ہر چہ ہست، از قامتِ کوتاہِ بے ہنگام ماست
ورنہ تشریفِ تو، بر بالائے کس، کوتاہ نیست

ڈھول پور آیا، تو ڈھول پور کے سب سے بڑے جاگیردار، اور اپنے حقیقی ماموں کی حویلی کے عوض، اپنے پرانے دوست سردار روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرا۔

میں نے اپنی روداد سُنائی اور کہا کہ مہاراجہ کے پاس آیا ہوں، شاید وہ کوئی ملازمت دے دیں۔ روپ سنگھ نے کہا مہاراجہ بڑا پاپی ہے، مجھے اُس سے کوئی اُمید نہیں، جب تک تمھاری کوئی صورت نکلے۔ تم میرے ہی ساتھ رہو۔ ملیح آباد جا کر بھابی کو بلا لاؤ۔ نواب صاحب (میرے ماموں) کے باڑے کی حویلی میں اُن کو ٹھہراؤ۔ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے، میں پان سو روپے ماہانہ تم کو دیتا رہوں گا۔ جب اچھے دن آئیں تو ادا کر دینا۔

میں نے کہا۔ میں تمھارا بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے بے کہے، تم میری امداد پر آمادہ ہو گئے، روپ سنگھ نے، میری بات کاٹ کر، کہا، یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ کیا ہم دونوں بہت پرانے دوست نہیں ہیں؟ کیا تم نے، اپنے ماموں پر ترجیح دے کر میرے یہاں قیام نہیں کیا ہے؟ کیا ہم میں کوئی غیریت ہے؟ میں راج پوت ہوں تم پٹھان، تم مسلمان راج پوت ہو، میں ہندو پٹھان۔

میں نے کہا بھائی رُوپ سنگھ، میں سوچ کر جواب دوں گا۔ رُوپ سنگھ نے کہا سوچ کر جواب دینے والے کی ایسی تیسی۔ ابھی ابھی جواب دو، ورنہ چھاتی پر چڑھ کر گلا دبا دوں گا۔ میں نے ہنس کر کہا، ایسی بول چال کاہے کی، ذرا سوچ تو لینے دو۔ یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے جست لگائی۔ مجھ کو فرش پر گرا دیا، میرے سینے پر چڑھ بیٹھے، اور زور زور سے میرا گلا دبا دبا کر کہنے لگے، منظور ہے کہ نہیں، یا مار ڈالوں؟ میں نے کہا منظور، منظور۔ اے ظالم، منظور۔ میری آنکھوں سے شکریے کے آنسو بہنے لگے

کانوں سے سُنتے تھے۔ دَرنہ ستانی، بستم می رسد، آنکھوں سے دکھا دیا، روپ سنگھ نے۔ دوست ہو تو ایسا۔ میں نے، تار دے کر، بیوی کو دھول پور بلا لیا۔ وہ چھوٹے دادا اور سخاوت ذظفر[1] کو ساتھ لے کر، آگئیں، میں بھی روپ سنگھ کے باڑے سے اُٹھ کر، ماموں کے باڑے آگیا، اور ان کی خالی حویلی میں رہنے لگا۔ کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملا، ہر بار انھوں نے ملازمت[2] کا وعدہ کیا، لیکن ایفار کی نوبت نہیں آئی۔ جب اس گومگو میں دو تین مہینے گزُر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

اُسی اثنار میں خواب دیکھا کہ مولوی احمد حسین[3] صاحب فرما رہے ہیں کہ مہاراجہ سے کوئی امید نہ رکھیئے، "آپ ایک رندِ پاک باطن ہیں، وہ بگلا بھگت۔ صبح ایک تار آئے گا، اُس پر عمل کیجیے گا۔ میں نے بیدار ہوتے ہی روپ سنگھ کو یہ خواب سُنا دیا، انھوں نے کہا یہ خواب تو ایسا ہے کہ اس کے سچّے جھوٹے ہونے کا تو آج ہی پتہ چل جائے گا

اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد، جب ہم لوگ، ناشتے سے فارغ ہو کر، گپ شپ کر رہے تھے کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری آ گئے، اور، مجھ سے کہا میں آپ سے تخلیئے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور جب میں اُن کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو انھوں نے کہا سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے، جیسا درخت اور بکّل (چھال) کا ہوتا ہے۔ اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو میں بے بکّل کا درخت ہو جاؤں گا میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ دینا چاہتا ہوں، مگر دو شرطیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ شراب ترک کر دیں، اور دوسری یہ ہے کہ روپ سنگھ[4] سے ملنا چھوڑ دیں۔ میں نے کہا مہاراجہ سے جاکر کہہ دیجیے کہ اُنھوں نے میری ذات کے ساتھ جس یگانگی کا اظہار کیا ہے، میں اس کا تہہِ دل سے، شکر گزار ہوں۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو میں شراب ہی ترک کروں گا، نہ رُوپ سنگھ ہی کی محبت سے دست بردار ہوں گا۔

رُوپ سنگھ پردے کی آڑ سے یہ باتیں سُن رہے تھے، میرا یہ آخری فقرہ سُن کر وہ یہ

---

[1] ایک پروردہ، دوسرا ملازم [2] آگے ان کا تفصیل حال آئے گا۔ [3] روپ سنگھ مہاراجہ کے ساتھ کھیلے ہوئے دوستوں میں تھے، جو اب معتوب ہو چکے تھے۔

کہتے کمرے میں در آئے کہ سکریٹری صاحب ٹھہریے ۔ سرکار سے جاکر کہہ دیجیے کہ جوش شراب بھی چھوڑ دیں گے اور روپ سنگھ سے بھی منہ پھیر لیں گے ۔ سکریٹری نے پوچھا ۔ جوش صاحب آپ کیا کہتے ہیں ، میں نے کہا میں شراب اور روپ سنگھ ، دونوں کو نہیں چھوڑوں گا ، مجھے سرکار کی یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں ۔" روپ سنگھ نے ڈپٹ کر کہا ، تم کو چھوڑنا پڑیں گی ، یہ دونوں چیزیں ۔ میں نے کہا نہیں چھوڑوں گا ، نہیں چھوڑوں گا ، نہیں چھوڑوں گا ۔ اور اسی شور و غل میں سکریٹری صاحب وہ ارے رام ایسی پکّی دُھن ، ایسی پکّی دوستی کہتے ہوئے رخصت ہو گئے ۔

سکریٹری کے چلے جانے کے بعد ، روپ سنگھ نے اُنگلی اُٹھا کر کہا تم ڈیم فول ہو ، سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ۔ میں نے کہا تم ڈیم فول ہو ، میں نے سارے بگڑے ہوئے کھیل کو سنوار دیا ۔ انھوں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے ؟ میں نے ، کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے ؟ انھوں نے کہا ، میں ہرگز ہرگز اپنی غلطی تسلیم نہیں کروں گا ، اب میں نے جست کر کے ، اُن کو گرا دیا ، سینے پر چڑھ بیٹھا ، اور ان کا گلا دبا کر کہا تسلیم کرو اپنی غلطی انھوں نے کہا اچھا بادا ، جان تو چھوڑ دو ، میں ہی غلطی پر ہوں ۔ میں اُن کے سینے سے اُتر آیا ، اور وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگے کہ میری خاطر تم نے بہت بڑا ایثار کیا ۔

اب ہم پھر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے ، روپ سنگھ نے کہا تمھارے خواب کا پہلا حِصّہ تو سچا نکلا کہ مہاراجہ سے قطع تعلق ہو گیا ۔ اب اگر تار بھی آ گیا تو پورا خواب سچّا ثابت ہو جائے گا ۔



نواب محمد احمد خان بہادر (مصنف کے دادا)



نواب محمد نسیم احمد خان بہادر (مصنف کے دادا کے سوتیلے بھائی)



نواب محمد بشیر احمد خاں (مصنف کے والد)



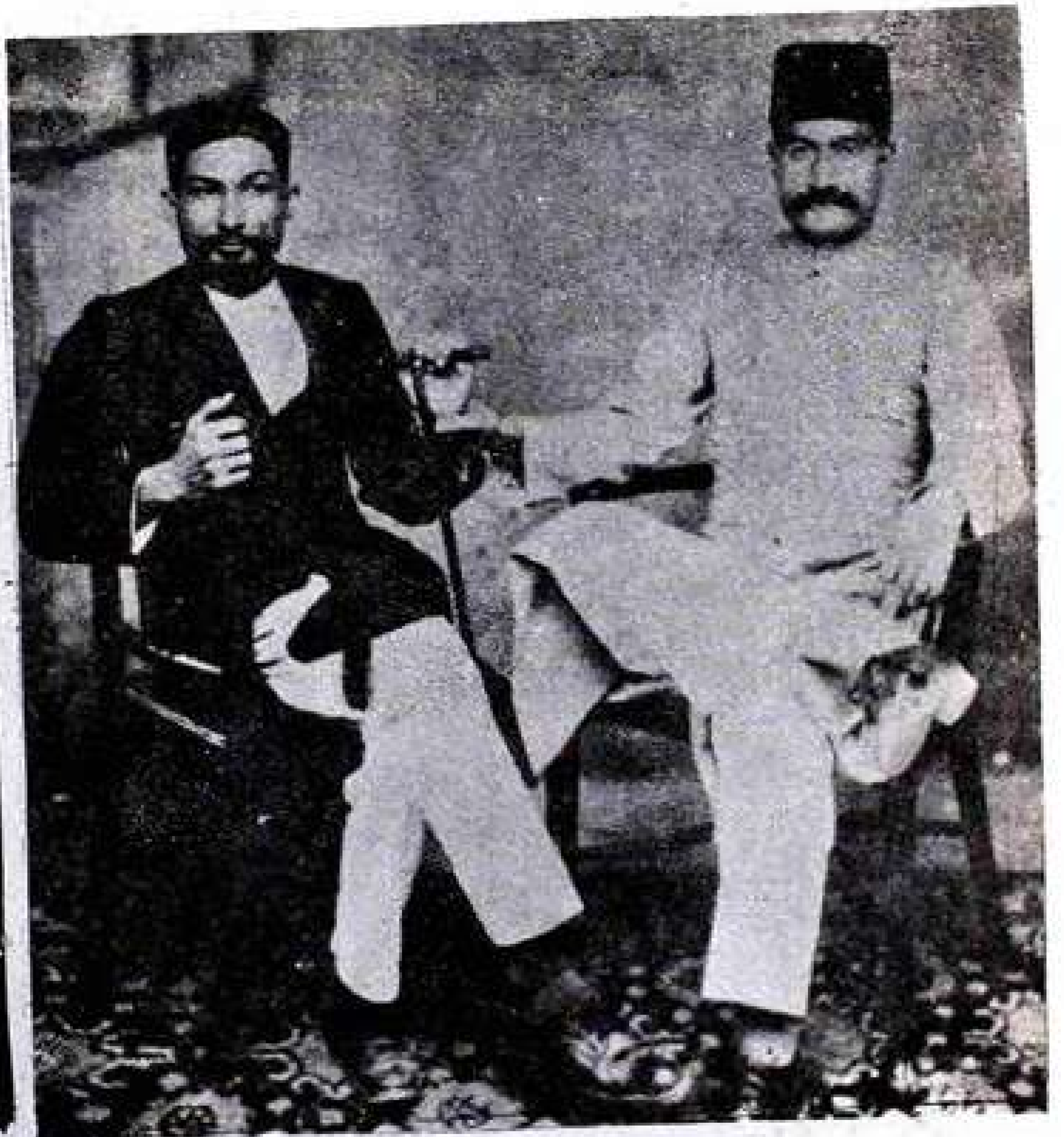
نواب محمد اسحٰق خاں (مصنف کے حقیقی چچا)



مصنف بہ زمانۂ تعلیم سینٹ پیٹرز کالج آگرہ ۱۹۱۵ء



مصنف بہ دورانِ زہد واتقا۔ ملیح آباد ۱۹۱۸ء



مصنف اپنے دوست مختار احمد خاں ملیح آبادی
کے ساتھ۔ لکھنؤ ۱۹۲۲ء



رئیس احمد خاں (مصنف کے چھوٹے بھائی)



مصنف اور بیگم جوش



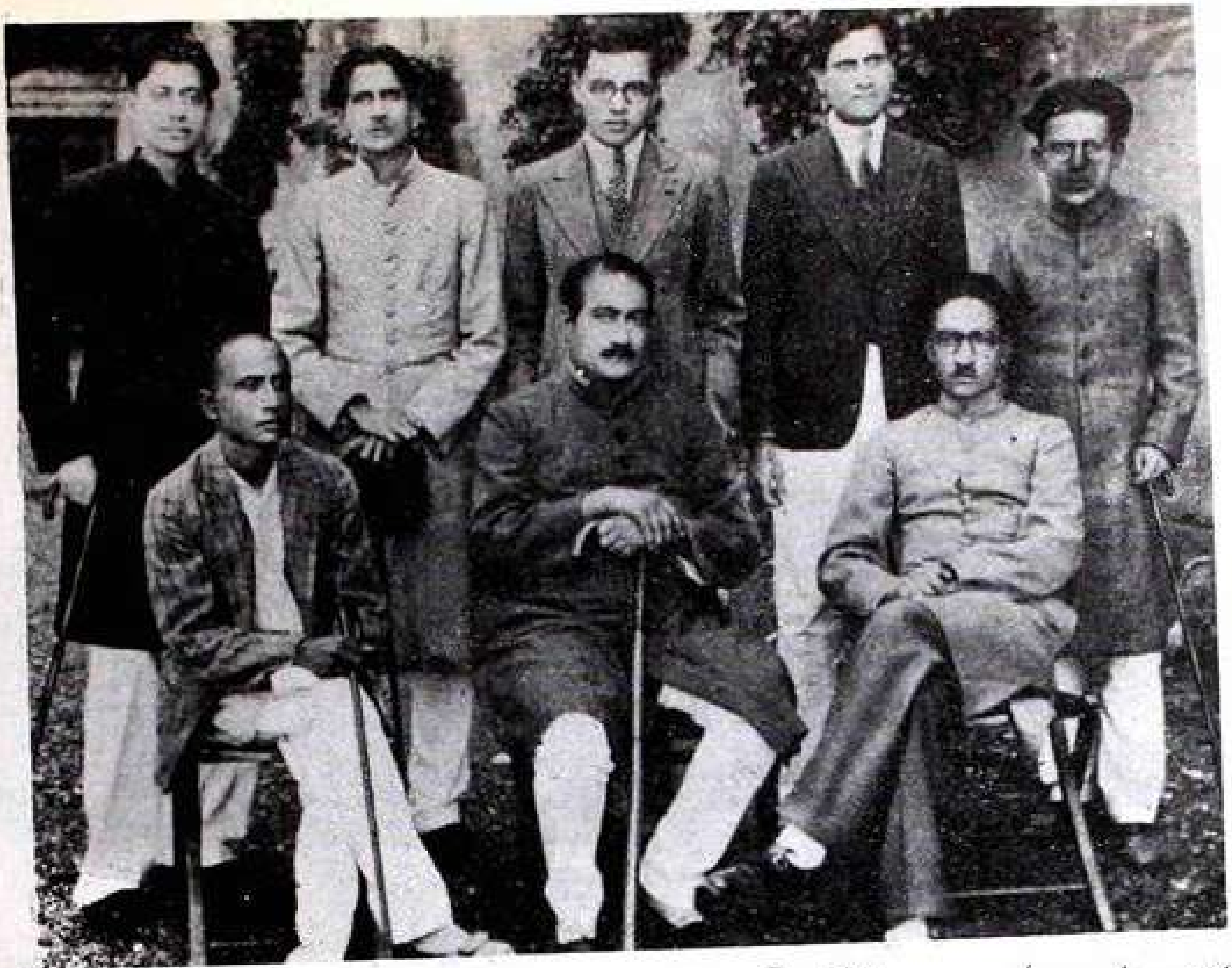


(بائیں سے دائیں)

مصنف

انور سعید (پوتا)

بیگم جوش، پرویز شہاب (نواسہ) حمید مسعود
(پوتا) اور سجاد حیدر (بیٹا) دہلی ۱۹۴۸ء



(کرسی پر بائیں سے دائیں) احسان دانش۔ مصنّف شوکت تھانوی (کھڑے ہوئے) مشرف الدین احمد، مجاز لکھنوی
سعید جعفری، وغیرہ شملہ ۱۹۴۰ء



(دائیں سے بائیں کرسیوں پر) نمبر۲ خلیفہ عبدالحکیم - نمبر۴ روش صدیقی - نمبر۵ ساغر نظامی -
نمبر۶ سر عبدالقادر - نمبر۷ مصنّف - نمبر۸ قدیر لکھنوی - نمبر۹ سراج لکھنوی
دوسری قطار - نمبر۱ لبھورام جوش - نمبر۳ احسان دانش - نمبر۴ مولانا حامد علی خاں -
نمبر۵ مولانا تاجور نجیب آبادی - نمبر۶ میاں بشیر احمد - نمبر۸ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
تیسری قطار نمبر۳ عرش ملسیانی - لاہور



مسٹر روشن علی بھیم جی کی ایک دعوت پر بائیں سے دائیں مصنّف، سید محمد جعفری مسٹر روشن علی بھیم جی
اور ڈاکٹر مالک وزیر محنت ۱۹۶۸ء



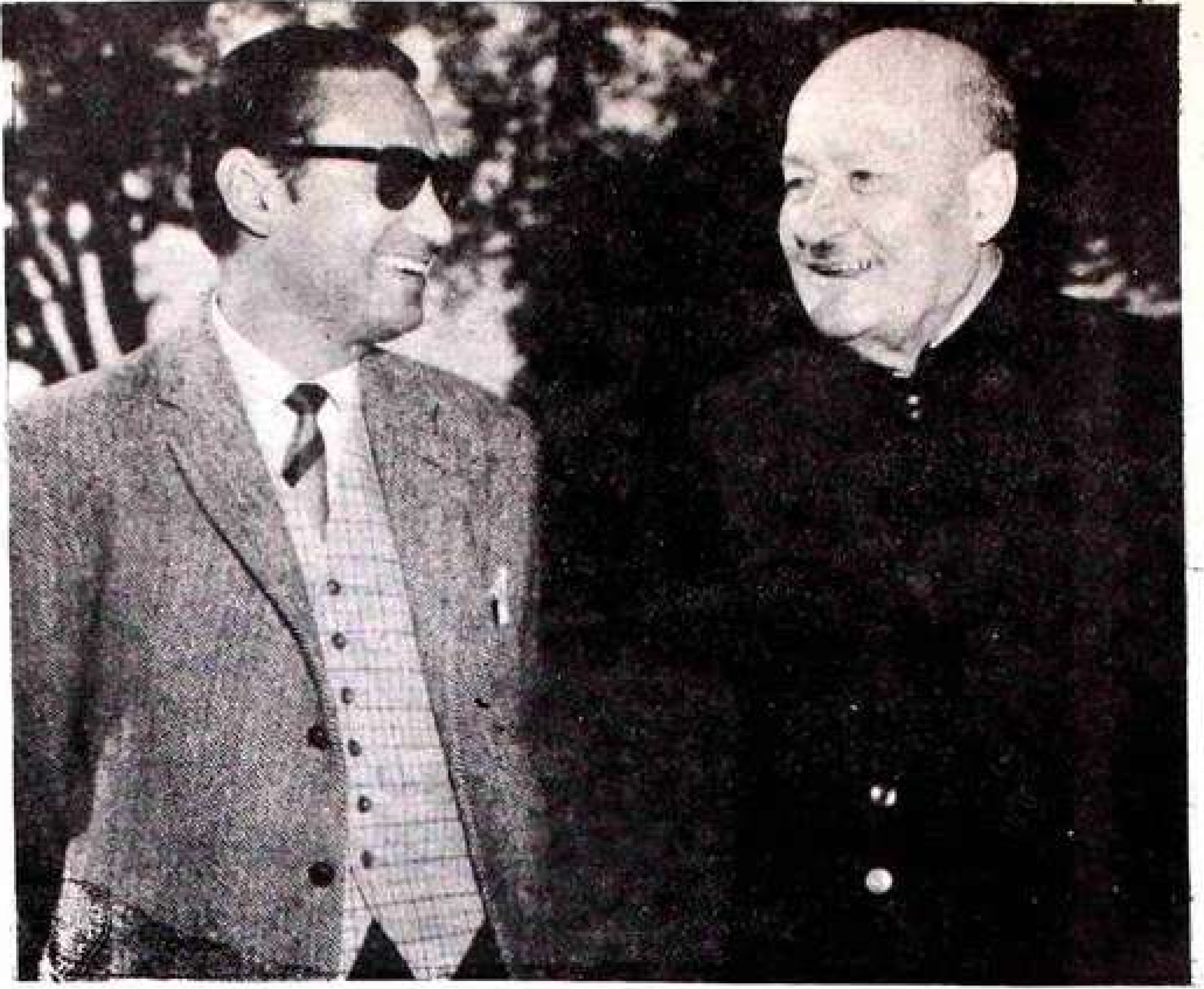
دائیں سے بائیں) ڈاکٹر عالیہ امام، مرزا ظفر الحسن، بیگم بلگرامی، ذوالفقار علی بخاری، مصنّف، فیض احمد فیض، شمس زبیری
حسن مصطفیٰ۔ سید سبط حسن ستمبر ۱۹۷۰ء



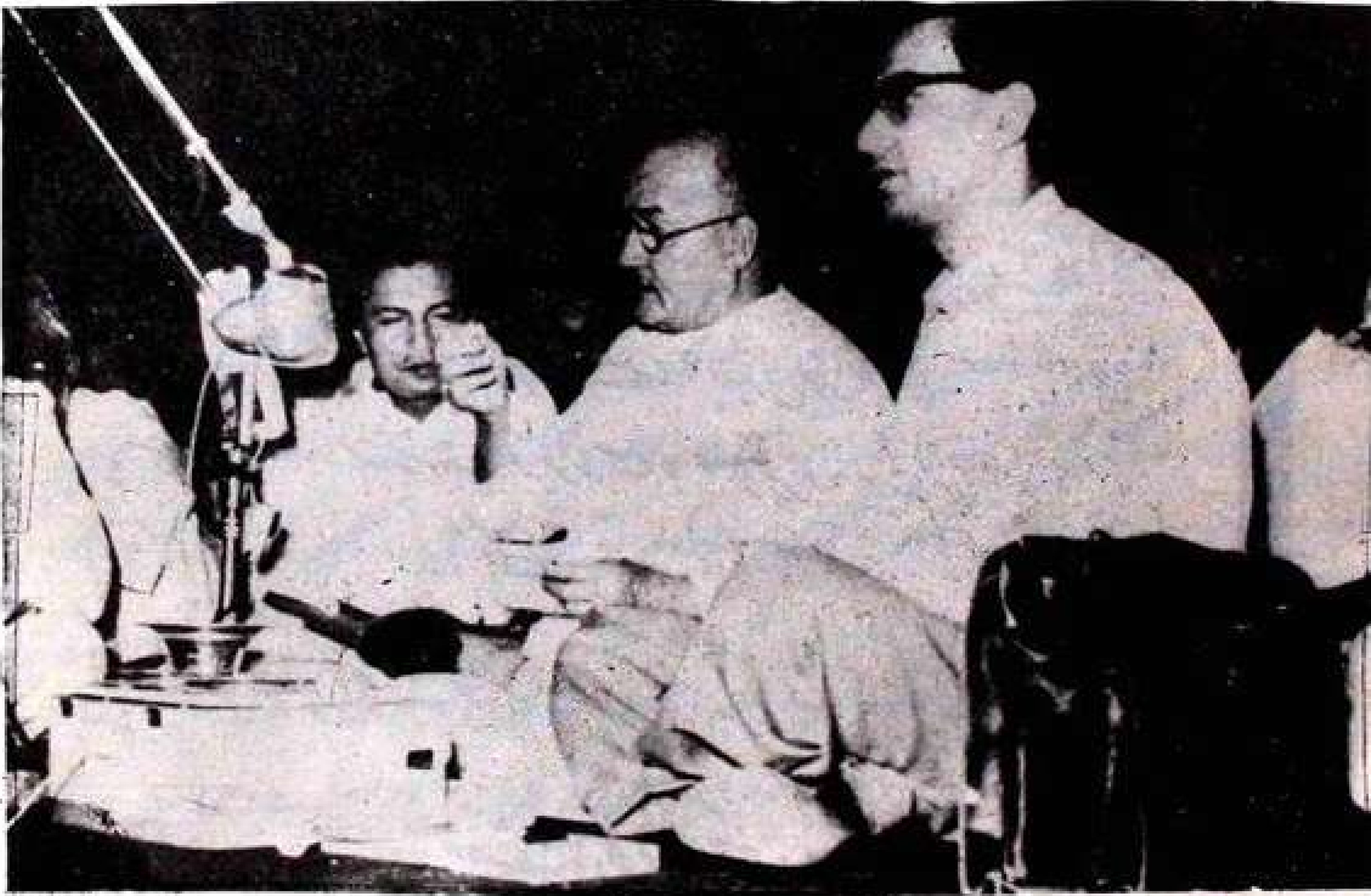
مصنّف، فانیؔ بدایونی اور جگرؔ مرادآبادی۔ پشت پر محمود علی خاں



فیض احمد فیضؔ، مصنّف اور ذوالفقار بخاری



مصنّف اور مصطفےٰ زیدی مرحوم



مصنّف نواب شاہ کے ایک مشاعرے میں کلام سُنا رہے ہیں۔ اُن کے بائیں جانب مصطفےٰ زیدی
اور دائیں جانب حمایت علی شاعر بیٹھے ہیں۔

مرنے کے بعد، قبر میں گڑتا ہے آدمی

میں دورِ زندگی ہی میں، خاک آرمیدہ ہوں

سو سال بعد آئے گی، جس کی زمیں پہ، فصل

میں بد نصیب، وہ ثمرِ نو رسیدہ ہوں

اے روزگارِ دگر، وقفِ سپردگی

تیری نوازشوں سے اگر بار دیدہ ہوں

گزرے گا، تیری [illegible] کے جادے سے، کل جلوس

~~ہر چند آج راہِ مصافِ آفریدہ [illegible]~~ گو، آج، کارواں سے تعلق بریدہ ہوں

کل، نطقِ عرش و فرش پہ ہوگا مرا سخن

کیا ہے، جو آج مصحفِ نا رحل دیدہ ہوں

پشتِ زمیں پہ، مہرِ نبوت، مرا قدم

~~میں [illegible] کائنات [illegible]~~ وہ، دلشبِ ذو الجلال [illegible] ناطقِ جریدہ ہوں

میں، کثرتِ ظہور سے، نادیدنی ہوں جوشؔ

میں، شدتِ وجود سے، نا آفریدہ ہوں

مصنف کی تحریر کا عکس

رسالہ "کلیم" کا دہلی سے اجراء

دہلی پہنچا تو مسز نائیڈو برس پڑیں۔ کہنے لگیں، ذرا اس کا نام تو بتائیے، جس نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مر چکی ہے ___ میں نے، حیران ہوکر، پوچھا، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انھوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھ کو زندہ سمجھتے تو سیدھے میرے پاس آکر اپنی بپتا کہتے ۔ اور میرا جواب سنے بغیر انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہاکہ اگر گھوش مجھ کو نہ لکھتے تو مجھے یہ پتا ہی نہ چلتا کہ آپ دھول پور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انھوں نے کہا۔ میں آپ کے ٹمپرامنٹ سے واقف ہوں، کچھ نہ کہئے، میری خواب گاہ میں جائیے۔ میرے تکیہ کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے۔ اسے کھولے بغیر، اپنی جیب میں رکھ لیجئے، ذرا سنبھال کر رکھئے گا۔ تاکہ گر نہ جائے ۔ اب آپ کا یہ کام ہوگا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہ نامہ نکالیں گے اور، کسی ریاست کی طرف مڑکر بھی نہیں دیکھیں گے۔ میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔

میں رسالے کا نام "کاخ بلند" رکھنا چاہتا تھا میرے دوست ذوالفقار علی صاحب بخاری نے رائے دی کہ میں رسالے کا نام کلیم رکھوں، "کاخ بلند" نام مشکل ہے، میں نے یہ رائے مان لی۔ اور رسالے کے اجرار کے ابتدائی مراحل میں سرگرم ہوگیا۔

رسالہ نکالنا ایک تجارتی امر ہے۔ میری سات پشتیں بھی تجارت سے واقف نہ تھیں

اس لئے ابتدائی مراحل ہی میں بہت سارو پیہ برباد ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دہلی کے احباب نے مجھے گھیر لیا۔ روز بوتلیں کھلنے، اور دعوتیں ہونے لگیں ۔ اور کاتبوں کاغذ والوں، بلاک سازوں اور چھاپہ خانے والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں سراسر لُمر آدمی ہوں، مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ ترببر ہوگیا۔ شرم آئی کہ مسز نائیڈو سے یہ داستان کہوں۔ اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے ۔ ابھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بیمار پڑ گیا۔ بخار اس قدر تیز آیا کہ حواس گم ہوگئے، اور نزلہ اس قدر شدید ہوا کہ تمام سینہ رندھ کر رہ گیا اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی، اور میں سمجھا کہ اب جاں بر نہیں ہوسکوں گا۔

میں اس زمانے میں فتح پوری کے کراؤن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک پرچہ پر میں نے مسز نائیڈو اور جواہر لال کا نام لکھا اور پرچہ لے کر کراہتا نیچے آیا، منیجر کو وہ پرچہ دے کر کہا۔ اگر میں مرجاؤں تو فوراً ان دونوں کو خبر کر دیجئے گا۔ منیجر نے بےحد بدحواس ہو کر مجھ سے کہا۔ جوش صاحب خدا کے واسطے خودکشی نہ کیجئے گا۔ مجھ کو منیجر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی، اور کہا۔ منیجر صاحب میں بزدل نہیں کہ خودکشی کروں، میری حالت خراب ہے اس لئے سوچا کہ مسز نائیڈو اور جواہر کو خبر ہو جائے۔ منیجر دوڑا ہوا گیا اور ڈاکٹر سید ناصر عباس صاحب کو جن کا مطب وہاں سے دس قدم پر تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ میرے سینے کا معائنہ کیا اور مطب جاکر، اپنے آدمی کے ہات، دوائیں بھیج دیں۔

دوائیں پی کر ابھی لیٹا ہوا اپنی بے کسی پر غور اور اپنی موت کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی، اور پنڈت شیو نرائن صاحب (جن کا مطبع ہوٹل سے ملا ہوا تھا۔ اور جن کو مطلبی فریدآبادی مجھ سے ملا چکے تھے) میرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ میں نے کہا۔ آئیے شیو نرائن صاحب۔ افسوس کہ میں اُٹھ نہیں سکتا، آپ میرے سرہانے بیٹھ جائیں۔ مزاج پُرسی کے بعد اُنھوں نے کہا۔ جوش صاحب، مجھ کو اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ رسالہ نہیں نکال سکتے۔ میں کاروباری آدمی ہوں، میرے پاس اپنا ذاتی چھاپہ خانہ

بھی ہے، اس لئے آپ پسند کریں تو میں آپ کا پچاس فی صد شریک ہوجاؤں ۔قلم آپ کا چلے گا، روپیہ میں لگاؤں گا۔ اور جب تک رسالہ چلنے نہ لگے پان سو روپیہ ماہانہ آپ کو بطورِ پیشگی دیتا رہوں گا۔ میں نے اس تجویز کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور فوراً قبول کرلیا

دو چار دن کے اندر، پنڈت شیو نرائن نے، ہوٹل کے سامنے ہی دو کمروں اور کشادہ صحن کا فلیٹ دفتر اور میری سکونت کے واسطے کرایہ پر لے لیا۔ اور میں ہوٹل سے وہاں اُٹھ آیا۔

اس کے کچھ روز کے بعد، جب میں نے اُن سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آنا چاہتا ہوں تو انھوں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس کو فرنیچر سے آراستہ کردیا۔ اور میں بیوی کو لے آنے کے لئے دھول پور چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ میری بیٹی بیمار ہے۔ بیوی اس کو آگرے لے کر چلی گئیں اور کسی ہسپتال میں وارڈ لیکر مقیم ہیں۔ اور میرا بیٹا میرے دوست لطیف الدین کے مکان میں رہتا ہے۔ سخاوت اور ظفر و بھاگ چکے ہیں۔ دوسری ہی گاڑی سے گھبرایا آگرے لطیف کے گھر گیا، دیکھا کہ میرا بیٹا اور اس کا چچازاد بھائی دونوں ایک نہایت بوسیدہ اور میلی دری پر، اُداس بیٹھے ہیں۔ میرے بیٹے نے مجھے دیکھا، دوڑکر، میرے گلے لگ گیا، اور روہانسی آواز میں کہنے لگا۔ ابا ہم یہاں اس دری پر سوتے ہیں۔ ہم کو چارپائیاں بھی نہیں دی گئی ہیں۔ اور ہم روز دس روپے دیتے ہیں تو ہمیں کھانا ملتا ہے، اور وہ بھی ابلا سبلا۔ جی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگوں لیکن اس خیال سے ضبط کیا کہ میرے پرانے دوست لطیف برا مانیں گے۔ (غالباً لطیف کی معاشی حالت اس وقت بگڑ چکی تھی)۔

لڑکے کو لے کر ہسپتال پہنچا۔ دیکھا بیوی کا منھ اترا ہوا ہے، اور بیٹی نڈھال پڑی ہے۔ اس کی چارپائی پر بیٹھ کر میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔ اور آنسو جاری ہوگئے۔ بیٹی بھی رونے لگی، بیوی نے آنسو پونچھ کر کہا۔ اللہ کے لئے اس طرح نہ روؤ، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا۔ ارے ہم کیا ہیں، بڑی بڑی شاہزادیوں پر اس سے بھی بُرے وقت پڑ چکے ہیں، اللہ کا شکر کرو، لڑکی کو پلوریسی ہوگئی تھی، اب اچھی ہوچکی ہے، بس

طاقت آنے کی دیر ہے۔

میں نے بیوی سے کل حالات بیان کر دیئے، انھوں نے کہا، بس آٹھ دن کی دیر ہے۔ یہاں ٹھہر جاؤ، پھر ہم سب ساتھ دہلی چلیں گے۔

آٹھویں دن دہلی آگیا، قرول باغ کی کوٹھی آباد ہوگئی۔ "کلیم" اچھا خاصہ چلنے لگا، معقول آمدنی ہونے لگی، میری نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ گئے۔ حیدرآباد سے عنابی وظیفہ بھی جاری ہوگیا، اور زندگی چین سے گزرنے لگی۔

سال دو سال آرام سے گزرنے کے بعد، میری زندگی پھر ایک بحران کی جانب مڑگئی ایک روز شام کے وقت شیو نرائن خشک چہرے کے ساتھ آئے اور "کلیم" سے اپنی دست برداری کا اعلان کرکے، کہ دیا کہ کل سے آپ اپنا پرچہ خود سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ شیو نرائن صاحب نے اپنے بھائیوں کے دباؤ میں آکر یہ بات کی تھی۔ مگر اُن کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مجھے، کم سے کم تین مہینے کا نوٹس دیتے۔ مگر انھوں نے صرف بارہ گھنٹے کا نوٹس دے کر، علیحدگی اختیار کرلی — میں سیدھا اپنے پڑوسی محمود علی خان جامعی کے پاس پہنچا، اور "کلیم" کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا۔ لیکن جب ایک مہینہ کے بعد اُنھوں نے کلیم کی آمدنی کے صرف نوّے روپے میرے حوالے کئے تو میں دَنگ ہوکر رہ گیا مگر فرطِ مروت سے کچھ کہہ نہ سکا۔ (خدا غارت کرے اس مروّت کو۔ ارے خدا مروّت کو کیا غارت کرے گا، خود مروّت نے مجھ کو غارت کرکے رکھدیا، آج بھی غارت کئے ہوئے ہے اور انشاءاللہ مرتے دم تک غارت کرتی رہے گی۔)

جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے مسٹر پانی کار[1] کو خط لکھا۔ اور پانی کار نے تار بھیج کر مجھے پٹیالہ بلالیا۔ پٹیالے پہنچتے ہی انھوں نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ سے ملواکر میرا وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اب دہلی آکر میں نے محمود علی خان سے رسالہ نکال لیا۔ قرول باغ سے دریا گنج اُٹھ آیا، ایک کوٹھی "ادبیہ بھون" کرائے پر لے لی ایک لکھے پڑھے ذہین پنجابی نوجوان اور دہلی کے دو تجربہ کار بوڑھوں کو ملازم رکھ کر میں

---

[1] وہ مدراسی زبان کے شاعر، ادیب اور مہاراجہ پٹیالہ کے وزراء میں سے تھے، جن سے سروجنی نائیڈو ملا چکی تھیں۔

خود رسالہ نکلنے لگا، اور حکیم حضرت آزاد انصاری بھی میرا ہات بٹانے لگے۔ اور حیرت ہے کہ خود میری بیوی بھی "کلیم" کے کاروبار میں میری دست گیری کرنے لگیں، اور "کلیم" صوری و معنوی، دونوں حیثیتوں سے، دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

میں نے اُسی زمانے میں، اپنی چچازاد بہن کے بیٹے التفات احمد خان سے، اپنی بیٹی سعیدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی، میری بیٹی کی شادی کا کھانا پکوایا تھا۔ قرول باغ کے عبداللہ صاحب نے، اور ایسا اچھا کھانا پکوایا تھا کہ باید و شاید۔ خدا جانے عبداللہ صاحب اب کہاں ہیں۔ جہاں کہیں بھی ہوں، میری یہ آواز سن لیں کہ میں آج تک ان کو یاد کرتا ہوں۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ، اس موقع پر میرے جگری دوست سردار دیوان سنگھ مفتوں نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا تھا، میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دہلی کلاتھ مل کے لالہ شنکر لال اور سروجنی نے جو تحائف دیئے تھے، میرے دل میں اُن کی یاد اور ان کا تشکّر بھی آج تک شاداب ہے۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہدیم، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ اقوال و اوہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب۔ کانگریس کی تحکیم، اور مسلم لیگ کی تنقیص، اس کی پالیسی میں داخل تھی، اور اسی بنا پر شاہ (فرنگی) اور شاہ صاحب، دونوں، مجھ سے بگڑ گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے، غلامی پرست مخالفین مسلم لیگ کے "خطاب یافتہ" مجاہدین" حکومت کے کفش بردار حکّام اور منبر و محراب پر للبلانے والے سرکاری وظیفہ خوار، علمائے کرام لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر اکھاڑے میں اُتر آئے تھے

اُدھر پلٹنیں تھیں اور ادھر میں ایک فردِ واحد تھا، کہ آواز دے رہا تھا ع

من و گرز و میدان و افراسیاب

ل میں کلیم کے دورِ آخر میں تحریکِ پاکستان کا حامی بن گیا تھا۔ اور پاکستان کی حمایت میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے ایک ایسی گھن گرج نظم پڑھی تھی کہ ہال گونجنے لگا تھا۔ اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے بےحد شکایت پیدا ہو گئی تھی، (وہ نظم میرے کسی مجموعے میں شائع ہو چکی ہے۔)

آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے نکلا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گم نام خط آیا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی، اور بیوی چلّاتی رہتی تھیں کہ ارے منھ اندھیرے ٹہلنا چھوڑ دو، نہ جانے اندھیرے میں کون پیچھے سے آکر چھری مار دے۔ لیکن میں ہر روز تاروں کی چھاؤں میں ایک زبردست "تنبیہ الغافلین" قسم کا ڈنڈا لے کر، جمنا کے کنارے، بڑے اطمینان کے ساتھ، ٹہلا کرتا تھا کہ آخر میں بھی آفریدی پٹھان ہوں، دو چار کو مار کر مروں گا۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ، بینی پشتِ مَن
آں منم، کاندر میانِ خاک وخوں بینی سرم

اس کلیمی دور میں، ایک بار سر تیج بہادر سپرو صاحب نے مجھ سے کہا، جوش صاحب، اگر آپ برٹش ایمپائر کی موافقت میں اور سوشلزم کے خلاف نظمیں کہنا اور مضامین لکھنا شروع کر دیں تو تھوڑی ہی مدّت میں نکھ پتی بن سکتے" اور حکومت سے خطاب حاصل کر سکتے" ہیں۔ بڑے بڑے والیانِ ریاست آپ کی شاعری کے رومانٹک اور نیچرل سیز کے حصوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی یہ روش بدل دیں تو ریاستوں سے بھی آپ کی لٹریری پنشنیں مقرر ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا۔ سپرو صاحب۔ آپ میرے باپ کے احباب میں سے ہیں۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں، لیکن آپ بُرا نہ مانیں تو اتنا عرض کروں کہ شاعری ایک خالص وجدانی معاملہ ہے جس کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانا گناہ ہے۔ اس لئے مجھ کو یہ امر اپیل نہیں کرتا کہ اگر میں حکومت یا امرا کی تعریف کروں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا۔ شاعری کو جانچنا چاہیئے اس کے مفید یا مضر اثرات کی روشنی میں ـــــ اور اگر محکم دلائل کے ساتھ آپ اس امر کو ثابت فرما دیں کہ ہندوستان کے واسطے انگریزی حکومت، اور والیان ریاست کی ہستی مفید اور بابرکت ہے تو میں اپنی روش ترک کر دوں گا۔

یہ سن کر سپرو کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ غیظ کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہو گئے اور انھوں نے اپنے تلخ لہجے میں ملائم تبسم کی پھیکی سی شیرینی پیدا کر کے مجھ سے فرمایا کہ، اگر

یہ بات ہے تو کیا میں آپ سے دریافت کرسکتا ہوں کہ پھر آپ حیدر آباد اور پٹیالے سے وظائف کیوں لیتے ہیں ؟۔ میں نے کہا ، سپرو صاحب ۔ غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ میں :۔ " منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن " پر عمل پیرا ہوں ۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کرکے مجھے اِس کا موقع دے دیا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کردوں ۔ پہلی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ ان والیانِ ریاست کے پاس جو دولت ہے ۔ وہ ان کی نہیں ، بلکہ عوام کی ہے ، اس لئے کہ وہ ہماری محنت کی پیدا کردہ ، اور انسان کے ضائع شدہ حقوق کا نتیجہ ہے ۔ اِس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوت استعمال کرکے ، اُن کی دولت چھین لیں ، اور اس کو عامۃُ النّاس میں تقسیم کردیں ، اور جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو ہم کو چاہئے کہ ان کی دولت سے تمتع کی سعی کرتے رہیں ۔

اگر ہم اپنے اصول قربان کئے بغیر ، اُن سے ایک روپیہ بھی وصول کرلیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اُن کو بقدر یک روپیہ کمزور کردیا ، اور اپنے کو بقدر یک روپیہ قوی بنالیا ۔ اور وہ ایک روپیہ جو مسخروں اور بھانڈوں بھگتیوں پر ضائع ہوجاتا ، اپنے مصرف میں لاکر ہم نے اس سے بہتر کام لیا ۔

یہ تو مختصر سا اصولی جواب ہے ۔ اب میری دونوں پنشنوں کی روداد سن لیجئے ۔ جہاں تک کہ میری حیدر آباد کی پنشن کا تعلق ہے ، وہ پنشن ، عتابی پنشن ہے ۔ میں نے نظام کے خلاف نظم کہی ، معتوب ہوا ، اور حسب روایتِ خاندانِ آصفیہ ، پنشن کا مستحق ٹھہرا دیا گیا ۔ اور اب تک سرتابی کی داد حاصل کررہا ہوں ۔ اب رہا پٹیالے کی پنشن کا معاملہ تو میری وہ پنشن سیاسی نہیں ، خالص ادبی ہے ، آج تک مہاراجہ نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں فرنگی کے خلاف شعر کہنا ، یا کھدر پہننا ترک کردوں ۔ اگر مہاراجہ کی پنشن مجھے میرے اصول سے منحرف کردیتی تو مجھ سے زیادہ ذلیل اور کون ہوسکتا تھا ۔ لیکن اس عالم میں کہ وہ پنشن قطعی طور پر غیر مشروط ہے ۔ میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں ۔

میری یہ باتیں سن کر سپرو خاموش ہوگئے ۔ لیکن چہرے پر تکدّر کی شکنیں اُبھر آئیں اور اُن کے چشم و ابرو سے یہ بات ٹپکنے لگی گویا میں نے براہِ راست اُن کی اہانت

کر دی ہے۔

وہ تا حیات مجھ سے روٹھے رہے۔ سچ کہا ہے صائبؔ نے:۔

گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

سیاستِ افرنگ کے دو رُخ

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہ نامۂ "کلیم" کو، کامیابی سے چلا کر، اور ایک ایسے رومانی عذاب میں گرفتار ہو کر، جس نے میرے حواس چھین لئے تھے، میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آبادؔ چلا گیا۔ اور چوں کہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا، میں نے اپنے داماد التفات احمد کو منیجر بنا دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نامِ خدا بالکل نکھٹّو ہیں۔ میں نے "کلیم" بند کر کے، مجازؔ، علی سردار، اور سبط حسن کی درخواست پر، اس کو ان لوگوں کے رسالۂ "نیا ادب" میں ضم کر دیا۔ جو "کلیم و نیا ادب" کے از روئے قواعد، غلط نام کے ساتھ لکھنؤ سے جاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت، سب سے بڑا مرہم ہے، ملیح آباد آکر چھ سات مہینے کے بعد میرے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا۔ اور میں "قصرِ سحر" کی چمن بندی، اور توسیع میں لگ گیا۔

ارے میں ادب نقیب، کشتۂ التفاتِ حبیب، اور باغوں کی تنصیب ۔۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا ۔۔ بیوی تل گئیں آموں کے باغ لگوانے پر، اور ایسی تُل گئیں کہ کھانا پینا دوبھر کر دیا۔ ہر آن یہ رٹ لگ گئی کہ باغ لگاؤ، اور جب تک باغوں میں قلم نہ لگ جائیں قلم نہ اٹھاؤ۔ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل ڈرامائی نظم "حرفِ آخر" شروع کی تھی انھوں نے وہ نظم بھی نہیں کہنے دی۔[۱]

---

[۱] غالباً ۱۹۴۰ء میں ۔ اور آج تک وہ نظم ناتمام پڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے اس کو تمام بھی کر سکوں گا یا ناتمام ہی چھوڑ کر سدھار جاؤں گا۔

تنگ آکر میں نے مانا دین پٹواری کو بلایا۔ پٹواری نے کہا، منجھلے بھیا[۱]۔ اب قانون
بدل گیا ہے۔ آپ کسی کاشتکار کو بے دخل کر کے اس سے زمین نہیں نکال سکتے۔ اور جب
زمین ہی نہیں نکل سکے گی تو باغ کیسے لگے گا۔

مانا دین کی یہ بات سن کر میں باغ باغ ہوگیا۔ کہ چلو ایک بڑی مصیبت کٹ گئی
میں خوشی خوشی بیوی کے پاس گیا۔ اور جھوٹ موٹ کا غمگین چہرہ بنا کر پٹواری کی بات
دہرا دی — لیکن بیوی مایوس نہیں ہوئیں۔ مجھے اور پٹواری کو ساتھ لے کر گاؤں گئیں،
تھانے کے سامنے کاشتکاروں کو جمع کر کے، پٹواری سے کہا۔ پوچھو کاشتکاروں سے کہ منجھلے
بھیا[۱] نے کیا تم پر کوئی ظلم ڈھایا ہے؟ تم پر لگان وصول کرنے میں کبھی سختی کی ہے، ہم سے
کبھی بیگار لیا ہے۔ اور جب مانا دین نے یہ تمام سوالات کئے تو ہر طرف سے آوازیں آنے
لگیں، " ناہیں۔ ناہیں۔ کبھو ناہیں۔ (نہیں نہیں۔ کبھی نہیں) منجھلے بھیا کی جے۔ منجھلے
بھیا کا راج بنا رہے۔ گنگا دھار تک (جب تک گنگا میں پانی ہے) پھر بیوی نے کہا۔
مانا دین پوچھو۔ اگر بھیاؔ، باغ لگانے کے لئے تم لوگوں سے تھوڑی زمیں مانگیں تو
کیا تم نہیں دو گے۔؟ ساری رعایا نے یک زبان ہو کر کہا۔ " دیبا، دیبا، ابھوں ابھوں
دیبا، گلے گلے دیبا، (دیں گے، دیں گے۔ ابھی ابھی دیں گے، گلے گلے دیں گے)

اس کے بعد مانا دین نے استعفے نکالے اور کاشتکاروں نے دھڑا دھڑ انگوٹھے
لگانا شروع کر دیئے۔ اور جب تمام استعفے مکمل ہو گئے، بیوی نے مجھ سے کہا، اب تم
ان کا شکریہ ادا کر دو۔ اور جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو تمام کاشتکار رونے لگے
" بھیا، ہم تو تُمری پنہئی ہیں۔ اس نہ کرو)۔ (بھیا ہم تو تمھاری جوتی ہیں ایسا نہ کرو)

بیوی نے مٹھائی تقسیم کی، رعایا نے منجھلے بھیا کی جے کے نعرے لگائے، اور
دو تین مہینے کے اندر آم کے باغ نصب ہوگئے، اور بیوی نہال ہو گئیں۔

میں غالباً ۱۹۲۱ء میں پھر لکھنؤ آکر رہنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ ملیح آباد میں بےحد
سکون تھا۔ امانی گنج کے میدان کی خالص ہوائیں تھیں، طلوع و غروب کے مناظر تھے

---

[۱] پہلے بھیا تھا۔ اب بوڑھا کھوسٹ ہوں۔

بور کی خوشبو، کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی ہو تھی۔ اور لکھنے پڑھنے کی فرصت۔

لیکن آدمی، مدنی حیوان ہے۔ شام کو جب لکھنے پڑھنے کے جھ اکبر سے فارغ ہو کر بادہ خواری کی عبادت شروع کرتا تھا، تو شدید تنہائی کے سوا کسی کو شریک نہیں پاتا تھا اور دوستوں کو آنکھیں ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ اور چونکہ ؎

زاہد کی نماز ہو کہ مے کش کی شراب
دونوں کا مزا ہے، با جماعت ساقی

اپنی تنہائی پر دل اداس ہو کر رہ جاتا۔

ایک روز اس گھٹن میں پی رہا تھا کہ دل ڈوبنے لگا، یاروں کے چہرے، اور دل داروں کے مکھڑے آنکھوں کے نیچے پھرنے لگے، رباعی کا ایک مصرع زبان پر جاری ہو گیا:-

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا

جی میں آیا کہ قافیے کو "ن" کی شرط لگا کر کہوں۔ "ن" کی شرط لگا کر "تنہا" کا "نباہ" بڑا ہی مشکل نظر آیا، بہرحال طبیعت پر زور ڈال کر، رباعی کہہ ڈالی۔ آپ بھی سن لیں، اور میری جگر کاوی کی داد دیں۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا
غلطاں بہ سبو، تمام خونِ فن ہا
ٹھٹری ہوئی، ساغر میں نظر آتی ہے
صہبا — رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ملیح آباد کی بے احباب شاموں سے تنگ آکر، میں لکھنؤ چلا گیا تھا اور لگے ہاتھوں اگر یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو میری گھٹن کا پورا اندازہ ہو جائے گا کہ اکثر ایسی بھیانک شامیں بھی گزرتی تھیں کہ میرے اقربا، مجھے گھیر لیا کرتے، اپنے دیوانی فوجداری مقدمات کے روح فرسا تذکرے چھیڑ دیتے۔ فوجداری کے وقت، دشمن کے حملے کو خالی دے جانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے گر، اور کالے سانپوں

سے بچنے کے پینترے بتایا کرتے تھے۔

ایک روز جب میں اپنی، بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنؤ کے گورنر کی تقریر، ریڈیو پر سُن رہا تھا، جس میں اہلِ ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر، جنگِ عظیم میں، برطانیہ کی مدد پر کمربستہ ہو جائیں، اس وقت میں نے، یہ مندرجہ ذیل نظم - ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔[ل]

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرد
دہر میں، انسانیت کے نام کو اونچا کرد
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا
بھیڑیئے کو مار دو گولی، پئے امن و بقا
باغِ انسانی میں، چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے، ہچکیوں پہ ہچکیاں
ہات ہے ہٹلر کا، رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو، جرمنی کی آگ پر

۲

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری، اور یہ ذکر!!
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر!!
جب، یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

ل یہ نظم چونکہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں کہی گئی تھی، اس لئے اس میں شاعرانہ محاسن کی تلاش نہ کیجئے اور چونکہ یہ نظم ضبط ہو جانے کی بناء پر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی ہے، اس لئے اس کو یہاں درج کر رہا ہوں، تاکہ محفوظ ہو جائے

ہندیوں کے جسم میں، کیا، روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ، کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

۳

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دَورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم، جب کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم!
سرد لاشوں سے، گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم!
صنعتِ ہندوستاں پر، موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی — تمھارے ہات کی لائی ہوئی

۴

اللہ اللہ، کس قدر، انصاف کے طالب ہو آج
میر[1] جعفر کی قسم، کیا دشمنِ حق تھا سراج[2]
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کِن کے سر[3] لائے تھے تم شاہِ ظفر کے سامنے

---

[1] ہندوستان کا روسیاہ غدار (ایسے غداروں کی ہندوستان میں کبھی کمی نہیں رہی) [2] نواب سراج الدولہ بہادر (جو ہندوستان کا سپوت تھا۔ [3] خونی دروازے میں شاہ زادوں کے سر کاٹ کر، ان کے باپ حضرت ظفر کے سامنے، خوان میں رکھ کر لائے گئے تھے۔

یاد تو ہوگی، وہ مٹیا برج[1] کی بھی داستان ؟
اب بھی جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا ؟
آج بھی آتی ہے جس سے "ہائے اختر"[2] کی صدا
سچ کہو، کیا حافظے میں ہے، وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون[3] میں، اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان[4] والا باغ بھی ؟
پوچھ لو، اُس سے، تمھارا نام کیوں تابندہ ہے
"ڈائر" گرگِ دہن آلود، اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ، اب بھی جسکے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے
ہند کے رہ بر، رہا کرتے تھے، کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے، جن میں کوڑوں کی صدا

۵

آج کشتی، خُلق کے امواج پر، کھیتے ہو کیوں ؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں ؟

---

[1] کلکتے کی وہ عمارت جس میں حضرت واجد علی شاہ کو قید کیا گیا تھا۔ [2] حضرت واجد علی شاہ کا تخلص۔
[3] حضرت ظفر کو رنگون میں قید اور دفن کیا گیا تھا۔ [4] پنجاب کا ایک باغ، جہاں شمرِ خو جنرل ڈائر نے صدہا محبانِ وطن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں !
آدمیت کو، کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں !

۶

لیکن ، آج ، اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم !
ہو نہ ہو۔ اپنے میں ، اب قوت نہیں پاتے ہو تم !
اہلِ حق روشن نظر ہیں۔ اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں
آج ، شاید ، منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں؟
"جس کی لاٹھی اس کی بھینس" اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا کہا ؛ انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں !
کیا قتال و ظلم کا ، اب تم میں کَس باقی نہیں ؟

۷

دیر سے بیٹھے ہو ، نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا ، خدا ناکردہ ، کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی ، نہ آبادی ، نہ ویرانے ، میں ہے
خیر تو ہے۔ اسپ تازی ، کیا شفاخانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں ، رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت ، کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے !
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے !

ظلم بھوسے ، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے

۶

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل ، یزید و شمر تھے ، اور آج بنتے ہو حُسینؑ
خیر ، اے سوداگرو ، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے ، جھکا دو گردنیں
اک کہانی ۔ وقت لِکھّے گا ، نئے مضمون کی
جس کی سُرخی کو ضرورت ہے ، تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

اس نظم کا چھپنا تھا کہ آگ لگ گئی۔ طلّاب اور عامّۃ النّاس جلوس بنا بنا کر نکلنے اور اسے گلی گلی گاتے پھرنے لگے۔ آگے آگے وہ لوگ ہوتے تھے، اور پیچھے پیچھے پولیس[1]۔

میری یہ نظم جب برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی تو میری شدید نگرانی ہونے لگی، اور میری کوٹھی سے ملی ہوئی دوسری کوٹھی میں، ایک سی آئی ڈی انسپکٹر صاحب میری شبانہ روز نگرانی کے واسطے، آکر رہنے لگے۔ ایک دن سہ پہر کے وقت پولیس نے میری کوٹھی پر دھاوا بول دیا۔ اور ایک ہندو انسپکٹر کی سرکردگی میں دس پندرہ کانسٹبل آدھمکے۔ میری خانہ تلاشی کے لئے۔ اور کھڑے ہوگئے برآمدے میں۔ اور انسپکٹر صاحب کمرے میں آگئے۔

انسپکٹر سے میں نے کہا۔ جناب میرا گھر کھلا ہوا ہے۔ آپ شوق سے ایک ایک گوشہ چھان ڈالیں، اس پر انسپکٹر نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں آپ کو ایسی عمدہ نظم کی مبارکباد دیتا ہوں، میں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لوں گا، صرف ضابطہ کی خانہ پُری کر کے چلا جاؤں گا۔ میں نے کہا، پولیس میں رہ کر آپ اس قدر شریف ہیں، بڑے تعجّب کی بات ہے؛ اس نے کہا۔ میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً نوکری کرتا ہوں، مگر میں نے

---

[1] جن لوگوں نے یہ نظم پڑھی وہ گرفتار کرلئے گئے، لیکن مجھ پہ ہات نہیں ڈالا گیا، اسی زمانے میں سنا تھا کہ تیج بہادر سپرو نے یہ کہہ کر میری گرفتاری رکوادی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر بہت خطرناک ہوجاؤں گا۔ معلوم نہیں یہ خبر جھوٹ تھی یا سچ، مگر یہ واقعہ ہے کہ میری گرفتاری عمل میں نہیں آئی یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی قوم کی شرافت نے میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو۔ انگریز محبانِ وطن کی دل ہی دل میں قدر کرتا تھا، یہ اور بات ہے کہ بحکمِ سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑتی تھی، حکمراں کی حیثیت سے انگریز کمینہ، لیکن من حیث القوم شریف تھا، اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہوجاتا تھا۔ لیکن میری قوم چوں کہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے، یہ اپنے خلاف آواز سن کر ناپیں مارنے لگتی اور کف در دہاں ہوجاتی ہے۔

کسی انگریز فلسفی نے لکھا تھا کہ دو ڈھائی سو سال کی ذہنی ورزش کے بعد ہم نے اس اعلیٰ شرف کو پالیا ہے کہ جب کوئی ہم کو بُرا کہتا ہے تو ہم بُرا نہیں مانتے، ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کہ وہ برائی ہم میں ہے کہ نہیں، ہوتی ہے تو ہم اس کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں، نہیں ہوتی تو ہم اپنے برا کہنے والے کو سمجھانے کی تو ضرور کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کی عداوت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔

ضمیر نہیں بیچا ہے، میرا دل آپ لوگوں کے ساتھ ہے ــ یہ کہ کر وہ ایک میز پر، سر جھکا کر ضابطے کی خانہ پُری کے واسطے کچھ لکھنے لگا، انسپکٹر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان ہڈ کانسٹبل صاحب نے میری ٹائم پیس اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی، چوری انھوں نے کی، میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اور جب ضابطہ کی کارروائی مکمل کرکے وہ انسپکٹر صاحب رخصت ہونے لگے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور ہندو کی شرافت اور مسلمان کی کمینگی دیکھ کر، مجھ کو دانتوں پسینہ آگیا۔

کوئی حد ہی نہیں اِس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن، اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اس کے بعد، میں نے اس واقعے پر ایک نظم کہہ کر، چھپوا دی[1] جو چھپتے ہی ضبط کر لی گئی۔ چونکہ وہ نظم بھی میرے کسی مجموعے میں طبع نہیں ہوئی ہے، اِس لئے اسے بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ محفوظ رہے،

اے حکومت کیا وہ شے اِس میز کے خانوں میں ہے؟
جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے؟
بند پانی میں سفینے کھے رہی ہے کس لئے
آ، مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مُراد
گھر میں، درویشوں کے، کیا رکھا ہوا ہے، بدنہاد
جس میں غلطاں آندھیاں، اندھے بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر، دہشتیں، پُرہول طوفانوں کی ہیں
شیر، جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
جس کے اندر ناگ ہیں لے دشمنِ ہندوستاں
جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی
چھوٹتی ہیں، جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی
نارِ دوزخ کو، پسینہ جس سے آجائے وہ آگ
جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جائے وہ آگ

---

[1] میں ان ہڈ کانسٹبل صاحب سے بخوبی واقف تھا، ہزاروں بار میں نے مجالس عزا میں انھیں، چیخیں مار مار کر روتے اور ماتم کرتے دیکھا تھا، وہ حسین کے محب، یعنی حق کے پرستار تھے، اور اس کے باوجود ان کو میری گھڑی چراتے وقت شرم نہیں آئی[2] فرنگی کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف نظمیں اور مضامین چھپ سکتے تھے، اور اخباروں کی ضمانتیں بالعموم ضبط نہیں ہوا کرتی تھیں۔

موت جس میں دیکھتی ہو منھ، اس آئینے کو دیکھ   میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

اس واقعے کے بعد میں نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدّس پڑھا "حسین اور انقلاب" کے نام سے۔

"حسین اور انقلاب" سننے کے لئے پورا ادبی لکھنو ٹوٹ پڑا تھا، امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی، لکھنؤ کے تمام شعرا، تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے، اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہلِ سنّت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چوں کہ اِس مسدّس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردارِ حسین پر عمل کرنے کی، بالکل پہلی بار، ترغیب دی گئی تھی، اس لئے اربابِ مجلس نے بالعموم، اور اعیانِ سیاست نے بالخصوص، بار بار کھڑے ہوکر، اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ اُن کی آوازوں کے تھپیڑوں سے، منبر میں جنبش پیدا ہو گئی تھی، — اور، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر، میدانِ جنگ میں کود پڑیں گے۔

حکومت کے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اس نے "شیعہ خان صاحبوں" "خان بہادروں" اور "سروں" کو طلب کرکے، یہ ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدّس کا اثر

ؔ یوں تو میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی، کہ حسینیت کی سی دولت کے علمبردار، شہادتِ حسین پر تو آنسو بہاتے، لیکن عزیمتِ حسین سے جی چراتے ہیں۔ اور یہ انوکھی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کربلا کا داورِ محشر یعنی حسینِ اعظم کا سا غیور سورما جس قوم کا ہیرو ہو۔ وہ قوم باطل پرستی و بزدلی کا صید زبوں کیونکر بن گئی، اور اس نے اس ننگ کے برداشت کر لینے پر، اپنے کو، کس طرح آمادہ کر لیا کہ وہ باطل بنیاد فرنگی کے آگے سربسجود ہو جائے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں، میرے اس شعلے کو، ایک آئی، سی، ایس، مستشرق انگریز نے جو بورڈ آف ریوینیو کا صدر تھا، شعلۂ جوّالہ میں تبدیل کرکے "حسین و انقلاب" کہنے پر مجھ کو آمادہ کر دیا تھا۔ اور آپ بھی سن لیں کہ، محرم کی پہلی تاریخ کو جب میں اس سے ملنے گیا تھا، تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تاریخِ اسلام میں حسین ایک ایسا منارۂ حق ہے کہ اگر ہندوستان کے صرف مٹھی بھر شیعہ، اپنے ہیرو کی اسپرٹ کو جذب کرکے اس کے راستے پر گامزن ہو جائیں تو ہماری برٹش حکومت کا ایوان پاش پاش ہو کر رہ جائے —

زائل ہو جائے، اپنے آقا کا حکم سن کر انھوں نے مشورہ کیا، اور مشورے کے بعد وہ تمام حُسین کے پرستار، یزید کی حمایت پر طیّار ہو کر، لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سیّد ناصر حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اُن سے یہ کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانیٔ مجلس، حکیم صاحب عالم صاحب نے، بالخصوص، ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے، اور منبرِ حُسَین پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خمار کو بٹھا کر، منبر کی تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے۔ اِس لئے آپ اُس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیں۔

قبلہ وکعبہ نے مجھے بلا بھیجا۔ مجھے دیکھتے ہی اُن تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔ اور چائے نوشی کے بعد قبلہ وکعبہ نے اپنے بائیں طرف مُصلّا بچھوا کر، جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب، زحمت نہ ہو تو آپ میرے مُصلّے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدّس سنا دیں، جو آپ نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں پڑھا تھا، تو حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی۔۔۔ اور، جب میں قبلہ وکعبہ کے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں، وہ مسدّس پڑھ کر، اپنی جگہ واپس آگیا تو انھوں نے، سرکار پرستوں کی ٹولی کی طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے یہ حدیثِ مبارک کہ لاتقربوا الصّلوٰۃ، اَنتُم سُکارا، تو ضرور سنی ہوگی، جس کے یہ معنی ہیں کہ جب تم نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ پھٹکو، اور اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ پینے والوں کو، ہوش کے عالم میں، نماز پڑھنے سے روکا نہیں گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں نہیں ہے تو وہ منبرِ حُسَین پر بھی بیٹھ سکتا، اور مسجد میں داخل ہو کر نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی سرکار پرستوں کا رنگ فق ہو گیا، اور میں سمجھ گیا کہ دراصل معاملہ کیا تھا۔۔۔ میرے اس مسدّس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر، جب مسٹر مارش[1]، مشیر گورنر

---

[1] مسٹر مارش، میرے باپ کے دوست، مجرموں کے دشمن، بے آسرا لوگوں کے مددگار، اور اپنی آدھی تنخواہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اگر حکومت، مسٹر مارش کے سے شریف حکام سے کام لیتی تو ابھی سو برس اور حکومت کر سکتی تھی۔

کے ملاحظہ سے گزرا تو انھوں نے مجھے بلا بھیجا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے، اور کہا اس سے پیشتر، جب میں نے آپ کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" کا ترجمہ پڑھا تھا، میری آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں، اور اب جب میں نے آپ کی نظم وہ حسین اور انقلاب" کا ترجمہ پڑھا تو میں نے آپ کے باب میں یہ رائے قائم کی کہ آپ حق کے پرستار، اور باطل کے دشمن ہیں ـــ اور اب میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مسولینی اور ہٹلر، دونوں اس وقت، یزید کا پارٹ کر رہے ہیں کہ نہیں، اور جب میں نے کہا بیشک آپ سچ کہہ رہے ہیں، تو انھوں نے مجھ سے دوسرا سوال کیا کہ اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ عصرِ نو کے ان زندہ یزیدوں کے خلاف، آل انڈیا ریڈیو سے، ہر ہفتے ایک نظم براڈ کاسٹ کرتے رہیں (جس کے معاوضے میں یوپی حکومت آپ کو آٹھ سو ماہانہ آنریریم دیا کرے گی)، تو کیا آپ اس "آفر" (پیش کش) کو قبول نہیں کریں گے؟

یہ سن کر میں نے سر جھکا لیا، انھوں نے پوچھا کیا بات ہے، یہ "آفر" تو آپ کی اُفتادِ مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ میں نے کہا، مسٹر مارش، میں دو وجوہ کی بنا پر آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں، ایک تو آپ میرے مرحوم باپ کے دوست اور دوسرے آپ عزیزوں کے بہت بڑے سرپرست ہیں۔ میں، کسی آنریریم کے بغیر آپ کے ارشاد کو مان لیتا، مگر کیا کروں، اپنے اصول سے مجبور ہوں، کانگریس نے اس جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں آپ کی حکومت نے انھیں نہیں مانا۔ مارش نے، میری بات کاٹ کر کہا میں آپ سے حکومت کے تعاون کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ فقط مسولینی اور ہٹلر کو بے نقاب کرتے رہیں، میں نے کہا، اگر میں ایسا کروں گا تو اس کا جو گرانڈ ٹوٹل نکلے گا، وہ بالواسطہ آپ کی حکومت کی موافقت پر مشتمل ہوگا۔

مارش یہ سن کر، تھوڑی دیر کے لئے تو خاموش ہو گئے، پھر، اپنی عینک کی تال صاف کر کے وہ بڑے ولولے کے ساتھ کھڑے ہو گئے، میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کریں گے میں بھی جوابی حملے کے واسطے کھڑا ہو گیا۔

لیکن وہ میرے قریب آئے اور میری پیٹ ٹھونک کر، کہنے لگے، "وانڈرفُل ینگ مین" (حیرت ناک جوان آدمی) آپ کے انکار نے میرے دل میں آپ کی عزت قائم کر دی، آپ اپنے باپ کی مانند بڑے آدمی ہیں، آپ کو دیکھ کر میں نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کر لی ہے کہ ہندوستان کی زمین کیریکٹر پیدا نہیں کرتی۔ اگر آپ کو، کبھی میری ضرورت پڑے، یاد کر لیجئے گا، یہ کہہ کر وہ مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے، اور، برابر مسکراتے رہے۔

کچھ دن فلمی دنیا میں

اُمّید صاحب اُمیٹھوی، اور ساغر صاحب نظامی کو ساتھ لے کر، جب میں، ایک مُشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا۔ تو اُس کے دوسرے ہی دن، شام کے وقت شالیمار پکچرز پونا کے مالک احمد صاحب بنّے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم لوگوں کا کلام سُننے کے بعد، وہ بنّے میاں کو، دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے، اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد، جب رخصت ہو گئے تو بنّے میاں نے مجھ سے کہا کہ احمد صاحب آپ کو، اور ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں، آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی، صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا، آپ کا مُعاوضہ گیارہ سو ٹنک، اور ساغر صاحب کا مُعاوضہ ساڑھے پانچ سو ٹنک ماہانہ[1] حاضر کیا جائے گا۔ میں نے کہا، یہ سرخوشی کا وقت ہے، اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں، کل جواب دوں گا۔ صبح کو، ساغرؔ نے مجھ سے کہا، اگر آپ یہ شرط لگا دیں گے کہ میرا اور ساغرؔ کا مُعاوضہ بالکل مساوی ہو گا تو احمد صاحب کی چونکہ یہ تمنّا ہے کہ آپ اُن کے وہاں کام کریں، اس لئے وہ اس شرط کو قبول کرلیں گے، اور میری زندگی بن جائے گی۔ میں نے ساغر کی بات مان لی۔

میں نے بنّے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر مُعاوضہ دیا جائے، اگر احمد صاحب اسے قبول نہیں کریں گے تو میں اُن کی یہ پیش کش نامنظور کر دوں گا۔

احمد صاحب نے، بادلِ ناخواستہ یہ شرط قبول کر لی۔ اور، تھوڑے دن کے بعد،

---

[1] معاوضہ اچھی طرح یاد نہیں، مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ساغر صاحب کا معاوضہ مجھ سے نصف تھا۔

ہم لوگ، پونے آ گئے، اور شنکر سیٹھ روڈ کے "طاہر پیلس" میں رہنے لگے۔

پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دل فریب صُبحیں اور شامیں، وہاں کی پابندِ اوقات برسات، اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں، جن کو آج تک بھلا نہیں سکا ہوں۔

میں نے اپنے دہلی کے رہنے والے پنجابی دوست مَلِک حبیب احمد، اور اپنے دکنی دوست حبیب اللہ رُشدی کو بھی شالیمار میں مُلازم رکھا دیا تھا، کرشن چندر کو بھی احمد صاحب پونے کھینچ لائے تھے، بے چارہ جوانامرگ شام تیواری، حمید بَٹ مرحوم، برج بھوشن، اور بھارت بھوشن رہندی کے شاعر) بھی شالیمار سے وابستہ تھے۔ میرے پُرانے فوجی دوست منّان خاں رام پوری بھی، بسلسلۂ تبادلہ، پونے آ چکے تھے۔ اور پونے کے نئے دوست قدّوس گھڑی والے، اور محمد نصیح بھی ایسے دل چسپ نکلے کہ رات کی اکثر نشستیں اُن کے گھر پہ ہُوا کرتی تھیں۔ اور ایک اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آئی تھی۔

اُسی اثنار میں قمر علی[1] صاحب اور سیّد[2] آفتاب حسین صاحب سے بھی بڑے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ نصیح[3] صاحب کی گردن میں ایک ذرا سا خم تھا، اس لیے میں اُن کو "مردِ کج گردن" کہا کرتا تھا، اُسی کے ساتھ ساتھ، چوں کہ وُہ تاویلات و قوافی پہ بڑی دست رس رکھتے تھے، میں نے ان کو "امیرِ تاویلات و قوافی" کا خطاب بھی دے دیا تھا۔

وہاں میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے "مَولا ڈینا" جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی، بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ، امداد کیا کرتے تھے۔ اور ایک سلسلۂ خاص میں انھوں نے میری اعانت بھی کی تھی جس کو میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔

وہیں ساغر صاحب کا، مراد آباد کی ایک صاحب زادی سے، قلمی معاشقہ بھی چل رہا تھا، اور کچھ روز کے بعد، وہ صاحب زادی، طاہر پیلس میں دُلھن بن کر آ گئی تھیں۔

---

[1] قمر علی ٹیلرنگ فرم کے مالک اور لکھ پتی انسان تھے۔ [2] آفتاب صاحب ایک لانڈری کے مالک اور آسودہ حال آدمی تھے۔ کراچی آ کر، دونوں تباہ ہو چکے ہیں۔ کراچی نے چھوٹوں کو اُبھارا اور بڑوں کو دفنا دیا ہے۔ [3] آگے چل کر یہ بات کھل گئی کہ وہ دل چسپ زیادہ، اور مخلص بہت کم تھے۔

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات، شب برات تھی۔ اور، ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جاکر، کسی کے آستانِ جمال پر، سجدہ ریزی بھی کرآتا تھا۔ لیکن، احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر، وہ سارا طلسم توڑ دیا۔ وہ چُپ چپاتے پاکستان کی طرف پرواز کرگئے، اور ہم سب لوگوں کے ہاتوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور وہ سارا کھیل۔ خوش درخشید، ولے دولتِ مستعجل بود، ہو کر رہ گیا۔

پونے کو خیرباد کر، میں بمبئی آگیا اور ملیح کے خالی گھر میں رہنے لگا۔ اُس گھر کے ایک گوشے میں ممتاز حسین، (جو آج کل کراچی کے کسی کالج میں اُردو کے استاد ہیں) بھی رہتے تھے، جہاں سعیدہ کے بچّوں اور اُن کے مابین، روز کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا، اس لیے، کچھ روز کے بعد، میں اپنے ایک بے تکلّف ملنے والے ماسٹر عبدالعزیز صاحب رام پوری کے، حبیب سرکل والے خالی فلیٹ میں اُٹھ آیا تھا۔ اس زمانے میں فلمی بازار، ٹھنڈا پڑا ہوا تھا، ساغر، ہر دوسرے تیسرے دن، میرے پاس آتے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ خاں صاحب اب ہو گا کیا۔

پُروڈیوسر اس بات پر مُصر تھے کہ جوش صاحب ہمارے اسٹوڈیو آئیں گے تو ہم اُن سے گیت لکھائیں گے، اور جوش صاحب اس بات پر اڑ گئے تھے کہ وہ ہمارے گھر آنے کا دُکھ سہیں گے تو ہم گیت کہیں گے،

میرے دوست آغا جانی کاشمیری، اور خواجہ احمد عباس نے بہت کوشش کی کہ مُعاملات روبراہ ہو جائیں، مگر کچھ نہ ہو سکا۔ اس کش مکش میں میرا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا، آمدنی کچھ تھی ہی نہیں، اور بیوی کے پاس جو کچھ ادھی پونجی تھی، وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

میں اُسی عالم میں ایک روز، شام کے وقت، شغل کر رہا تھا کہ بازار میں، یکایک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اور ہر طرف سے "مارو، مارو، مارو" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں برآمدے میں جاکر جھانکنے لگا کہ دیکھوں مُعاملہ کیا ہے کہ اتنے میں، کسی نے، زور زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا، میں نے، بھری سوڈے کی بوتل ہات میں لے کر، دروازہ

---

[1] وہ کہیں بہت دور گئے ہوئے تھے۔

کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی، ایک صورت آشنا ہندو پڑوسی نے، بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا مسٹر جوشؔ آپ فوراً یہاں سے، کسی مسلم محلے میں چلے جائیں۔ کسی نے مہاتما[1] گاندھی کو گولی مار دی ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے، اس لئے فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ میں اپنے بال بچوں اور لوٹل کو لے کر، اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں، جو بھنڈی بازار میں تھا، چلا گیا۔ اور وہاں پہنچا تو ریڈیو پر جواہرلال کا یہ اعلان سُنا کر مہاتما جی کو، ایک ہندو مرہٹے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اُس اعلان نے مسلمانوں کو قتلِ عام سے بچا لیا۔ اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا۔ دوسرے دن، میں اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ اور، زندگی، فاقہ و فقر کے سائے میں گزرنے لگی۔ ایک دن، میں نے دیکھا بیوی بے حد اُداس بیٹھی ہیں، پوچھا کیا بات ہے، کہنے لگیں میرے پاس جو روپیہ تھا، اب وہ سِسکیاں بھر رہا ہے، جلدی کوئی سُبیتا کرو، نہیں تو، خُدا نہ کرے، دھڑا دھڑ فاقے ہونے لگیں گے۔ یہ سُن کر یہ بات میرے دل میں آئی کہ اب میں اپنی آن توڑ دوں، اور قلم کان میں لگا کر "کام گیت لکھنے کا" کے نعرے لگاتا، اسٹوڈیوں کی گلیوں میں پھرنا شروع کر دوں۔

کہ جاہا، سپر باید انداختن !

میرے خون میں جب اس ارادے کی دھمک پیدا ہوئی، تو میرے سینے کا خوابیدہ شاعر، جوشؔ یکایک بیدار ہو گیا، اور جامے سے باہر ہو کر کہنے لگا کہ تو اس دنیا دار شبیر حسن خاں کے بہکانے میں آ کر اگر یہ دڑیو سروں کی طرف جائے گا تو تیری ٹنگڑیاں توڑ کر، رکھ دوں گا۔

اپنے غیور شاعر کی یہ گھن گرج سُن کر، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور بجلی کی لپک کے مانند، فوراً ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی۔ میں سیدھا، بیوی کے پاس گیا، اور کہا اشرف جہاں پانچ دن، اور راستہ دیکھ لو۔ اگر اس مُدت میں کوئی سُبیتا نہ ہوا تو مجھے تیس چالیس روپے اور یہ کالا کمبل دے دینا۔ بیوی نے کہا اس روپے سے کیا کرو گے، اور روپے کے ساتھ، یہ کمبل کیوں مانگ رہے ہو۔ میں نے کہا میرے ایک کاروباری ملنے والے ہیں، ان کو ساتھ لے جا کر، مارکٹ سے

---

[1] اسی بمبئی نے گاندھی جی کی موت کی منحوس خبر سنائی تھی، اور اُسی بمبئی نے آزادیٔ ہند کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ پہلی خبر پر میں نے آنسو بہائے تھے، اور دوسری خبر سن کر، اپنے ساتھیوں کے ساتھ، سڑکوں پر ناچا تھا۔

ترکاریاں لاؤں گا، اور عین اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے، کمبل بچھا کر، آلو، گوبھی اور بنڈے بیچنا شروع کردوں گا۔ میرے باپ کو بنڈے بہت پسند تھے، اور اُن کے خُدّام بازار سے بنڈے خرید کر لاتے تھے، اب ان کا بیٹا سڑک پر، بیٹھ کر، بنڈے بیچے گا۔ اور اوّل و آخر میں ایک نسبت پیدا ہو جائے گی۔ یہ سُنتے ہی بیوی اُچھل پڑیں، گویا، خدا نہ کردہ، بجلی کا جھٹکا لگ گیا، اُن کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے، کہنے لگیں ایسا کروگے تو ناک کٹ جائے گی۔ میں نے کہا اشرف جہاں تعلّقہ داری کی بو دماغ سے نکال ڈالو، حلال کی روزی کمانے میں کہیں ناکیں کٹا کرتی ہیں، ناک تو کٹتی ہے چوری چکاری کرنے، اپنی آن توڑ دینے، اور اسٹوڈیوں کے چکّر لگانے سے۔ اور، بفرضِ مُحال، اگر اس بات کو بے عزّتی مان بھی لیا جائے، تو میرے اس طرح سڑک پر بیٹھ کر، ترکاری بیچنے سے، میری نہیں، ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی۔

بیوی نے، سر سے لے کر، پاؤں تک مجھے دیکھا، "اے اللہ تو کہاں جا کر سو گیا ہے" کہا، تکیئے پر سر رکھ دیا، اور، بڑی بیکسی کے ساتھ، آنکھیں موندلیں۔

بیوی کی اس اُداسی پر میرا دل بھر آیا، دوسرے کمرے میں لیٹ کر، سو گیا، اور خواب دیکھنے لگا کہ میں اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے، سڑک پر کمبل بچھائے، ترکاریاں بیچ رہا ہوں، اور سامنے سے جنازے گزر رہے ہیں، میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ جنازے کس کے ہیں، لوگ کہہ رہے ہیں تمہارے آبار واجداد کے۔ جب بیدار ہُوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آرہا ہے، اس نے اخبار دے کر کہا، ماموں سرکارِ ہند کو، اپنے رسالے "آج کل" کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے جسکی درخواستیں مانگی گئی ہیں، آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے، آپ فوراً درخواست روانہ کردیں، اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس، اُسی درخواست کی نقل بھیج دیں۔ میں نے کہا بیٹا درخواست تم لکھ لاؤ، میں دستخط کردوں۔ داماد تھوڑی دیر میں درخواست لکھ کر آگیا۔ اور درخواست دہلی بھیج دی گئی۔

اُس واقعے کے دوسرے تیسرے دن، حُسنِ اتفاق سے، پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام، دونوں بمبئی آگئے۔ میں نے اُن کی اس آمد کو وُہ سمجھا جس کو عُرفِ عام میں "تائیدِ غیبی" کہتے ہیں، اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پنڈت جی اور مولانا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور، ایک گھنٹے میں پلٹ آئیں گے۔

جی میں آیا کنور مہاراج سنگھ[1] سے کیوں نہ مل لوں، اور خالی بیٹھ کر، انتظار کیوں کروں۔ پرچے پر اپنا نام لکھ کر بھیجا۔ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ اور بڑے تپاک سے پیش آئے۔ اور پوچھا خاں صاحب آپ یہاں کہاں، میں نے کہا میں تو آج کل بمبئی ہی میں رہتا ہوں، انھوں نے کہا اور پھر بھی مجھ سے کبھی نہیں ملے۔ میں نے کہا میں اس وقت پنڈت جی سے ملنے آیا تھا، وہ موجود نہیں ہیں اس لئے آپ سے ملنے آگیا ہوں۔ میں، بے سوچے سمجھے یہ کہہ تو گیا، مگر فوراً خیال آیا کہ میں نے بڑی بے تکی بات کہی ہے، اس کے تو یہ صاف معنی ہیں کہ میں کنور صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پنڈت جی، اس وقت غیر حاضر نہ ہوتے تو میں آپ سے ملنے نہ آتا، یہ سوچ کر میرے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا ہو گئے، مہاراج سنگھ، بڑے ذہین آدمی تھے بھانپ گئے اور مسکرا کر کہنے لگے، آپ پٹھانوں کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ جو بات آپ کے دل میں ہوتی ہے، وہی، پھٹ سے، زبان پر آجاتی ہے۔ میں نے کہا میں اپنی بدحواسی کی معافی چاہتا ہوں، انھوں نے کہا میں جس بات کی، دل سے، قدر کرتا ہوں، آپ اُسی کی معافی چاہ رہے ہیں، ان کے یہ کہتے ہی، مولانا آگے آگے، اور پنڈت جی پیچھے پیچھے، ان کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ مولانا نے فقط ہات ملایا، اور پنڈت جی، لپک کر، میرے[2] گلے لگ گئے، اور، چھوٹتے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں، میں نے کہا پنڈت جی ''آج کل'' کے واسطے درخواست دے کر، اُس کا انتظار کر رہا ہوں۔ پنڈت نے مسکرا کر کہا یہ ''آج کل'' کی اُلٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مولانا آزاد نے، لال بھبوکا بن کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے، ہمارے سرکاری رسالے ''آج کل'' کا جو اشتہار نکلا ہے، اس کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہوگی۔ پنڈت جی نے کہا تو پھر، چھٹے روز آپ دہلی آجائیں۔ میں بندوبست کر دوں گا۔

مولانا آزاد نے کہا پنڈت جی، آپ کو معلوم نہیں، یہ محکمہ سردار پٹیل کا ہے، آپ، سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں۔ پنڈت جی نے کہا جوش صاحب، ہمارے شانے سے شانہ

---

[1] کنور مہاراج سنگھ اُس وقت بمبئی کے گورنر تھے، اور میرے پورے خاندان سے ان کو واقفیت تھی۔

[2] مولانا بے چارے پر، تعلیمات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا، اور نہرو، وزارت عظمیٰ کا، پورا مے خانہ خالی کر دینے کے باوجود، ہوش میں تھے۔ یہ فرق دیکھ کر، مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں، اور پنڈت سالک کے درجے پر فائز ہیں۔ افسوس کہ مسلمان پر، حکومت کا نشہ بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔

ملاکر، برٹش ایمپائر سے لڑ چکے ہیں، ٹیپو کو بھی یہ بات معلوم ہوگی۔ اور نہیں معلوم ہوگی تو میں ان کو بتا دوں گا۔ آپ بڑے اطمینان کے ساتھ، دہلی آجائیں۔

مژدہ! خارِ دشت پھر

وہ غالباً ۱۹۴۸ء کا دور تھا کہ میں، سبزہ کاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کر کے، دہلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا، اور انھوں نے، سردار پٹیل سے، ٹیلی فون پر بات کر کے، میری ملازمت کی بات پکّی کر لی، اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشنیں بھی مقرر کرا دیں گے۔ اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا، جو اُس وقت، اطلاعاتِ عامّہ کے سکریٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے۔ میں اُن کی شرافت سے بے حد متاثر ہُوا۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے مجھ سے کہا تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی، آپ اس قلیل تنخواہ میں کیوں کر زندگی بسر کر سکیں گے، میں نے کہا میاں صاحب، پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پنشن مقرر کرا کے، اس قلیل تنخواہ کی خانہ پُری کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے، میں نے اُس، کھچا کھچ بھرے ہوئے، ہال میں قدم رکھا، جہاں "آج کل" کی ادارت کے اُمیدواروں کا، ایک لشکر، بیٹھا ہوا تھا، تو میری صورت دیکھتے ہی تمام اُمیدواروں کے چہرے فق ہو گئے۔ اور، میرے مقابلے میں، اپنی ناکامی کا یقین، ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھکّا پہنچا۔ اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آ کر، اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا۔ اور عرفی کا یہ شعر، سر میں گونجنے لگا:۔

اے متاعِ درد، در بازارِ جاں، انداختہ
گوہرِ ہر سود، در جیبِ زیاں، انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ، چار پانچ آدمی ایسے بھی وہاں موجود ہیں، جن کو میں نہیں جانتا۔ اُس کمرے میں میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے 'جو صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے، مجھ سے انگریزی میں کہا یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے۔ میں نے، جھلا کر، جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی، آپ اپنے پُرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہُوئے ہیں۔ میں پان کھانے سے باز نہیں آسکتا، پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا۔ آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر، باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں، میں ڈبیا بند کر کے اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا، تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے یہ کہہ کر مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد، غالباً اجمل خاں نے کہا جوشؔ صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں، بس وہ نظم سُنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی۔ میں نے کہا اجمل خاں جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مُہر لگی ہوئی ہے، وہ میری نظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں، اور ان کے ساتھ، کئی اصحاب نے، ہم زبان ہو کر کہا جوشؔ صاحب، آپ ہماری طرف دیکھیں، اور ہم کو نظم سنائیں، ہم سب آپ کے قدردان ہیں۔ میں نے اس نظم کے چند شعر سنا دئے، اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

"آج کل" کی ادارت سنبھالنے کے بعد، جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر، سردار پٹیل سے اب تک ملے کہ نہیں۔ میں نے کہا نہیں، اور نہ ملنے کا ارادہ ہی ہے، پنڈت نے پوچھا کیوں، میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ :

"Because he has got a criminal face" (اس لئے کہ ان کا چہرہ مجرموں کا سا ہے)۔

یہ سُن کر پنڈت جی نے، بڑا زبردست قہقہہ لگایا۔ اور، پھر، مجھ سے کہا، نہیں، نہیں، آپ کو اُن سے ضرور مل لینا چاہیئے۔ میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں۔ انھوں نے فون کیا، جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے۔ میں ان کی کوٹھی پر پہنچا، وہ، دھوتی باندھے، برآمدے

میں کھڑے ہُوئے تھے۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہی، ان سے کہا سردار صاحب مجھے آپ سے ملنے کا، ایک خاص وجہ سے، بڑا اشتیاق تھا۔ وہ بڑے گھاگ آدمی تھے، "خاص وجہ" سن کر بھانپ گئے، اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا۔ میں نے کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سُن چکا ہوں۔

یہ سُن کر وہ مجھے کمرے میں لے گئے، بیٹھتے ہی انھوں نے انگریزی میں کہا، آپ نے یہ سنا ہوگا کہ میں مسلمانوں کا دشمن ہوں۔ آپ جس قدر خوناک برہنہ گفتار آدمی ہیں، اُسی قدر میں بھی ہوں، اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کے سے اُن تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں، جن کے خاندان، باہر سے آکر، یہاں آباد ہو گئے ہیں، لیکن میں ان مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق ہندو قوم کے شودروں اور نیچی ذاتوں سے تھا، اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آکر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، یہ لوگ دراصل نہایت متعصب، شریر، اور فسادی ہیں، اور اقلیت میں ہونے کے باوجود، ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا سردار صاحب، پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے ہیں۔ میں ذات پات کا بالکل قائل نہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر آج سے دو تین سو برس، کسی کے پردادا کا پردادا چمار تھا، تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اُس کے چمار پن میں، آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوسکی ہے؟ اور وہ آج تک چمار ہی چلا آرہا ہے۔ اس بات کا وُہ جواب دینے والے ہی تھے کہ ان کے سکریٹری نے آکر کہا آپ نے مہاراجہ پٹیالہ کو یہ ٹائم دیا تھا، وہ آگئے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے ابھی نکلا تھا کہ مولانا آزاد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انھوں نے اپنی موٹر رُک کر مجھے آواز دی، اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر، اُن کی موٹر میں بیٹھ گیا، انھوں نے، مجھے بڑے درد انگیز تیوروں سے دیکھ کر، کہا جوش صاحب آپ اور سردار پٹیل، میں نے سر جھکا لیا، اور انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

غنی، روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را، تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش، روشن کُند چشمِ زلیخا را

مولانا آزاد تو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے۔ لیکن میرے دل کا عجیب عالم ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ

ہم نے اپنے مُلک کو، اتنی قربانیاں دے کر، کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اُردو کا بیڑا غرق ہو جائے، اور مسلمانوں کے مُنھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

کان میں ریاستِ دتیا کے وزیرِ اعظم قاضی عزیز الدین کی آواز آئی کہ جوش صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہندو، مسلمانوں کو تہِ تیغ کر ڈالیں گے؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان بنانے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے، ان کا حشر کیا ہوگا۔ وہ ایک ایک مسلمان کو پاکستان کیوں نہیں لے گئے پھر میں نے اپنے کو اس امید سے تسلّی دی کہ نفرت کی عُمر زیادہ نہیں ہوتی، چار دن میں یہ تعصّبات ختم ہو جائیں گے۔ اور سوشلسٹ حکومت آجائے گی، اور پھر یہ ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی۔ اور دینی برادری ختم ہو کر، انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ، ایک شب کی تڑپ ہے، سحر تو ہونے دو
بہشت سر پہ لئے، روزگار گزرے گا
فضا کے دل میں پرافشاں ہے آرزوئے غبار
ضرور ادھر سے کوئی شہسوار گزرے گا!

۱۹۵۵ء میں، جب، بسلسلۂ شرکتِ مشاعرہ، تیسرے بار میں پاکستان آیا تو، ہرچند اُس سے پیشتر بھی، میرے دیرینہ دوست سید ابو طالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تو وہ، پنجے جھاڑ کر، میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

میں پاکستان آنے پر بالکل طیّار نہیں تھا۔ لیکن صاف انکار نہیں کیا کہ نقوی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ اور یہ کہ کر ٹال دیا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

اُس اثنا میں انھوں نے اپنے گھر پہ مجلس کی، تمام اکابرِ شہر کے ساتھ، اسکندر مرزا صاحب کو بھی بلایا، اور سب کو میرا مُسدّس "حسین و انقلاب" سنوایا، اور ان تمام اکابر نے، جن میں اسکندر میرزا بھی شامل تھے، مجھ سے اصرار کیا کہ میں پاکستان کا باشندہ بن جاؤں، اُن کی دعوت پر ہرچند میں نے اپنے دل میں تو یہ کہا کہ خدا کی قسم، میں ایسا

ہرگز نہیں کروں گا۔ لیکن زبان سے یہ کہا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب نقوی کا یہ تکیہ کلام ہوگیا کہ جوش صاحب، آخر آپ کب تک سوچیں گے۔ تو میں پریشان ہوگیا کہ آخر میں کب تک ٹالتا، اور اسے دودھ کا بچہ پالتا رہوں گا۔

اسی دوران میں ایک روز، وہ میٹرو پول آگئے، اور مجھ سے کہا سارے کام چھوڑ کر آج آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے پاکستان آجانے کا اقرار لے کر، دم لوں۔

میں نے کہا نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھ کو آپ سے کس قدر محبت ہے، اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کردوں، لیکن۔ نقوی صاحب نے کہا دیکھئے، "لیکن" کے بعد انکار نہ کردیجئے گا۔ میں چپ ہوگیا۔ وہ اپنا صوفا چھوڑ کر، میرے صوفے پہ آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے فرمائیے آپ پاکستان کب آرہے ہیں۔ اب جی کڑا [1] اور، آنکھیں نیچی کرکے، میں نے کہا نقوی صاحب جب تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں، میں پاکستان کیوں کر آسکتا ہوں۔

انھوں نے میرے شانے پہ ہات رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہوگا، یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں نے کہا خدا نہ کرے کہ میں ان کے بعد زندہ رہوں۔ انھوں نے کہا شاعر کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تولا کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی ہی میں سدھار گئے، تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا، آپ کی یہ نوکری، آپ کی یہ فراغت وعزت کیا اُن کے بعد ختم نہیں ہوجائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے، یہ بھی فرض کر لیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی، ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پہ بٹھائے رہے گا، لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ، خدانہ خواستہ، آپ کے بعد، وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ دیکھئے جوش صاحب، آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے دَردَر مارے پھریں گے، اور ایک متنفس بھی اُن کے سر پہ ہات نہیں رکھے گا ——— یہاں تک تو معاشی پہلو پر میں بات کر رہا تھا، اب ذرا تہذیبی پہلو پر بھی نگاہ ڈالئے۔ یہ اُس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ جوش صاحب آپ کے بچے اردو بھول جائیں گے، ہندی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہوگی۔ وہ آپ کے کلام کا

---

[1] میں جس وقت، دل ہی دل میں، پاکستان نہ آنے کی قسم کھا رہا تھا، اس وقت، فرمانِ روزگار، مجھ پر مسکرا رہا تھا۔

ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی، روایتی اور ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست وعبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے اُس کا، کسی نوعیت کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا، کیا یہ عظیم لسانی، مزاجی اور روائتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ اور اگر آپ یہاں نہ آ گئے تو کیا اُس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ آپ اپنی وقتی فراغت وعزت کی قربان گاہ پر اپنے پورے خاندان کو بھینٹ چڑھا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

اُن کی اس طویل، جذباتی و منطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا، اور میری آنکھیں کھول دیں، اور میں سوچنے لگا کہ میرے بعد، یہ میرے نازوں کے پلے بچّے، اور میری یہ شاہانہ مزاج رکھنے والی بیوی، کیا کرے گی۔ نقوی صاحب سے میں نے کہا آپ نے مجھ کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ بے شک میری آل اولاد ہندوستان میں پنپ نہیں سکے گی۔ نقوی صاحب، مجھ کو چوبیس گھنٹے اور دے دیجئے کہ میں اس مسئلہ پر، ایک بار اور غور کر لوں، کل اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر، اپنا آخری فیصلہ سنا دوں گا۔

نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے ناصر احمد خاں سے کہا تم نے سن لی نقوی صاحب کی ساری تقریر، اب کیا کہتے ہو، ناصر نے کہا مجھ کو ان کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے، اگر آپ یہاں منتقل نہ ہوئے تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ یہ کہتے ہی ناصر میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ، انگشتِ شہادت بلند کر کے کہنے لگے خاں صاحب آپ کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں، آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھرّاتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے، کل اُسی دو کوڑی رعایا کے بچّے، آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے، ان کو دھوتیاں بندھوائیں گے، اور اُن کے سروں پر چوٹیاں رکھوائیں گے۔ اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیش تر ہم مر جائیں۔

صبح اُٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا۔ نہا دھو کر نقوی صاحب پاس گیا، اور اُن سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر طیار ہو گیا ہوں، یہ سنتے ہی نقوی کی باچھیں کھل گئیں، دوڑ کر مجھے

لہ ناصر احمد ملیح آبادی، میرے قرابت داروں میں سے ہیں، وہ مجھ سے پہلے ہی پاکستان چلے آئے تھے، اور جب سے میں آیا تھا، وہ ہر وقت میرے ہی ساتھ رہتے تھے، لیکن ب س خطا پر کہ ان کی ایک معیبت کے وقت میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا' انھوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک فرما دیا ہے۔ ایک اور کا ٹ کام نکلا ہم سے۔ ایک اور ہوا دشمن جانی پیدا۔

گلے لگا لیا۔ اور اسی وقت ڈپٹی کمشنر کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہاں گیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہے، اُس کو جوش صاحب کے نام الاٹ کر دیجئے، اُس پر اُن کا سینما ہال اور مکان تعمیر کیا جائے گا۔ اور فلاں[1] مقام پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجئے، وہاں اُن کا بانع نصب کیا جائے گا۔

جب اُن کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو دونوں زمینوں پر مجھ کو قبضہ دے دیا گیا۔ اور میرے چوکی دار جھونپڑیاں ڈال کر، وہاں رہنے لگے۔

اور جب تمام لکھا پڑھی مکمل ہو گئی۔ تو نقوی صاحب نے کہا آپ دہلی جا کر، ایمرجنسی سرٹیفکیٹ پر، اپنے بال بچوں کو یہاں لے آئیں۔ آپ کے آتے ہی سینما کی تعمیر کا کام شروع کرا دوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ، انھوں نے اپنے سکریٹری ربانی صاحب کو بلا کر میرے مکان کی تلاش کے لئے کہا، ربانی صاحب نے سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک اچھی سی کوٹھی میرے حوالے کر دی۔ اور میں دہلی پرواز کر گیا۔

دہلی پہنچا، معلوم ہوا پنڈت جی، باہر گئے ہوئے ہیں، دو تین دن میں آئیں گے۔ سیدھا مولانا کے پاس گیا۔ مولانا کسی اخبار میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ہندوستان کے ایک شاعر پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا غالباً آپ ہی وہ شاعر ہیں جس پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں مولانا میں وہی شاعر ہوں، اس کے بعد، میں نے اپنی ساری روداد بیان کر دی، نقوی صاحب کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو دُہرا دیا، اور پھر ان سے پوچھا اب آپ کی کیا رائے ہے مولانا؟

انھوں نے چند سُوال کر کے جب معاملے کے ہر پہلو کو سمجھ لیا تو کہا آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگرانی کا باعث ہوگا، لیکن جہاں تک کہ آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے، میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں۔ نقوی نے یہ سچ کہا ہے کہ نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا، آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔

میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا خوگر ہوں، لیکن جواہر لال شدید جذباتی آدمی ہیں، وہ آپ کی ہجرت پر، کسی طرح آمادہ نہیں ہوں گے۔

---

[1] نام یاد نہیں رہا اس مقام کا۔

تیسرے دن، یہ سُن کر کہ پنڈت جی آج آرہے ہیں، میں پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ وہ اُترے تو میں نے اُن سے کہا مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے، اور آج ہی۔ انھوں نے کہا تو پھر ابھی میرے ساتھ چلیئے۔ اور جب اُن کے گھر آکر، میں نے اپنا کُل ماجرا بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولانا آزاد کی اس باب میں کیا رائے ہے، تو اُن کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور کہا جوشؔ صاحب آپ نے مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہند کی تنگ دلانہ[1] حب الوطنی یہ صورتِ حال نہ پیدا کر دیتی تو آپ کے دل میں ترکِ وطن کا کبھی خیال پیدا ہی نہ ہوتا۔ لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے، مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے، میں خود بھی غور کر دوں گا، اور مولانا سے بھی رائے لوں گا۔

دو دن کے بعد، جب پہنچا تو، نظر اٹھاتے ہی، میں نے اُن کے، دل موہ لینے والے چہرے پر، اُس قسم کی شگفتگی دیکھی، جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھا لینے کے بعد، پیدا ہوا کرتی ہے، انھوں نے، بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اٹھائی، شیریں تبسّم لبوں پر مچلنے لگا، اور، انھوں نے کہا جوشؔ صاحب میں نے، آپ کے معاملے کا ایک ایسا اچھا حل نکال لیا ہے، جسے آپ بھی پسند کریں گے۔ کیوں صاحب یہی بات ہے نا، کہ آپ اپنے بچّوں کے معاشی و تہذیبی مستقبل کو سنوارنے، اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے، انھوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو پاکستانی بنا دیں۔ لیکن آپ یہیں رہیں، اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے، اردو کی خدمت کر آیا کریں۔ سرکارِ ہند آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اُچھل پڑا، میں نے کہا یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے، اس طرح سانپ بھی مر جائے گا، اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ پنڈت جی میری منظوری سے، بے حد بشاش ہو کر، میرے گلے لگ گئے۔ حوریاں رقص کناں، ساغرِ و پیمانہ زدند!

---

[1] انھوں نے انگریزی میں "Narrowminded Patriotism" کہا تھا۔

دوسرے ہی دن اخبار والوں نے مجھ کو گھیر لیا۔ میں نے وہ تمام معاملہ جو میرے اور پنڈت جی کے مابین ہوا تھا۔ بیان کر دیا۔ اور تیسرے روز ہی میرا انٹرویو ہندوستان کے تمام انگریزی و اردو اخباروں میں شائع ہو گیا۔

پاکستانی شہریت

جانا، شاہ زادہ گل فام کا، چوتھی طرف[1]، اور گھر جانا، اس کا آسیبوں کے نرغے میں

آسیبوں کے ذکر سے پیش تر، یہ سن لیجیے کہ جب، پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا، تو نقوی صاحب نے، میری خوشی پر پانی پھیر دیا، انھوں نے کہا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں، اور یہاں زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے، ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں، جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینما بنوائیں، یا باغ لگوا دیں اس کے علاوہ، یہ صورتِ حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی۔ پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے، اور ہندوستانی آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے، اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے۔ جوش صاحب، دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر، دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا۔ میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا۔ لیکن چونکہ بات تھی، باون تولے پاؤ رتی کی، اس

---

[1] ہماری کہانیوں کے تمام شاہ زادے "گل فام" ہوا کرتے تھے، اور جب وہ شکار کے واسطے جانے لگتے تھے تو ان کی مائیں ہمیشہ ان کو یہ تاکید کیا کرتی تھیں کہ جنگل میں صرف تین طرف شکار کھیلنا، چوتھی طرف ہرگز ہرگز نہ جانا اور چوتھی طرف جانے سے وہ اس بنا پر منع کیا کرتی تھیں کہ انھوں نے یہ سن رکھا تھا کہ چوتھی طرف بھوتوں اور آسیبوں کا دنگل ہے لیکن چونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس شے سے منع کیا جاتا ہے اُدبدا کر اس شے کی طرف دوڑتا ہے، اس لیے تمام گل فام شادی، شکار کھیلتے کھیلتے چوتھی طرف ضرور جاتے، اور اپنے کو بھوتوں کے نرغے میں گھیر لیا کرتے تھے۔

لئے ان کی منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا۔ اب سُنیئے آسیبوں کا ذکر۔

میرے پاکستانی بنتے ہی، یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی، ایک قیامت کا غُلغُلہ برپا ہوگیا، پورے پاکستان میں، اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اُٹھا گویا صُورِ قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر، خم ٹھونک ٹھونک کر، میدان جنگ میں آگئے۔ تمام ادبار و شعرار اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں، نیام سے نکال کر، میرے خلاف مضامین، قطعات، اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غُلغُلہ بلند ہوگیا کہ دُہائی سرکار کی، مغلِ اعظم، یعنی ابو طالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا ——— مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ، میرے خلاف متحد ہو کر، شیر و شکر ہو گئے۔ وہابیوں بریلیوں، دیو بندیوں، قادیانیوں، سُنّیوں اور شیعیوں نے، اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو، یکسر بُھلا دیا، تبرّا اور مدح صحابہ کے مابین، طرح مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف، متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا اَبرَہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ یا کام دیو، اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے، اور تمام کنواری کنیاں، ہائے اللہ، ہائے اللہ کے نعرے لگا لگا کر، بھاگ رہی ہیں۔ یہ تمام شور، یہ تمام غُلغُلے، یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دُہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گِھر گئے ہیں، تو میں نے چپکے سے، باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم تھے، نقوی صاحب کی آن سے

کھٹ پٹ ہو گئی، نقوی صاحب نے، اسکندر مرزا کے بل بوتے پر، وزیر اعظم سے ٹکر لی تھی، اسکندر مرزا نے ان کی پشت پناہی سے روگردانی کی، اور ان کی کمشنری ختم کر دی گئی۔ نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی ۔ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں، غیرت نے اجازت نہیں دی ۔ میں نے دل سے پوچھا خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کہا ہمت نہ ہار، اگر خارے بُود، گل دستہ گردد ۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر، کاروبار شروع کر دوں، مجھ گاؤدی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں تجارت کا اہل نہیں، میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس دوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہوگئی ۔ روز صبح کو گھر سے نکلتا، دوپہر کو پلٹتا، تھوڑی دیر آرام کر کے، پھر باہر نکل جاتا، اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اُس گاؤں والوں کے عَلم کا سا ہو گیا تھا، جو محرّم کے زمانے میں اٹھایا جاتا، ڈھول تاشوں کی تڑوڑ، تڑوڑ، جھَنّم جھَنّم کی گونج میں، ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا، اور اسی طرح، دن بھر، چکر کاٹ کاٹ کر پھر اُسی تڑوڑ تڑوڑ، جھَنّم جھَنّم کے ساتھ مکان میں لاکر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ ہات تو آیا نہیں، البتہ ڈائرکٹروں، سکریٹریوں، اور وزیروں کے ایسے، دو دو کوڑی کے، نخرے، ایسے اوچھے ٹھسّے، اور اس قدر غیر شریفانہ گنڈا میئرپَن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا۔ اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور ہر ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ خودکشی فرمالے۔ یہ سچ ہے کہ ہندو حُکّام بھی، بعض اوقات نخرے دکھاتے ہیں، لیکن، اللہ اکبر، یہ مسلمان، جب ہڈ کانسٹبل ہو جاتا ہے تو ہامان و فرعون بن جایا کرتا ہے۔ اور حکومت کی گدّی پر بیٹھ کر، خدمت گاروں، اور پھیری

والوں کے لڑکے بھی، اپنے کو قیصر دارا سمجھنے لگتے ہیں۔ اللہ بُوتوں کے در پر لٹکا والوں کو نہ لے جائیے۔ اب، میری، مسلسل ناکامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ، اور باغ لگانے کی زمین — خود میں نے واپس کر دی۔

۲۔ ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں، میرے نام چھوٹا — قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

۳۔ کاشتکاری کے لئے، ہاشمی صاحب، ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی۔ الطاف گوہر صاحب نے اسے ضبط فرمالیا۔

۴۔ سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے — نرخ گر گیا، پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

۵۔ کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی۔ روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا

۶۔ واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیں دینے پر آمادہ ہو گئے — روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔

۷۔ بیڑی کے پتّوں کا لائسنس مل رہا تھا۔ لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا۔ اُسے بُرا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔

۸۔ سینما کے سازوسامان کا، دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا — وزیر معطّل کر دیا گیا۔

۹۔ ٹیکسٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا — وزیر بدل گیا۔

۱۰۔ پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا۔ دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

۱۱۔ مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا — سکریٹری کو برطرف کر دیا گیا

۱۲۔ پٹرول پمپ کی سعی کی — ناکام ہو گئی۔

۱۳۔ ایک مکان الاٹ ہوا تھا — آج تک قبضہ نہ مل سکا۔

۱۴۔ دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی — منظور نہیں ہوئی۔

۱۵۔ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت چاہی[1]۔ کوئی ناشر طیّار نہیں ہوا۔

۱۶۔ فریئر ہال کے ایک گوشے میں ریسٹران کھلوا دینے کا وعدہ محکم کیا گیا۔ افسر صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔

۱۷۔ سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔ اُجرت نہیں ملی۔

۱۸۔ محکمۂ آبادکاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے۔ الاٹ منٹ کا پُرزہ پھاڑ کر اُن کے سامنے پھینک دیا۔

۱۹۔ پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب، ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اُسی دن فوجی انقلاب آگیا۔ اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا۔ الغرض:۔

جس جگہ، ہم نے بنایا گھر، سڑک میں آگیا

ان مسلسل ناکامیوں نے مجھ کو جکڑا دیا، شدّتِ یاس اور ہجومِ افلاس نے میرا احاطہ کرلیا۔ نقوی صاحب جو ایک ہزار روپیہ، بطور قرض دیتے تھے، وہ اس قدر کم تھا کہ میرا گھر چلا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے، اپنے ایک دوست کے ذریعے سے زیور بیچ بیچ کر، کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذی ناؤ کب تک چلے گی۔۔۔ بیوی نے کہا ساری مدیں آدھی کر دو۔ اُس کی لپیٹ میں آکر، شراب ترک کر دی۔۔۔ ترکِ شراب کے بعد، میرا اُس بچّے کا سا عالم ہوگیا، جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ شراب کی پھڑکن سے نجات پانے کے واسطے، شام ہی سے کھانا کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن بے چینی میں کمی نہیں آتی تھی۔ جی بہلانے کو کتاب اُٹھا لیتا تھا کہ شراب کی للک بہل جائے، کتاب کی سطریں، ناگنوں کے مانند رینگنے لگتی تھیں، اور، حروف کے دائروں میں، بچھو، ڈنک اُٹھائے نظر آتے تھے۔

گڑ مڑا کر بستر پہ لیٹ جاتا اور، کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا، لیکن نیند کسی طرح بھی نہیں آتی تھی، اور تمام جسم میں کھجلی ہونے لگتی تھی، گھنٹوں کھڑ کھجایا کرتا

---

[1] کھانے کے بعد شراب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم کے مانند، رات رات بھر تڑپتا رہتا تھا۔ اور صبح کو، جب خط بنانے کے واسطے، آئینے کے سامنے بیٹھتا تھا، تو، اپنا بے خوابی کا روندا ہوا، تُتھیا کا سا منھ، دیکھا نہیں جاتا، اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی، تھوبڑ قسم کے مسکین شاہ، دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے، دانت نکال نکال کر، بھیک مانگ رہے ہیں۔

اگر، کسی دن، کُتّے کی سی جھپکی آ بھی جاتی تھی تو اتنے بُرے بُرے، اور ٹوٹے ٹوٹے خواب دیکھتا تھا کہ، بار بار، بھّق سے، آنکھ کھل جایا کرتی ——— اور گھڑی کی ٹِک ٹِک، دل پر گھن چلانے لگتی تھی۔

نہ جانے کتنے سَنسناتے، بیلے، سپاٹ، سوکھے، روکھے، پھیکے، ڈِکارتے، ڈَستے پھُنکارتے، بھیانک اور بھنبھوڑتے خواب دیکھ ڈالے اُس زمانے میں، اُن خوابوں میں سے ایک خواب[1] درج کر رہا ہوں :۔

تکیئے پر سر رکھا، اندازہ ہو گیا کہ آج بھی پایاب، اور اوچھی نیند آئے گی ——— تھوڑی دیر چت پڑا رہا۔ بدن سنسنانے لگا، آہستگی سے داہنی طرف کروٹ لی، ——— داہنی کروٹ کو پھر بائیں کروٹ میں تبدیل کیا ——— دماغ کو خالی کر کے چاہا کہ اس بین نیند کو آباد کر دوں، ——— رفتہ رفتہ، سانس میں ہمواری پیدا ہونے لگی۔ اور سر پر ایسے آہنگ کے ساتھ نیند منڈلانے لگی، جیسے اُترتے وقت، جہاز کی آواز ——— شاید بیس پچیس منٹ میں سو گیا۔ اتنے میں، کسی احمق نے فریج میں کوئی چیز رکھ کر، دھڑام سے اس کا دروازہ بند کر دیا ——— اوچھے کا پیار، بالو کی دیوار ——— اُس دھڑاکے سے نیند اُچٹ گئی اور الف ہو کر، ہنہنانے لگی۔ اور دماغ تپ تپ ہونے لگا۔ دل نے کہا ارے غضب ہو گیا۔ اب نیند نہیں آئے گی ——— گھبرا کر، سیدھے ہات کی طرف کروٹ بدلی کمبل کو سینے تک کھینچ لیا، چادرے کے گوشے کو گل تکیہ بنا لیا۔ اور دماغ کو اس تصوّر کی موجوں میں ترانے لگا کہ میں، اپنے ریزرو کمپارٹ منٹ میں، سفر کر رہا ہوں،

---

[1] اس خواب کو صبح ہوتے ہی لکھ لیا تھا، اس لئے محفوظ رہا۔

گھنے اور اندھیرے جنگل سے ریل، ستار بجاتی گزر رہی ہے، تھوڑی دیر میں دوبارہ ہلکی سی جناتی نیند آنے لگی۔ ایسا لگا کہ دماغ پر اوس گر رہی ہے، پھر ہلکے سے کُہرے نے میرے وجود کو ڈھانک لیا۔ ریل چھکا چھک چلی جا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے نیند آ گئی تو خواب دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا میدان ہے، جہاں خیمہ نصب کرنے کے لیے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں، کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ ــــ اس کے بعد، ایک ڈل بادل خیمہ نصب کر دیا گیا ہے۔ خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کئے جا رہے ہیں ــــ اس کے بعد، دس پندرہ فراش آ گئے، اور بڑی بڑی دریوں کو، زور زور سے جھٹک کر، بچھا رہے ہیں۔ دریوں کے جھٹکے جانے سے گرد اڑ رہی ہے، گرد سے، مرچوں کی دھانس آ رہی ہے ــــ ایک کچّو داڑھی کا فرّاش، چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے، ابے رمضیا سالے، زندہ ہے کہ مرگیا، ارے اُگال دان لا، اُگال دان۔

اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں، ان کی ٹوپیاں دو دو گز لانبی ہیں، ٹوپیوں پر مُرغے کڑھے ہوئے ہیں، کچھ لوگوں کے سَروں پر بڑے بڑے کالے بگڑ ہیں، پگڑوں کے اوپر، اُگیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے، جوتوں کی ڈوریوں میں مگرمچھ بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں، بندروں کی گردنوں میں، ناگوں کے مفلر پڑے ہوئے ہیں۔ اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر۔ تو بیٹھتے ہی ان کی ناکیں، دفعتہً چھ چھ فیٹ لانبی ہو گئیں، اور ناکوں کی چونچوں پر، ریچھ ناچنے لگے ــــ ادہو، ایک مشعلچی بڑھتا چلا آ رہا ہے، اس کی ٹھُڈّی پر، لنگور کی دُم کی سی پتلی داڑھی ہے ــــ اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے ــــ بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ ــــ طائفہ خیموں کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا ــــ حاضرین حقّے پینے، اور سازندے ساز ملانے لگے ــــ سازوں کے ملنے سے، دو خوں خوار بلّیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور حقّوں کے

کڑاکے، ایک دوسرے کو فحش گالیاں دینے میں سرگرم ہو گئے۔ گانے والی سامنے آئی اس کا منہ گھونس کا سا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتوں میں کھڑاویں بندھی ہوئی ہیں۔ سارنگیا، تانت کی طرح پتلا، اور تاڑ کی طرح لانبا ہے۔ طبلچی اس قدر موٹا ہے، کہ پندرہ گز زمین گھیرے بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ اپنے سونڈوں کے سے ہاتوں سے دھما دھم طبلہ بجا رہا ہے۔ اس کے طبلے کی تھاپ سے گیس کے ہنڈے چٹختے چلے جا رہے ہیں۔ گھونس کی سی شکل والی مُغنیہ گا نہیں، چیخ رہی ہے، اور اس کے منہ سے موٹے موٹے کوّے نکل نکل کر، قاؤں، قاؤں کر رہے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ مشکل سے دو بالشت کا ایک بونا، گل مُچھے رکھے، مٹکتا چلا آ رہا ہے، اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اُس دیگ کو ٹن ٹن ٹن بجا بجا کر، تال دے رہا ہے ——

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کی دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجھیں بجانے لگا۔ اور جھانجھیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مُجھ بدبخت کی آنکھ کھل گئی۔ اور دیکھا کہ گھڑی تین بجا رہی ہے۔ اور سیفؔ شاہ جہاں پوری کا یہ شعر، دماغ میں گونج رہا ہے:۔

دل کی لگی، شبِ فراق، اپنا اثر دکھائے گی
لیٹو گے، لاکھ بن کے تُم، نیند کبھی نہ آئے گی

سُہروردی صاحب۔ اُسی اثناء میں، سہروردی صاحب کو، وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اور میں اس فکر میں پڑ گیا کہ لائسنسوں کے چکّر سے نکل کر، میں نے "بابِ قرطاس وقلم،، دا ایکاڈمی آف لیٹرز) کے نام سے جو منصوبہ طیّار کیا ہے، اس کو سہروردی صاحب کی بارگاہ میں کیوں کر پیش کروں۔ اور جب میں نے اپنے ایک مخلص دوست منّان خاں، ایڈوکیٹ سے اس کے متعلق مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں محمود الحق صاحب عثمانی، جو سُہروردی صاحب کے مُقرّبِ خاص ہیں، اُن سے کہوں گا کہ وہ آپ کو سُہروردی صاحب سے ملا دیں۔

چناں چہ، ایک روز، ممتاز خاں، عثمانی صاحب کو لے کر خود میرے گھر آگئے، اور معاملہ طے ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہی دن عثمانی صاحب نے مجھے سہروردی صاحب سے ملا دیا۔ سہروردی صاحب نے میری تجویز کو بہت پسند کیا، اور وعدہ فرمایا کہ میں اکیڈمی قائم کرا دوں گا۔

لیکن میری بدبختی دیکھیے کہ دوسرے ہی دن عثمانی اور سہروردی کے مابین ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ اُن کی آمد و رفت ہی بند ہو گئی۔ اور میں بے آسرا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد، خدا کا کرنا یہ ہُوا کہ بیگم شائستہ اکرام کراچی آگئیں، اور آفتاب احمد خاں، وزیرِ اعظم کے سکریٹری، بلکہ دستِ راست بن گئے — اور چوں کہ یہ دونوں مجھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے، انھوں نے میری بڑی دست گیری کی۔[1]

بیگم صاحب، سہروردی کی، رشتے کی بہن تھیں، اُنھوں نے میرے "مبالغہ آمیز" "محامد و محاسن"، کچھ اس طرح دل نشیں کر دیئے کہ سہروردی صاحب، جو خود بھی ایک ادبی اور صاحبِ جوہر آدمی تھے، مجھ پر بے حد مہربان ہو گئے۔ اور مجھ کو اُجازت دے دی کہ میں، جب بھی جی چاہے، بلا روک ٹوک، ان کے پاس آ جایا کروں۔

اس طرح آفتاب احمد خاں نے بھی، سہروردی پر میرا سکہ جمانا اور میرا ہاتھ بٹانا[2] شروع کر دیا اور میری تجویز حرکت میں آگئی۔

حُسنِ اتفاق، یا میری خوش قسمتی کہیے کہ، اُس اثنا میں زُبیری صاحب مرحوم تعلیمات کے سکریٹری کے عُہدے پر فائز ہو گئے — وہ نہایت ذی علم و ادب نواز انسان تھے، میری امداد پر تُل گئے۔ اپنی زبردست سفارش کے ساتھ، انھوں نے میری کارروائی فنانس بھیج دی۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ میں فنانس سکریٹری ممتاز حسن صاحب سے مل لوں۔

ممتاز حسن صاحب کا نام سُن کر، میں چکرا گیا۔

---

[1] میں اپنے ان دونوں محسنوں کو تا مرگ، فراموش نہیں کر سکوں گا۔ [2] آفتاب صاحب کے توجہ دلانے پر سہروردی صاحب نے، لٹریری فنڈ سے مجھے پانچ ہزار روپئے بھی بھیجے تھے، پانچ ہزار روپے اس وقت پانچ لاکھ معلوم ہوئے تھے۔

اور اُس چکرانے کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ چوں کہ ۱۹۴۲ء میں، دہلی کے ایک مشاعرے کی شرکت کے سلسلے میں، ہمارے مابین ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آچکا تھا، اور اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی مفیدِ ملک کام میں بھی میرا ساتھ نہیں دیں گے، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ، حدیثِ متواتر کے طور پر، میں یہ سُن چکا تھا کہ ممتاز حسن صاحب، اُس بدنصیب صوبے کے دشمنِ جانی ہیں، جس کو "یوپی"، کہتے ہیں۔ لیکن میں ان سے کیوں کر ملتا۔ ارتکاب اذدواج کے بعد، باپ اور نانا بن چکا تھا، اُن سب کو پالتا کیوں کر۔ اس لئے، اپنی اوقات پر لعنت بھیجتا ہُوا دفترِ مال پہنچا۔ پہنچتے ہی قدم دو دو من کے ہو گئے۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اپنا نام لکھ کر، پرچہ اندر بھیج دیا۔

چپراسی نے آکر کہا۔ اس وقت ایک صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ پی اے کے کمرے میں انتظار کریں۔ دل نے کہا، اور آؤ پاکستان۔ خون کے گھونٹ پیئے۔ اور پی اے کے کمرے میں جاکر بیٹھ گیا۔ پی اے صاحب نہ تو کھڑے ہُوئے نہ ہات ملایا، مجھ کو فرعون کی طرح دیکھا، اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا۔ مُبارک ہو خاں صاحب، پاکستان کی طرف سے یہ عزّت افزائی۔ جی چاہا کہ کمرے سے نکل جاؤں، پھر سوچا کہ ہم تو طارق کی طرح کشتی جلا کر آئے ہیں، اب کہاں جاسکتے ہیں۔

ابھی، مشکل سے چھ سات منٹ اس عذاب میں گزرے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں کہ خود ممتاز حسن صاحب میرے سامنے کھڑے، اور معذرت خواہی کر رہے ہیں ــــ ممتاز صاحب کی اس غیرِ متوقع اور غیرِ معمولی شرافت نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا اور، میرے دل کو، اُن کی جانب جھکا دیا۔ اور میں اپنے سوءِ ظن پر دل ہی دل میں، ملامت کرنے لگا۔

اپنے کمرے میں لے جاکر اُنھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اکاڈمی کی تجویز بہت لمبی چوڑی ہے۔ اگر آپ اس کو تدوینِ لُغت تک محدود کر دیں تو فنانس اس کی منظوری دے دے گا۔ مجھے اپنی اس تجویز کے بچاؤ پر افسوس ہُوا۔ لیکن میں بے چارہ

کر ہی کیا سکتا تھا، ناچار اسی شکل کو غنیمت سمجھا۔ میں نے ان کی بات مان لی، ترقی اُردو بورڈ، وجود میں آگیا۔ اور میری، کئی سال کی عرق ریزی اور سعی مسلسل مشکور ہوگئی۔

بورڈ بن گیا تو انجمنِ ترقی اُردو کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کو رُکنیت کی دعوت دی گئی مولوی صاحب مجھ کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے انھوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مجھ کو لُغت کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رُکنیت کی دعوت کو ٹھکرا دوں گا

ممتاز حسن صاحب نے عبدالحق صاحب کی اس ضد پر مُنھ بنایا۔ لیکن، کچھ سوچ کر منظور کرلیا۔ اب کیا تھا، عبدالحق چیف ایڈیٹر ہوگئے۔ انجمنِ ترقی اُردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا۔ میں نے بورڈ کے لئے، دوڑ دھوپ کر، جو عمارت کرائے پر لی تھی، وہاں چند کلرک رہ گئے، اور میں۔ ممتاز حسن صاحب نے مجھ کو "مشیرِ ادب" کا عُہدہ دے دیا، سب سے زیادہ میری تنخواہ مقرر کردی لیکن عبدالحق صاحب نے کوئی سوا یا ڈیڑھ برس تک، مجھ سے کوئی کام ہی نہیں لیا، اور میں، دفتر میں بیٹھا تنخواہ لیتا، مکھیاں مارتا اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے جس دفتر کو، کئی سال خون پانی ایک کرنے کے بعد، قائم کرایا تھا، مجھ کو، اُسی دفتر میں "چوں مد بحساب اندر" بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ بے کاری، اور مُفت کی تنخواہ داری سے تنگ آکر میں نے آخر ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔ اور جب انھوں نے مجھ کو لُغت نویسی پر مقرر کردیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو اس قدر تاؤ آگیا کہ وہ ادارت و رکنیت، دونوں سے، دست برداری پر آمادہ ہوگئے۔

اس کے بعد بورڈ کے سکریٹری شان الحق صاحب حقی کا مولوی عبدالحق اور شوکت صاحب سبزواری سے سخت بگاڑ ہوگیا۔ اور گرماگرم مُراسلت کا سلسلہ چھڑ گیا۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد، لُغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا۔ اور حقی صاحب و سبزواری صاحب کے مابین ظاہری مصالحت تو ضرور ہوگئی، لیکن دلوں میں کدورت باقی رہی، اور، انشاء اللہ تاقیامت باقی رہے گی۔ (اس لئے کہ اربابِ یوپی اور اہلِ دہلی کی فطرت ہی یہی ہے۔)

اس کے بعد حقی صاحب کے دل میں مجھ سے بھی گرہ پڑنا شروع ہو گئی۔ برتاؤ تو ہمارے درمیان خوردانہ و بزرگانہ ہی رہا۔ لیکن چوں کہ حقی صاحب کا یہ درپردہ مطالبہ رہتا ہے کہ لوگ اُن کے روبرو جھکتے رہیں، اور، میں نے ان کے اس مطالبے کو خوراک نہیں پہنچائی اور جب وہ مطالبہ مسلسل بھوکا رہنے لگا تو وہ سوچنے لگے کہ مجھ کو کس طرح زک پہنچا سکتے ہیں۔ اور آخر کار، اللہ نے اُن کو وہ موقع دے ہی دیا۔

غالباً اگست ۱۹۶۷ء میں رخصت لے کر، میں، اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفیے کی خاطر، ہندوستان گیا۔ اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے وہاں چار مہینے رہنا پڑا۔ باغوں اور مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا رض۔ انصاری صاحب، کسی اخبار کے نمائندے کو لے کر، انٹرویو کے لئے آئے۔ اور میرا انٹرویو کسی انگریزی اخبار میں شائع ہو گیا۔ رخصت کے اختتام پر جب لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے نئے معانی پہنا کر، یہاں کے اخباروں نے خوب اُچھالا اور مجھ کو پاکستان کا دشمن ٹھہرا دیا ہے۔ مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لئے، تاویلات کے ذریعے سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے۔ لاہور میں اُن اخباروں کا ابطال شائع کرا کے، جب کراچی آیا اور دفتر پہنچا تو حقی صاحب نے، بڑے گستاخانہ انداز میں مجھ سے مراسلت شروع فرمادی۔

اور آخر کار، اس غیر شریفانہ سلسلے کو بند کر دینے کے واسطے میں نے حقی کو لکھ بھیجا کہ میں جس خاندان کا رکن، اور جس مزاج کا آدمی ہوں، اس مزاج کا آدمی، ٹوٹ تو سکتا ہے، لیکن لچک نہیں سکتا۔ اگر آپ میری معاش پر ضرب لگانے کی ٹھان چکے ہیں تو :-

نگاہِ گرم سے، حالت ہو دل کی اور تباہ
اگر، یہی ہے ارادہ ترا، تو بسم اللہ

میری اس آخری تحریر کے بعد، حقی صاحب کا مراسلہ آیا کہ اب مجھے توسیع نہیں دی جائے گی۔ میں، دفتر سے قطع تعلق کر کے، گھر آگیا، اور حقی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔

لیکن اس خبر کو حقی صاحب نے کسی اخبار میں شائع نہیں ہونے دیا، تاکہ اُن کا پول نہ کھلنے پائے۔ اور جب ہندوستان کے ریڈیو نے میری برطرفی کا اعلان کیا تو یہاں کے اخبار نے ، بڑی ڈھٹائی کے ساتھ، اس کی تردید کرتے ہوئے، الٹا اس کو جھوٹا قرار دے دیا۔ چہ دلاورست دُزدے ...... میری زندگی کا، بحمداللہ کہ یہ پانچواں معاشی بُحران ہے، جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں۔ ہر چند میری ملازمت کو ختم کر دیا گیا ہے، میرا پاس پورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے، میری سیمنٹ کی ایجنسی بھی مجھ سے چھین لی گئی ہے ۔۔ اور میرے باغوں کا جو روپیہ، ہندوستان کے ریزرو بینک میں جمع ہے، وہ بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چند، خُدا کے فضل و کرم سے میرا کوئی بینک بیلینس بھی نہیں ہے، لیکن میں بدحواس نہیں ہوں، بدحواسی تو درکنار، میں پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ میرا یہ بحران بھی میرے چار عدد سابق بُحرانوں کے مانند، کسی خیر جدید کا سرچشمہ بن جائے گا۔

مجھ کو اس امر کا یقین کس بنا پر ہے؟ یہ بھی سن لیجئے:۔

میں جب حیدر آباد گیا تھا، اور سر اکبر حیدری کی سی طاقت ور شخصیت سے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد، جب میرے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی ۔۔۔ اس وقت نظام نے، میری خاطر، ایک جدید و غیر ضروری عُہدہ خلق کر کے، مجھے بر سرِ روزگار بنا دیا تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا ۔۔ اس وقت سردار روپ سنگھ اور سر دجبنی نائڈو نے میری مدد کی تھی، اس کے بعد شیو نرائن نے ہاتھ بٹایا تھا، اور جب شیو نرائن نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، ۔۔ اس وقت مہاراجہ پٹیالہ میری پُشت پر آ کر

کھڑے ہو گئے تھے۔

جب بمبئی میں، نانِ شبینہ تک سے محروم ہونے کا وقت سر پر آ پہنچا تھا۔ اس وقت پنڈت نہرو نے میری دست گیری کی تھی۔

جب نقوی صاحب کی دعوت اور بھروسے پر یہاں آیا تھا، اور نقوی صاحب کی کمشنری جاتی رہی تھی ـــــ اس وقت سہروردی صاحب، شائستہ اکرام، آفتاب احمد خاں، زبیری صاحب، اور ممتاز حسن صاحب نے میری تجویز کو منظور کر کے، ترقیِ اردو بورڈ بنایا، اور میری معاش کا بندوبست کر دیا تھا۔

سوچتا ہوں کہ جب کوئی نامعلوم توانائی یا حسنِ اتفاق کی تکرار ہر بُرے وقت پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے، اور ہر موقع پر کوئی اللہ کا بندہ "مردے از غیب" کی طرح چپکے سے آ کر، اور میری مصیبت کے پہاڑ کاٹ کر، غائب ہو جاتا ہے تو مجھ کو اس بحران کی بھی کوئی پروا نہیں کرنا چاہیئے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بحران کا سر بھی، میرے قدموں پر جھک کر رہے گا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں، ایک جنبش میں
جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے!

اور اسی بنا پر جس دن میری نوکری چھُٹی تھی، تو نوحے یا مرثیے کے بدلے میں نے اُسی روز ایک نظم "ترانۂ بہار" کے نام سے کہی تھی، آپ بھی سُن لیں اور داد دیں۔

لو، اُٹھا جھوم کر، وہ ابرِ بہار
والشرلو، والشرلو، اولی الابصار

آؤ، "یاہو" کی گونج میں، وہ الاپ
کہ دو عالم ہوں رقص پر طیار

آؤ، وہ دھن، کنشت میں چھیڑیں
جھوم جائیں، بہشت کے اشجار

خطۂ برف سے اُگائیں آگ
آگ میں لہلہائیں پھر گل زار

سنگ و آہن کو بخش دیں آہنگ
خار و خس کو عطا کریں جھنکار

کھٹکھٹائیں، سبو کے دستے سے
بابِ آگاہیٔ درِ اسرار

آج ، یہ راز ، فاش کر دیں ، آؤ — کہ رئیسانِ شہر ہیں نادار
آؤ ، دربارِ کج کلاہاں میں — عاجزی کو سکھائیں استکبار
بخش دیں ، رہ نشیں گداؤں کو — حکمِ سلطاں سے ، جرأتِ انکار
کنجِ باطل کو چھوڑ دیں شاخیں — دستِ قاتل کی توڑ دیں تلوار
آندھیوں کو بنائیں ، موجِ نسیم — زلزلوں کو سکھائیں وضعِ قرار
نارِ گیتی سے بین لیں شعلے — مارِ گردوں سے ، چھین لیں پھنکار
آؤ عرفاں کے یوں سبو چھلکائیں — کہ اُلٹ جائیں ، اولیائے کبار
یوں کریں ، شرحِ وحدتِ آفاق — ایک ہو جائیں کافر و دیں دار
ذرّہ و آفتاب کے مابین — ڈال دیں ، آؤ ، طرحِ بوس و کنار
آؤ ، یوں ، دھوم سے ، گلال اڑائیں — کہ گلابی ہو ، کہکشاں پہ سوار
آؤ ، پیدا کریں ، بگردشِ جام — وقتِ اندک میں ، فرصتِ بسیار
آؤ ، عمرِ خضر کو ، چکرا دیں — بتب و تابِ لمحۂ سرشار
آؤ ، ذرّات کو ، عطا کر دیں — تتلیوں کے پروں کے نقش و نگار
لائیں ، پھر ، بوئے زلفِ لامحدود — مرحبا ، مرحبا ، نسیمِ بہار
ہاں اب اے دل نواز سازندے — اور ، کچھ اور ، تھاپ کی گمکار
اور بپھر جائے ، این و آں سے نگاہ — اور گھر جائے ابرِ زمزمہ بار
اور بڑھ جائے صحتِ مستی — اور چڑھ جائے ، نرگسِ بیمار
اور ہو تیز ، اے نسیمِ شمال — اور ہو تند ، اے ہوائے چنار
اور ، اے ابرِ سرمگیں ، دھمال — اور ، اے آبِ آتشیں ، دہکار
اور مہکو ، ہزارہ و سوسن — اور بہکو ، ثوابت و سیّار
اور ، بوجھل ہو مے کدے پہ گھٹا — اور گُھٹّل ہو ، احتیاط کی دھار
اور ، سازِ الست کی آہنگ — اور رندانِ مست کی جھنکار
اور ، شیشوں کی ، انجمن میں کھنک — اور ، بوندوں کی شاخ سے ٹپکار

ہاں، اُٹھ، اے شرابِ کاکُل و رُخ
ہاں، لہر دے ہیں، گھوم جائے گھٹا
بدلیو، ہاں، یہی گرج، ہر آن
خونِ شب خوں پہ، ہاں یہی پتھراؤ
ہاں، یہی بھیڑ بھاڑ، اے رِندو
ہاں، یہی نغمۂ "ہُوَ الموجود"
ہاں، گدایانِ کوئے پیرِ مغاں
کہ سلاطینِ آسماں اور نگ
یوں اُلجھنے لگے، گھٹا سے ہوا
کھول دو، ہاں، زمین کے غُرفے
یوں، بکھرنے لگے، رگوں میں سرور
مست رامش گرو، دُھنوں میں گھماؤ
یوں، ستاروں پہ، مُتصل چھائے
یوں، اِن آڑے سُروں کو، قوس بناؤ
مُغبچو، گھوم کر، کمر لچکاؤ
گرہِ زُلفِ ناز و بندِ قبا
یوں، نقابیں اُٹھاؤ مکھڑوں سے
اس، ٹھکانے کے ساتھ، بھاؤ بتاؤ
بوئے گُل کو بناؤ، خیمۂ زر
اس انوکھی لٹک سے، توڑا لو
لَے کو پہناؤ اَدکھلی چولی
اس جُونٹی دھمک سے رقص کرو
یوں ہو چھم چھم کہ فرش بن جائے

ہاں بدل، اے مزاجِ لیل و نہار
ہاں، کہر دے ہیں، جھُوم جائے ملہار
بجلیو، ہاں یہی کڑک، ہر بار
جمرِ گردوں سے، ہاں یہی پکار
ہاں، یہی چھیڑ چھاڑ، اے بوچھار
ہاں، یہی نعرۂ "ہُوَ الغفار"
یوں جگا دو، لبوں پہ، صوتِ ہزار
مانگنے آئیں، رقص و رنگ، اُدھار
کہ سُلجھنے لگیں، نشاط کے تار
بول دو، آسمان پہ، یلغار
کہ تھرکنے لگے، چمن کا نکھار
نغمۂ بحر و موجۂ انہار
کہ پڑے، دور تک، مہین پھوار
کہ جھلک جائے مصر کا بازار
مُطربو، جھوم کر، اُٹھاؤ ستار
کھول دو، دخترانِ قاف و تتار
کہ گلابی کو، توڑ دیں، رخسار
کہ بدل جائے، وقت کی رفتار
رنگِ مُل کو بجاؤ، سلسلہ دار
کہ دھڑکنے لگے دلِ کہسار
سُر پہ جھمکاؤ، لٹ پٹی دستار
کہ گمکنے لگیں، در و دیوار
تُند قلزم کی سطحِ ناہموار

توڑ دو جال ، اے زمان و مکاں تال دو ، تال اے یمین و یسار
ہاں ، گلوں کی خمیدہ پیکھوں پر کم سنو ، یو نہیں ، پتیوں کی قطار
اے بُتوں کی جبیں ، یہی جادو اے گلابی لبو ، یہی مہکار
مدھ بھری پائلو ، یہی چھل بل گھومتی چھاگلو ، یہی جھنکار
نشر کرنا ہیں ، جوشؔ کے نغمات
ہاں ، اُٹھو ، اے پیمبرانِ بہار !!

دیکھے ، آپ نے میرے تیور ؟ ایسی تیسی اس بحران کی - بَرپاپوشِ قلندر !!

بحمداللہ کہ میری نوکری چھٹے ہوئے ، اب ایک مدت گزر چکی ہے جس روز میں حضرتِ حق کے فضل و کرم ، اور حقی صاحب کے قلمِ فیض رقم سے برطرف کر دیا گیا تھا ، اُس روز ، پورے دن نہ سہی - چند گھنٹے تو ضرور پریشانی رہی تھی - لیکن میری بیوی کی ہمت اور میری عزیمت نے اُس وقتی پریشانی کو ، شام ہوتے ہوتے ، کُہنی کی چوٹ کے مانند ، فراموش کر دیا تھا -

اور اب جوں کہ وہ سارا معاملہ :- رونے والے ، رو چکے ، اور ہنسنے والے ہنس چکے

لہ نوکری چھوٹ جانے کے بعد - میں نے محمد موسیٰ خاں ، فدا حسین صاحب ، اور خود صدرِ پاکستان کو اس مفہوم کے خط لکھے تھے کہ اب میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ کبھی سرکاری نوکری نہیں کروں گا ، البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اتمام حجت کے طور پر اس غلط فہمی کو دور کر دوں ، جو حکومت کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں ، حکومت سے کسی خیر کا طالب نہیں ، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ معاملے کی صفائی کر کے ، اپنے کو مزید شر سے محفوظ کر لوں - اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں تیدے سے کر قتل تک اپنے کو آمادہ پاتا ہوں ، اس لئے اپنی صفائی میں دروغ بیانی سے کام نہیں لوں گا ، اور جو کچھ میں نے کہا ہے ، اس کو سچائی کے ساتھ بیان کر دوں گا ـــــ اُن خطوں کا حشر یہ ہوا کہ فدا حسین صاحب ، اور صدرِ پاکستان نے تو مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی ، البتہ موسیٰ خاں نے جواباً لکھا کہ میں اپنی شکایات لکھ بھیجوں - لیکن میں نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا ، اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اب ان کو کبھی خط نہیں لکھوں گا - اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دیا کہ درج کر لیا گیا رہے کہ میں نے دراتمام حجت ، میں کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے -

اِک پُرانا واقعہ ہے، خانہ ویرانی مری

کے حدود میں داخل ہو کر، گل دستۂ طاقِ نسیاں بن چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ، چوں کہ میں، اپنے بزرگوں کے ناموس اور اپنی عزّتِ نفس کو شاہد بنا کر، یہ قسم کھا چکا ہوں کہ مر جاؤں گا، لیکن اب سرکاری ملازمت کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یعنی، "اب کھائی تو کھائی، اب کھاؤں تو، رام دُہائی"، تو اس منزل میں اگر اب میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کا ارادہ کر دوں گا، تو، مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل کو حکومت کی خوشامد یا ملازمت کی آرزو نہیں سمجھا جائے گا۔ اور، اسی بنا پر، میں، بہانگِ دُہل اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ، ۱۹۶۷ء کے اواخر میں، میرے خلاف، ارادی غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی بنا پر، جو یہ پروپیگنڈا فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن یا صدرِ پاکستان کا مخالف ہوں۔ قطعی طور پر غلط اور بے بُنیاد تھا۔ حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ میں پاکستان کا دُشمن ہوتا تو، اپنی دولت، اپنی عزت، اپنی زراعت، اپنے احباب، اپنے بزرگوں کی ہڈیوں سے منہ موڑ کر، اور اپنے ناز بردار جواہر لال نہرو کا دل توڑ کر یہاں آتا کیوں۔؟

اگر اس موقع پر کوئی زبوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ کر لے آئی تھی، تو میں اُن سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اُس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا۔ اور، اس کے ساتھ ساتھ، میں اُن بزُرگ دار سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ میرے مزاج اور میری زندگی کے حالات سے اگر واقف ہوتے اور اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ میں ایک لکھ لُٹ انسان رہا ہوں، اور لکھ لُٹ انسان کبھی لالچی ہو نہیں سکتا۔ تو وہ میرے باب میں اس قدر اوچھی بات کہنے کی کبھی جرأت نہ فرماتے۔

اور، بالفرضِ مُحال، تھوڑی دیر کے واسطے، یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر یہاں لائی تھی، لیکن جب نقوی اور سکندر مرزا کے زوال کے بعد، مجھ پر "عرصۂ حیات" تنگ ہو چکا تھا اور میری پریشانیوں کا حال سن کر، جب پنڈت جی نے مجھ سے کہلا بھیجا تھا کہ میں، پاکستان کو ترک کر کے، ہندوستان آ جاؤں تو اس وقت میں نے ہندوستان

جانے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

اور اب، جب کہ میں پاکستان میں اپنا مکان بھی بنوا چکا ہوں، اور یہیں کی خاک میں دفن ہو جانے پر بھی آمادہ ہوں۔ تو کس کے مُنھ میں اتنے دانت ہیں کہ مجھ کو پاکستان دشمن کہہ کر اپنے خُبثِ نفس یا اپنی حماقت کا اعلان فرمادے۔

پھر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ خدانخواستہ حکومت مجھ پر مہربان ہو جائے، میں جانتا ہوں کہ، ایک میرے سے مزاج، اور ایک میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دُنیا کی کوئی حکومت، کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی۔ حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر، اور میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے۔ اور اب، جب کہ خدا کے فضل وکرم سے، میرے چل چلاؤ کا زمانہ سر پہ آچکا ہے، سوچتا ہوں، اب کوئی مہربان ہوا بھی تو کیا، اور نا مہربان رہا بھی تو کیا۔

(اس، اوّل تو نہ آئے گی، زمانے کی ہوا
(اس بھی، دو دن، زمانے کی ہوا آئی تو کیا

میں اس نفرت پروردہ و سیاست گزیدہ زمانے میں جب کہ ایک ملک۔ دوسرے ملک کو اپنے پیٹ میں رکھ لینے پر تُلا بیٹھا ہے، اور ملک تو پھر بھی ایک وسیع تصوّر ہے، جب کہ ایک صوبہ، دوسرے صوبے پر چھُری تانے کھڑا ہے یہ بات کس سے کہوں کہ میں تمام نوعِ انسانی کا دوست ہوں، اور یہ کہوں بھی تو یقین کون کرے گا، ہر سننے والا، میرے اس دعوے کو، اپنے خُبثِ نفس کی ترازو میں تول کر۔ مجھ کو جھوٹا سمجھے گا، لیکن میں اپنے سچ کو اس خوف سے دبا نہیں سکتا کہ اس کو جھوٹ خیال کیا جائیگا اس لئے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں، جوتی کی نوک سے کوئی مانے یا نہ مانے، کہ اب، ایک مدت دراز سے، میرے سینے میں ابو الانسان حضرتِ آدم کا دل دھڑک رہا ہے۔ میں اس دنیا کے ہر قریب و دور ملک کو۔ بلا استثناء، اپنا وطن، اور اس کرۂ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثناء اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔

جب کسی کے گھر میں جشن ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا ہے،

اور جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ انفس و آفاق، وحدت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے، اور ایک ہی قسم کے عناصرِ ترکیبی کے مختلف مظاہر ہیں۔ جن میں صرف اسم و جسم کا فرق ہے اصلیّت اور حقیقت سب کی ایک ہے، اس کائنات میں غیریّت کا کہیں کوئی نام ہی نہیں ہے، اور عینیّتِ کامل سب کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ اس عالمِ وحدت و عینیّت میں اگر کسی سے نفرت یا دشمنی کروں گا، تو اس کے سوا، اور کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے کہ میں خود اپنی ذات سے نفرت یا دشمنی کر رہا ہوں۔

اے دوست، دل میں، گَردِ کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا، بُرے سے بھی وحشت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہیئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے، لہو، سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا!!

میری موجودہ زندگی

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں —— اللہ اللہ، یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری —— یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں، یہ نئے ماحول کی آریاں —— یہ، مولد و منشا سے دوری، یہ غربت کی رنجوری —— سینے میں یہ کھٹکتی پھانسیں، یہ، حالات کی اکھڑی سانسیں —— یہ، دل پر چلتے بان، یہ، سر پر کڑکتی کمان —— یہ، اخباروں کی ریشہ دوانیاں، یہ حکومت کی سرگرانیاں —— یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران —— اور، یہ، چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ، اور، یہ دوش پر عزتِ نفس کا جنازہ ——

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو، خون تھوک تھوک کر، مر چکا ہوتا —— لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں۔ اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں، آلامِ حیات پر، مُسکرا بھی رہا ہوں۔ ان دردمندیوں کے بولتے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے، بحمد اللہ کہ میرا جگر لوہے کا ہے۔ میں ایک دقیقے کے واسطے بھی، اپنے کو اُداس نہیں ہونے دیتا، غم کو برابر ٹھکراتا رہتا، اور:

چوں عزمِ تو، نتواں یافت، مگر در دلِ شاد

ما، بامیدِ غمت، خاطرِ شادے طلبیم

کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں۔ میں، خارج سے خوشی کی طلب گاری نہیں کرتا۔ خارج میں رکھا ہی کیا ہے۔ میں اپنے باطن میں خوشی بوتا، خوشی کی آب یاری کرتا، خوشی اُگاتا، اور خوشی کی بالیاں کاٹتا رہتا ہوں۔ اور مستی کے عالم میں، دنیا کے تمام بے دردوں کو، مخاطب کرکے، گنگناتا رہتا ہوں کہ:

تھوڑی سی زندگی تھی۔ بہر حال کٹ گئی
تم کو، جو ہم پہ رحم نہ آیا، تو کیا ہوا!

حسبِ معمولِ قدیم، تاروں کی چھاؤں میں، بلاناغہ، ہر روز، دو یا تین بجے صبح کو بیدار ہوکر، خوب اچھی طرح کلّیاں اور غرارے کرتا، ڈغڈغا کر کٹورا بھر پانی پیتا، منہ پر دو چار چھپکے مار کر تولیا سے منہ پوچھتا، اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ میز پر اگربتی جلتی رہتی ہے۔ اور وہاں پہنچ جاتا ہوں، جس عالم کا، کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے۔

اُس وقت، کبھی کبھی میرے گرد و پیش، ہلکی ہلکی گھنٹیاں سی بجنے لگتیں، اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں چھڑ جاتی ہیں، کہ بقولِ حضرتِ اقبال: من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نہ تواں۔ بعض اوقات طبع میں اس قدر نازکی ہوتی ہے کہ، موذن کی آواز گراں گزرتی ہے، اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرۂ ارض، عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور تمام ثوابت و سیّار، زمین کی جانب جھکتے چلے آ رہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی، سانولے پن میں تبدیل ہونے لگتی ہے، تو، کتاب و قلم سے دست بردار ہوکر، کبھی کبھی انگنائی میں آتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر، یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا، اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو، بلبلا بلبلا کر، پوچھتا ہوں:

اے، پچھلے پہر کے غم گُسارو، بولو
اے مجمرِ گردوں کے شرارو، بولو
اس پردۂ رنگ و بو میں، پوشیدہ ہے کون؟
بولو، اے ڈوبتے ستارو، بولو!!

اُس کے بعد، اگر ہمّت ہوتی ہے، تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں، یا پھر، مکان ہی میں، ورزش کر کے، خط بناتا، نہاتا، ناشتہ کرتا، اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں ـــــ اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو، یا تین بجے تک، بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ پھر، نیند آئے، یا نہ آئے، ایک گھنٹے کے واسطے

---

[1] وہ ایک بار یہ بھی سوچ چکا ہے کہ تاروں کو دیکھ کر گریبان کے ٹکڑے کر دئے، اور ہچکیاں لے لے کر، اپنے بے پایاں جہل پر رو یا بھی ہوں۔ [2] کچھ اوپر تیس برس سے دوپہر کا کھانا ترک کر چکا ہوں۔

لیٹ جاتا ہوں۔ اور اس کے بعد، دوبارہ حمام کرکے، نوشت[1] وخواند کا سہ بارہ آغاز کر دیتا ہوں۔ اور شام ہوتے ہی منہ ہات دھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر، سوال کرتا ہوں:۔

اے دشمنِ بے پناہ، کب ہوگا غروب؟
اے سنگِ رہِ گناہ، کب ہوگا غروب؟
پیاسے بیٹھے ہیں کب سے، رندانِ کرام
اے شعلۂ روسیاہ، کب ہوگا غروب؟

اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے، تب:۔

دل کی جانب، رجوع ہوتا ہوں میں
سرتا بقدم، خضوع ہوتا ہوں میں
جب، مہرِ مبیں، غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف، طلوع ہوتا ہوں میں!

اس دشمنِ بے پناہ کی تجہیز و تکفین کی خوشی میں، بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے ساتھ، پیمانہ بھرتا ہوں، اور یہ سوچ کر کہ اس کرۂ آفات میں، آج کا دن بھی، محض حسنِ اتفاق سے بخیریت

---

[1] کھوکھلے اقتدار کی چھچھوری آرزو کے ڈسے ہوئے، ان سفید اور دیوانے سیاست والوں کو، جو، گلی گلی، ووٹوں کی بھیک مانگتے، اور کھوئی دولت کی، تا ہرگز نہ بجھ سکنے والی پیاس کے مارے ہوئے، ان جاہل اور نور انے صنعت کاروں یعنی دولت مند ناداروں کو، جو قریوں قریوں نوٹوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں، اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ اس دنیا میں دولت کی نہیں، دماغ کی فرماں روائی ہے، اور سرکارِ قلم کے دربار میں، سکندرِ اعظم اور قارونِ بے شکم کی بس اس قدر آبرو ہے کہ اسے غلام اور اسے دریوزہ گر کے سوا اور کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور خمیۂ رامش و رنگ کے متوالوں کو اس بات کا پتا نہیں ہے کہ نوشت و خواند ایک ایسی بے نظیر عیاشی بھی ہے، کہ راجہ اندر کا اکھاڑا اس کے روبرو، گورِ غریباں سے زیادہ سنسان نظر آتا ہے، اور فاتحینِ عالم کو یہ معلوم نہیں کہ جب ایک نیا لفظ یا نیا خیال ہات آ جاتا ہے تو ان کے جشن ہائے فتح مندی کے زمزمے، بازاری شور بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور بے ریا اربابِ تقشف و تصوف کے علم میں یہ بات اب تک نہیں آئی ہے کہ ادب کی تخلیق، ہنر کی پیداوار، اور اسرارِ حیات و کائنات کی تحقیق ایک ایسی بے لوث و گراں قدر عبادت ہے کہ کروروں حج اکبر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں، اور جس وقت کہ اس کے نیم دقیقے کو، ہزار سالہ زہد پر لادا جاتا ہے تو اس کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، اور، پل بھر میں، وہ اس اونٹ کے مانند، زمین پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے، جس کی کمر، ناقابلِ برداشت وزن سے دب کر، چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔

گزرئی، یہ رباعی پڑھ کر :۔

جو، سامنے آیا تھا، وہ عفریت گیا
میں، ہارنے والا تھا، مگر جیت گیا
اس مرد نگن، صبر شکن، دنیا میں
صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

بھرے پیمانے کو نعرۂ "بسم اللہ" اور "بیادِ فلاں، بنتِ فلاں" کے ساتھ، لبوں سے لگا لیتا، اور "الحمدُ للہ" کہ کر، پیمانے کو، سامنے کی گھڑی کے قریب رکھ کر، شفق پر نگاہیں جما تا حال سے منقطع، اور مستقبل سے بے پروا ہو کر، ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔

ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے ـــــ پہلے، یادش بخیر، بوتل کھلتے ہی، طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، نازنینوں کی پائلیں جھنک اٹھتی تھیں، اور یارانِ سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی ـــــ اب طبلے کی تھاپ کی جگہ مسامات سے اٹھتی بھاپ ہے، پائلوں کی جھنک کے عوض سینے میں، بربادی کی کھٹک ہے، اور یاروں کے لطیفوں کے بدلے، حالات کے کثیفے ہیں۔

نہ محرمے، نہ شفیقے، نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل، بکہ گویم، عجب غمے دارم

میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس اور کم سے کم پندرہ منٹ کے وقفے سے، صرف چار پیگ پیتا ہوں، اور جب تین پیگ ختم کر کے، چوتھا پیگ بنانے لگتا ہوں تو اُمّ الشعرا ر پوچھتی ہیں "کو تھا" تو میں "چوتھا" کہ کر، ہنسنے لگتا ہوں، اور جب چوتھا پیگ آدھا ختم ہو جاتا ہے تو کھانا طلب کر لیتا ہوں، اور کھانا کھا کر، کلّیوں اور غراروں سے فارغ ہو کر، تکیئے پر، سر رکھ دیتا ہوں، اور پھر جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں، حسبِ معمول، تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو کر لکھنے پڑھنے لگتا ہوں۔

پہلے شراب تھی مایۂ نشاط وآب حیات، اور آج ہے خواب نوشئی و داروئے بے ہوشی۔ ہائے، کہاں سے کہاں آ گیا میرا کاروانِ حیات۔ !!

مجھ کو آخر، یہ زبردستی جلایا کیوں جا رہا ہے، کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشقِ ستم کے واسطے؟ ہاں، تو جب "چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ"، ماضی کے سسکیاں لیتے سمندر میں ڈوب کر،

تے کشتی کا نہیں تے کشتی" کا آغاز کرتا ہوں تو ـــــ سلونی فضا، سینما کے پردوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، ہر آن، پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں۔ اور، ہر پردے کے اُٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں، اور مُنادی کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے جوش دیکھ ـــــ یہ تیرا ملیح آباد ہے جہاں تو، شاہ زادوں کی طرح رہتا تھا، یہ تیرے محل کے سقف و بام ہیں، یہ وہ انگنائی ہے جہاں تو کھیلا کرتا تھا۔ یہ تیری وہ کھلائی ہے، جس نے برکھا رُت میں کلکتے والا ساون گایا، اور گھر بھر کو رُلایا تھا اور یہ تیرے ماں باپ ہیں۔ میری ماں، میری طرف، ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر، دور سے میری بلائیں لیتیں، اور سر پیٹنے لگتی ہیں۔ اور میرے باپ، بڑی حسرت کے ساتھ، میری طرف آنکھیں اٹھاتے اور "ہائے میرا بیٹا"، کہہ کر، بے ہوش ہو جاتے ہیں ـــــ اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب، دوسرا پردہ اٹھتا اور مُنادی کہتا ہے ـــــ اے جوش دیکھ۔ یہ تیرا سب سے پہلا شہر درس گاہ، سیتا پور ہے۔ یہ تیرا گنبد غنا اور کعبۂ تہذیب لکھنؤ ہے ـــــ یہ تیرا آگرہ ہے۔ یہ تیرا حیدرآباد دکن ہے۔ یہ تیری بمبئی ہے۔ اور یہ تیری دہلی ہے۔ میں اُن کی گلیوں میں گھومنے لگتا ہوں، بہت سے جانے پہچانے لوگ مجھے سلام کرتے ہیں، اور جب اُن سے اُن کے نام پوچھتا ہوں تو پردہ گر جاتا ہے۔

اب تیسرا پردہ اٹھتا ہے، اور مُنادی کہتا ہے ـــــ اے جوش دیکھ ـــــ یہ تیرے بچھڑے، اور زیرِ خاک سوتے ہوئے، احباب، یعنی تیرے مُوَرِّخانِ شباب ہیں۔ "تو انھیں پہچانتا ہے"؟
"ہاں پہچانتا ہوں ـــــ ان کو نہیں تو اور کسے پہچانوں گا۔

یہ صفِ اوّلیں میں کھڑے ہوئے ہیں، ابرار، مختار، مانیؔ، صاحب عالم، مجازؔ اور مخمورؔ۔ تم سب تو ہمیشہ چہچہاتے رہتے تھے۔ ارے اب بولتے کیوں نہیں؟ تم مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو۔ ہائے تمہارا تبسّم تو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ارے کچھ تو بولو۔ سب رو رہے ہیں، اور مجازؔ اپنا وہی پُرانا گیت:۔ بریلی کے بجار میں جھمکا گرا ری" سُنا رہا ہے۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں، اور پردہ گر گیا۔

اب چوتھا پردہ جو، چھم چھم کی آوازوں کے ساتھ، اٹھ رہا ہے۔ اور مُنادی آواز دے رہا ہے۔ دیکھ اے جوش ـــــ یہ تیری جوانی کے خیمۂ رقص و رنگ کی گانے اور ناچنے والیاں ہیں

اور ایک نغمۂ روزگار، بڑی غم گیں آواز میں، گا رہی ہے :۔

لذّت سے نہیں خالی، جانوں کا کھپا جانا
کب، خضر و مسیحا نے، مرنے کا مزا جانا
اے نغمۂ محشر، ہم، سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے گزرے تو، ہم کو بھی جگا جانا

سارنگی سے، نوحوں کی آواز، نکل رہی ہے۔ اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب پانچواں پردہ اٹھا ہے۔ اور کہنے والا کہہ رہا ہے —— دل تھام کر دیکھ اے جوش۔ یہ تیرے محبوب ہیں۔ جن کے مکھڑوں کی جوت سے، تیری نبضیں چلا کرتی تھیں۔ جن کی پل بھر کی جدائی بھی تجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اور جب، روزگار، تیرے اور ان کے مابین فاصلہ پیدا کر دیتا تھا تو نیند، تیرے پپوٹوں پر، صبح تک، پر بھی نہیں مارتی تھی اور تیرے تکیے روتے روتے بھیگ جاتے۔

اللہ اللہ جگر جگر مکھڑے فضا پر دمک رہے ہیں۔ سب کی انکھڑیوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں، کسی کسی نے اپنی زلفیں سوگ وارانہ انداز سے، بکھرا دی ہیں، اور کسی کسی نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا ہے۔ اور فضا پر" ہائے اللہ، ہائے اللہ کی آوازیں تیرنے لگتی ہیں، کہ عین اس وقت یکایک، پشت کی جانب سے، ایک آواز آتی ہے "سنو"[1] میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ آواز ہے، میری، دن بھر کی اُکتائی ہوئی بیوی کی —— اور "سنو" کے بعد وہ کہنے لگتی ہیں کہ آج لوز کرنے حساب میں اتنے پیسے مار لئے۔ فریج میں پانچ انڈے تھے، اب صرف تین باقی ہیں۔ سعیدہ کے منجھلے

---

[1] بات یہ ہے کہ میری بیوی، میرے پڑھنے لکھنے کا بہت احترام کرتی ہیں، اور ہرگز نہیں چاہتیں کہ وہ میری مشغولیت میں خلل انداز ہوں، اسی لئے صبح سے وہ گھر کے دھندوں میں لگ جاتی ہیں، لیکن فرصت پا کر جب وہ تخت پر بیٹھتیں اور مجھ کو دین و دنیا سے بے پروا پاتی ہیں، تو، اکتا کر نیچے اُتر جاتی ہیں، اور سعیدہ سے کہتی ہیں کہ بیٹا میں کس سے بات کروں، وہ تو، پچھلے پہر سے لے کر شام تک سر جھکائے لکھتے رہتے ہیں، اور میں سارا سارا دن حقّا تو بنی بیٹھی رہتی ہوں۔ گھنٹے، دو گھنٹے کے بعد جب اوپر آتی ہیں، مجھ کو اُسی عالم میں پاتی ہیں، اور کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر کہتی ہیں، ارے اتنی محنت نہ کرو، خدا نہ کرے بیمار پڑ جاؤ گے۔ اور میں، اُن سے، مسکرا کر، کہتا ہوں کہ بیوی تم کو معلوم نہیں ایک بالشت بھر کا فرشتہ، چھوٹا سا پستول ہاتھ میں لئے، میری میز کے اوپر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تو گولی مار دوں گا۔ اور

بیٹے نے آج بڑی بدتمیزی کی، میں نے اُسے تھپّڑ مار دیا۔ اور ہاں، میں نے غزالہ سے کہا تھا، اوپر آکر، حساب لکھ دینا، وہ ابھی تک نہیں آئی، تم اُسے بُلا کر ڈانٹ دو ——— بیوی کی یہ باتیں سُن کر، میری جان نکل جاتی ہے، میرے سینما ہال سے دھواں اٹھنے لگتا ہے، اور میرے سارے پنچھی، پھڑّا مار کر، اڑ جاتے ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ بیوی اس بھید کو پا جائیں کہ میں اُن کی باتوں سے گھبرا رہا ہوں، اس لئے، ان کی باتوں سے میرے چہرے کا رنگ جب اُڑنے پر تُل جاتا ہے تو میں جھپّا مار کر، اسے اپنے چہرے پر پھر جما لیتا، اور، مصنوعی طور پر، مسکرانے لگتا ہوں ——— لیکن بعض اوقات، یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے آتے ہی جب میں، ایڑ لگا کر، اپنے چہرے کو شگفتگی کی جانب موڑنا چاہتا ہوں، تو میرا چہرہ، شریر گھوڑے کی طرح، دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگتا ہے۔ میرے دونوں گالوں کی ہڈّیاں اُبھر آتی ہیں۔ مُنہ، چوڑا ہو کر، توبڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور میری ناک، میرے قابو سے نکل کر، ڈیڑھ بالشت لانبی ہو جاتی ہے، اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں، کالا لوّ اینٹھا ہوا ہے۔

---

۴۴ وہ تخت پہ، گڑ مڑا کر، لیٹ جاتی ہیں، کبھی کبھی تو ان کی اس تنہائی پہ ترس کھا کر میں اُن کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ کے بعد، پھر لکھنے لگتا ہوں۔ اور جب، غروب کے بعد، میں شغل شروع کرتا ہوں تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت میں خالی بیٹھا ہوا ہوں، میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں، اور گھر کی باتیں کرنے لگتی ہیں۔ بیوی بے چاری کو کیا معلوم کہ جس وقت وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں خالی ہوں، اس وقت تو میں، پرانی یادوں سے، لبالب بھرا ہوا بیٹھا ہوتا ہوں۔ اور ایسا بھرا ہوا کہ سانس لینے تک کی گنجائش نہیں پاتا۔ ہائے میری بیوی کہ سہاگن ہونے کے باوجود، ان پر بیواؤں کی سی تنہائی چھائی رہتی ہے۔ میرا دل کڑھتا رہتا ہے، مگر کیا کروں، کام بہت ہے، اور عمر کم رہ گئی ہے، چاہتا ہوں کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے، اسے گھبرا گھبرا کر، کاغذ کے سپرد کر دوں۔

میرا دین

میر کے دین و مذہب کو، کیا پوچھو ہو تم، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ایک جری انسان کے مانند، میں، بآوازِ بلند، یہ اعلان کرتا ہوں۔ جو اُدھر دیکھ رہا ہے، وہ ادھر مُڑ جائے۔ جو دور ہے، وہ قریب آجائے۔ جس نے اب تک نہ سنا ہو، وہ کان کھول کر سُن لے۔ جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے، وہ اپنے حُسنِ ظن سے دست بردار ہو جائے۔ اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر، یعنی لفظِ خدا کے لامحدود معنیٰ میں منکر ہوں، وہ بھی اپنے سوءِ ظن سے توبہ کرلے کہ میرا دین، خیابانِ ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصولِ علم و نُقدانِ جہل کی آرزو، اور محرّکِ اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہر طرف سے منھ موڑ کر۔ میں کافر باللہ و مومن بالانسان۔ قوائے کائنات سے گرم پیکار، جنسِ آگاہی کے خریدار، اور ذرّاتِ صید افگن شکار نوعِ بشر کی طرف، نگاہ اٹھا کر، یہ کہہ رہا ہوں کہ:۔ من قبلہ راست کردم، بر طرف کج کلاہے۔

میں بھی، ایک زمانے میں عقل بیزار و عقائد پرستار۔ میری دنیا میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح حاصل تھی، تیغِ روزگار کے روبرو، میرے ہات میں بھی "مصلحت الٰہی" اور "ہر چہ از دوست می رسد، نیکوست"، کی مضبوط سپر تھی۔ میرے گردوپیش بھی بہت سی مناجاتیں، بہت سی ڈھارسیں۔ بہت سی تشفیاں، بہت سی تسلّیاں، بہت سی اُمیدیں، بہت سی دعائیں، بہت سی فردا کی کامگاریاں، اور بہت سی نجات کی امیدواریاں تھیں۔ اور میرے مشام تک بھی جو ان مفروضات

کے لب ہائے رنگیں کی مہکیں آیا کرتی تھیں

لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ میرے دماغ نے مجھ کو لوٹ لیا ہے۔ اور میں اب "بیکسی، میں تو اُدھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں" کا مصداق بن کر رہ گیا ہوں۔ اور بے مروّت عقل میرے آذرکدۂ تصورات کے تمام خوب صورت مجسموں کو پاش پاش کرکے، میر سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔

ایک زمانۂ دراز تک، عقل کو آنۂ ابلیس خیال کرکے، میں اس سے لڑتا اور اس کا راستہ روکتا رہا، لیکن وہ میرے عقائد پر سے یوں گذر گئی، جس طرح ڈاک گاڑی، ان پتھروں کو پیس گزر جاتی ہے، جن کو بچے پٹری پر رکھ دیا کرتے ہیں۔

اے ایمان والو، تمہارے پاس، اللہ کا دیا، سب کچھ ہے۔ اور میرا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ مجھ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھو، یہ موقع تو ہے ترس کھانے کا۔

اور اے میرے مفکر احباب، تم بھی مجھ پر طنز نہ کرو، اور مجھ سے یہ نہ کہو کہ اے نافہم جوش تو کیسا عجیب آدمی ہے کہ منقولات سے نجات پانے، اور معقولات کے قریب آجانے پر افسوس کر رہا ہے۔ بیج تمہارے طنز کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ بے شک میں عجیب انسان ہوں۔ لیکن، اس بات کو نہ بھولو کہ میں ایشیا کا باشندہ ہوں، وہ ایشیا جو روایات، اقوال اور اوہام کا پائے تخت ہے۔ وہ ایشیا، جہاں لاکھوں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں، بچوں کو سلایا جا رہا ہے۔ جہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنون، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے چلے آرہے ہیں۔ جہاں روایت کی قربانگاہ پر درایت کو چڑھایا جا رہا ہے۔ جہاں "دعائے صبح و آہ شب"، کو "کلید گنج مقصود" ٹھرا دیا گیا ہے۔ جہاں "دو دو چار" کے سر کو "دو دو پانچ کے آستانہ پر جھکا دیا گیا ہے۔ جہاں "الف لیلہ"، "اندر سبھا"، "چہار درویش" اور "طلسم ہوشربا" کے عقلیں چک لینے والے سائے ہیں، ذہنوں کو پالا پوسا جا رہا ہے۔ اور جہاں، براہین قاطع کی گردنوں پر، صدیوں سے، کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جا رہی ہیں۔ اس ایشیا میں کسی خالص مفکر کا پیدا ہو جانا، تقریباً ایک محال امر ہے۔ اس لئے اگر تم یہ دیکھو کہ میں اپنے دماغ کی آبادی، اور دل

کی بربادی پر، کبھی کبھی آزردہ سا نظر آتا ہوں تو مجھے قابل معافی سمجھو۔ اس لئے کہ: زمین شور، سنبل برنہ آرد"

اور اے مفکر دوستو، اظہار حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آبار واجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انھوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں۔ اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں۔ مرنے کے بعد، میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں، اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں۔ شافع محشر سے اپنے سارے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں، حوض کوثر کے کنارے، جام پر جام لنڈھاؤں، اور حور وغلماں کو، بھینچ بھینچ کر گلے لگاؤں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، یہ بھی سن لیجئے کہ ان کمزور لمحوں کے روزن سے، جب میری عقل، جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو، میرے مرجھائے گالوں پر، تڑاق سے، تھپیڑ مار کر، مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر کے بڈھے، بول، تو نابالغ کب تک رہے گا، تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ، تیرے دل میں جو بچہ مٹھافیں کر رہا ہے، اسکی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی؟

اس جملۂ معترضہ کے بعد، اپنے موضوع کی جانب مڑ کر، یہ عرض کر دینا بھی چاہتا ہوں کہ آج بھی میرے دل میں دنیا کے تمام بانیانِ مذاہب کا بے حد احترام ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ توت وحیات کے شاہکار، حضرت محمد عربی، حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کا شیدائی، اور آبائی عقائد سے آزاد ہو جانے کے باوجود، میں ان متذکرہ بالا تینوں مقتدر ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔

آں حضرتؐ کے بارے میں اکثر، یہ سوچتا رہتا ہوں کہ عرب کی سی جہالت کی رلج دھائی میں، اور وہ بھی آج سے، کچھ اوپر، چودہ سو برس پیش تر ان کا پیدا ہو جانا، اور کسی ایک متنفس کی شاگردی کئے بغیر جہاں استاد کا مرتبہ حاصل کر لینا، روزگار کا ایک ایسا معجزہ عظیم ہے کہ انسانی تاریخ، انگشت حیرت کو، اپنے دانتوں کے نیچے سے، آج کے دن تک نکال نہیں سکی ہے۔ وہ پیدائشی عالم اور پیدائشی مفکر اور نظری نہیں، عملی مفکر تھے۔

لے، اس دھرتی ماتا پر کون ایسا ماں کا لال، اور کون ایسا سورما ہے، اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقائد اور ان عقائد کے پیدا کردہ مزاجی قوام سے کلیتہً آزاد ہو چکا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بہمہ وجوہ، آزاد ہو چکا ہوں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس، خود ستائی ہے، یا خود فریبی۔ دانش مندی ہے کہ حماقت۔

انھوں نے، جاہلوں کے درمیان حقائق کو ننکار کرکے، سقراط کے مانند، زہر کا پیالہ نہیں پیا، اور حقائق کو دل نشیں لباس پہنا کر، چشمۂ حیواں پر قبضہ کر لیا۔

سقراط نے اپنی قوم کی ذہنی سطح سے بلند ہو کر زبان کھولی، اس کو ہمیشہ کے واسطے خاموش کر دیا گیا۔ محمدؐ نے اپنی قوم کی ذہنی سطح پر قدم رکھ کر بات کی، اور وہ بات، اذان بن کر، اس دنیا میں اب تک گونج رہی ہے۔ محمدؐ کو ایسی حیرت ناک بصیرت حاصل تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی لرزشِ مژگاں سے، ان کے دلوں کی پرتیں شمار کر لیتے، اور ان کے انفاس کی درازی و کوتاہی پر نظر جما کر، ان کے جذبات و خیالات کا عرض و طول ناپ لیا کرتے تھے۔

وہ ایک طرف تو اپنی قوم کے تمام مکروہات و مرغوبات کے زبردست نباض تھے، اور دوسری طرف وہ نوعِ انسانی کی اس کمزوری کو بھی پا گئے تھے کہ یہ سود و زیاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خود پرست حیوان، صرف تخویف و تحریص کی وساطت سے راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

اور اسی لئے وہ دوزخ کے انگاروں اور حوروں کے رخساروں کو دمکا کر، اپنی قوم کو راہِ راست پر لے آئے۔ انھوں نے ایک مصلح عملی حکیم کے مانند، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں، ایسی فلسفیانہ موشگافی، ایسی منطقی پردہ دری، اور ایسی حقائق کشا، برہنہ گفتاری سے کام نہیں لیں گے، جس سے ایک صحرا نشیں قوم کی فعالیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔

اور اسی دانش مندانہ فیصلے کی بنا پر، انھوں نے کاروانِ خیال کی نقل و حرکت کے واسطے ایک وجدانی شاہ راہ تراش لی، اور اس کے دونوں طرف، روایات، کنایات، اشارات، تمثیلات اور تشبیہات کے درخت، اس قدر پیوستگی کے ساتھ نصب فرما دئے کہ منطق کی شعلہ بار دھوپ، اس شاہ راہ کے مسافروں کو جھلسا نہ سکے اور تمام قافلے، بے روک ٹوک چلتے رہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کلمات کی کھنک، ان کے لہجے کی لچک، اور ان کے پراسرار الفاظ کی ڈھنک کے نیچے، اس شاہ راہ سے، لاکھوں قافلے اب تک گزرتے نظر آرہے ہیں، اور محمدؐ کا دل، کروڑوں انسانوں کے سینوں میں آج بھی دھڑک رہا ہے۔

اور پھر، دنیا کی سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ موت کے بھیانک میدان میں، حوروں کے خیمے نصب کر کے، انھوں نے، عربوں کے خون میں وہ حرارت پیدا کر دی کہ مٹھی بھر

آدمیوں نے، دیکھتے ہی دیکھتے، آدھی دنیا کو مسخر کر کے اپنے خاک نشیں کملی والے تاج دار کے قدموں پہ لا کر ڈال دیا۔

اے غلاموں کو، مقامِ فرزندی تک لانے والے۔ اے قاتلوں کو، مسیحائی کے گرُ سکھانے والے۔ اے انگاروں میں پھول کھلانے والے۔ اے خوف و حزن کو علامتِ کفر بتانے والے۔ اور اے رگ ہائے ذرّات میں، نظامِ شمسی کا لہو دوڑانے والے۔

اے وحشیوں کو بردباری۔ اے زلزلوں کو تمکین شعاری۔ اور اے، عزائم انسانی کو، آفاق شکاری عطا فرمانے والے۔ اے لاوارثوں کے وارث، اے، بے آسراؤں کے سہارے، اے یتیموں کے باپ، اور، اے بیواؤں کے سہاگ —— اے، حرف ناشناس معلّم، اے سفر نہ کردہ سیّاح، اے فاقہ کش رزّاق —— اے خُلق کی برہانِ عظیم، اے اُمّی حکیم —— اے خدیوِ اقلیم حبل المتین، اے اولادِ آدم کی فتحِ مُبین، اے ناموسِ مادروطین، اور رحمتہ للعالمین! روحِ کائنات کا سجدۂ تعظیمی قبول فرما۔

محمد کے بعد اب اُن کے نازشِ روزگار بھائی علی کی طرف، اپنی ٹوپی کو سنبھال کر نگاہ اٹھائیے۔

ہزاروں ماہ و سال کے مُسلسل تجربوں کے بعد، یہ کلیّہ قائم کیا گیا ہے کہ علم اور شجاعت، یہ دو ایسے اضداد ہیں، جو کبھی ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جس ہات میں تلوار ہوتی ہے، وہ قلم کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں نہیں لا سکتا، اور جس ہات میں قلم ہوتا ہے، وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن، انسانی تاریخ میں، علی کا ہات، وہ تنہا جامعِ اضداد ہات تھا، جو تلوار اور قلم، دونوں کو، مساوی روانی کے ساتھ، چلا سکتا تھا۔

وہ ادیب، شاعر اور مفکر تھے، اور اسی کے دوش بدوش، عدیم النظیر سپاہی بھی۔ وہ صفحۂ قرطاس پہ مجسّم کلکِ گوہر بار اور میدانِ کارزار میں سراپا شمشیرِ آب دار تھے۔

وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ موت ان پہ گرے، یا وہ موت پہ۔ ان دونوں کو وہ مساوی طور پر محبوب سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی نگاہوں نے موت کی پیشانی پر حیات ابدی کا جھومر دیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو ایک ایسی حواس بخشی و برکت بھی حاصل تھی، جس سے اس دور کا کوئی انسان بہرہ ور نہیں ہوا

تھا، اور جس نے اُن کو اپنے تمام معاصرین پر وُہ فوقیت بخش دی تھی، جو آفتاب کو ذرّات پر حاصل ہے۔ اور وہ فوقیت یہ تھی کہ انھوں نے جو چہرہ سب سے پہلے، دیکھنے کی طرح، دیکھا وہ محمدؐ کا چہرہ تھا، اور انھوں نے جو آواز سب سے پہلے، سُننے کی طرح سُنی وہ محمدؐ کی آواز تھی۔

محمدؐ نے ان کو گودوں میں پالا، اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا، اپنے سائے میں پروان چڑھایا، اور وُہ ان کے وجود میں اس طرح جذب ہو گئے کہ علی کو، اپنے انفاس سے، بوئے محمدؐ آنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ علی، حق پر اس مضبوطی سے قائم ہو گئے کہ وہ حق کا جسم، حق کی جان، حق کا اعلان، اور حق کی آواز بن گئے۔ اور یہاں تک کہ حق کو علی سے اور علی کو حق سے پہچانا جاتا تھا، اور چونکہ بہر آن و بہر نفس حق پر قائم رہنا ایک بہت بڑا خطرناک مرحلہ ہے، اس لئے اُن کی زندگی کبھی پنپ نہیں سکی ـــــ دنیا والے ان کی شدّتِ حق پرستی کو برداشت نہیں کر سکے، اور تو اور خود اُن کے حقیقی بھائی اُن کا ساتھ چھوڑ کر، اس ایوان میں چلے گئے، جہاں اسلام کے سر پر شاہی تاج رکھ دینے کے منصوبے طیار کئے جا رہے تھے، اور جہاں شہد میں اس نیت سے زہر ملایا جا رہا تھا کہ ارباب حق کو موت کے گھاٹ اتار کر، باطل کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا جائے۔

علی کی حق پرستی کی تاب نہ لا کر، مسلمانوں کی ایک جماعتِ کثیر نے ان سے منھ پھیر لیا تھا۔ اور یہاں تک کہ انھیں، آخر کار، یہ کہنا پڑا تھا کہ دنیا نے مجھ کو ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا، اور اس قدر کہ میرا اور مُعاویہ کا تقابُل کیا جانے لگا۔

علی کی زندگی، اس کُرۂ ارض کے تمام عظیم انسانوں کے مانند، محرومی و ناکامی کے سوا، انھیں کوئی اور چیز نہیں دے سکی، لیکن جب انھیں قتل کر دیا گیا تو اُن کی موت نے، اُن کی قبر پر وہ چراغ عظمت جلا دیا، جس سے اُن کی زندگی کو محروم کر دیا گیا تھا۔

اُن کے کامگار حریف، اپنے تمام کرّوفر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں، لیکن ان کی زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود، اُن کا نام، تاریخ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے۔ اور وہی لوگ، جنھوں نے اُن کی طرف سے مُنھ موڑ لئے تھے، اُن کی موت کے بعد، جب کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں، تو "یا علی" کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔

اے علی، شرافتِ انسانی، تیرے ان دو اخلاقی معجزوں کو، قیامت تک فراموش نہیں کر سکے

ئی کہ جب تیرے حریف نے، تیرے مُنھ پر تھوک دیا تھا، تو نے اس کی جاں بخشی فرمادی تھی، اور موت کے وقت جب تیرے سامنے شربت کا پیالہ پیش کیا گیا تھا، تو نے یہ کہا تھا کہ جب تک میرے قاتل کو شربت نہیں پلایا جائے گا، میں نہیں پیوں گا۔

اے علی، اے میدانِ جنگ کے سورما رجز خواں، اے منبرِ امن کے شیریں سخن خطیب۔ اے ایوانِ عدل کے دیدہ ور قاضی، اے کشورِ سیف وقلم کے خدیو کج کلاہ، اے نانِ جویں کی بے پناہ طاقت کے مظہر، اے زندگی کے منتوب، اے موت کے محبوب ـــــ اے علّت العلل کے باب میں "لا غفور" "لا رحمٰن" اور "لا قہّار" اور "الا ھُو" کی سی معنی خیز و خیال انگیز بات کر کے، خاموش ہو جانے والے مفکر ـــــ سیف وقلم کا مجرا قبول کر!

اب، دل تھام کر، نگاہ اٹھایئے، علی کے سورما بیٹے، اور محمدؐ کے لہو لہان نواسے حسین کی جانب۔ جو اگریاں تاریخ کے سینے کا ناسور، اور، گزراں وقت کی پیشانی کا نور ہے۔

وہ حسینؑ جس کے نظامِ انفاس کی، اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر، میدانِ کربلا کی بادِ سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا ـــــ جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر، فرات کی موجیں، آب آب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر، کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے، پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

وہ حسینؑ ـــــ جس نے اس ارادے سے کہ ایوانِ حق کے چراغاں پر کوئی آنچ نہ آسکے، اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا ـــــ اور ناموسِ انسانی کو بچانے کی خاطر جس نے، فولاد کو پگھلا دینے والے عزم، اور، زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی، اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا فوارہ جاری ہو گیا تھا۔ حسین ناتواں تھے، یزید توانا تھا۔ قانونِ قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہیئے تھا کہ یزید، حسینؑ کو شکست دے کر، حسینیت کا چراغ گل کر دیتا۔

لیکن ہُوا یہ کہ، قانونِ قدرت کے علی الرغم، حسینؑ کی ناتوانی نے، یزید کی توانائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ـــــ اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے، قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں، وہ موت۔ مُنھ کھولے، جب حسینؑ کے سامنے آئی تو حسینؑ اس کو دیکھ کر، ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ تیروں کا موسلا دھار مینھ برس رہا

تھا، اور حسین اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں، میدان سے اٹھا اٹھا کر، بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے۔ اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ، جب کہ ان کے تمام انصار و اقربا موت کی نیند سو چکے تھے اور اُن کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا عین اس نازک ترین، اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے، اور ایک بہادر سپاہی کا حوصلہ مندانہ تبسّم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا ـــــ اور یہ دیکھ کر کہ، ہیبتِ باطل سے حق کا چہرہ سفید ہو چلا ہے، وہ اُس پر سرخی دوڑانے کے لئے، بڑے اطمینان کے ساتھ، اپنا خون روانہ کر رہے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ اس یقینی ہلاکت کے موقع پر ان کے حواس بجا تھے، بلکہ، تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی، ان کے چہرے پر، اس فخر و مباہات کی ایک ایسی معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی، اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ یہ کہ رہے ہیں کہ اے اہل اسلام میں نے عزتِ اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر، تم پر احسان کیا ہے، اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر، میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسین ـــ اے دریائے زہر سے، آبِ حیات پینے والے ـــ اے بپھرے طوفان کو، اپنے سفینے میں ڈبو دینے والے ـــــ اے حریمِ شہادت کے، سب سے اونچے منارے اے، ہمّتِ مردانہ کے اوتار۔ اور اے ثبات و عزم کے پروردگار ـــ ازل سے لے کر ابد تک کے انسانیت کا، غلامانہ سلام قبول کر۔!

لیکن، میری زبان سے، ان، متذکرۂ بالا، اعیانِ ممکنات کی تعریف سن کر، اس مغالطے میں نہ پڑ جائیے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مدح سرا ہوں۔ میرے اُن کے مابین جو رابطہ ہے، وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور اُس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط، مزدک، زرتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیشس، مسیح، کبیر داس، گرونانک، مارکس، لینن، نطشے اور برٹنڈرسل کا بھی جان و دل سے شیدائی ہوں، اور جب تک رام چندر اور کرشن کے متعلق مجھ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں، تاریخی انسان نہیں، صرف اساطیری کردار ہیں، اس وقت تک میں اُن کا بھی بہت احترام کرتا تھا لیکن ان، متذکرۂ بالا شخصیتوں کی شیفتگی کے یہ معنی نہیں کہ میں اُن کا ہم خیال اور اُن پیرو بھی ہوں۔

بات یہ ہے کہ مبلغانِ ادیان و مصلحانِ اذہان نے جس "خشتِ اول" پر اپنے نظام کے تصور کی تعمیر فرمائی ہے۔ وہ "خشتِ اول" سائنس دانوں کی سی کرید، اور کھرے سونے کی سی تحقیقی نیت کے باوجود، اب تک میرے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکی ہے۔

اور یہی میرا دیانت دارانہ اعترافِ جہل ہے، جس کو یاروں نے، الحاد، عُدوان، اور ارتداد کا نام دے کر میرے خلاف ایک غوغا بلند کر رکھا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ میری عقل کا قصور ہو، لیکن یار لوگ اس کو میری نیت کا فتور سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور لُطف یہ کہ جو لوگ مجھ سے برافروختہ ہیں، وہ علت العلل، یا محرکِ اوّل کے باب میں، مجھ سے بھی زیادہ جاہل ہیں ــــ اُن کو اپنے جہل کا علم نہیں، اور اسی بنیاد پر وہ دین دار ہونے کے مدعی ہیں۔

کاش اُن کو اس بات کا پتا ہوتا کہ ہمارا ایمان، اُس پیڑھی اور سیڑھی کے مثل ہے، جس کو ہم نے والدِ مرحوم کے ترکے میں پایا ہے۔ ہمارا ایمان تحقیقی نہیں، تقلیدی ہے۔ ہم حادثۂ اتفاقی کے طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے مسلمان ہیں۔ اگر یہودی کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہم سے بڑا یہودی کوئی نہ ہوتا۔ اور ہمارے معتقدات کا پُرفسوں محل، ٹھوس کھوپڑی پر نہیں، کھوکھلے کانوں پر تعمیر فرمایا گیا ہے۔ اب رہا علت العلل اور محرکِ اولیں، کا مسئلہ، جس کو "خدا"۔ "بھگوان"۔ "اللہ"۔ "یہوا"۔ "مزدا" یا گاڈ کے نام دئے گئے ہیں۔ جو تنزیہ کے دائرے میں "نور" یا "ہو" ہے، لیکن تشبیہ کے میدان میں ایک مطلق العنان بادشاہ، اور انسانوں کا سامراج رکھنے والا انتہائی طاقت ور شخص ہے۔ سو یہ بحث اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اس کے واسطے، اس کتاب میں گنجائش نکالی نہیں جا سکتی۔

بہرحال میں اقرار و انکار کے دو کُرّوں کے، بیچوں بیچ بیٹھا ہوا ہوں، نظامِ سماوی کو دیکھتا ہوں، تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا، دل اقرار کرنے لگتا ہے اور نظامِ ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروڑں خلا نظر آتے ہیں، اور حیاتِ انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور اس کی بے کراں دردمندیوں پر نگاہ کرتا ہوں تو دل انکار پر مُصر ہو جاتا ہے۔

نوعِ انسانی، ابھی تک اس قدر ــــ جہل میں گرفتار ہے کہ، ہم اپنی اس موجودہ ذہنی سطح پر بیٹھ کر نہ اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

اقرار، یا انکار کا موقع اُس وقت آئے گا جب ہم، ذرّے سے لے کر، آفتاب تک کے علم

پر حاوی ہو جانے کے بعد علت العلل کے ہر پہلو کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ میرا یہ خیال ہے کہ اس آخری منزل تک پہنچنے میں ابھی لاکھوں سال بیت جائیں گے۔ اور میں اسی تذبذب کے عالم میں خالی ہاتھ، دنیا سے اُٹھ جاؤں گا۔

لیکن مجھ کو یقینِ کامل ہے کہ، لاکھوں یا کروروں برس کے بعد سہی، مگر، ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ نوعِ انسانی آخرِ کار، روحِ کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گی۔ اور پوری کائنات پر فرماں روائی کرنے لگے گی۔

جس وقت، بفیضِ مشقِ فکرِ جولاں
انسان بنے گا، تاجدارِ دوراں
مجھ کو نہ ملا، تو، اے نگارِ آفاق
بچ کر، مری اولاد سے جائے گا کہاں؟

میرا خاندان

میرے پردادا

تہور جنگ ۔ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر، گویاؔ[1] ان کے دادا، یار بیگ خاں

---

[1] کتاب کی طباعت سر پر آگئی ہے، وقت نہیں کہ تاریخوں سے حضرت گویاؔ کے تمام حالات جمع کرکے قلم بند کریں۔ اس لئے اختصار سے کام لوں گا ان کے تفصیلی حالات مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں سراپا سخن۔ جلوۂ خضر تاریخ محتشم، از محمد محتشم خاں پسر نواب محبت خاں۔ تاریخ قاسمی، تاریخ اسپرنگر نامۂ منظفری تذکرۂ شعراء از ابن امین اللہ خاں طوفاں، بوستانِ اودھ از راجہ درگا پرشاد، سندیلہ، تاریخ آفتاب اودھ۔ سیرت سید احمد بریلوی، از ابوالحسن علی۔ تاریخ امیر خانی، قیصر التواریخ، از کمال الدین حیدر، نائر لکھنوی لکھنؤ گزیٹیر، از مسٹر نیل آئی سی ایس، تاریخ ادب اُردو، از رام بابو سکسینہ۔ تاریخ نظمِ اردو، از محمد باقر ایم۔ اے، دہلی۔ داستانِ اردو، از حامد حسین قادری۔ تاریخ اودھ، ایسٹ انڈیا کمپنی از ڈاکٹر باسو۔ تاریخ غازی الدین حیدر، از محمد تقی ایم اے، پی ایچ ڈی، لکھنو۔ تاریخ واجد علی شاہ از ڈاکٹر بھٹناگر، خطوطِ گویاؔ۔ کتب خانۂ ٹونک و دارالانشاء رام پور، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، از سعادت علی خاں، ناصر لکھنوی۔ تذکرۂ گلشنِ بے خزاں از نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ تذکرۂ شعرائے اردو، از عبدالغفور، نساخ، کلکتہ۔ تذکرۂ شعرائے اردو، از صغیر بلگرامی تاریخ عمادت السعادت، از غلام علی آزاد۔ تذکرۂ ریاض الفصحاء، از مصحفی، روزنامچہ قاضی، کاکوری، وصیت نامۂ فقیر محمد خاں بہادر گویاؔ (قاضی عظیم ملیح آبادی) تاریخ فرخ آباد شیو پرشاد۔ قدیم نسخہ قلمی ناسخ (کتب خانۂ سید مسعود حسن رضوی، لکھنؤ) تذکرۂ آبِ حیات از آزاد، شعرالہند از عبدالسلام ندوی۔ نغمات القلندریہ۔ (تکیہ شریف کاکوری) شباب لکھنؤ از احمد علی لکھنوی تاریخ داستان اُردو۔ از ڈاکٹر گیان چند جین، ایم اے، اور اودھ کے پہلے دو نواب "THE FIRST TWO NAWWABS OF OUDH" از اشیر بادی لال سریواستوا۔

درۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد نام دار خاں، اور چھوٹے کا محمد بلند خاں۔ نام دار خاں درۂ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر ۱۲۳۴ھ میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھوں نے اودھ کا رخ کیا۔ اور لکھنؤ آکر مقیم ہو گئے۔

اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپے ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پا کر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا: میں آزاد قبائل کا فرد ہوں، کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ہے، شہر میں میرا دم گھٹتا ہے، مجھ کو اطراف لکھنؤ کے کسی ایسے قصبے میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنؤ آؤں اور فرائض منصبی انجام دے کر، شام کو وہاں چلا جاؤں۔

نواب نے کہا آپ اطراف لکھنؤ میں کوئی قصبہ منتخب کر لیں، زمین آپ کو دے دی جائے گی۔

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے۔ کنول ہار کو پسند کیا جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلہ ہے زمین ان کو دے دی گئی اور انھوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کر لی۔ اور اب اُن کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنؤ جاتے، اور شام کو کنول ہار پلٹ آتے تھے۔

کنول ہار میں انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد، ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بد دل ہو کر ریاست اندور چلے گئے، اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

کنول بار سے چلتے وقت، انھوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی، جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی، اپنے ساتھ اندور لے جائیں۔ لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ آپ جائیں، میں تعلیم سے فراغت پاکر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھ سال کے بعد، جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے، تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بھائی نے ان کو بھی رسالہ داری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد، مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ، اندور پر چڑھائی کی نیت سے آیا ہے، اندور کے قریب اس کی فوج کا پڑاؤ ہے اور صبح ہوتے ہی حملہ ہونے والا ہے۔

یہ سنتے ہی مہاراجہ ہلکر نے بگل بجوا دیا، اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا بھائی اب صبح ہوتے ہی میدانِ جنگ میں اترنا ہے، دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ چھوٹا بھائی علم حاصل کرکے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی قتل کیوں نہ کر دوں، تاکہ خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے پائے۔ لیکن برادرانہ محبت جوش میں آ گئی انھوں نے سوچا کہ جب میدانِ جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا ابھی جلدی نہ کرنا چاہیئے۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدانِ کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کا اٹھارہ سال کا چھوٹا بھائی، صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے، یہ جوان مردی دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔

معرکہ بے حد سخت تھا، لیکن یہ دونوں بھائی اس جوان مردی کے ساتھ لڑے کہ راجہ ہلکر کی فوج کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دن ڈھلتے ڈھلتے، دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ

لہ یہ سارا ماجرا، دادی جان نے مجھ سے کہا تھا۔

گئے، اور حملہ آور راجہ بھاگ کھڑا ہوا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجہ کا تعاقب کیا، بیس میل کا فاصلہ طے کرکے، اسے گرفتار کرلیا اور مہاراجہ ہلکر کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ اس واقعہ کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونو بھائیوں کی بہادری کے۔ جب ان کی شجاعت اور کارناموں کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کرکے، ٹونک پہنچا تو نواب میر خاں، والیٔ ٹونک نے مہاراجہ ہلکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجہ ہلکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، سوچا کہ اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھر رہ کیا جائے گا، اور اگر نہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کرلینا خطرے سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرکے اس نے والیٔ ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار رہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں۔ نواب میر خاں نے یہ بات مان لی، اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، اور رسالدار بنا دیا۔

ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال کر ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد، نواب میر خاں اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اور چوں کہ نواب میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی، انگریزوں کے دشمن جانی تھے، انھوں نے، بڑے دلولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ پنڈارے انگریزوں کے مددگار، اور گوروں کے دوش بدوش، نواب میر خاں کی فوج سے برسرپیکار تھے۔ پنڈاروں نے فقیر محمد خاں کے تیور دیکھ کر، یہ سوچا کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہوگی اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی، گولا ان کی ران میں آکر لگا، وہ گھوڑے سے گر پڑے، ایک پنڈارا تلوار سونت کر ان کی طرف جھپٹا، انھوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے اس

طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی، گھوڑا دوڑاتے آئے، اور پنڈارے کا ایک ہات میں کام تمام کر دیا۔ اور چاہا کہ اُنھیں اٹھا کر گھر پہنچادیں، تاکہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو خوب کس کر باندھ لیا ہے، پا ہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا، آپ یہ توپ میرے قریب کرا دیں، میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انھوں نے اس قدر شدت کے ساتھ دشمن پر گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔

نواب میر خاں نے خوش ہو کر، ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز کے بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔

جب انھوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا۔ رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے جب یہ دیکھا کہ فقیر محمد خاں کا مقابلہ آسان نہیں ہے تو بانسوں پر اپنے ڈوپٹے بندھوا کر، ہوا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں

فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے، یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے۔ اور انھوں نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اور رشتے کو یہاں تک نبا ہا کہ جب بھی کبھی کسی نے جے پور یا گوالیار پر حملہ کیا انھوں نے فوراً موقع پر جا کر انھیں بھگا دیا۔

اسی دوران میں، نواب میر خاں نے، فقیر محمد خاں کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کر دیا۔

ان کی شجاعت، اور فنِ جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر والیٔ اودھ سے ملے، نواب نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی، اور جب سیاسی مسائل پر بات چھڑی تو نواب اودھ نے بڑی جرت سے کہا۔ خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانش مند اور ذی علم انسان بھی ہیں میں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔

انھوں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرے باپ محمد بلند خاں آپ کی سرکار میں ملازم تھے، وہ ملیح آباد میں موجود ہیں غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ "حق بحق دار رسید" کی طرح اپنے وطن ہی میں آجائیں گے۔

اس پر انھوں نے کہا۔ لیکن یہ بات آئینِ وفاداری اور اصولِ شرافت کے منافی ہے کہ میں والیٔ ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔

نواب نے کہا خاں صاحب میں ابھی اس مسئلے کو حل کئے دیتا ہوں۔۔ اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب معتمد ولہ آغا میر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔

آغا میر کے آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ اس جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔

خط روانہ کر دیا گیا۔ اور چند روز کے بعد آغا میر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والیٔ ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہ جانے کی اجازت دے دی ہے

انھوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہِ راست، خط لکھ کر، اجازت نہیں دیں گے، میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس، نواب میر خاں کا براہ راست خط آگیا تو انھوں نے شاہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی۔ اور یہ عرض کیا کہ خداوندِ نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر، میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب اس تزک و احتشام کے ساتھ وہ ملیح آباد پہنچے کہ ان کے ہاتی کے پیچھے تین سو سوار ہیں اور ان کی ہاتی کے آگے آگے نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آرہی ہے کے نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ ادھر سے گزرتا

ہوا تھا، غالباً سندیلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب یہ سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انھوں نے لوگوں سے کہا۔ ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے۔ یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا کہ جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آرہا ہے اور آپ کے اس کچے مکان میں دربار کریگا۔

اس پر محمد بلند خاں نے کہا مسخر دہنستے کیا ہو، اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد جب وہ "شاہی سواری" سندیلے کا راستہ چھوڑ کر کنول ہار کی طرف مڑنے لگی، تو تمام پٹھانوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پوری آبادی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھنے لگی۔ اور جب وہ جلوس محمد بلند کے مکان کے سامنے آکر ٹھہ گیا، تمام لوگ اُدھر دوڑ پڑے، اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فقیر محمد خاں کی نظر جب اپنے باپ پر پڑی، انھوں نے، ہاتی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا، دھم سے اس کی پیٹ پر سے "بادا بادا" کہتے کود پڑے، اور جاکر، باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ باپ نے "ارے میرا فقیرا" کا نعرہ لگا کر، بیٹے کو قدموں سے اُٹھا کر کلیجے سے لگا لیا اور بوڑھے باپ کی آنکھوں سے، خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرکے، جب وہ لکھنؤ واپس آئے، غازی الدین حیدر نے اُن کو پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد، وزارتِ مال بھی ان کے سپرد کردی اور اسی کے ساتھ ساتھ انھیں "سرکار خیرآباد" کا گورنر بنا دیا[1]۔ اس کے دوش بدوش، غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اس قطعے کے انھوں نے دو ٹکڑے کر دیئے، ایک ٹکڑے کا نام "احاطۂ پختہ فقیر محمد خاں" اور دوسرے احاطہ کا نام "احاطۂ خام فقیر محمد خاں" رکھ دیا۔

احاطۂ پختہ فقیر محمد خاں میں متعدد محلات تعمیر کرا کے خود رہنے لگے اور احاطۂ خام

---

[1] راجہ صاحب محمود آباد کے دیوان میں جس کا نام "دیوان سحر" ہے ایک قطعہ موجود ہے جو انھوں نے ان کے گورنر بنائے جانے کی خوشی میں بطور مبارکباد، کہا تھا۔

میں اپنے ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کو آباد کر دیا[1]۔ ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انھوں نے میرزا گنج میں سیکڑوں ایکڑ زمین خرید کر، وہاں اپنے محل بنلائے۔ بارہ دری کی آم کے باغ نصب کرلئے اور، گرمیوں کے واسطے ایک پختہ برف خانہ بنوا دیا۔

اسی اثنار میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھنؤ کیا، پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچادی، جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغامیر وزیر اودھ کے خلاف تھی اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مُقربین میں سے ایک میرزا حاجی۔

میرزا حاجی نے دو راجپوتوں کو دس دس ہزار روپے رشوت دے کر اس امر پر آمادہ کرلیا تھا کہ جب آغامیر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہوجانا اور جیسے ہی آغامیر دروازے میں قدم رکھیں، تم دونوں بیک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغامیر کے محل گئے۔ ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا، اور جب آغامیر حکیم صاحب کے لڑکے کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہم راہ ہو گئے۔

حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے آغامیر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا، اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

ان کی اس انوکھی درخواست سے آغامیر کے تمام رفقار دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آغامیر نے آنکھیں جھکالیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، خاں صاحب آپ کی تجویز منظور۔ بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں۔ فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا، راجپوت نے تلوار چلادی، جس سے ان کا داہنا ہات بڑی

---

[1] وہ دونوں احاطے، اپنے چند محلوں کے ساتھ دو بڑے محلوں کی صورت میں آج بھی لکھنؤ میں موجود ہیں

طرح زخمی ہوگیا۔ اور جب فوراً تلوار سونت کر، انھوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا، تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتوں سے تلواریں گر پڑیں انھوں نے بھاگنا چاہا، لیکن انھوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر، کلیجے سے لگا لیا، ان کے زخمی ہات کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے کی فرمائش کی تھی، اسی وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔

اس کے بعد انھوں نے پوری سازش کا حال بتا دیا۔ میرزا حاجی کو کھڑے کھڑے حبسِ دوام کی سزا دی گئی۔ اور آغا میر نے ان کو دوبارہ گلے لگا کر کہا خاں صاحب، آپ نے اپنی جان پر کھیل کر، میری جان بچائی، یہ مجھ پر آپ کا وہ احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔

شاہِ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامۂ ایثار سنا، ان کی بے حد تعریف کی سات پارچے کے خلعت سے نوازا، اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرما دیا۔

حضرتِ ناسخ نے اس واقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا۔ جو ان کے دیوان میں "تاریخ مجروح شدن دستِ فقیر محمد خاں بہادر" کے عنوان سے موجود ہے۔

لگے ہاتوں، میرے پردادا کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے۔

آغا میر پر جب زوال آیا۔ اور ان کے حریف میر مہدی کو قلمدانِ وزارت ملا تو چونکہ فقیر محمد خاں آغا میر کے طرف داروں میں سے تھے اور میر مہدی کے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ فقیر محمد خاں ایک نہ ایک دن اپنے اثرات سے کام لے کر، آغا میر کو پھر برسرِ حکومت لے آئیں گے، اس لیے اس نے ان کی ہلاکت کا منصوبہ بنا کر، ایک روز انھیں دوپہر کے کھانے

پر اپنے ہاں مدعو کیا۔

اور اس منصوبے کی تکمیل کے واسطے اس نے یہ صورت نکالی کہ خود تو بالائی کمرے پر بیٹھا اور سنگین دیواروں سے محصور، تنگ انگنائی میں، ایک بھینسے کو، خوب شراب پلا کر آزاد چھوڑ دیا کہ جیسے ہی وہ انگنائی میں قدم رکھیں وہ بھینسا ان پر حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دے۔

چنان چہ یہی ہوا کہ جب فقیر محمد خاں نے انگنائی میں قدم رکھا، بھینسے نے، شیر ببر کے مانند جھپٹ کر، اُن پر حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے بھینسے کا وار خالی دے کر پینترا بدلا اور دوسرے گوشے میں تلوار تول کر، کھڑے ہو گئے، وہ اُدھر بھی تیر کی طرح آیا، انھوں نے اس پر تلوار چلا دی جس سے اس کی پیٹ زخمی ہو گئی۔ زخمی ہو کر وہ اور بھی خوفناک ہو گیا اور اپنے دونوں سینگ جھکا کر دوڑا کہ ان کا پیٹ پھاڑ ڈالے، لیکن جیسے ہی اس نے سر جھکایا انھوں نے تلوار کا ایک ایسا دو ٹوک وار کیا کہ اس کی پہاڑ سی گردن کٹ گئی اور خون کا ایک فوارہ آسمان کی طرف جست کرنے لگا۔

وہ اپنی خون آلود تلوار لئے اوپر چڑھ گئے، میر مہدی اور ان کے مصاحب، دوسرے کمرے کی طرف بھاگے۔ انھوں نے جھپٹ کر میر مہدی کا گریبان پکڑ لیا، اور اس کی گھگی بندھ گئی اور پھر اُنھوں نے اس کے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ اوندھے منھ گر گیا اور دستار وزارت، ڈھلکتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اور فقیر محمد خاں یہ کہتے ہوئے اُتر گئے کہ اوگندھی کے بچے، تو پٹھانوں کی شجاعت کا امتحان لیتا ہے۔

یہاں تک تو، سرسری طور پر ذکر تھا ان کی عالی مرتبگی اور دلیری کا۔ اب ان کی تہذیبی زندگی کے بھی چند واقعات سماعت فرمایئے۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ ہر چند پشتو ان کی مادری زبان تھی، پھر بھی انھوں نے اردو شاعری اور اردو زبان پر اس بلا کی قدرت حاصل کر لی کہ ناسخ سے کٹر آدمی نے ان کو اپنے حلقۂ تلامذہ میں لے لیا۔ اور ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوتی کہ میرے زمانۂ تعلیم تک ان کا کلام نصاب میں داخل تھا۔

اور ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان کے محلوں کی سجاوٹ، ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست، ان کی بیٹروں اور مرغوں کی پالیاں، ان کے مشاعرے، ان کے شبستان میں راتوں کے مجرے، ان کی ادب نوازیاں اور اہلِ علم پر ان کی زر پاشیاں، اُن میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ، دین تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں۔ اور دراصل ایک بالکل اجنبی زبان اور ایک قطعی ناموس تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی یہ، حیرت ناک، صلاحیت و اخاذیت ایک ایسی نادر صفت ہے جو لاکھوں ہی نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیرِ معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند وہ بہت دولت مند انسان تھے، اور میری دادی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا تمھارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیہ آتا تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ تھیلیوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا لیکن تمول کے باوجود، وہ کثرتِ زر کی نحوست سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گراؤں، یا کسی قسم کی کوئی جائے داد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے اخلاف، دولت و عشرت کی فراوانی کے صیدِ زبوں بن کر اوصافِ انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنّا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

اور اس خیال کے تحت اُنھوں نے اپنے نائب میرزا حسن علی بیگ، عرف میرزا حسّو کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدیں۔

ایک روز جب یہ بات ان کے علم میں لائی گئی کہ میرزا حسو بیگ ان کے نام پر سیکڑوں زمینیں، سیکڑوں باغ اور سیکڑوں گاؤں آئے دن دھڑا دھڑا خریدتے چلے

جارہے ہیں تو ان کو یہ بات بے حد ناگوار گزری ، انھوں نے حسو بیگ کو طلب کرکے اُن سے کہا۔ میرزا میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ میں نے تم سے وہ کون سی ایسی برائی کی ہے کہ تم میرے واسطے جائے دادوں کی خریداری پر اُتر آئے ہو، اور میری اولاد کے حق میں کانٹے بو رہے ہو۔ میرزا حسو بیگ نہایت دور اندیش آدمی تھے انھوں نے دست بستہ عرض کیا کہ خاں صاحب بہادر، آپ کی سرکار میں تعمیرات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے ۔ اور میں دوسرے زمیں داروں پر دباؤ ڈال ڈال کر ان کے وہاں سے مزدور بلاتا رہتا ہوں، اس لئے آئے دن کی مصیبت سے نجات پانے کے واسطے میں نے جائے داد اس لئے خرید لی ہے کہ آسانی کے ساتھ ، مزدور مہیا ہوتے ہیں۔ یہ سنا تو فقیر محمد خاں کا غصہ فرو ہو گیا، اور ارشاد فرمایا کہ جائے داد کی یہ خریداری صرف مزدوروں کی فراہمی کے حدود میں رہے اور ریاست نہ بننے پائے ۔

میرزا صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ تو کر لیا ، مگر درپردہ ، جائے داد کی خریداری کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رکھا۔

ایک روز فقیر محمد خاں سے چوب دار نے آکر عرض کیا کہ کان پور کی ایک بیگم صاحب سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں انھوں نے فرمایا بلالاؤ۔

وہ بیگم صاحب آتے ہی رونے لگیں، اور کہا میرا بیٹا بدراہ ہو گیا ہے باپ کا سارا اندوختہ چوک میں اڑا چکا ہے اور پرسوں اس نے بہت بڑی جائے داد، صرف ڈیڑھ لاکھ میں آپ کے نائب کے ہات بیچ ڈالی ہے آپ کی دریا دلی اور سخاوت کے اودھ میں ڈنکے پٹے ہوئے ہیں، اس لئے میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوئی ہوں کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ نقدے کر میری جائداد واپس فرما دیجئے ۔

انھوں نے حسو بیگ کو بلایا، انھوں نے آتے ہی جھک کر سلام کیا، فقیر محمد خاں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میرزا صاحب نے، ہات جوڑ کر کہا ، کیا فدوی سے کوئی قصور ہو گیا ہے ؟ فقیر محمد خاں نے بگڑ کر ارشاد فرمایا۔ میرزا جائے داد پیدا کرنے کا چسکا تم سے جائے گا نہیں ، یہ دیکھو کان پور کی بیگم صاحب بیٹھی ہوئی ہیں ، جن کو تم

شکار کر چکے ہو۔

میرزا نے کہا خدا گواہ کہ میں ان بیگم صاحب سے بالکل واقف ہی نہیں، اس پر بیگم صاحب نے جلدی سے بات کاٹ کر اپنے بیٹے کا نام لیا اور پوچھا۔ کیا آج سے ایک مہینہ پیشتر آپ نے اس کی جائے داد نہیں خریدی ہے اور جب میرزا صاحب گھبرا کر سر کھجانے اور کوئی عذر ڈھونڈنے لگے تو فقیر محمد خاں نے کہا۔ ان بیگم صاحب کے لڑکے کی جائے داد، اسی وقت واپس کر دو۔ میرزا صاحب نے کہا میں نے وہ جائے داد تین لاکھ میں خریدی ہے، اور بیگم صاحب ڈیڑھ لاکھ کہہ رہی ہیں، انھوں نے حکم دیا کاغذات لاؤ، اور جب کاغذات آ گئے تو معلوم ہوا کہ میرزا صاحب سچ کہہ رہے تھے اس پر ان بیگم صاحب نے کہا کہ اب پتا چلا کہ وہ جائے داد، ڈیڑھ میں نہیں، تین لاکھ میں خریدی گئی ہے، آپ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو میں اپنے ساتھ لائی ہوں اپنے خزانے میں جمع کرا دیں، اور مجھ کو دو مہینے کی مہلت عطا فرما دیں اس مدت کے بعد میں جب باقی ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاضر خدمت کر دوں تو میری جائے داد میرے بچے کے نام کر دی جائے۔

فقیر محمد خاں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیگم صاحب آپ کا فرزند اس جائے داد کو پھر کسی کے ہات فروخت کر ڈالے گا۔ بیگم نے یہ بات سنی تو یہ سمجھ کر رونے لگیں کہ فقیر محمد خاں ان کی جائے داد واپس کرنے پر طیار نہیں ہیں۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انھوں نے فرمایا بیگم صاحب آپ میری بات نہیں سمجھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فرزند کے عوض، وہ جائے داد آپ کے نام منتقل کرا دوں، تاکہ آپ کا لڑکا دوبارہ فروخت نہ کر سکے۔

بیگم کا چہرہ یہ سن کر کھل گیا، اور کہا خاں صاحب، جیسا کہ ابھی کہہ چکی ہوں یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آپ اسی وقت لے لیں، باقی روپیہ جب دو مہینے کے بعد لے کر آؤں تو۔ ان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ انھوں نے ارشاد فرمایا، میرزا ہم بیگم صاحب سے مطلق روپیہ نہیں لیں گے تم ان کے فرزند کی جائے داد، میری طرف سے بیگم صاحب کے نام اسی وقت ہبہ کر کے۔ ہبہ نامہ ان کے سپرد کر دو۔

یہ سنتے ہی میرزا صاحب کا رنگ اڑگیا، بیگم کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو ٹپکنے لگے اور ان کی جائے داد واپس کر دی گئی۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے جن کا نام غالباً محمد علی خاں تھا، ان سے کہا کہ ریاست رام پور پر، میرے ایک قرابت دار، ناجائز طور پر قابض ہو چکے ہیں، حالانکہ از روئے شریعت و قانون یہ ریاست مجھے ملنی چاہیئے کہ میں ہی اس کا صحیح وارث ہوں، میں نے غاصب پر مقدمہ دائر کیا تھا، لیکن رشوت کے بل بوتے پر وہ جیت گیا ہے اب میں اس مقدمے کو ولایت کی پریوی کونسل تک لے جانا چاہتا ہوں، جس کے واسطے اسی ہزار کی شدید ضرورت ہے، مجھے یقین ہے کہ پریوی کونسل میں رشوت نہیں چل سکے گی، اور میں یقیناً مقدمہ جیت جاؤں گا ــ ان کی اس استدعا پر، فقیر محمد خاں نے ان کو اسی ہزار روپئے دے دیئے۔

اور جب مقدمہ جیت لینے کے بعد، ان کو رام پور کا نواب بنا دیا گیا، تو انھوں نے فقیر محمد خاں کو خط پر خط لکھے کہ رام پور تشریف لایئے، کچھ روز میرے میہمان رہیئے۔ میں اس اثنا میں تمام اعیانِ ریاست کو جمع کر کے، آپ کے اس احسان کا اعلان کروں گا، جو آپ مجھ پر کر چکے ہیں اور اسی دربار میں آپ کے اسی ہزار بڑی نیازمندی کے ساتھ واپس کر کے، آپ کی خدمت میں ایک بڑی جاگیر بھی پیش کروں گا۔ فقیر محمد خاں نے اس روپئے کے واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ "حسابِ دوستاں در دل" کے طور پر دی گئی تھی، میں کوئی بنیا نہیں کہ اسے واپس لے لوں[1]۔

---

[1] میں نے جب کہ میں ۱۹۲۷ء میں والیٔ رام پور، نواب حامد علی خاں کے زمانے میں بطور میہمان رام پور میں ٹھہرا ہوا تھا ان تمام خطوں کو ریاست کے دارالانشا سے منگا کر خود پڑھا تھا، لیکن جوانی کے لاابالی پن میں ان کی نقلیں نہیں کرائی تھیں اور اب جب کہ مجھے ان نقلوں کا خیال آیا تو میں نے کتب خانۂ رام پور کے لائق مہتمم عرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ نقلیں مجھے بھیج دیں تاکہ اس کتاب میں درج کروں تو انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ "دارالانشا" کے تمام کاغذات کو حکومت نے الہ آباد بھیج دیا ہے۔ اب اتنا وقت کہاں کہ الہ آباد جاؤں اور نقلیں حاصل کروں۔

اب چند تذکرہ نویسوں اور مورخوں سے بھی ان کے حالات ملاحظہ فرمائیے :۔

صاحب الیاقوت والمرجان فی ذکرِ علمائے سہوان " لکھتے ہیں کہ حکیم بدرالدین فاروقی، ابن شیخ محمد صدرالدین تھانیسری وشاگرد شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، نواب فقیر محمد خاں بہادر کے مشیر و ندیم اور ان کے محلات کے معالج رہے۔

صاحب "تاریخ اودھ" کا بیان ہے کہ نواب فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپاہ سالار ہی نہیں مزاج بھی شاہی پایا تھا۔ ایک بار نواب آغا میر نے ان سے کہا کہ اس فصل میں ہم آم کھانے ملیح آباد آئیں گے، اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں نے ان شاہی مہمانوں کے لئے ایک بارہ دری تین لاکھ روپے میں تعمیر کرائی اور تین لاکھ کے فرنیچر سے اس کو آراستہ کیا۔

صاحب "صبحِ گلشن" نے لکھا ہے کہ اس قصبے (ملیح آباد) میں عمارات رفیع وبساتین و انہار رواں، ان کی عظمت و ثروت کے آثار ہیں۔

صغیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انھیں آموں کا بہت شوق تھا، اور آم بڑے اہتمام سے لگائے تھے اور سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے تحریر کیا ہے کہ باوجود ہجومِ دنیا، قدردانِ اہلِ ہر فن است۔ تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" میں درج ہے۔ اتمام اس (فقیر محمد خاں) کا، آغاز سے خوش تر۔ جب کہ دولت مند تھا، اب شیعۂ امیرالمومنین حیدر[1]

کریم الدین خاں ان کے باب میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ شیعوں سے منہگا مدہتا ہے سننے میں آیا ہے، بہت متعصب سنی ہے[2]۔ "تاریخ محتشم" میں لکھا ہے کہ نصیرالدین حیدر کے وزیر منتظم الدولہ فقیر محمد خاں سے ناخوش ہو گئے تھے۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ انھوں نے وزیر کے روبرو، تاج الدین حسن خاں کے حق میں کلمات درشت کہے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فقیر محمد خاں جری آدمی تھے، اور ان کے سامنے ظلم ہوتا تو مظلوم کی پاس داری

---

[1] ان کے شیعہ ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا[2] انھوں نے حضرت علی کی شان میں جو قصیدے اور امام حسینؑ کی جناب میں جو سلام کہے ہیں، ان سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

کرتے تھے۔ اس لیۓ ان کے خلاف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ دربار میں ہتیار باندھ کر نہ آئیں گویاؔ نے کہا میں اس پر خانہ نشینی کو ترجیح دیتا ہوں، اس پر انھیں ہتیار لگانے کی اجازت دے دی گئی۔

الہ آباد کے رسالہ "ہندوستانی" میں ایک مقالہ "مخزنِ آلام" اور "احمد کی شاعری" کے عنوان چھپا تھا جس میں صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ گویا کا عروج نصیرالدین حیدر تک رہا، وہ اودھ کے ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کے سالار تھے، اور خود چودہ سو پیادے اپنی ذاتِ خاص میں رکھتے تھے۔

صاحب "نامۂ مظفری" نے لکھا ہے کہ گویاؔ، عربی بھی ایسی صاف بولتے تھے کہ گویا مادری زبان ہے اور ان کی ترکی بولنے پر بھی لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ چودہ سو سپاہی ان کے ذاتی ملازم تھے۔ فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑی آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان ہی میں رہے، بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کیۓ کہ باپ محلوں میں اُٹھ آئیں، لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑے کو، لنگوری[1] چال سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا، ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا یہ سوار کون ہے۔ نائکہ نے کہا، چپ رہ، یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔

یہ سن کر، وہ غصے میں بھرے ہوئے، گھر آئے اور بیٹے سے کہا فقیرے اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا، بیٹے نے سبب پوچھا تو انھوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا، دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا، باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بہی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے۔ لعنت، ہزار لعنت، چوک سے گزرنے والے پر۔

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم "باغات" نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے

---

[1] گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر اُچھلتا، اور قوس سی بناتا، زمین پر قدم رکھتا ہے۔

والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول ان کے پیچھے آتے اور ہزاروں کچے پکے آم توڑ کرے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے ہیں

یہ خبر سن کر، نیفیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام، لکھنؤ سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ باوانہم باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے، آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انھیں باغوں میں نہ جانے دیا جائے۔

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیرا امیر ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے۔ چلو میرے ساتھ لکھنؤ، میں آج فقیرے کو مزا چکھا دوں گا۔

نیفر محمد خاں اپنے محل میں شاہ زادوں اور عمائد لکھنؤ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوب دار نے آکر عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصّے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں گا۔

نیفر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا۔ میں اس بڑی الماری کے پیچھے جا کر چھپ جاؤں گا۔ باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجیے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں

اتنے میں، بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آگئے، تمام محفل کھڑی ہو گئی، انھوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہے، حاضرین نے جواب دیا کہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔ محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورو، جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔

"خوشامد خوردں" کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ ہو کر رہ گئے۔ لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے، کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا اڑتا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔ محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے، بیٹے کو کھڑ کھڑا کر، الماری کے پیچھے سے نکالا اور ان کا گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ

مجال ہے کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والے کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے، طمانچہ مار دیا۔ اور جب طمانچہ کھا کر انھوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا، ماموں بس، اب اس سے زیادہ، اور ذلیل نہ کیجیے۔

اور جب محمد بلند خاں، بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد، باہر جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لیے، اور کہا بادا معاف کر دیجیے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا۔ اور شعرا نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے۔ اور انھوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔

میرے دادا

نوّاب محمّد احمد خان بہادر، آحمد، صاحب "[1] مخزن الآم" اور تعلقدار کسمنڈی، جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے، ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے اُن کو اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا، ان کا جسم بیحد گٹھا ہوا تھا، کلائیاں دو آدمیوں کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں، اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں۔

اُن کی آنکھیں بہت بڑی تھیں، مُنھ پر داڑھی تھی، سر پہ پگڑی باندھتے تھے، اور جب داڑھی اور پگڑی کے مابین اُن کی آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں، تو ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہونے لگتا تھا، وہ انگرکھا پہنتے اور انگرکھے کے اُوپر ایک مخملی رومال لپیٹ لیا کرتے ہیں۔

اُن کی چال اس قدر نپی تلی تھی کہ اس میں تیز رفتاری کا عنصر پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ تیز تیز چلنے کو وہ آدابِ شرفار کے خلاف سمجھتے تھے۔

وُہ صرف ایک وقت، یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے، اور صبح، روز قے کرکے، ناشتہ کیا کرتے تھے۔

اُن کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں

---

[1] اُن کے دیوان کا نام

تھیں، ـــ وُہ ایک سو بارہ بچّوں کے باپ تھے۔ اُن کے بچّوں کے غالباً پچّاسی نام میرے پاس لکھے ہُوئے ہیں۔ باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں۔

اُن کا انتقال اٹھّاسی برس کی عمر میں ہوا۔ اُنھوں نے بلوغ کے بعد سے، انتقال تک، کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گزاری، ـــ البتّہ جب لکھنؤ جاتے، تو پردے کی شدّت کی بنا پر، چوں کہ بیویاں کیسی، لونڈیاں باندیاں بھی اُن کے ساتھ نہیں جاسکتی تھیں، اور، چوں کہ طوائفوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے، اس لئے دو ایک راتیں ناغہ ہو جاتی تھیں، اور صبح ہوتے ہی اُن کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا، ـــ اس عالم میں یہ ایک بندھا ٹکا معمول تھا کہ دو مضبوط جسم کے خدمت گار، اُن کی کنپٹیوں پر روئی کے گالے چپکا کر، ایک گھنٹے تک سنسنی سے اُن کا سر دبایا کرتے تھے۔

اُن کی اس غیر معمولی جنسی طاقت کا غلغلہ سُن کر، لکھنؤ کے بڑے بڑے سول سرجن اور ڈاکٹر اُن کے پاس آتے۔ اُن سے اُن کی غذا، اُن کے معمولات مرغوبات و مکروہات کے بارے میں دیر تک سوال کرتے، اور اُن کا خون جانچتے تھے۔ مگر کسی کو اُن کی بے مثال جنسی طاقت کی لم نہیں معلوم ہوسکی۔

میں نے کم سنی میں اُن کی اس بے کراں طاقت کے متعلّق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ چوں کہ وہ کاکوری کے تکیۂ شریف کے شاہ صاحب کی دعا سے پیدا ہُوئے تھے اور اُنھوں نے، دادا میاں کو اُن کے لڑکپن میں اپنا پائے جامہ پہنا کر، کچھ زیرِ لب دُعا رکی تھی، اِس لئے اُن میں یہ غیر معمولی طاقت آگئی تھی (اس بات کو میں ایک افسانے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا)

ہمارے خاندان کا یہ اصول تھا کہ خلفِ اکبر کو باپ کا جانشین اور تعلّقدار بنایا جاتا تھا اور باقی بچّوں کو صرف گزارہ دار کی حیثیت دی جاتی تھی۔ ـــ لیکن دادا میاں کو، چوں کہ اپنے تمام بچوں سے بے حد محبّت تھی، انھوں نے اس اصول کو دوسری شکل دے دی، یعنی میرے حقیقی چچا اور میرے باپ کو، ہرچند سب

سے بڑی جائے داد عطا فرمائی۔ اور تعلّقہ داری چچا کو بخش دی۔ لیکن اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا۔ اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے۔ بعض کو، مرتبے کے لحاظ سے زیادہ جائے داد دی۔ اور بعض کو کم۔ لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا، اور اُن بیٹوں کو بھی جو لونڈیوں، باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کم سے کم، دو دو گاؤں اور دو دو باغوں کا مالک بنا دیا۔

جس طرح ململ کی چادر کو ببول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے، اُسی طرح انھوں نے اپنی جائے داد کے ٹکڑے اُڑا کر رکھ دیئے۔

اَوَدھ کے تمام تعلّقہ داروں کی طرح، دادا میاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجّہ مبذول نہیں فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ اُن کے تمام فرزند جاہل رہ گئے اور حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دادا میاں کو عورتوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اپنے علاقے کی نگرانی اور ضلع داروں سے حساب فہمی کرتے، اس لئے تمام کارندوں نے خوب جی بھر کر لوٹا اور ایک کارندے صاحب نے تو، جن کی تنخواہ فقط بیس روپے ماہوار تھی، ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لئے، جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کی اکلوتی بیٹی کو مل گئے۔

مہینے، دو مہینے کے بعد، جب وُہ محل سے برآمد ہوتے تھے، تو لوگوں میں یہ غلغلہ بلند ہو جاتا تھا کہ آج بڑے خاں صاحب برآمد ہوئے ہیں، اور احاطے میں اہلِ ملیح آباد اور رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے، سلام کرنے کی غرض سے، شرفاء کے واسطے کرسیاں اور رعایا کے واسطے، دُور دور تک بنچیں رکھ دی جاتی تھیں، اور اُن کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وُہ، اِس سرے سے لے کر اُس سرے تک، ہر شخص سے فرداً فرداً باتیں کرتے، اور کسی ایک فرد کو بھی مکالمت سے محروم نہیں رہنے دیتے تھے۔

وُہ انگریزوں کو ناپاک سمجھتے تھے، اور دورے کے سلسلے میں، جب ملیح آباد میں

کمشنر کا پڑاؤ ہوتا، تو حسب دستور، وُہ، سب سے پہلے دادا میاں سے آکر، ملتا تھا اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب وُہ اس فرنگی سے ہات ملاتے۔ تو اسی وقت تسلہ آجاتا اور وُہ اس کے سامنے، بیسن مل کر، ہات دھولیا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد (جس کو فرنگی "غدر" سے منسوب کرتے تھے) جب تعلّقہ داری کے اسناد تقسیم ہو رہے تھے، تو تمام تعلّقہ داروں کے ساتھ، دادا میاں بھی، تجدیدِ سند کے واسطے، گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے تھے۔ اور، جیسے ہی لیفٹیننٹ گورنر کی نظر دادا میاں پر پڑی، اس نے، چیخ مار کر کہا، وِل، ہم نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہے جو نبشیر ت گنج کی لڑائی میں برٹش کے خلاف لڑا تھا، آپ نے ہمارا بہت سا آدمی مارا تھا، ہم فوج کا کرنل تھا، ہم نے آپ کو دُوربین سے دکھا تھا، نائیں نائیں، ہم آپ کو سند نہیں دے سکتا۔

جب یہ سنا تو دادا میاں نے گرج کر کہا، بے شک میں آپ کے خلاف لڑا تھا، اور مجھے لڑنا ہی چاہئے تھا، میں نمک حرام نہیں ہوں کہ نواب اودھ اور اپنے ملک سے غداری کرتا۔ ہم پٹھانوں کے خون میں غداری نہیں ہے۔ ہم لوگ تو آن پر جان دے دیا کرتے ہیں، آپ سند نہیں دیتے شوق سے نہ دیں۔

دادا میاں کی اس گرج سے دربار پر خاموشی چھاگئی، بہت سے تعلّقہ دار ڈر گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ لیکن لیفٹننٹ گورنر بڑا معقول اور شریف آدمی تھا۔ وہ مسکرایا، اور کہا، بہت اچھا بولا، بہت اچھا بولا۔ ہم آپ کو تعلّقہ داری کی سند دے گا۔ بہت اچھا بولا۔ پٹھان کیریکٹر کے مابِق (موافق) بولا۔

لیفٹننٹ گورنر نے اُن کو تعلّقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ، درجۂ اوّل کا آنریری مجسٹریٹ بھی بنادیا۔ اور وہ مہینے میں ایک بار، مجسٹریٹی کے فرائض انجام دینے لگے۔

ملیح آباد چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے۔ اس لئے آئے دن وہاں لٹھ پونگا ہوا کرتا تھا، اور برابر فوج داری کے مقدمے پیش ہوا کرتے تھے۔ لیکن ان کی مجسٹریٹی

کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی پر جرمانہ کرتے تھے تو جرمانے کی رقم خود اُن کے خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

ایک بار اُن کے اجلاس پر ایک پٹھان کا مقدمہ پیش ہوا۔ جس نے ملیح آباد اسٹیشن پر، ایک بدکلام انسپکٹر پولیس پر لٹھ سے حملہ کرکے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ انھوں نے اس پٹھان پر جرمانہ کرکے، جرمانے کی رقم، حسبِ دستور اپنی سرکار سے ادا کر دی، اور شام کے وقت اسے بلا کر، اس کے سر پر ہات پھیرا، اور فرمایا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے اس بدتمیز انسپکٹر کا دماغ صحیح کر دیا، میں اس صلے میں تیس روپے ماہانہ تمھارا وظیفہ مقرر کر رہا ہوں۔ جو تمام عمر تم کو ملتا رہے گا۔ (دادا میاں کے بعد بھی اُن کو وہ وظیفہ تا حیات ملتا رہا)

ایک دن علاقے کے چند کاشتکار خاں صاحب بہادر کی دہائی، خاں صاحب بہادر کی دہائی کے نعرے مارتے آئے اور کہا حضور ہمارے گاؤں سیداپور سے داروغہ جی گزر رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے ٹھوکریں ماریں اور کہا۔ سالو سلام کے لئے کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔

دادا میاں نے کسی سپاہی کو حکم دیا کہ اُن کے سر پر کس کس کر چپتیں مارو کاشت کار چلائے کہ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے تھے، آپ اُلٹے ہمیں کو پٹوا رہے ہیں۔ اس پر اُنھوں نے کہا۔ تمھارے سروں پر چپتیں اس لئے لگوا رہا ہوں کہ تم ہماری رعایا ہو، اور پھر بھی ٹھوکریں کھا کر آئے ہو۔ جاؤ، ابھی جاؤ، اور تھانے میں گھس کر داروغہ کے سر پر جوتے مارو، اور جب جوتے مار کر آؤگے میں تمھارا ساتھ دوں گا۔

اور جب وہ لوگ داروغہ کو جُتیا کر آ گئے تو اُن کی پوریوں، کچوریوں اور مٹھائیوں سے تواضع کی گئی اور اُن کا آدھا لگان معاف کر دیا گیا۔

انھیں بٹیریں لڑانے، بٹیریں پالنے اور بٹیریں کھانے کا بہت شوق تھا، سیاہی راتوں کو، کھیتوں میں جال لگاتے پھندیتوں کے پنجرے چاروں

طرف لٹکاتے، اُن کی بولیوں پر بٹیروں کو کھیتوں میں گراتے، اور صبح کو سینکڑوں بٹیریں جالوں میں پھنسا کر لے آتے تھے، اُن میں سے کچھ، لڑنے کے لئے پال لی جاتیں، کچھ بچّوں میں تقسیم کردی جاتیں اور کچھ دسترخوان کے لئے پکالی جاتی تھیں۔

جب وہ دوپہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے، تو محل کا پورا لمبا چوڑا لق و دق برآمدہ اُن کے ساتھ کھانے والے بچوں سے بھر جاتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ سکندرِ اعظم کی فوج ٹوٹ پڑتی ہے۔

ایک روز میں اپنے باپ کے پاس بیٹھا برفی کھا رہا تھا کہ دادا میاں کا خاص خدمت گار رحم علی آیا اور ہاتھ جوڑ کر، کہا بڑے خاں صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔

جب میں، اپنے باپ کے ساتھ، محل میں داخل ہوا، دیکھا کہ، وہ ایک مخمل سے ڈھکے ہُوئے مونڈھے پر تشریف فرما ہیں، اور، فرطِ غضب سے اُن کا سر ہل رہا ہے۔ اور جب میرے باپ نے جھک کر سلام کیا، اور پوچھا باوا کیا بات ہے تو اُنھوں نے سر کو جھٹکا دے کر فرمایا "بشیر، مجھے آج محمد اسحٰق کی صورت سے نفرت ہوگئی" میرے باپ نے بڑے ادب سے پوچھا باوا کس بات پر۔ دادا میاں نے فرمایا کہ ابھی اسحٰق تیز تیز قدم رکھتا میرے پاس آیا تھا، میں نے کہا اسحٰق۔ اس طرح چھچھورے پن سے تیز تیز چلنا آدابِ شرفا کے منافی ہے، تم جانتے ہو اس نے میری یہ ڈانٹ سن کر کیا جواب دیا، اس نے کہا باوا معاف فرمائیے۔ خوشی کے مارے میری چال بدل گئی۔ ہمارے علاقے کے گاؤں ٹھری میں ایک بہت بڑا خزانہ نکل آیا ہے۔ اس کی خوش خبری دینے آیا ہوں، بشیر، اس کا یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، میں نے کہا دور ہوجا میری نظروں سے بھلا خزانہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے شریفوں کی چال میں فرق آجائے۔

ل فرزندِ اکبر

پچاسی برس کی عمر میں بھی دادا میاں کی صحت اس قدر اچھی، اور اُن کے قوا اس قدر مضبوط تھے کہ وہ ابھی دس بیس برس تک اور جی سکتے تھے، مگر ایک حسین عورت اُن کی موت کا باعث بن گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ اُن کو خوش کرنے کے لئے میرزا امداد بیگ نے، لکھنؤ سے ایک نہایت خوب رُو اور دراز قامت مُغلانی کو بطورِ تحفہ اُن کی سرکار میں پیش کیا تھا، اس عورت کو آتشک کا مرض تھا جو اُن کو لگ گیا، انھوں نے، شرم کے مارے، کسی سے نہیں کہا، اور کچھ روز بیمار رہ کر، اسی مرض میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک روز، رات کے وقت، جب دادا میاں کے پاس گیا تھا۔ اُن کی داہنی میز پر ایک بڑا سا اکّا جل رہا تھا، اور بائیں جانب وہ صبیح و دراز قامت مُغلانی، کولے پر ہات رکھّے کھڑی تھی، میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا اور اس کی جانب، ٹکٹکی باندھ کر، دیکھنے لگا تھا، اور اُنھوں نے میری یہ حالت دیکھ کر، یہ ارشاد فرمایا تھا، ڈیوٹ[1] الوٹ کیا دیکھ رہا ہے، بدتمیز کہیں کا، جھکالے آنکھیں،

یہ بات کہیں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دادا، اپنے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خان سے خوش نہیں تھے، اور نسیم خان کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند نواب محمد علی خان کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

دادا جان جب مرض الموت میں گرفتار ہوگئے تو۔ عین اُن کے انتقال کے دن، اُن کو خبر دی گئی کہ محمد علی خان عیادت کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی انھوں نے، لونڈیوں سے کہا مجھے اُٹھا کر بٹھا دو، گاؤتکیہ پیچھے رکھ دو، حقّہ سامنے لگا دو، میری دادی جان نے کہا اُٹھ کر نہ بیٹھو، ایسا نہ ہو دشمنوں کی طبیعت اور خراب ہوجائے، انھوں نے جواب دیا کہ محمد علی مجھ کو دیکھنے آیا ہے

---

[1] ایک بار سوٹ پہنے دیکھ کر انھوں نے مجھ کو "ڈیوٹ الوٹ صاحب بہادر" کا خطاب دیا تھا، اور اکثر اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے۔

آیا ہے۔ میں اس کو یہ دیکھ کر خوش نہیں ہونے دوں گا کہ چچا اب انتقال کے قریب آگئے ہیں،

اور جب وہ اُٹھا کر بٹھا دیئے گئے اُنھوں نے حکم دیا بلالاؤ محمد علی کو۔ محمد علی خان نے پوچھا چچا مزاج کیسا ہے، دادا میاں نے بلند آواز سے ارشاد فرمایا، محمد علی اب افاقہ ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر، وہ، بڑے کڑاکے سے حقّہ پینے اور پان کھانے لگے، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بھتیجا چلا گیا تو گاؤ تکیہ ہٹوا کر میری دادی سے ارشاد فرمایا۔ میرے بدن میں جس قدر بھی طاقت باقی تھی وہ میں نے محمد علی پر صرف کر دی، اس کے بعد۔ کلمہ پڑھا۔ اور رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اُن کے مجموعۂ کلام کا نام " دیوانِ احمد، موسوم بہ مخزنِ آلام " ہے۔ ٹائیٹل پیج پر مندرجۂ ذیل عبارت، ایک حلقے میں درج ہے:۔ "من نتائجِ افکار، سخن سنج، معجز بیان و عالی خاندان، الا دودمان جناب محمد احمد خان صاحب بہادر، تعلقہ دار و آنریری مجسٹریٹ خلف الرشید، دست گیر افتادگاں، جنت مکاں حضرت نفیر محمد خاں صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور۔"

دادا میاں نے ایک مطبع قائم کر کے، ملیح آباد (میرزا گنج) ہی میں یہ دیوان چھپوایا اور خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔

اس دیوان کی ضخامت پانچ چھ سو صفحے سے کم نہیں تھی میرے پاس ان کے پچاس دیوان تھے گھر میں چوری ہوئی تو چور کتابیں بھی لے گیا۔ اب چند اوراق میرے پاس رہ گئے ہیں۔

وہ ٹھیٹ قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے چند اشعار آپ بھی سن لیں۔

کبھی گر سامنا ہو گا رُخِ گل گونِ جاناں کا
تو فق ہو جائے گا منہ، دیکھنا، صبحِ بدخشاں کا
علیٔ مرتضیٰ شیرِ خدا کی مدح لکھتا ہوں
نیستاں نام رکھا جائے گا میرے قلمداں کا
وہ ہوں میں رند اے واعظ، نہیں کچھ مذہب و ملت

نہ قائل کفر کا سمجھو، نہ تابع مجھ کو ایماں کا

قتل کرنے کو مرا بانی بیداد آیا
آرزو تھی مجھے جس کی وہی جلاد آیا
نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی
میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا، سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغِ جہاں میں یہ ملا نخلِ جوانی کا
کہ وصلِ یار حاصل ہے، مزا ہے زندگانی کا
حسینوں میں تمھارا نام ہوتا بوت پر میرے
صنم تم ڈال دو اپنا ڈوپٹہ کام دانی کا

جیتے جی فرقتِ دلدار نے سونے نہ دیا
قبر میں حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا
رات بھر گنتے رہتے ہیں، شبِ تار میں ہم
یادِ افشانِ رخِ یار نے سونے نہ دیا
خواب میں دیکھ لیا، رقص جو کرتے ان کو
گھنگروؤں کی ہمیں جھنکار نے سونے نہ دیا

عدم سے جانبِ ہستی جو بوتراب آیا
ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

جو یاد ہجر میں ان کی کوئی ادا آئی
پری کا بھیس بدل کر، مری قضا آئی
صبا، تو آتی ہے کیا ہو کے اس کے کوچے سے؟
کہ تجھ سے آج مجھے بوئے آشنا آئی
بہایا آنکھوں سے دریا لہو کا احمدؔ نے
تمھاری یاد جو اے شاہ کربلا آئی

پژمردہ ہو کے جب رخ باغباں سے ہم
برگِ خزاں کی طرح چلے بوستاں سے ہم
تلقیں کی احتیاج نہیں ہم کو زاہدا
ہیں فیضیاب صحبتِ پیرِ مغاں سے ہم

جب سے عاشق ہوئے تمھارے ہم
لگ گئے گور کے کنارے ہم
وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں
آج تم جیتے اور ہارے ہم

میرے باپ

نام تھا نوّاب بشیر احمد خان۔ اور تخلّص تھا "بشیر" مردانہ حُسن میں ان کا جواب نہیں تھا، یہ منسلکہ تصویر اس وقت کے ایک اناڑی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہے جس سے ان کی صورت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ان میں جمال وجلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہوجاتی تھیں، اور جب ریل میں سفر کرتے تھے تو فرنگی بھی، جن کی تہذیب میں تعارف کے بغیر، بات کرنا بدتہذیبی ہے، اس قدر متاثر ہوجاتے تھے کہ اُن سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ آپ کا نام کیا ہے، اور آپ کس خاندان کے فرد ہیں۔ اُن کو، اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ ستّر ماؤں کی محبّت کو اُن کی ایک محبّت پر قربان کردیا جاسکتا تھا۔ وہ، رات کے ایک یا دو بجے مردانے سے اُٹھ کر جب زنانے میں تشریف لاتے تھے، تو ایک خادمہ، لال ٹین ہات میں لیئے، آگے آگے چلتی تھی، اور وہ ہم ساتوں بھائیوں بہنوں کی نبضیں دیکھے بغیر نہیں سوتے تھے، اور جب ہم میں سے کسی کا ناخن بھی دُکھتا تو ڈاکٹروں سے ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا۔ اور جب ہم میں سے کسی کے منھ سے کوئی بدشگونی کی بات نکل جاتی تھی، تو ہم پر سے صدقے اتارے جاتے تھے اور چونکہ ہمارے تمام محلوں کو بھوتوں اور چڑیلوں کا رمنا خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ہم سب بچوں کی خواب گاہ کے گرد روز رات کو حصار کھینچا جاتا، اور ہماری پائینتی ایک ایک

لہ میں اپنے باپ کے بہت سے واقعات اوپر درج کرچکا ہوں، اس لئے اس موقع پر اختصار سے کام لینا پڑا ہے

انّا یا دو، سلائی جاتی تھی، جب ہم زنانے سے مردانے میں جاتے تو بھی، ڈیوڑھی میں سے گزرتے کے لیے، کوئی نہ کوئی خادمہ، ہمارے ساتھ کر دی جاتی تھی، جب ہم غسل خانے جاتے اس وقت بھی دروازے پر ایک ماما کھڑی رہتی، اور، بار بار، پکار پکار کر کہا کرتی تھی بھیا، میا بیٹا ڈرنا نہیں، ہم دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر، تین بار تالیاں بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے، میرے تمام رونگٹے خوف سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

لیکن انتہائی شفقت کے باوجود وہ تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر، اور دادی جان کی اس نصیحت پر کہ "بیٹا، بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے" بڑی شدت کے ساتھ عامل تھے۔

انھوں نے، خصوصیت کے ساتھ، ہم تینوں بیٹوں کو، بڑی سختی کے ساتھ، اس بات کی ممانعت کر دی تھی کہ آپس میں، یا دوسرے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے کشتم کشتا نہ کرو، شور نہ مچاؤ، کونوں کھدروں میں نہ کھیلو۔ خدمت گاروں کارندوں اور سپاہیوں کی چارپائیوں پر نہ بیٹھو۔ خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، لکھنے پڑھنے کے وقت کھیل کود کے قریب بھی نہ پھٹکو، کمرے کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھو، اگر کوئی مذاق دل لگی کی بات کرے، اسے مارو اور ہمارے پاس لے آؤ، لونڈیوں، باندیوں سے ہنس کر بات نہ کرو۔

ایک روز، کسی مخبر نے آدھی رات کو، اُن تک یہ بات پہنچا دی کہ میرے بڑے بھائی اور میں، دونوں حضرت احسن مارہروی[1] کے صاحبزادے کے ہات میں ہات ڈالے باغ میں ٹہل رہے تھے، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے۔ محافظن ماما کی معرفت، ہم دونوں بھائیوں کو اسی وقت جگوا کر بلوایا، ہم پہنچے تو انھوں نے فرمایا سنا ہے آج آپ دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے ہات میں ہات ڈالے باغ میں گل گشت فرما رہے تھے

ہمیں کیا معلوم تھا کہ کسی کے ہاتھ میں ہات ڈال کر ٹہلنا کوئی بری بات ہے ہم نے اقرار کر لیا، ہمارے اقرار کے بعد، انھوں نے، بھاری آواز میں فرمایا۔ آپ

[1] وہ ہمارے یہاں اکثر آتے اور ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے۔

دونوں ادھر آئیں، جب ہم اُن کے قریب پہنچ گئے، انھوں نے کہا آپ دونوں اپنے اپنے ہاتھ کھول کر جھکا دیں، اور جب ہم نے ہات کھول کر جھکا دیئے، تو انھوں نے اپنے بھرے ہُوئے حقّہ کی دہکتی ہوئی چلم کے انگارے ہمارے ہاتھوں پر گرادیئے ہمارے ہات بُری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑگئے۔

جہاں تک کہ علم و فضل کا تعلّق ہے وہ عام رُؤسار سے بالکل مختلف، اور رات کے دو بجے تک کتب بینی کیا کرتے تھے۔ فارسی زبان اور تاریخِ اسلام پر اُن کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ سعدی، حافظ، نظیری، قاآنی اور فردوسی کا پورا کلام ازبر تھا۔ اُردو میں وہ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے۔ اور جب انیس کے مرثیے اور فردوسی کا شاہنامہ سناتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔

شاعری میں سب سے پہلے مرزا داغ سے اصلاح لی، اُس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے استفادہ کیا، ہرچند وہ لکھنؤ کی غالب پرست "معیار پارٹی" کے رکن تھے، مگر غالب پر میر کو ترجیح دیتے تھے۔

اور تاریخِ اسلام جب بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے۔ مجھ سے ایک بار، سید ناصر حسین صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ آپ کے والدِ گرامی کو تاریخِ اسلام پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ خود مجھے اس پر غبطہ پیدا ہوا کرتا تھا۔

دینی اعتبار سے وہ سُنّی تھے، لیکن اہلِ بیت کی محبّت کو جزوِ ایمان ہی نہیں عینِ ایمان سمجھتے اور حضرتِ علی کو تینوں خلفار پر بمراحل ترجیح دیتے تھے۔

قلب کی گُداختگی، شاعری سے شیفتگی اور، علم و فضل سے وابستگی، اور لکھنؤ کی تہذیب سے دل دادگی کے باوصف، اُن کے مزاج میں اس قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوف ناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اور "قبضے پر ہات رکھتے ہی، کچھ اور ہوگئے" کا عالم اُن پر طاری ہوجایا کرتا تھا۔

ان کی سرکار سے سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظائف ملا

کرتے تھے، اور اس کے اخفار میں اُن کو اس قدر غلو تھا کہ کسی کو کانوں کان، خبر ہی نہیں ہونے پاتی تھی ۔

اُن کے انتقال کے بعد، میں نے وظائف کا رجسٹر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اس رجسٹر میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جو ہمارے خلاف عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے چکے تھے ۔ اور اس کے باوجود اُن کا وظیفہ بند نہیں کیا گیا تھا

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی ُانھیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرّحمٰن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ انھیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اِس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدّت سے عداوت چلی آرہی ہے، پھر وہ میرے باپ سے کیوں ملنے آتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ عبدالرّحمٰن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھک جاتی ہیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرّحمٰن خان سے ڈرتے ہیں، جبھی تو اُن کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں ۔ لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ کہتا نہیں تھا۔ جب بہت دن تک یہ تماشہ دیکھتا رہا تو مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور، ایک روز۔ ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا میاں آپ عبدالرحمٰن خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے ؟ اُنھوں نے میرا یہ سوال سن کر، پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا بیٹا۔ عبدالرّحمٰن خان ایک زمانے میں رئیس تھے اب اُن کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے اس لئے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں۔ اور بیٹا۔ شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے۔ — اور جب میری آنکھوں میں آنسو بھرے جانے لگا تو انھوں نے فرمایا، دیکھ بیٹا میرے سر کی قسم، یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا۔

جہاں تک اُن کی اَدَبی زندگی کا تعلق ہے۔ وہ گاہ گاہ غزلیں کہا کرتے تھے۔ ان کے پاس کوئی بیاض نہیں تھی، غزلیں پرچوں پر لکھ کر، ادھر ادھر ڈال دیتے ۔

یا کبھی صندوقچے میں رکھ لیا کرتے تھے، اس لئے اُن کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہوگیا، جو چند غزلیں مل سکیں وہ بھائی صاحب نے "کلامِ بشیر" کی صورت میں چھاپ دیں، جس کا ایک حصہ ترقی اُردو بورڈ میں موجود ہے۔

اُن کو زبان کی صحت، اور لہجے کی نجابت کا بے حد خیال رہتا تھا، اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بولتا تھا، وہ، تڑاق سے، تھپڑ مار دیا کرتے تھے

افسوس کہ "کلامِ بشیر" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔ حافظے میں جو چند شعر موجود ہیں وہ سن لیجئے:-

آمادہ ہو جو سوزِ نہاں کے بیان پر — انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر
چھوڑو، خدا ہی پر کہ وہاں ہوگا فیصلہ — میرے بیان پر نہ، تمھارے بیان پر
اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے — دل مر گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

یہ رشک کے صدمے کبھی دل سہ نہیں سکتا — جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا
سمجھو تو اسی پردے میں کہ جاتا ہے سب کچھ — جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہ نہیں سکتا

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں — وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا
دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسنا ان کا — اثرِ ضبط وہ چہرے سے نمایاں ہونا

راہ پر ان کو، لے ہی آیا دل — اُف رے چلتے ہوئے زمانے کے

دم ان کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا — ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رُو کرتے
بُرا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا — قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

کوئی گریاں قریبِ تُربت ہے — زندگی، پھر تری ضرورت ہے

میری ماں

نواب خواجہ محمد خاں، جاگیر دار دھول پور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں۔

میرے نانا ہر چند، بہت معمولی سے پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن، یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انھیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم و تربیت میں بےحد غلو تھا۔ انھوں نے لکھنؤ سے ایک قابل استانی اور لائق استاد کو بلا کر اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا، اور، اسی کے ساتھ ساتھ، انھوں نے لکھنؤ کی مغلانیوں کو بھی ملازم رکھا تھا کہ وہ انھیں آداب سکھائیں۔

اس لکھنوی اثر کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے ماموں تو بالکل شیعہ ہوگئے اور میری ماں ہر چند اصحابِ ثلاثہ کو مانتی رہیں لیکن حضرت علی کو سب پر برملا ترجیح دینے اور محرم میں عزاداری کرنے لگیں۔

میری نانی کا سایہ، میری ماں کے سر سے، لڑکپن ہی میں اُٹھ چکا تھا، لیکن اُن کی سوتیلی ماں حاتم زمانی بیگم نے انھیں سگی ماں کی طرح اس لاڈ سے پالا کہ میری ماں کو یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ اُن کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، جب میری ماں کی شادی کا وقت آیا تو چونکہ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دادا براتیوں کا ایک لشکر ساتھ لے کر آرہے ہیں، اس لئے وہ دھول پور سے آگرہ چلی آئیں کہ نانا کے آگرے والے محل میں بیک وقت پانچ چھ سو مہمان ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔

میرے نانا کے تعلقات راجپوتانہ کے تمام والیانِ ریاست سے برادرانہ تھے

اسی لئے میری ماں کی شادی میں چھ سات والیانِ ریاست نے شرکت کی تھی۔

اور چونکہ میری سوتیلی نانی حاتم زمانی بیگم واقعی حاتمِ ثانی تھیں؛ اس لئے انھوں نے اس قدر جہیز دیا تھا، کہ وہ مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد لایا گیا تھا اور آگرے میں اس شادی کے ڈنکے پٹ گئے تھے۔

حاتم زمانی بیگم نے دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی، اُس کے چاندی سونے کے زیوروں کے ساتھ جہیز میں شامل کر دیا تھا۔

آگرے سے کامل دو مہینے کی مہمان داری کے بعد، جب برات ملیح آباد آئی، تو میری دادی فرماتی تھیں کہ تمام محل میں چراغاں کیا گیا، اور ایک عشرے تک دعوتوں اور مُجروں کا سلسلہ جاری رہا۔

دادا میاں چونکہ غیر معمولی طور پر بے حد کثیر العیال تھے، اور چونکہ اُن کے بہت سے بیٹے فوت ہو چکے تھے، اس لئے ان کا یہ معمول تھا کہ ہر وہ، ہر ہفتے، شام کے وقت اپنے مرے بیٹوں کو نام لے لے کر پکارتے کہ اے امیر احمدؔ اور اے رشید احمدؔ واپس آجا، واپس آجا، اور اس قدر زور سے روتے تھے کہ محل کے تمام سقف و بام ہلنے لگتے تھے۔[1]

دادا میاں کی آواز چراغ جلے جب محل میں گونجنے لگتی تھی ڈر کے مارے میری ماں کا بُرا حال ہو جاتا تھا۔ وہ کانپنے لگتی تھیں اور میکے سے آئی ہوئی "مغلانیاں" ان سے کہتی تھیں صاحب زادی، یہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے آپ کو شیروں کے کٹہرے میں بند کر دیا ہے۔

میرے باپ کو میری ماں کی اس دہشت زدگی کا علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی محمد اسحٰق خاں کے محل میں اُٹھ گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر بھی میری ماں کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔

میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اصیلوں

---

[1] یہ ماجرا میری ماں نے مجھ سے بیان فرمایا تھا

کو اس قدر زور سے ڈانٹتے ڈپٹتے تھے کہ اُن کی آواز کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چبوترے پر بکھر جاتے تھے۔ — خُسر کے محل میں ہائے ہائے کی پکار اور دیور کے محل میں شیر کی ڈہکار۔ میری ماں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہوگئیں۔

اُس کے بعد میرے باپ کا محل کیسے بنا، اس کی روداد، خود میری ماں کی زبان سے سن لیجئے۔

انھوں نے، ایک روز مجھ سے کہا۔ بیٹا جب میں تمھارے چچا کے گھر میں رہتی تھی ایک دن ایک ایسی ہلچل برپا ہوگئی کہ میں سمجھی آج میرا دم نکل جائے گا۔ اور وہ ہلچل کیسے ہوئی، یہ بھی سن لے۔

ایک دن تمھاری چچی، ساٹھن کا، بے حد چست گُٹّنا پہنے جب چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو اس قدر گھٹنے پر زور پڑا کہ وہ اُن کے گھٹنے کے نیچے کوئی ایک بالشت بھر ادھڑ گیا۔ اتنے میں بدقسمتی سے تمھارے چچا ناوقت زنانے میں آنکلے، انھوں نے اپنی بیوی کا اُدھڑا گُٹّنا دیکھا تو، بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جاکر، ایک بڑی لانبی سی چھری لے کر آگئے، تمھاری چچی کو چبوترے پر گرادیا، اُن بیچاری کے سینے پر چڑھ بیٹھے، اور کہا اے بے غیرت، بھرے گھر میں ننگی پھر رہی ہے۔ یہ کہتے ہی اُنھوں نے چھُری اُٹھائی کہ اُن کا گلا کاٹ ڈالیں۔ وہ تو اللہ نے یہ بڑی خیر کی کہ یہ ماجرا تمھاری دادی نے دیکھ لیا، اُنھوں نے آکر تمھارے چچا کی پیٹھ پر، زور سے، چھڑی مار کر کہا اسحٰق میرے سر کی قسم، میری بہو کے سینے سے اُتر آ، بڑا غیرت دار بنا ہے۔

جب ماں نے قسم دی تو تمھارے چچا تمھاری چچی کے سینے سے اُتر آئے، اور، چھری پھینک کر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیٹا یہ تماشہ دیکھ کر میں ادھ موئی ہوکر رہ گئی۔ اور جب تمھارے باپ گھر میں آئے میں نے سارا ماجرا بیان کرکے اُن سے کہا، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خود اپنا مکان بنوا لیجئے، نہیں تو میں ہول کھا کھا کے ایک دن مرجاؤں گی

اس کے بعد میرے باپ کا مکان تعمیر ہوگیا، اور میری ماں نے اپنے مکان میں آکر اطمینان کی سانس لی۔

میری ماں کو اِس ناز و نعم سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں، پکانا ریندھنا۔ یا سینا پرونا تو بڑی بات ہے، اُن کو پوری سو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی، اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں۔
اُن کی خاص مغلانیاں ممّو بیگم اور عبّاسی خانم اُن سے مہینے میں دو دو، اور کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کرلیتی تھیں، اور ان کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ اور جب کبھی وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی کو تمھاری تنخواہ دے چکی ہوں، تو وہ کہتی تھیں ''ہے ہے بیگم صاحب، بھلا ایسا اندھیر ہوسکتا ہے کہ ہم تنخواہ پا چکنے کے بعد بھی پھر آپ سے تنخواہ مانگیں حضرت عبّاس کی قسم آپ کو دھوکا ہورہا ہے''، تو میری ماں اُلٹی شرمندہ ہوکر رہ جایا کرتی تھیں ــ اِن امور پر نگاہ کرکے۔ میرے باپ نے گھر کا انتظام کبھی اُن کے سپرد نہیں کیا۔ اور میری دادی[1] جان گھر چلاتی رہیں۔

---

[1] میری دادی، آگرے کے اس ممتاز اور متموّل گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جس کے محل کے چاروں طرف ایک بہت بڑا پائین باغ تھا اور اسی بنا پر اہلِ آگرہ اس بانغ کو ''باغ والے'' کہا کرتے تھے۔ دادی جان کے باپ کا نام غالباً میرزا اشار حسین بیگ تھا جن کے داد ا ترکستان سے آکر آگرے میں آباد ہوگئے تھے۔ میرزا اشار حسین بیگ صاحب آگرے کے کوتوال تھے، اور آگرے کی مشہور ''کوتوالی گلی'' آج تک اُن کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے دادی جان کے حقیقی خالہ زاد بھائی میرزا خادم حسین صاحب، رئیس اکبرآبادی کو لڑکپن میں دیکھا تھا، وہ کڑھا انگرکھا پہنتے تھے، اور شانوں پر شالی رومال پڑا رہتا تھا، حضرت رئیس بڑے وضع دار اور بڑی آن بان کے بزرگ اور آدھے شعرائے آگرہ کے مانے ہوئے استاد تھے۔ آخر عمر میں ان کی جاگیرداری پر زوال آگیا تھا مگر رکھ رکھاؤ میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی تھی۔ ایک بار کسی نے ان کے سامنے میرزا غالبؔ کا ذکر کیا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ غالبؔ کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، اس لئے کہ وہ میرے قرابت داروں میں سے تھے۔ دادی جان کو ہزاروں کہاوتیں اور فارسی و اُردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ جنھیں وہ برمحل صرف کیا کرتی تھیں۔ اور جب ہم سب بھائی بہن دسترخوان پر بیٹھتے تھے وہ ہمارے ساتھ آکر بیٹھ جاتیں اور کھانے کے آداب بتایا کرتی تھیں۔ اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا تھا تو وہ منھ پر تھپیڑ مار دیا کرتی تھیں ــ وہ بیحد راسخ العقیدہ شیعہ تھیں اور جب وہ چپکے چپکے، مجھ کو شیعیت کا درس دیا کرتی تھیں تو میری پھپھی، جو میرے چچا کی طرح کٹّر سنّی تھیں، اُن سے، ہنس کر کہا کرتی تھیں، امّاں پوتے کو شیعہ بنائیے تو بنائیے، مگر وہ، بگڑ کر کہتی تھیں چل پرے مردار خارجن، آخر گھر میں کوئی تو ایسا ہو جس کا فاتحہ درود، مرنے کے بعد، مجھ تک پہنچ سکے
اُن میں اس قدر زبردست انتظامی قوت تھی کہ وہ ایک سلطنت کا کام چلا سکتی تھیں۔

میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور میر انیس سے بڑی محبت تھی، اور ان کے مرثیے پڑھ پڑھ اور سُن سُن کر رویا کرتی تھیں۔

ہم سات بھائی بہن تھے، یعنی افسر جہاں[1] بیگم، شفیع احمد خاں، شبیر احمد خاں (بعد کو شبیر حسن خاں جوشؔ) انیس جہاں بیگم، رئیس احمد خان، حشمت جہاں اور شوکت جہاں ــــ لیکن ہم سات بھائی بہنوں میں، میری ماں مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھیں، اوروں کی خدمت گزاری بوا گلزار کے سپرد تھی، لیکن میرے ناشتے کا دودھ، شہد اور جلیبیاں ملا کرُدہ اپنے ہاتھ سے طیّار کر کے مجھ کو آواز دیا کرتی تھیں، ننّھے آ تیرا دودھ طیّار ہے۔

ابھی کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ صبح کو میری بیوی نے مجھ سے پکار کر کہا اے ہے کب تک اچھل کود (ورزش) کرتے رہوگے، تمھارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے ــ بیوی کی یہ آواز سُن کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں، دل پر بجلی گر پڑی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔ ــ

میری پیاری ماں، آپ سو چکی ہیں، اور میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔ زندگی کی رات کس قدر بھیانک ہے، یہ آپ سے کیوں کر بتاؤں ــــ امّاں آپ کا "ننّھا" اب بوڑھا ہو چکا ہے، اور اب اس کو "ابّا" اور "نانا" کے ناموں سے پکارا جا رہا ہے۔ کاش! میں آپ کے سامنے مر جاتا۔ اور یہ دن نہ دیکھتا۔

میری اچھّی ماں اب مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ اور اے اللہ اب مجھ کو اس دُنیا سے اُٹھا لے۔

سر گھوم رہا ہے، ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو، فریبِ عیش دیتے دیتے
اُف کارِ حیات، تھک گیا ہوں معبُود
دم ٹوٹ چکا ہے، سانس لیتے لیتے!

---

[1] صد حیف، افسر جہاں بیگم، شفیع احمد خان اور حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا ہے۔

میرے چچا

نام تھا نوّاب محمد اسحٰق خان "کسمنڈی" کے تعلّقہ دار اور بڑے رعب و داب کے بے حد اکھڑ پٹھان تھے. آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہوجائیں۔ مزاج میں اس قدر زبردست غصہ تھا کہ جب بگڑ جاتے تو بے تحاشہ گالیاں دینے اور بکنے لگتے تھے۔ اور یہ بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ بھائی بھتیجے بھانجے. بیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ میرے باپ کے حقیقی بڑے بھائی اور اُن سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ میرے باپ نے اُن کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ مزاج میں وہ میرے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ علم و ادب اور تہذیب سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے باپ تفضیلی، اور وہ بجد کٹر سنّی خلیفۂ اوّل کو تمام اصحاب پر ترجیح دیتے تھے۔

جب اُن کے علم میں یہ بات آئی کہ میں شیعہ ہوگیا ہوں، تو اُنھوں نے مجھے اس نیّت سے اپنے گھر بلایا کہ میری مرمت کردیں، مجھے دیکھتے ہی انھوں نے گرج کر کہا:

سب کے سرتاج بعدِ پیغمبر
یعنی بوبکر، افضل و برتر

پوچھا کیسا شعر ہے. میں نے کہا، بڑے باوا بہُت اچھا، میرا جواب سن کر،

وہ بھینچے ہوئے غصے کے ساتھ، مُنھ سے آوازیں نکالنے لگے۔ ہُوں، ہُوں، ہُوں، وہ معمولی آواز کی "ہوئیں" نہیں، بڑی گھڑگھڑاتی، اور طویل الصّوت "ہُوئیں" تھیں، جن کے یہ معنی تھے کہ اگر اس شعر کے خلاف کچھ کہوگے تو مزا چکھادوں گا۔ لیکن میں بے وقوف نہیں تھا کہ اُن کو موقع دے دیتا۔ اس لئے ٹال کر چلا آیا۔

میری دادی جان، میرے باپ کے ساتھ رہتی تھیں، اور وہ ہر جمعرات کو اُن سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز رئیس احمد انگنائی میں کھیل رہا تھا۔ کہ وُہ دادی کے سلام کی خاطر آگئے، رئیس احمد سے انھوں نے کہا آؤ میرے ساتھ، امّاں کو سلام کرنے کے بعد تم کو گھر لیجا کر خوب برفی کھلاؤں گا۔ وہ دادی کو سلام کرکے بیٹھ گئے، اور رئیس کو گھٹنے پر بٹھالیا۔

دادی جان نے باتوں باتوں میں کہا۔ بیٹا اسحٰق یہ بوکیسی آرہی ہے، انھوں نے کہا امّاں یہاں تو کسی قسم کی بو نہیں ہے، دادی نے اپنی لونڈی سے کہا سکُونت کیا تجھے بھی بو محسوس نہیں ہو رہی ہے، اور جب سکونت نے بھی یہی کہا کہ بی بی مجھ کو تو بُو نہیں آرہی ہے، تو دادی نے ناک پہ آنچل کا سرا رکھ کر کہا اُفوہ۔ بُو بکر

یہ سنتے ہی چچا جامے سے باہر ہوگئے۔ رئیس کو گھٹنے سے نیچے گرادیا، اور کہا امّاں آپ تبرّا بازی کر رہی ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے فرش پر دھم سے ڈنڈا مار کر کہا "امّاں" دمِ چار یار، دمِ چار یار[1]" یہ سنتے ہی دادی نے کڑک کر کہا "بیٹا دمِ پنجتن دم پنجتن، اور وہ دمِ چار یار دمِ پنجتن کے نعرے اس قدر بلند ہوگئے کہ مردانے تک آواز پہنچی، میرے باپ گھبرائے اندر آئے کہ یہ "دم چار یار" اور" دم پنجتن" کیا ہو رہا ہے۔

میرے باپ کے آتے ہی بڑے باوا غصے میں کانپتے کھڑے ہوگئے اور کہا بشیر تم دیکھ رہے ہو کہ اماں تبرّے بازی کر رہی ہیں۔ کیا کروں ماں ہو پڑیں، کوئی اور کہتا تو خون چوس لیتا۔ ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مُرغی گزُرنے لگی،

---

[1] یعنی میں چار یار کا دم بھرتا اور ان کی برتری کا نعرہ لگاتا ہوں

اُنھوں نے مُرغی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیں۔ اور فوراً میرے گھر سے کانپتے ہُوئے رخصت ہوگئے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد، فرنگی حکومت نے ایک سخت مزاج کمشنر کو، جس کا نام شاید ہیولاک تھا، اس امر پہ مامور کیا تھا کہ وہ روہیلکھنڈ اور ملیح آباد کے پٹھانوں کو ڈرائے اور اُن کے دلوں پر انگریزی حکومت کے رعب کا سکہ بٹھائے ــــ دورہ کرتا جب وہ ملیح آباد آیا، تو میرے دادا کی مخالف پارٹی نے اس سے کہا کہ نوّاب محمد اسحٰق خان کے سپاہیوں میں بہت سے بدمعاش اور ڈاکو شامل ہیں۔ اور جب چچا اُس سے اپنے سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ ملنے گئے، تو کمشنر نے ان سے کہا "دِل کھان صاحب، آپ کا سپاہی لوگ بدماس (بدمعاش) اور ڈاکو ہے۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے، بڑے زور سے ڈپٹ کر، کہا ابے تو بدمعاش ہے، تو ڈاکو ہے، میں ابھی تیری اور تیری میمنی (میم) کی ..... پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اور کھانچی[1] بھر ہنگا دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھپٹے وہ گھبرا کر خیمے سے نکل گیا، اور گھوڑی پر بیٹھ کر لکھنؤ بھاگ گیا ــــ اور لکھنؤ جاتے ہی اس نے ملیح آباد کے تھانے کے انچارج کو تار دیا کہ چچا کے تمام اسلحہ ضبط کرلئے جائیں ــــ تھانے دار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ سیدھا دادا میاں کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دادا میاں محل کے اندر جا چکے تھے۔ اس نے اُن کے مُنھ چڑھے خدمت گار رحم علی کی ٹھڈّی میں ہات ڈال کر کہا مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آگئی ہے، میں اس وقت بڑے خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، خدا کے واسطے میری خبر کردو ــــ رحم علی کو ترس آگیا۔ اس نے فوراً ماما کے ذریعے خبر کردی، دادا میاں نے پردہ کرا کے، اس کو اندر بلا لیا۔

تھانے دار اُن کے قدموں پہ گر پڑا، اور کہا خاں صاحب بہادر میری جان بچا لیجئے۔ چھوٹے خان صاحب (میرے چچا) کے اسلحہ ضبط کرلینے کا مجھے کمشنر نے تار دیا ہے، حضور مدد کردیں گے تو میری جان اور نوکری بچ جائے گی۔

---

[1] بہت بڑا خربزے کا ٹوکرا (یہ ان کا تکیہ کلام تھا، وہ جب کسی کو ہگاتے تو کھانچی بھر ہگاتے تھے۔

دادا میاں نے چچا کو بلا کر کہا اسحٰق میرے سر پہ ہات رکھو، چچا نے اُن کے سر پہ ہات رکھ دیا تو انھوں نے کہا ان تھانے دار کو کمشنر نے تار دیا ہے کہ تھارے اسلحہ ضبط کر لئے جائیں، اِس میں اُن کی کوئی خطا نہیں، میرے سر کی قسم انھیں کوئی گزند نہ پہنچانا۔

اُنھوں نے تھانے دار سے کہا آیئے میری طرف اور لے جائیے ہتھیار — اُس کے بعد بیٹھکے میں ایک بڑی سی میز پہ تمام اسلحہ چن دیئے گئے،

سب سے پہلے انھوں نے بندوق اُٹھائی، اس کو فرش پہ رکھا، اور اس پہ پانچ جوتے مارے۔ اور تھانے دار کی طرف یہ کہہ کر بندوق پھینک دی کہ لیجئے اس کو اپنی ماں کی۔۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے۔ اور اسی طرح، ایک ایک کر کے، تمام اسلحہ پہ پانچ پانچ جوتے مار کر، اور " اسے بھی اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے" کہ کہ کر اُنھوں نے تمام ہتھیار واپس کر دیئے۔ اور گالیاں کھایا ہوا تھانے دار سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اُن کو جب غُصّہ آتا تھا، تو، بقدرِ شدّتِ غضب، وُہ دیر تک اس قابل نہیں رہتے تھے کہ بات کر سکیں، اُس عالم میں وُہ اپنے دونوں ہات کی انگلیوں کو باہم پیوست کر کے، اپنے دونوں انگوٹھوں کو اُٹھا لیتے اور ایک دائرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد گردش دینے لگتے تھے۔ اور جب تک اُن پہ یہ کیفیت طاری رہتی تھی، کوئی اُن کے پاس آنے یا اُن سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی کو گالیاں دینے کے بعد اپنے انگوٹھوں کو گھما رہے اور تمام حاضرین اُن کے کمرے سے نکل کر، برآمدے میں لرزاں و ترساں کھڑے ہُوئے تھے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب اُن سے ملنے کے واسطے آ گئے، ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ فرطِ غضب کی بنا پر خاں صاحب کے انگوٹھے گھوم رہے ہیں۔ اس وقت اُن کے پاس نہ جایئے۔

چناں چہ ڈپٹی صاحب اُن کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ داخل ہوتے ہی انھوں

نے کہا، " آداب عرض خاں صاحب" چچا جان نے، اُن کی طرف، گھور کر دیکھا، بول سکنے کی طاقت نہیں تھی، سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور" ہوں" کرکے اور تیزی سے انگوٹھے گھمانے لگے۔۔ ڈپٹی نے، بڑے غور سے اُن کو دیکھا، اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ انھوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور یہ کیا تماشہ ہے کہ اُن کے انگوٹھے برابر گھوم رہے ہیں ـــ اور دو ایک منٹ کی حیرانی کے بعد، جب اس نے پھر کہا" خاں صاحب مزاج کیسا ہے؟" ـــــــ تو اُنھوں نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کرکے کہا، " لے۔۔۔۔۔" مزاج پرسی کا یہ انوکھا جواب سن کر وہ دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا، اور بنتناتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک بار ہمارے گھر میں مشاعرہ ہونے والا تھا، لکھنؤ کے مشاہیر میرے باپ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ ماں کو سلام کرنے کے لئے، چچا جان، کھڑکی سے نکل کر ہمارے صحن میں آگئے، اور، میرے باپ کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر، اُن کے کمرے میں چلے آئے، میرے باپ کھڑے ہوگئے۔ ٹوپی پہن لی، حقّہ سامنے سے ہٹا دیا گیا اُنھوں نے پوچھا بشیر، یہ کون لوگ ہیں بتاؤ، میرے باپ نے کہا میاں بھائی یہ لکھنؤ کے شعراء ہیں، آپ ہیں مولانا صفیؔ، آپ ہیں حضرتِ عزیزؔ، آپ ہیں حضرت محشرؔ، آپ ہیں حضرتِ آرزوؔ، آپ ہیں حضرتِ آبرؔ، آپ ہیں محمد صاحب بہارؔ اور آپ ہیں حکیم منےؔ آغا صاحب فاضلؔ۔

چچا جان نے کہا مولانا صفی، سنتا ہُوں آپ شاعر لوگ یہ باندھتے ہیں کہ معشوق کے کمر ہی نہیں ہوتی، کیا یہ سچ ہے۔ مولانا صفؔی نے کہا جی ہاں خاں صاحب شاعری میں معشوقوں کی کمر کو معدوم وموہوم کہا جاتا ہے، اس پر چچا نے کہا اب ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر معشوقوں کے کمر ہوتی ہی نہیں تو پھر شب وصل میں وہ کیا چیز ہوتی ہے۔ جس کو، دونوں ہاتوں سے پکڑ کر، آپ لوگ خچ خچ خچ خچ کرتے رہتے ہیں۔؟ اُن کے اس سوال سے تمام شعراء دنگ ہوکر رہ گئے، اور میرے باپ کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

ایک بار اُن کے خلفِ اکبر وصی احمد خان، ایک ابتدائی قسم کا گراموفون لے کر آئے، اور کہا باوا اس باجے سے آدمیوں کی آوازیں آتیں اور گانا سنائی دیتا ہے، میں آپ کو سنانے آیا ہوں، اُنھوں نے کہا یہ عجیب چیز لائے ہو، سناؤ۔

اُنھوں نے باجا بجایا تو اُس سے بڑی مدّھم گانے کی آوازیں آنے لگیں، اور جب وہ تیسری چوڑی چڑھانے لگے تو بڑے باوا نے فرمایا ہٹاؤ اس سالے باجے کو، اس سے تو "چری پھٹی" "چری پٹی" "چری پٹی" کی آوازیں آرہی ہیں۔ آئندہ مجھ کو یہ مخش باجا نہ سنانا، ورنہ ڈنڈا . . . . گھسیڑ دوں گا۔

اور جب، وصی احمد بھائی، کھسیانے ہوکر، باجہ اٹھانے لگے، تو بڑے باوا نے ڈنڈا مار کر، اس کو توڑ ڈالا۔

ایک مرتبہ وصی احمد بھائی، سوٹ پہن کر، اپنی فرنگی معشوقہ سے ملنے کے لئے لکھنؤ جا رہے تھے، ابھی وہ احاطے کو طے ہی کر رہے تھے کہ، معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ بڑے باوا، خلافِ وقت ومعمول مردانے میں نکل آئے، اور اُن کی پشت دیکھ کر، سپاہیوں سے پوچھا یہ کون فرنگی جا رہا ہے، سپاہیوں کو یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے فرزندِ اکبر وصی احمد خان ہیں، لیکن بڑے باوا نے، جب ڈانٹ کر پوچھا تو انھوں نے، ڈرتے ڈرتے بتادیا کہ حضور یہ وصی احمد خان ہیں بڑے باوا نے ڈانٹ کر آواز دی پلپلی صاحب ادھر آئیے۔ وصی احمد بھائی اچھل پڑے رنگ زرد ہوگیا، سر جھکائے ہوئے آئے، بڑے باوا نے فرمایا کہ آپ پٹھان ہوکر ایسے بے غیرتی کے ننگے کپڑے پہنتے ہیں، جب آپ پھاٹک کی طرف منھ کئے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے سُرین ط، ظ، ط، ظ کرتے اُوپر نیچے آجا رہے ہیں، تھوک ہے آپ کی پھٹنولی پر، جائیے، ——— میں آپ کو عاق کرتا ہوں، ہر چند آپ فرزندِ اکبر ہیں، مگر میں آپ کو نہیں، آپ کے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بناؤں گا— جائیے، اور اب بڑے مزے سے اپنے سرینوں کو طوئے ظوئے، طوئے ظوئے، طوئے ظوئے کرتے پھریئے۔

میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن، چھوٹے بھائی، نوّاب محمد نسیم خان بہادر، تعلقہ دار سہلامؤ کے فرزند محمد مقیم خان کی بیٹی، اور سائمہ بیگم کی نواسی ہیں۔

سائمہ بیگم کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

سائمہ بیگم، میرے اور میری بیوی کے پرداد نوّاب فقیر محمدؔ خان بہادر کی نہایت شعلہ مزاج، اور چہیتی بیٹی تھی، اور باپ نے، اس خیال سے کہ بڑے محل میں اُن کی شعلہ مزاجی کی بنا پر کوئی ہنگامہ نہ ہو، اُنھیں "منجھلا محل" دے دیا تھا، کہ وہاں وہ بلا شرکتِ غیرے آرام سے رہیں۔

سائمہ بیگم کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ اُن کے کپڑے دھوبی کے وہاں نہیں جاتے تھے، دھوبن اُن کو گھر ہی میں دھوتی اور استری کر دیا کرتی تھی،

اُن کا کھانا تو منجھلے محل ہی میں پکتا، لیکن اُن کا ناشتہ، ایک روپیوں اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ، بطورِ جیب خرچ، باپ کے گھر سے آیا کرتا تھا، جس کو وہ چاندی اور سونے کی آمیزش کی بنا پر "کھچڑی" کہا کرتی تھیں۔

چوں کہ ان کے دو تین بچے "سَنَوَر" ہی میں جا چکے تھے، اس لئے اپنی مغلانیوں ماماؤں اصیلوں، اور لونڈیوں باندیوں کے متعلق انھیں یہ بدگمانی پیدا ہوگئی تھی

کہ ہو نہ ہو، اُن میں کوئی "ٹُنہیا"[1] ضرور ہے۔

اور جب تیسرے یا چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تو اُنھوں نے محل کے تمام دروں میں پردے جھڑوا دیئے اور، زچہ خانے کے دروازے پر، عورتوں کا پردہ بٹھا دیا کہ مخصوص ماماؤں کے سوا، اور کوئی اندر نہ آ سکے۔

اسی اثنا میں، ایک متجسّس مزاج کم سن لونڈی نے، اُن کے بچے کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر، کوٹھے پر، دبے پاؤں چڑھ کر جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا، سائمہ بیگم کی نگاہ اس پر پڑ گئی، اُنھوں نے، جھٹ سے، بچے کے مُنھ پر پلو ڈال کر، فوراً یہ حکم دیا کہ اس کلموئی ٹُنہیا کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ اور اس بے چاری لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں، قدِ آدم گڑھا کھود کر، دفن کر دیا گیا۔

اس انتہائی ظالمانہ حادثہ کے بعد، ایک روز اُن کے شوہر نے جو اودھ کی فوج کے عہدہ دار تھے، جب لکھنؤ جانے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے کہا آج نہیں، پرسوں جانا۔ شوہر نے کہا ایک ایسا سرکاری کام ہے کہ مجھے آج ہی جانا ہے، اُنھوں نے کہا، میں آج تو ہرگز جانے نہیں دوں گی، شوہر نے کہا بیگم مجھے تو آج ہی جانا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ محل سے نکل گئے۔ سائمہ بیگم نے کسی لونڈی کو حکم دیا کہ سِل اُٹھا لائیے، وہ سِل اُٹھا لائی، اور سِل اُنھوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے مار لی کہ، پَل بھر میں رُوح پرواز کر گئی:

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، اُن کے شوہر نے وُہ آہ و بکا کی آواز سنی، گھوڑے سے کود پڑے اور جب محل میں قدم رکھتے ہی انھیں بیوی کی خودکشی کا حال معلوم ہوا، تو پستول نکال کر، سینے پر مار لیا۔ اور بیوی کی چارپائی کے پاس ہی گر کر دم توڑ دیا۔

---

[1] وہ عورت جو ٹونے ٹوٹکے سے بچوں کو ہلاک کر کے اُن کا کلیجہ نظروں ہی نظروں میں چبا ڈالتی ہے۔

یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر — وہ، بہمہ وجوہ، سائمہ بیگم ہیں اس لئے جب اُن کو غصہ آجاتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اُتر آتی ہیں۔

میں اب تک زندہ ہوں، میری سخت جانی کا یہ معجزہ ہے — وہ کبھی سیدھے مُنھ بات نہیں کرتیں، میری بیٹی سعیدہ، میرا بیٹا سجّاد، اور ان دونوں کے بچّے، اُن سے ڈرتے ہیں، اور چوں کہ وُہ بچّوں کو ہر آن ڈانٹتی، ڈپٹتی، گھرکتی اور، بات بات پر بدتمیز کہتی رہتی ہیں، اِس لئے وہ اُن کے پاس آنے جانے سے گریز کرتے ہیں۔

جب مکانوں کے سقف و بام سے آوازیں اگلوا لینے والا کوئی آلہ ایجاد ہو جائے گا تو میرا سارا مکان "بدتمیز" "بدتمیز" کی آوازوں سے گونجنے اور کانپنے لگے گا۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرّۂ ارض کا کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی ماہرِ نفسیات، یا ماہرِ نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو، اس امر کا کبھی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ وُہ کب، اور کس بات پر، ہنسیں اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

کون اُن کے مزاج کو پرکھ یا پکڑ سکتا ہے — میں، ہزاروں بار تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک روز میرے جس لطیفے پر وُہ خوب جی بھر کے ہنسی تھیں، جب میں نے اُن کو وہی لطیفہ دوبارہ سنایا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائیے، یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔ — میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو۔

ہرچند میں نے اپنے مُعاملاتِ عشق امکانی حد تک اُن سے مخفی رکھے تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے، میرے دو ایک، اور خصوصیّت کے ساتھ، میرے آخری عشق کے معاملات اُڑتے اُڑتے اُن تک پہنچ گئے تھے، اور اُنھوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر کے، جو جو ستم مجھ پر ڈھائے تھے اُن کی شرح اب بیکار ہے کہ:-

سفینہ اپنا، کنارے جب آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخُدا کہیے

لیکن اب بھی جب کہ میں کم بخت بوڑھا ہو چکا ہوں، وُہ، کم سے کم، مہینے میں چار پانچ بار، عین اس وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد میں طلوع ہونا شروع کرتا ہوں، وُہ مجھے، بڑی شدّت کے ساتھ میری عاشقی پر، طعن و تشنیع کا ہدف بنایا کرتی ہیں ۔میں دانت نکال نکال کر کہتا ہوں، ارے اشرفِ جہاں میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے اور جینے بیٹھا ہوں، اس وقت تو گڑے مردے نہ اکھیڑو، اس وقت، میری غلطی سے ہوگیا سو ہو گیا، ارے اب تو اس پر خاک ڈالو، بھول جاؤ، معاف کر دو، لیکن میری گڑگڑاہٹوں کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور مجھے لگاتار برا بھلا کہتی رہتی ہیں۔ وہ سلسلہ اِس قدر طویل اور روح فرسا ہوتا ہے کہ میں تلملا اٹھتا ہوں، کبھی کبھی جلدی جلدی چار پیگ زہر مار کرکے، اور اوندھے سیدھے دو چار لقمے کھا کر، اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی، خواب گاہ کی طرف بھاگتا، اور اور بستر پر جاکر لیٹ جاتا ہوں، مگر وہاں بھی وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں، اور خواب گاہ میں داخل ہو کر وہی سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔

اثنائے ملامت میں، جب وہ پان دان کھول کر، پان بنانے لگتی ہیں، تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب تبرّے بازی ختم ہو جائے گی، اور میں کم بخت سو سکوں گا۔ لیکن، وہ وقفہ، خاموشی قبل از طوفان بن جاتا ہے، اور گلوری منھ میں رکھ کر، وہ اپنی ملامت کی بندوق میں نئے کارتوس بھر کر، مجھ پر دوبارہ گولیاں برسانے لگتی ہیں۔

اس طرح وہ بار بار پان بناتیں اور، دو ایک منٹ خاموش رہ کر پھر تبرّا شروع کر دیتی ہیں۔ میں بار بار کروٹیں بدلتا ہوں، اور وہ ہر بار، ٹھہر ٹھہر کر طعن و تشنیع کے بالکل نئے نئے گوشے نکال کر "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔

شاید کسی نے یہ شعر میرے ہی واسطے کہا تھا:

اگر سرِ مزار وہ کیا کیا نہ کہہ گئے،
ہم نے نہ کچھ جواب دیا، چپ پڑے رہے

اور بالآخر، : مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں" کے زیرِ اثر میں، تڑپ تڑپ کر سو جاتا، نہایت بھیانک خواب دیکھنے لگتا۔ اور صبح کو اس زخمی چوہے کی طرح بیدار ہوتا جس سے جی بھر کر بلی کھیل چکی ہو۔

اب اُن کے مزاج کی چند خصوصیات اور بھی سن لیجئے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وسوسے، ہر قیاس، ہر ظن، اور ہر واہمے کو ایک حقیقتِ کبریٰ اور وحیٔ والہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

مثلاً جب کسی نواسے یا پوتے کو وہ کوٹھے سے پکارتی ہیں، اور وہ بچہ آواز پر آواز نہیں دیتا تو یہ جانچے بغیر کہ وہ اس وقت مکان میں ہے کہ نہیں، یا کسی ایسے دور کے گوشے میں ہے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی اُن کو اس بات کا یقین، اور یقینِ کامل ہو جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے نے اپنے بچوں کو ہدایت کردی ہوگی کہ وہ میری آواز پر آواز نہ دیں، اور یہ سوچ کر وہ بیٹی اور بیٹے پر برس پڑتی ہیں، اور وہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یعنی ان کے دل میں جب کسی امر کے متعلق "ایسا ہوا ہوگا" کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ہمیشہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ "یقیناً ایسا ہو چکا ہے" اور اس کے سوائے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو میں، بالعموم، پچھلے پہر بیدار ہوتا ہوں، لیکن مہینے میں کبھی ایک آدھ بار، کسی نامعلوم سبب کے باعث، جب میں دیر سے جاگتا ہوں تو اس غم میں سر پکڑ کر، بستر پر بیٹھ جاتا ہوں کہ آج میں جلوہ ہائے طلوعِ صبح سے محروم ہو کر رہ گیا۔ اور وہ جب مجھے اس عالم میں دیکھتی ہیں تو اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی معشوقہ کو خواب میں دیکھا ہوگا، اور چوں کہ "دیکھا ہوگا"

کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں " دیکھ چکا ہوں" وہ مجھ سے بگڑ کر کہتی ہیں، اب بھی تم خوابوں میں اس کلموئی کو دیکھا کرتے ہو، اللہ تم کو غارت کرے کیا اب بھی مجھے چین سے رہنے نہیں دوگے۔؟

اُن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں، اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے۔ اگر اس وقت کوئی بلند آواز سے بول دیتا ہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔

چھوٹے دادا کو بلند آواز سے بولنے کا مرض تھا، اور میری بیوی سب سے زیادہ اُن کو جھڑکیاں دیا کرتی تھیں۔ اور، وہ میرے پاس مُنھ پُھلائے آتے اور کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں تمھاری بیوی نے تو ناطقہ بند کر رکھّا ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انھوں نے جو چیز کسی جگہ رکھ دی ہے۔ اب وہ چیز قیامت تک اُسی جگہ رکھّی جائے گی، اور اگر کوئی اس چیز کو کسی دوسری جگہ رکھ دے گا تو قیامت آجائے گی، وہ صبح کو خواب گاہ سے نکل کر، برآمدے کے تخت کے جس گوشے پر، سب سے پہلی مرتبہ آکر بیٹھی تھیں، روز اس گوشے پر آکر بیٹھتی ہیں۔ ہر چند گرمیوں کے موسم میں اُدھر دھوپ آجاتی ہے، مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتیں اور جب میں کہتا ہوں دھوپ سے ہٹ کر، سائے میں بیٹھ جاؤ تو وُہ بگڑ کر کہتی ہیں، یہ میری وضع کے خلاف ہے، میں تمھاری طرح تو ہوں نہیں کہ روز ٹھور ٹھکانے بدلتی رہوں، اگر میں اس قدر مستقل مزاج نہ ہوتی تو تمھارے سے ہر جائی کو آج تک نباہ ہی نہ سکتی تھی،

اُن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتیں کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں، اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی عورت سے اُن کا خلا ملا نہیں بڑھ سکا، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ترتیبی کو برداشت نہیں کرسکتیں،

چادروں کی شکنوں اور کرسیوں وغیرہ کے زاویے درست کرتی رہتی ہیں
پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وُہ ناشتہ کے بعد، کم سے کم، آدھ گھنٹے کے واسطے ہمیشہ لیٹ جاتیں اور مُنھ سے نہیں بولتی ہیں

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوتے ہی کراہتیں اور کہتی ہیں کہ آج طبیعت بہت خراب ہے، ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وُہ، لڑکپن ہی سے اِختلاجِ قلب میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ میں نے لاکھوں علاج کر دیکھے مگر وہ بیچاری تن درستی سے آج تک محروم ہیں۔

اور اُن کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز، ایک ایک پائی کا حساب لکھاتیں اور جب تک حساب نہ لکھ جائے ماہیٔ بےآب کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔

جہاں تک کہ تدبیرِ منزل کا تعلّق ہے، اُن کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔

میں ایک لکھ لُٹ انسان ہوں، اگر میری شادی اُن سے نہ ہوئی ہوتی تو میں فاقے کرکے مرجاتا۔

میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، وہ اس سے چوگنی طاقت کا بریک ہیں، اگر اس قدر قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن، ہمالیہ سے ٹکراکر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

میں جب حیدرآباد دکن میں تھا، وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے، تین مہینے کے لئے، ملیح آباد چلی گئی تھیں، اُن تین مہینوں کا حال سن لیجیے۔

جب پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی تو ساری تنخواہ، مہمان نوازیوں اور اللّوں تللّوں کی وجہ سے دسویں پندرھویں دن ہی ختم ہوجاتی تھی، اور ہر پندرھویں کو رام لال بقال سے قرض لے کر، گھر کا کام چلایا کرتا تھا۔ اور جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو، تنخواہ لے کر گھر آتا، رام لال کو اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا یا سوتا پاتا اور، رام لال اپنا روپیہ، مع سود کاٹ کر، باقی رقم میرے حوالے کر دیا

کر دیا کرتا تھا۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سی دکانوں میں کھاتے بھی کھول لئے تھے۔ اور اس طرح چیزیں گھر لایا کرتا تھا گویا وہ سب آندھی کے آموں کی طرح مفت مل رہی ہیں، اور مہینے کی پہلی یا دوسری کو جب اُن دکانوں کے بل آتے تھے، تو سر پکڑ کر رہ جاتا، رام لال سے مزید قرض لے کر بل ادا کیا کرتا تھا۔

بیوی جب ملیح آباد سے آئیں تو گھر کا یہ رنگ دیکھ کر، انھوں نے منھ پیٹ لیا۔ اور تھوڑے ہی دن کے اندر انھوں نے پھر گھر کو درست کر کے رام لال بقال سے نجات دلا دی، اور میرے سارے کھاتے بند کرا دیئے۔

اُن کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے جاتے وقت اُن سے دس پانچ روپے مانگتا ہوں، تو تین چار پیشیوں کے بعد دس مانگتا ہوں تو صرف پانچ دیتی ہیں، اور جب گھر پلٹتا ہوں تو پائی پائی کا حساب لکھا لیتی ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے خلاف معمول دیر تک جاگنا پڑتا ہے، اور میرے دماغ پر اس کا کم از کم، دو تین دن تک بار رہتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مشاعروں میں زاغ و زغن کو، اس یقین کے ساتھ کلام سنانا پڑتا ہے کہ مفہومِ شعر تو الگ رہا، سامعین الفاظ کا تک سمجھ نہیں سکیں گے، اور اسی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا کلام سننا بھی پڑتا ہے۔

لیکن چوں کہ میں اس قربانی کے بعد مشاعرے سے ایک ہزار روپیہ گھر لاتا ہوں، وہ مجھے مشاعروں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا کرتی ہیں، اور مجھے قربان گاہ پر نہ چڑھائیں تو کیا کریں، اس لئے کہ میری معاش بےحد محدود ہے۔
لگے ہاتھوں مشاعروں کے متعلق میری دو رباعیاں بھی سن لیجیے۔

ہوتی ہے مشاعروں میں بُوگھوڑے کی
حاجی بخشُ اللہ کی، میاں نوُرے کی
افسوس کہ اس عطرِ سخن کو اپنے
بھرتا ہوں میں شیشیوں میں تاروڑے کی

یہ بندہ، ہرحشر، بجُرمِ تشنگیک
دوزخ کا سزاوار ہے؟ تیرے نزدیک
معبُود، خطا ایک، سزا ہو سو بار
فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

ابھی پانچ چھ برس کی بات ہے، جب میں عامل کالونی میں رہتا تھا، اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھارا مزاج ایسا ہے کہ نوکری زیادہ دن تک نبھ نہیں سکے گی۔ اور نبھ بھی گئی تو جب پنشن پر علیحدہ ہو جاؤگے تو یہ مکان چھن جائے گا اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنا ایک ذاتی مکان بنوالوں، یہ سن کر میں نے کہا تھا کہ اب تو میرا مقبرہ بننے کا زمانہ ہے، تم مکان کی فکر کر رہی ہو

لیکن صاحب، میری بیوی کی ہمّت پر صد آفریں کہ انھوں نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا دومنزلہ مکان بنوا کر دم لیا، ورنہ ایوب خان سابق صدرِ پاکستان اور اُن کے نفس لوّامہ الطاف گوہر صاحب کے عتاب کے بعد میں، اپنے پورے قبیلے کے ساتھ، آج کسی جھونپڑی میں پڑا ہوتا۔ سچ ہے سگھڑ بیوی بڑی دولت ہوتی ہے۔ اُن کا ایک کارنامہ اور بھی سن لیجیے۔

ایک روز، انھوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انھوں نے پوچھا۔ تم کب سے شعر کہہ رہے ہو، میں نے کہا لڑکپن سے، انھوں نے کہا وہ پرچے اور کاپیاں کیا کیں، جن پر تم نے شعر کہے تھے، میں نے کہا سب کی سب تلف ہو گئیں، میری یہ بات سن کر، اُنھوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمھاری ایک ایک کاپی اور تمھارا ایک ایک پرچہ اس بکس میں محفوظ کر لیا ہے، اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہات فروخت کر دو اور میں نے وُہ

کاپیاں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کردیں (میں اس باب میں مختار حسن صاحب اور پیر حُسام الدین صاحب راشدی کا شکرگزار ہوں کہ اگر وہ توجّہ نہ کرتے تو یہ سودا کبھی نہ ہوسکتا)

کہاں تک اپنی بیوی کی خوش انتظامی بیان کروں۔ آموں کے چار باغ انھوں نے نصب کرائے اور ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ٹھیل ٹھیل کر، مجھے مجبور کیا، میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" کے مُرتب اور شائع کرانے پر۔ اُس کے بعد انھوں نے میرے سر پر مسلط ہو ہوکر میری مندرجۂ ذیل کتابیں مجھ سے مرتّب کرائیں اور چھپوائیں۔ اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرضِ وجود میں آہی نہیں سکتی تھیں۔

روحِ ادب۔ جذباتِ فطرت۔ خیالاتِ زرّیں۔ اوراقِ سحر۔ آوازۂ حق شاعر کی راتیں۔ شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایت۔ جنون و حکمت۔ آیات و نغمات سیف و سبو۔ فکر و نشاط۔ سرود و خروش۔ حسین اور انقلاب۔ اشارات۔ سنبل و سلاسل۔ رامش و رنگ۔ عرش و فرش۔ سموم و صبا۔ قطرہ و قلزم طلوعِ فکر۔ نجوم و جواہر۔ اور الہام و افکار[1]

اور میری یہ زیرِ نظر کتاب "یادوں کی برات"[2] بھی، اُنھیں کی مرہونِ منّت ہے۔ اگر وُہ میرے سر پہ سوار نہ ہوجاتیں تو میں اسے بھی مرتّب نہ کرسکتا۔

اپنے ان متذکرۂ بالا کارناموں کی بنا پر جب وُہ، حسبِ سُنّت جاریّہ، مجھ سے

---

[1] میری مندرجہ ذیل کتابیں ہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں: "مدّ و جزر" "آگ" "وحدتِ انسانی" "موت، محمد و آلِ محمد کی نگاہ میں" "موجد و مفکر" "عظمتِ انسانی" اور "حرفِ آخر" اس طویل ڈرامائی نظم کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔ اُس کے بعد مجھ کو زندگی کے مکروہات سے نجات نہیں ملی، اس لئے ابھی تک ناتمام ہے۔ اگر فرصت ہاتھ آئی تو اس نظم کو مکمل کرکے، کسی بینک میں، یا بیوی کے پاس رکھوا دوں گا کہ اسے میرے مرجانے کے بعد شائع کیا جائے، اور یہ اس لئے کروں گا کہ اگر یہ اوہام شکن و روایات شکن نظم میری زندگی میں شائع ہوگئی تو مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کردیا جائے گا۔

[2] بیوی سے چھپا کر میں نے اس کتاب میں اپنے معاشقوں کا حال قلم بند کیا ہے۔ اب دیکھئے اس کی طباعت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

کسی بات پر، بگڑ جاتی ہیں، تو کہتی ہیں کہ یہ میری جوتیوں ہی کا طفیل ہے کہ تم اس وقت جوشؔ صاحب بنے بیٹھے ہو۔ اگر میں تم پر زور نہ ڈالتی تو تمھاری کوئی ایک کتاب بھی نہ چھپتی، اور دُنیا کو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو۔

اور کبھی یہ بھی کہتی ہیں کہ جب مجھ سے تمھاری شادی ہوئی تھی، اس وقت تک، تم، چھوٹے دادا کی زبان میں، "لَفا جُھنّا" تھے، اگر میں، جی لگا کر، تمھاری تاک نہ کرتی تو تم کو یہ ڈِیل ڈول کبھی حاصل ہی نہ ہوتا، اور ہمیشہ دُبلے پتلے نقات ہی بنے رہتے

ہر چند، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں وہ نہایت مغلوب الغضب اور تنک مزاج ہیں، لیکن میری ذات کے ساتھ اب بھی اُن کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اُسے لفظِ عشق سے منسوب کروں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں اُن کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں۔

جوانی میں جب میں، باہر سے، رات کے وقت، گھر آتا تھا، تو، اس اَمر کا پتہ چلانے کی نیت سے کہ میں کسی عورت سے ہم آغوش ہو کر تو نہیں آ رہا ہوں وہ مجھے روشنی میں لے جا کر، غور سے میرا چہرہ دیکھتیں، لال ٹین اوپر اٹھا کر میری شیروانی پر نگاہ کرتیں کہ کہیں کسی زلف کا بال تو اس میں چمٹا ہوا نہیں ہے، اُسی کے ساتھ ساتھ وہ میرے کپڑے، لانبی لانبی سانسیں لے کر سونگھا کرتی تھیں کہ میرے جسم سے کسی عورت کے بدن یا بالوں کی خوشبو تو نہیں آ رہی ہے۔

اور :۔ عشق است و ہزار بد گمانی " کے تحت یہاں تک ہوتا تھا کہ وُہ جاڑوں میں پچھلے پہر، میرے لحاف میں ہات ڈال کر، یہ پتہ چلانے کے لئے کہ میں اُن کے سو جانے کے بعد کسی عورت کے پاس چلا تو نہیں گیا تھا، وہ میرے تلوے ٹٹول کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں یا گرم۔

اور آج بھی جب کہ میں ایک خبیث بوڑھے کی صورت اختیار کر چکا ہوں، جب کبھی کوئی اخباری جوان عورت میرا انٹرویو لینے، یا کوئی نوعمر شاعرہ مجھ سے

ملنے آتی ہے، وہ میرے چہرے کے نشیب و فراز اور میری آنکھوں کے رنگ پر، اپنی متجسس نظروں کے آلات لگا کر، یہ جانچتی رہتی ہیں کہ میں اس کو محبت کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا ہوں ــ اور جب تک وہ عورت بیٹھی رہتی ہے، اُن کے چہرے پر، بدگمانی کا پیدا کردہ کرب مچلتا رہتا ہے۔

مری خاک بھی لحد میں، نہ رہی امیرؔ باقی
انھیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

وہ مجھ کو آج تک چوتھی کا دولہا سمجھتی۔ اور پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔

ہر چند میری پاگل اور اندھی جوانی کے مسلسل معاشقوں نے، میری اختلاج کی ماری دھان پان بیوی کے دل پر، ایسے ایسے گھن چلائے تھے، کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلائے جاتے تو اُن کے پرخچے اڑ جاتے۔ لیکن اللہ ری میری بیوی کی استقامتِ محبت کہ انھوں نے ان روح فرسا حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایسا مقابلہ کہ العظمۃ للہ۔

جھانسی کی رانی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا، میدانِ جنگ میں شہید ہوگئی مگر دشمن کے سامنے سپر نہیں ڈالی، میری بیوی نے ڈٹ کر میرے محبوبوں کا مقابلہ کیا، نہ سپر ہی ڈالی نہ شہید ہی ہوئیں اور آخر کار مجھ کو سب سے چھین کر، میدان جیت لیا۔

بہر کارے کہ ہمّت بستہ گردد
اگر خارے بود گل دستہ گردد

میں نے ۱۹۵۰ء میں اُم الشعراء، یعنی اپنی بیوی پر، ایک نظم کہی تھی، جو ہنوز نا تمام ہے، آپ بھی سن لیں۔

رفیقۂ حیات سے خطاب

دیکھ کر تجھ کو ، مرے دل سے ٹپکتا ہے لہو
اے مرے باپ کی ، غم دیدہ و ناشاد بہو
تیرا ، ہر لمحہ ، بجز حسرت و وسواس نہ تھا
میری قصّاب جوانی کو یہ احساس نہ تھا
مجھ کو، ہر رات ، وہ آوارہ لیے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی کہ خرمن پہ ترے گرتی تھی
جب مجھے ، چھاؤں میں زلفوں کی وہ سُلواتی تھی
چاندنی، دھوپ ترے واسطے بن جاتی تھی
آگ تھی جس میں ، برستا نہ وہ پانی تجھ پر
کاش بھولے سے بھی آتی نہ جوانی تجھ پر
ہائے ، اک شب بھی نہ ہوتی تھی سُہانی تیری
کروٹیں ، آنچ پہ لیتی تھی ، جوانی تیری
جب بھی اُٹھتی تھیں ، مری سمت ، نگاہیں تیری
ان نگاہوں سے برستی تھیں کراہیں تیری
تیری عفّت کے شبستاں میں ہے اک حشر بپا
میرے معصوم گناہوں کو یہ معلوم نہ تھا
تجھ پہ بالقصد نہیں تھیں وہ جفائیں میری
جبرِ سرکارِ مشیّت تھیں ، خطائیں میری

اس قدر قرب پہ بھی، تجھ سے بہت دُور تھا میں
الاماں، طبع کی اُفتاد سے مجبور تھا میں
اب کہ، بالوں کی سفیدی نے جگایا ہے مجھے
جذبۂ کرب ترے سامنے لایا ہے مجھے
شرم سے جو نہیں اٹھتی وہ نظر لایا ہوں
اپنی بھٹکی ہوئی شاموں کی سحر لایا ہوں
اپنی آنکھوں کے، ترے در پہ گہر رکھتا ہوں
بخش دے مجھ کو، ترے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں

میری بیٹی

نام ہے سعیدہ خاتون۔ میں پیار سے مردانہ نام بنا کر کلّو کہتا ہوں۔
غالباً ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ وہ ملیح آباد میں، اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی تھی۔
حیدرآباد دکن میں تعلیم پائی، تعلیم جاری تھی کہ مجھے نظام نے خارج البلد کردیا، اور اس کے بعد برابر ایسے موانع پیدا ہوتے رہے کہ اس کی تعلیم کا تکملہ نہیں ہوسکا۔
وہ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا کہ میں نے دہلی میں اس کی شادی کردی تھی۔
اپنی چچازاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے۔ التفات احمد علی گڑھ کا گریجویٹ، خوش فکر شاعر، اور صاحبِ فکر انسان تھا۔ لیکن اس میں جینے اور اُبھرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کثرتِ آرام سے بیمار ہوکر وہ بے چارہ بہت قبل از وقت، اس دنیا سے سدھار گیا۔
سعیدہ بے حد ذہین اور نکتہ سنج ہے، اور سخن فہم بھی، طبیعت موزوں ہے مگر شعر نہیں کہتی۔ وہ ماشاءاللہ نو بچوں کی ماں ہے۔ نانی بھی بن چکی، لیکن مجھ کو اب تک گڑیاں کھیلتی بچی نظر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے نام بھی لکھ دوں، ان خطابات کے ساتھ جو اُن کو میری سرکار کی جانب سے عطا ہوئے ہیں۔
انور سعید خاں، عرف "میاں"، "مویاں" اور "مسٹر بھقاقا" ـــ حیدر مسعود خاں، عرف "بُغا" ـــ پرویز شہاب خاں، عرف "پَری"، "مسٹر پرپر"، "مسٹر باٹا" اور "وحشت کا چونغا" صبوحی خاتون، عرف "بوئی چوئی" ـــ غزالہ خاتون، عرف "غزلیا" ـــ خسرو شہاب خاں، عرف بلّو، "مسٹر نارزن" اور "جاموسِ اشرف جہاں" ـــ علی معظم خاں عرف "مسٹر مینڈک" اللہ

"مسکین شاہ" ۔ فرّخ جمال، عرف "بدّھا"، "قلن"، "قلندر"، اور "قلنوا" سراج انور خاں، عرف "مسٹر کٹّی" اور "مسٹر کالا گڈّون" ماشاءاللہ۔ اتنے بہت سے بچوں کا پالنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس نے اپنے خونِ جگر سے ان پودوں کو سینچا اور پروان چڑھایا ہے۔ میری بیوی شکایت کرتی ہیں کہ اب سعیدہ کو ہمارا خیال نہیں رہا ہے۔" میں کہتا ہوں اس بے چاری کو فرصت ہی کب ملتی ہے۔ اپنے بچوں، اور اپنی نواسیوں نواسوں کی خدمت سے کہ وہ کسی اور طرف توجہ کر سکے۔

اس دن رات کی مسلسل کاوش نے اس کی صحت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ اور جب میں اپنی بیٹی کا منہ اُترا ہوا دیکھتا ہوں تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں

میرا بیٹا

نام ہے سجّاد حیدر خاں، میں اس کو پیار سے "ببھوا" کہتا ہوں۔ سعیدہ کی ولادت کے غالباً دو سال کے بعد وہ لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا۔

وہ بیمار پیدا ہوا، اور آج تک تندرست نہیں ہے۔ وہ اپنڈکس سے لے کر ٹائی فائیڈ ڈبل نمونیا اور طاعون کے سے مہلک مرض تک میں گرفتار رہ چکا ہے

اس نے سات آٹھ برس کی عمر ہی سے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا، اور جب کسی قدر سیانا ہوا تو شوفر کی مدد سے اس نے تھوڑا بہت موٹر کی مرمت کا علم بھی حاصل کر لیا۔ جو آج، آڑے وقت اس کے کام آ رہا ہے۔ (جس کی تفصیل آگے آئے گی)۔

میرے پونے کے اثنائے قیام میں اس نے محمد فقیہہ صاحب بیرسٹر اور نائب وزیر جوناگڑھ کی بیٹی انور خانم سے، اپنی ماں کے علی الرّغم شادی کر لی تھی جس پر بیوی اب تک ناخوش ہیں۔

وہ ماشاءاللہ پانچ بچوں کا باپ ہے۔ ان کے نام بھی، مع عرفیت سُن لیجئے ــــ ساجد حیدر خاں، عرف "مسٹر ٹائر"ــــ ناز خاتون، عرف "امّی"ــــ ترنّم خاتون، عرف "چمنی"، تاج دار بیگم"ــــ تبسّم خاتون، عرف "چھنّی"ــــ اور فوّاد حیدر، عرف "مسٹر بندر"۔

سجّاد بھی، اپنی بہن کی طرح، بلا کا ذہین ہے، شعر بھی کہتا ہے، بعض اشعار آب دار بھی ہوتے ہیں اور وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ــــ افسوس کہ بیماریوں کے تواتر سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

وہ آج سے کچھ اوپر دو برس پہلے میری سیمنٹ ایجنسی کو چلاتا خود اپنے پر خرچ کرتا اور مجھے کما کر دیا کرتا تھا، لیکن ۱۹۶۷ء میں جب کہ میں ہندوستان گیا اور وہاں کسی انگریزی اخبار میں میرا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا، اس وقت ترقی اُردو بورڈ کے سکریٹری شان الحق حقی، وزارتِ اطلاعات کے سکریٹری الطاف گوہر، اور میرے نئے حواری عیش ٹونکی نے اس انٹرویو کے معنی کچھ اس قدر مسخ کر کے پیش کئے کہ اس وقت کے مطلق العنان صدر فیلڈ مارشل صاحب، یعنی ایوب خاں نے، برہم ہو کر میری نوکری بھی ختم کردی، میرا پاس پورٹ بھی چھین لیا اور قومی عجائب گھر کو بھی میرے مسودات کی خریداری سے روک دیا میری بیوہ لڑکی کے آئیل ٹینکر کے بارے میں بھی اشارہ فرمادیا کہ اس میں مال نہ بھرا جائے اور میری ایجنسی بھی بند کردی۔

میری اس بے سروسامانی سے متاثر ہو کر سجاد نے ایک چھوٹی موٹی ورک شاپ کھول لی جس سے وہ نشتم پشتم زندگی بسر کر رہا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ زندگی کو بھوگ رہا ہے۔ ہائے میرے بچے۔

سجاد نے لکھنؤ کی بھاٹ کھنڈے یونی ورسٹی سے سند حاصل کی تھی، وہ پاکستان ریڈیو پر ستار بجانے کے واسطے بلایا جاتا تھا، ایوب خاں صاحب بہادر نے اس کا وہ دروازہ بھی بند کروادیا۔

میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنالیا تھا، میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے۔ ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور وائے یہ زوال۔

میرے
چند قابلِ ذکر احباب

افسوس، دلا - کہ غم گساراں رفتند
شیریں بدنان و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل - آمدند — بر باد، سوار
در خاک - چو قطرہائے باراں رفتند

یاں چمپئی دھوپ ہے ، گلابی سایا
رہتا ہے ، سحابِ ابدیت چھایا
جوشؔ آؤ ، کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
آیا ــــ یارانِ رفتہ ــــ آیا ، آیا

ابرار حسن خاں اثرؔ ملیح آبادی

خوب صورت، خوش دماغ، حاضر جواب، جادو بیان، داستان سرا، عاشق مزاج، لطیفہ گو، شوخ و طرار، ملیح آباد کی نژادِ نو میں، سب سے زیادہ ذہین۔ مُرغ و ماہی پکانے میں اُستاد۔ میرے لنگوٹیا یار، میرے بہنوئی، میری سَراپا شفقت پھپی زاد بہن کے، منجھلے بیٹے (جو میری صحت کی ناز بردار، اور میری بیماری میں، مُستقل تیمار دار تھیں)۔ چڑھتی عمر تک سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوفناک دُشنام طراز۔ اور، میرے اُس کوچے کے راہ برادِلیں تھے، جس کو، بد توفیقوں کی اصطلاح میں، کوئے بد اعمالی، کہا جاتا ہے چوں کہ وُہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، اس لئے میرے باپ نے اُن کی پرورش و تعلیم کا بار اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ اُن کے اور میرے مکان کے مابین کھڑکی تھی۔ وُہ، سونے کے اوقات کے علاوہ ہمارے ہی مکان میں رہا کرتے ہمارے ہی ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے رہتے تھے لڑکپن کا ذکر ہے، ایک روز ہم لوگ، دوپہر کے وقت، ڈیوڑھی میں بیٹھے غالباً تاش کھیل رہے تھے کہ ابرار آ گئے، اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی کھیل میں شریک کرو۔ میرے بڑے بھائی نے (جو سال، دو سال مجھ سے بڑے تھے) اُن سے کہا تم کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتے ہو، ہم تم کو نہیں کھلائیں گے۔ انھوں نے کہا اگر ہم کو نہیں کھلاؤ گے تو ہم "قُوان مجیدؔ[1]" کی قسم، تم کو بشیر ماموںؔ[2] سے ابھی پٹوا دیں گے۔ میرے بڑے بھائی

---

[1] نہ جانے ان کی زبان میں کیا خرابی تھی کہ وہ "قرآن مجید" کو "قُوانِ مجید" کہا کرتے تھے [2] چوں کہ میرے باپ

نے کہا جا بے مردود، تو کیا پٹوا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی[1] میرے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے بشیر ماموں، شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) کہ رہے ہیں کہ ہم سے مسلمانی لڑاؤ۔ یہ سنتے ہی میرے باپ آگ بگولا ہوگئے، اور ڈیوڑھی میں آکر، میرے بڑے بھائی کو خوب مارا، وہ چیختے رہے کہ ابرار جھوٹا ہے۔ لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ اور ابرار کا چہرہ[2] بحال ہوگیا۔ وہ، رئیس احمد[3] کی انا سے اس گمان پر جلتے تھے کہ وہ اُن کو باسی کھانا دیتی ہیں، اور انا اُن سے اس بنا پر کُڑھتی تھیں کہ وہ ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ ایک روز شام کے وقت مکان کی ڈیوڑھی میں، اتفاقیہ طور پر یا بالارادہ، وہ انا سے ٹکرا گئے۔ اور، چھوٹتے ہی کہا "اوندھی ہو جاؤ"، یہ سنتے ہی، انا نے آسمان سر پر اٹھا لیا، اور ڈیوڑھی کے پھاٹک سے، چیخ چیخ کر کہا، ہے ہے میاں آگ لگے اس چودھویں صدی کو، ارے، غضب خدا کا، یہ کل کا چھوکرا ابرار مجھ سے کہہ رہا ہے "اوندھی ہو جاؤ"، میرے باپ کو تاؤ آگیا، سپاہی کو حکم دیا کہ آٹھ دس چھڑیاں نیم سے، کاٹ لاؤ، پھاٹک بند کر دو کہ ابرار بھاگ نہ پائے۔ اور جب چھڑیاں آگئیں ابرار کو پکڑ بلوایا۔ اور میرے باپ نے، چھڑی اٹھا کر کہا کیوں بے مردود، گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بدتمیزی کرتا ہے۔ ادھر آ، آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ انھوں نے، تھر تھر کانپتے ہوئے، کہا بشیر ماموں، قرآن مجید کی قسم، قرآن مجید کی قسم، قرآن مجید کی قسم، میرے باپ نے کہا قسمیں ہی کھاتا رہے گا، یا کچھ کہے گا بھی۔ وہ دوڑ کر میرے باپ کے قدموں پر گر پڑے۔ اور، ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر، کہا بشیر ماموں قرآن مجید کی قسم، میں نے تو "اوندھی ہو جاؤ" نہیں، "اندھی ہو جاؤ"، کہا تھا۔ ابرار کی اس ذہانت پر میرے باپ کو ہنسی آگئی، اور، چھڑی پھینک کر، فرمایا گرُدگھنٹال، آج تو چھوڑے

کو ان کی ماں "بشیر ماموں"، کہتی تھیں اس لئے ان کی زبان پر یہی لفظ چڑھ گیا تھا۔ [1] یہ اور بات ہے کہ جب میرے باپ کو، دوسرے دن، یہ پتا چل گیا کہ ابرار نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ان کی بھی پٹائی کر دی گئی تھی۔ [2] میرا چھوٹا بھائی [3] چوں کہ وہ ہم لوگوں کو نئی نئی شرارتیں سکھایا کرتے تھے، اس لئے میرے باپ نے ان کو "گرُدگھنٹال"، کا خطاب دے دیا تھا۔

دیتا ہوں، لیکن اب اگر اس قسم کی کوئی بات زبان پر لائے گا تو تیری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔

ہماری ماماؤں میں سے تھیں، ایک کوزہ پُشت محبوبن بُوا، وہ بھی ان کی شرارتوں کے باعث، ان سے جلتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے، امام باڑے سے ملے ہوئے کمرے میں ان کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور میرے باپ سے جا کر کہا۔ میاں" اَبریل" (ابرار) چُرَٹ پی رہا ہے۔ اور جب" ابریل" خوب تھپیڑائے گئے، تو بُوا محبوبن کے چہرے کی جُھریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ابرار نے، اُسی رات کو، جب وہ سو رہی تھیں تو ان کی فاختہ اڑادی، اور اس چالاکی سے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حرکت ان کی تھی۔ جس زمانے میں رئیس احمد، اور ابرار میرے ساتھ لکھنؤ کی لاٹوش روڈ کی گلی کے مکان میں، بسلسلۂ تعلیم رہتے تھے ابرار کا معمول تھا کہ روز مُنھ اندھیرے وہ سگریٹ پی کر، دو غزلیں :۔ "کُھلی ہے کُنجِ قفس میں، مری زبانِ صیاد" اور :۔ "محبّت میں تری، ہم ہے، ہر آں اہلِ وطن بگڑا"، بالالتزام گایا کرتے تھے، اور سگریٹ کے واسطے جب فق سے دیا سلائی جلاتے تھے، تو دھندلکے کا اندھیرا کانپ اُٹھتا تھا، اور اس کا شعلہ میری آنکھوں میں اس طرح چُبھ جاتا تھا کہ میں آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا۔ اُس مکان کا ذکر ہے، میرے باپ، ملیح آباد سے آکر، اس مکان کی نچلی منزل میں اور میرے بڑے بھائی، ہمارے اوپر کے کمرے سے ملے ہوئے، دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہفتے کی رات تھی، میں اور ابرار اپنے پڑوسی طالب علم شریف[1] کے ساتھ باتیں کر کرکے، قہقہے مار رہے تھے۔ ابرار نے مجھ سے کہا ہم ہنس بول رہے ہیں، شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) پر یہ بات شاق گزر رہی ہوگی۔ وہ عجب نہیں کہ بشیر ماموں سے جا کر شکایت کر دیں۔ وہ تو ہمیشہ ہماری تاک میں رہا کرتے ہیں۔ ابرار کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب، دروازہ کھول کر نیچے اُترنے لگے، اُنھوں نے کہا دیکھیے وہ ہو میں نے ابھی کہا تھا وُہی ہوا۔ شفیع احمد خاں ہماری شکایت کرنے کے لئے نیچے جا رہے ہیں

[1] وہ "بھدوئی" کا رہنے والا، اور میرا محبوب دوست تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہے

میں تو شریف کو لے کر، اس چور دروازے سے اسی وقت بھاگا جا رہا ہوں اگر بشیر ماموں اوپر آکر آپ کو بُرا بھلا کہیں تو آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے وہاں آ جائیے گا، اور صبح کی گاڑی سے ہم لوگ نواب صاحب رام پور کے پاس چلے جائیں گے ۔ ابرار یہ کہہ کر اُتر گئے ۔ میں تنہا رہ گیا، اتنے میں میرے باپ آئے، فرمانے لگے ۔ تم لوگوں نے شفیع احمد کی نیند حرام کر دی، شُہدے کہیں کے، اور وہ مردود گرد گھنٹال کہاں ہے، میں نے کہا وہ شریف کے گھر چلے گئے ہیں۔

باپ کی یہ بے جا ڈانٹ پھٹکار، مجھ کو زہر لگی، ان کے نیچے اُتر جانے کے بعد میں، ابرار کے پاس چلا گیا ۔ ابرار نے کہا اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہا ہے قرآن مجید کی قسم شفیع احمد خاں ایک روز ہم کو مروا ڈالیں گے، چلیئے انیس خالہ (میری چھوٹی بہن) کے گھر میں رات گزار دیں اور پہلی ٹرین سے رام پور چلے جائیں ۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے ۔ ابھی ہم شریف کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ دیکھا ہمارے باپ کے سپاہی، ریاست علی خاں، لالٹین لئے چلے آ رہے ہیں ۔ ابرار نے کہا کہ یہ مُخبری بھی شفیع احمد خاں نے کر دی ہوگی کہ آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے ہاں چلے آئے ہیں، دیکھیئے ریاست علی خاں جب قریب آئیں تو قرآن مجید قسم، ان کو ماں کی گالی دیجئے گا ۔ میں نے کہا ابرار کیسی باتیں کرتے ہو، ریاست علی خاں کھرے پٹھان ہیں، اور بوڑھے آدمی بھی ہیں ۔ میں ان کی سفید داڑھی کی حرمت کرتا ہوں ان کو ہرگز گالی نہیں دوں گا ۔ اتنے میں ریاست علی خاں قریب آگئے، اور کہا خاں صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ فوراً گھر آ جائیں، نہیں تو مجھ سے بُرا اور کوئی نہیں ہوگا ۔ ابرار نے، دو قدم آگے بڑھ کر، کہا ۔ ریاست علی خاں سُو بات کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم، تمھاری تو ماں . . . . . ،،
بے چارے ریاست علی خاں، اس قدر فحش گالی سُن کر اس طرح اُچھل گئے، گویا کسی نے ان کو گولی مار دی ہے ۔ انھوں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ، نگاہیں جھکا لیں، اور ڈھل ڈھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (دامن کے بہتے آنسو آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں)
انیس کے وہاں، ہم دونوں، بہت تڑکے بیدار ہو کر، سفر کی طیاری کر ہی رہے تھے

کہ مکان کے نیچے گاڑی ٹھہرنے کی آواز آئی، انھوں نے جھانک کر دیکھا تو اُن کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ ارے بشیر ماموں آگئے، انیس خالہ نے ہماری مخبری کر دی۔ آپ کو ایسا چاہیئے نہ تھا اور زینے پر جب قدموں کی آواز گونجنے لگی، تو انھوں نے، آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے چارپائی کے نیچے جاکر، دُبک گئے۔ میاں نے آکر، بڑی خُشونت کے ساتھ، مجھ کو دیکھا، میں کانپنے لگا۔ فرمایا گرو گھنٹال کہاں ہے۔ انیس نے چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا، میاں نے، گرج کر، فرمایا نکل چارپائی کے نیچے سے مردود۔ ابرار چارپائی کے نیچے سے یوں نکلے، جیسے آوازِ صور، سن کر بے چارے مُردے، اپنی بے حساب دردمند زندگی کا حساب دینے کے واسطے، اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

میاں نے، ایک حرف بھی نہیں کہا، ہم دونوں کو کوٹھے سے اترنے کا اشارہ فرمایا۔ آگے آگے میاں، اور پیچھے پیچھے ہم مفرورین کوٹھے سے اُترے تو میاں نے گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور ہم دونوں ان کے سامنے اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئے، گویا، شیر کے سامنے دو بکرے بندھے ہوئے ہیں۔ راستے بھر میاں نے کوئی بات نہیں کی، گھر آتے ہی فرمایا۔ چلو اوپر۔ جب ہم اوپر آگئے تو میاں نے ابرار کے مُنھ پر، ایسے زنّاٹے کے ساتھ، تھپڑ مارا کہ ابرار لُونڈ پُونڈ ہو گئے لیکن چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہی اندر، بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ایک ایک جست میں تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے۔ مکان سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس ڈرامائی فرار کے بعد، میاں نے مجھ سے کہا سُنتا ہوں آپ کو سپہ گری کا بڑا دعویٰ ہے اُمیدی[1] دو لاٹھیاں لے آؤ۔ ایک اِن سورما صاحب کے ہات میں دے دو، ایک مجھے۔ آج میرے ان کے مابین دو دو ہات ہو جائیں، اور پتا چل جائے کہ بہادر کون ہے۔ اُمیدی نے ایک لاٹھی میاں کے ہات میں دے دی، اور دوسری لاٹھی میری طرف بڑھائی میری کیا مجال تھی کہ باپ سے نبرد آزمائی کے واسطے، لاٹھی ہات میں لیتا، میں نے ہات نہیں بڑھایا

---

[1] داروغہ اُمید علی خاں

اور اُمیدی نے میرے کاندھے سے لگا کر، لاٹھی کھڑی کر دی، میں پیچھے ہٹ گیا، لاٹھی گر گئی میاں نے ڈپٹ کر فرمایا اے بزدل لاٹھی ہات میں لے، اور میدان پکڑ۔ اور جب میں ٹس سے مس نہ ہُوا تو میاں نے ارشاد فرمایا کہ تو سراسر زنخا ہے۔ علمائے اخلاق نے سچ کہا ہے کہ بزدلی و بے حیائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تو سمجھا میں تجھے بے حیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ آج کل تیرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا ہے، اگر تو غیرت مند ہوتا تو اس موقع پر گھر چھوڑ کر نہ چلا جاتا کہ اگر میرے باپ مقدمے سے ہات اُٹھالیں گے، تو میری بیوی کسی اور کے پہلو میں چلی جائے گی۔ میں نے آب دیدہ ہو کر، کہا میاں میں آپ کو اس قدر غیرت مند اور شریف انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہو جائیں، مگر مقدمے سے کبھی دست بردار ہو ہی نہیں سکتے۔ میری یہ بات سن کر، میاں کی آنکھوں سے، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رئیس احمد کو ابتدا ہی سے شکار، ورزش، گھوڑے کی سواری اور اپنے جیب خرچ کو گنیوں میں تبدیل کر کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ ابرار نے اُن کے اس میلانِ صحت کو دیکھ کر، ایک دن اُن سے کہا رئیس احمد، میں آپ کو قرآن مجید کی قسم، ایک ایسی نایاب دوا دے سکتا ہوں کہ آپ، دو مہینے کے اندر اندر، ایک دیو پیکر پہلوان بن جائیں، رئیس کی باچھیں کھل گئیں، پوچھا اس دوا کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا "زبان پر لگانے کا طلا"۔ رئیس نے قیمت دریافت کی، ابرار نے کہا، ارے کچھ نہیں، فقط پانچ گنیاں۔ رئیس نے، چپکے سے گنیاں دے دیں، ابرار، ایک چھوٹی سی شیشی میں روغنِ بادام لے آئے، اور کہا دیکھیے، روز ایک کوری سینک اس میں ڈبو کر نہار مُنھ چاٹ لیا کیجیے گا، قرآن مجید کی قسم آپ بھونپو ہو جائیں گے بھونپو۔ ایک روز بڑے بھائی صاحب نے رئیس کو سینک چاٹتے دیکھ کر پوچھا یہ کیا دوا ہے رئیس نے، بڑی سادگی کے ساتھ کہا، میاں بھائی یہ زبان کا طلا ہے، ابرار پانچ گنیوں میں لائے ہیں۔ بڑے بھائی صاحب کو لفظ طلا کے معنی تو معلوم نہیں تھے، لیکن یہ سمجھ کر کہ ابرار ڈاکٹر ہیں نہ حکیم، ہو نہ ہو انھوں نے چھل بٹا کر کے رئیس سے اشرفیاں اینٹھ

لی ہیں، میاں سے جاکر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ میاں نے رئیس کو بلا کر پوچھا، اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس میں کوئی بُری بات ہے، کُل واقعہ بیان کر دیا۔ میاں نے شیشی دیکھی، اس میں روغن بادام پایا۔ اُسی وقت ابرار کو بلایا، اور، فرمایا کیوں مردود، تو نے "دبا با"[1] سے گنیاں اینٹھ لیں، مجھ کو اس کی پروا نہیں، مگر اس دوا کا نام اس قدر فحش بتایا۔" زبان کا طلا" آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا، یہ کہہ کر میاں ابرار کی طرف جھپٹے، ابرار نے، چیخ مار کر، کہا، قرآن مجید کی قسم میں نے" زبان کا طلا" نہیں" زبان کا تیل" کہا تھا، رئیس احمد خاں نے میری بات سمجھی ہی نہیں، میں نے کہا تھا "تیل" وہ سمجھے طلا۔ طلا کیا چیز ہوتا ہے، قرآن مجید کی قسم مجھ کو معلوم ہی نہیں۔ میاں سمجھ تو گئے کہ ابرار بات بنا رہا ہے۔ لیکن، اُن کی ذہانت و حاضر جوابی کی داد کے طور پر، اُنھیں معاف کر دیا۔

جس زمانے میں ہم[2] آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور ملیح آباد سے، تعطیل کی مدت گزار کر، آگرے جا رہے تھے، میاں نے رئیس، ابرار اور مجھے پان پان سو روپئے دیئے تھے کہ آگرے جاکر، جڑاؤل بنوا لینا۔ اُس وقت ابرار نے، یہ لکھ کر کہ میری جڑاؤل، پان سو روپئے میں نہیں بن سکے گی، مزید پان سو روپئے کا مطالبہ کیا تھا۔

میاں نے ہم دونوں بھائیوں اور ابرار کو طلب کر کے، مجھ سے اور رئیس سے پوچھا کہ تمھاری جڑاؤل پان پان سو روپئے میں بن جائے گی کہ نہیں، ہم نے جواباً عرض کیا کہ بن جائے گی۔ میاں نے ابرار سے کہا کہ ان دونوں کی جڑاؤل تو پان پان سو میں بن جائے گی، تمھاری جڑاؤل میں کیا سرخاب کے پَر لگے ہیں کہ وہ اس قدر رقم میں طیّار نہیں ہو سکے گی؟ تو ابرار نے، آنکھوں میں آنسو بھر کر، یہ جواب دیا تھا کہ بشیر ماموں آپ غصّے نہ ہو جائیں تو یہ کہوں کہ ان دونوں کی جڑاؤل بھی اس قدر کم روپئے میں نہیں بن سکے گی، یہ آپ کے بیٹے ہیں، روپیہ کم پڑے گا تو یہ آپ سے دوبارہ منگا لیں گے، میں آپ کا

---

[1] رئیس کا پیار کا نام [2] رئیس و ابرار

بیٹا نہیں ہوں ۔ مجھ یتیم کی ہمت نہیں پڑے گی ۔ یہ سن کر میاں نے ابرار، اور، ان کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو بھی ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرما دیئے تھے۔

ایک بار ان کے ایک کشمیری محبوب نے ان سے چار سو روپے طلب کئے وہ اس سے وعدہ کر کے تو چلے آئے لیکن بڑے خلفشار میں پڑ گئے کہ روپیہ دوں گا کہاں سے کئی روز تک پریشان رہنے کے بعد، انھوں نے مجھ سے کہا شبیر حسن خاں ، قرآن مجید کی قسم ایک ایسی تدبیر سمجھ میں آگئی ہے کہ کبھی پٹ نہیں پڑ سکتی ۔ آپ رئیس احمد خاں کو بلالیں ۔ رئیس آگئے تو انھوں نے کہا ۔ آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں آپ سب کو کس قدر چاہتے ہیں وہ آپ کے ناخن کا دُکھنا تک برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

رئیس نے کہا آخر کہنا کیا چاہتے ہو، انھوں نے کہا بشیر ماموں کو جو محبت آپ سے ہے ، اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں ۔ میں نے کہا پہیلیاں سی کیوں بجھا رہے ہو، صاف صاف بات کہو ، انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی بیہوشی سے بشیر ماموں کا دل دہل کر رہ جائے گا اور تھوڑی دیر بے ہوش رہ کر ہوش میں آجائیں ، اور ان سے چار سو روپے کی فرمائش کر دیں ۔ اگر رئیس احمد خاں آپ یہ ڈراما کھیل کر مجھے روپے دلا دیں گے ۔ تو قرآن مجید کی قسم ، میں زندگی بھر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا ۔ رئیس نے اُن سے امداد کا جب وعدہ کر لیا تو برابر تین دن تک ابرار نے اُن کو ریہرسل کرایا ، جسمانی حرکات بتائے اور لہجے کے طول وعرض کو بار بار سکھایا ، خود لیٹ لیٹ کر بتایا کہ کھانا کھانے میں آپ یوں لیٹ جائیے گا ، یوں نوالہ توڑیئے اور پھر یوں ، دھم سے گر پڑیئے گا ، اور ہوش میں آجانے کے بعد پھر یوں ٹھہر ٹھہر کر حرف مطلب زبان پر لائیے گا۔

جب تین دن تک کا مسلسل ریہرسل ختم ہو گیا تو ہمارا طائفہ ملیح آباد آیا ۔ اور شام ہوتے ہی رئیس احمد نے ، حسب تعلیم ابرار ، اپنی انّا سے کہا ، آج طبیعت کچھ خراب ہے ، کھانا ابھی سے کھلا دو ۔ کھانا ، امام باڑے کے برآمدے میں چن دیا گیا ، ابرار اور ہم ، دونوں صحن میں بیٹھ گئے یہ دیکھنے کو کہ رئیس کیسی ایکٹنگ

کرے گا۔

رئیس نے ابرار کے کہنے کے مطابق، گن کر، تین نوالے کھائے۔ چوتھا نوالہ اٹھا کر، کراہنے لگا۔ ابرار نے مجھ سے، چپکے سے کہا، کتنی اچھی ایکٹنگ ہو رہی ہے۔ رئیس نے کراہ کر، تین بار آہ آہ آہ کی آواز نکالی، نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، اور دھم سے لیٹ کر مد بے ہوش "ہو گیا۔

اس کے "بے ہوش" ہوتے ہی، گھر بھر میں کہرام برپا ہو گیا۔ انا دوڑی ہوئی باہر گئیں، اور دیوانہ وار، پکار کر کہا تے ہے میاں رئیس بے ہوش ہو گیا۔ میاں کے حواس اُڑ گئے، ننگے پاؤں دوڑتے آئے، اور رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعا کرنے لگے کہ اے اللہ میری جان کی قربانی قبول کر، اور اسے اچھا کر دے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آ گئے، میاں نے کہا خدا کے واسطے میرے بچے کو بچا لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے آلہ لگا کر، اور انگلیوں سے ٹھونک ٹھونک کر اس کے سینے کا مطالعہ کیا، نبض دیکھی، اور کہا خاں صاحب کوئی گھبرانے کی بات نہیں، گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے، میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میاں پھر رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعائیں مانگنے لگے، دادی جان نے، جب قرآن کی ہوا دی۔ رئیس نے ابرار کی سکھائی ہوئی، انتہائی نقاہت کے ساتھ، ذرا سی آنکھیں کھول دیں۔ میری ماں نے کہا۔ مبارک ہو رئیس کو ہوش آ گیا۔

میاں نے، انتہائی بے تابی کے ساتھ، جھک کر پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے؟ رئیس نے سن کر، بار بار پلکیں جھپکائیں، میاں کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ رئیس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر، تاگے کی سی مہین آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر، کہا باوا۔ چار۔ سو۔ روپے۔ میاں نے میری ماں سے کہا اے جلدی سے پان سو کی تھیلی لے آؤ، اور جب تھیلی اس کے سامنے رکھ دی گئی، اس نے۔ بڑی کانپتی آواز میں پوچھا، میاں، ہمارے سر کی قسم۔ یہ۔ روپے۔ دے کر۔ واپس۔ تو نہیں لے لیں گے؟ میاں نے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا۔ ارے تیرے

سر کی قسم واپس نہیں لوں گا۔ اس کے دوسرے ہی دن ہم لوگ لکھنؤ چلے گئے۔ اور شام ہوتے ہی ابرار اس کاشمیری لڑکے کو چار سو دے آئے اور باقی سو روپوں سے خوب تفریح کی۔

انھیں کہانیاں کہنے کا بھی نہایت شوق تھا، سُنی ہوئی کہانیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ ہزاروں من گھڑت کہانیاں، اور فرضی قصے بھی سنایا کرتے تھے اور اس جادو بیانی اور اس ڈرامائی انداز کے ساتھ کہ سننے والے چھ چھ سات سات گھنٹے تک مسلسل سُنتے رہتے، اور بھوک پیاس تک بھول جایا کرتے تھے۔

اور جب وُہ مسائل پر زبان کھولتے، تو حاضرین پر سناٹا سا چھا جاتا، اور بڑے بڑے صاحبان علم و اربابِ خطابت کا مُنھ کھُلا کا کھُلا رہ جاتا تھا۔

ابتدا میں، بادہ خواری کے وقت، وہُ بلبلِ ہزار داستان بن جاتے، ٹھُمریاں، دادرے، اپنا اور دوسروں کا کلام، اور لطیفے سناتے، اور بسا اوقات انگریزی ناچ بھی دکھایا کرتے تھے۔ لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اس قدر خوفناک ہو گئے تھے کہ شراب پینے کے وقت، جس کی طرف بھی ان کی نظر اُٹھ جاتی تھی، وہ اس کو گالیاں دینے لگتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کھوپڑی میں، ماں بہن، اور بیٹی وغیرہ کی گالیوں کے کارتوس، مختلف خانوں میں لگے ہوئے تھے اور شراب جس خانے میں پہنچ جاتی تھی، اس کا کارتوس دَن سے چل جایا کرتا تھا۔ میں نے اور مجھ سے زیادہ رئیس نے بے حد کوشش کی اور بار ہا سزائیں بھی دیں، کہ اُن کی اصلاح ہو جائے، مگر عمر کے انحطاط اور شراب کی کثرت نے ان کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا کہ وہ راہ راست پر نہیں آئے۔ آخرکار تنگ آکر، میں نے، اپنی رات کی محفلوں میں شریک ہونے سے اُن کو روک دیا، اور پہرے بٹھا دیئے کہ وہ باریاب نہ ہو سکیں۔

حُقّہ پانی بند ہو گیا تو وہ بڑے اداس ہو کر رہ گئے۔ اور اپنے گھر میں بیٹھ کر پینے لگے اور گھر والوں کو گالیاں دینے لگے۔ اور اس مقاطعے اور گھر والوں کے احتجاجِ مسلسل سے تنگ آکر، وہ نان پارے چلے گئے اور راجہ صاحب نان پارہ

کی نوکری کر لی۔

ایک روز میں اپنی لکھنؤ کی، بنارسی باغ کے سامنے والی کوٹھی سے منھ اندھیرے سیر کرنے کے واسطے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ تانگے پر اپنا سامان رکھے آگئے، میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہو نہ ہو وہ راجہ صاحب نان پارہ کو گالیاں دے کر آتے ہیں۔

اور جب تانگے سے اُترتے ہی اُنھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ شبیر حسن خاں یہ نان پارہ کا راجہ نہایت کمینہ ہے، تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی اس لئے کہ اُن کی یہ سنتِ جاریہ تھی کہ وہ رات کو جسے گالیاں دیتے تھے، اگر وہ صبح کو شکایت کرتا تھا تو وہ اُسے کمینہ آدمی کہا کرتے تھے۔

میں نے کہا تمھارا اس طرح لدا پھندا آنا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ رات کے وقت تم نے راجہ کو ضرور گالیاں دی ہیں۔ اُنھوں نے کہا قرآن مجید کی قسم میں نے گالیاں نہیں دی ہیں۔ اُسی دن سرِ شام میں اُنھیں ساتھ لے کر راجہ صاحب کے پاس گیا۔ اُن سے کہا تم موٹر میں بیٹھے رہو، جب بلاؤں تو آنا۔ اندر جا کر راجہ صاحب سے پوچھا، انھوں نے کہا رات کو خاں صاحب نے میری تمام محفل درہم برہم کر دی، میرے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی پارٹی تھی جس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا[1] جب ہم سب کھانے کی میز پر آئے، خاں صاحب، چینی کی پلیٹ میں ہڈی توڑنے لگے کھٹا کھٹ، اور جب میرے سکریٹری نے انھیں روکنا چاہا تو خاں صاحب نے اس کو فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد، میں نے کہا راجہ صاحب، ابرار کو آپ سے بے حد محبت ہے، وہ اپنی اس غلطی پر بے حد پشیمان ہیں، اب وہ نوکری کرنا نہیں چاہتے لیکن چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں، اس لئے ان کی یہ تمنا ہے کہ آپ کے پاس آ کر معذرت کر لیں۔ راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب، میں نے خاں صاحب کو کبھی ملازم نہیں، ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا، آپ اُنھیں بُلوا لیں۔ آدمی بھیج کر، میں نے انھیں

---

[1] جس دعوت میں انگریز شریک ہوتے تھے، ہم گھٹیا لوگ اس دعوت کو بڑھیا سمجھتے تھے۔

بُلوالیا، ابرار نے جھپٹ کر راجہ کو گلے سے لگا لیا اور رونے لگے ۔ راجہ نے کہا خاں صاحب خُدا کے واسطے نہ روئیے ، میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں، چھوڑیئے اس ذکر کو پھر آجایئے میرے پاس ، اسی اثنا میں آفتاب غروب ہوگیا ، میں اُٹھنے لگا ، راجہ نے کہا ، ایسی بھی کیا بے مُروّتی ، تھوڑی سی ڈرنک تو کرتے جایئے ۔ میں نے کہا میں ابرار کی صحبت میں شراب نہیں پیوں گا ۔ آپ کسی دوسرے کمرے میں ان کا انتظام کردیں ۔ ابرار نے مجھ کو بڑی شکایت آمیز نظروں سے دیکھا ، اور راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ اجازت دے دیں تو خاں صاحب ایک پیگ تو میرے ساتھ کرلیں ، پھر دوسرے کمرے میں اُنھیں بھیج دوں گا ۔ اس کے بعد بوتل کُھلی ، سب سے پہلے حسبِ دستور مُہتمم شراب کو ایک پیگ پلایا اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ شراب میں کسی دشمن نے زہر نہیں ملوا دیا ہے ۔ ہم لوگوں کے جام بھر دیئے گئے ۔

آدھا جام خالی کرکے ، ابرار نے سوفا چھوڑ دیا ۔ راجہ کے سامنے ، فرش پر آکر بیٹھ گئے ۔ اور اُن کے ہات چوم چوم کر "میر مُنّوا" "میر اُمنّوا" کہنے لگے ۔ اس کے بعد ، جلدی سے ، اپنا گلاس ختم کرکے ، انھوں نے میرا جام غٹ غٹا کر پی لیا ۔ اور اس کے بعد جلدی سے ، راجہ کا جام بھی ایک سانس میں خالی کرکے ، وہ مُسکرائے ، اور اپنی تُرکی ٹوپی کج کرلی ۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ گالی دینے ہی پر ہیں ، اس لیے کہ بارہا دیکھ چکا تھا کہ گالیاں دینے سے پیش تر ، وہ مہین مہین مسکراتے اور ٹوپی کج کرلیا کرتے ہیں ، میں نے چاہا کہ میں فوراً اُٹھ جاؤں ، لیکن راجہ نے میرا دامن پکڑ کر ، مجھے بٹھا لیا ۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ابرار نے راجہ صاحب کی جانب نظر اُٹھائی ، ان کا ہات چوما ، اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ،

راجہ صاحب قرآن مجید کی قسم آپ بھی بڑے حرام زادے ہیں ۔ اور محفل برخواست ہوگئی ۔ ایک روز سہ پہر کے وقت لکھنؤ کے "مقبرۂ جنابِ عالیہ" کے قریب کے مکان میں ، جہاں میں اپنی سالی کے علاج کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا ۔ وہ میرے پاس

اُداس آداس آئے، اور کہنے لگے۔ شبیر حسن خاں آپ جانتے ہیں کہ مجھے، لڑکپن ہی سے آپ سے کس قدر محبّت ہے، آپ نے جس دن سے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ میری زندگی ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے اُنھیں گلے لگا لیا، اور کہا ابرار تم کو بھی معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں، مگر بابا تمھاری گالیاں کون برداشت کر سکتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے "اِرّی ٹیٹ[1]" (برافروختہ) کر دیتے ہیں، اس لئے مشتعل ہو کر، میرے مُنھ سے، آخر پٹھان ہوں نا، گالیاں نکل جاتی ہیں۔ اگر کوئی مجھے "اری ٹیٹ" نہ کرے تو، قرآن مجید کی قسم، میرے مُنھ سے گالی نکل ہی نہیں سکتی۔ میں نے کہا اچھا تو آج یہ کر دکہ میرے ساتھ پیو، اور اس طرح کہ میرے تمھارے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو۔ میں تو "اِرّی ٹیٹ" نہیں کروں گا؟ انھوں نے کہا۔ بھلا آپ اور مجھے اری ٹیٹ کریں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور آپ نے اگر مجھے "اِرّی ٹیٹ" بھی کیا تو آپ کے قدموں پر سر رکھ دوں گا، اور اگر آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو قرآن مجید کی قسم اُف تک نہیں کروں گا۔ میں نے کہا میرے گھر پر روز دس پانچ دوست آجاتے ہیں، یہاں تخلیہ میسّر نہیں ہو سکے گا، انھوں نے کہا چلیئے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کے نیچے، گومتی کے کنارے بیٹھ کر پیئں۔ گومتی کے کنارے، ایک پیگ کرنے کے بعد، انھوں نے کہا۔ یہاں اندھیرا ہو چکا ہے، چلیئے چوک چلیں، اور نازنین[2] کے کمرے میں بیٹھ کر پیئں، اور گانا بھی سُنیں۔ میں نے کہا چلو، اسی وقت چلو، بسم اللہ، دیکھو میں تمھیں "اری ٹیٹ" نہیں کر رہا ہوں۔

نازنین کے کمرے کے زینے پر پہنچ کر، انھوں نے کہا۔ میری رائے یہ ہے کہ پہلے ٹنڈے کبابی کے وہاں دو پیگ پی لیں، اور کباب کھا کر، گانا سُنیں۔

میرے نزدیک کبابی کی دُکان پر بیٹھ کر، شراب پینا تو درکنار، کباب تک کھانا، آدابِ شُرفا کے خلاف تھا، مگر ابرار کی خاطر میں نے یہ ننگ بھی گوارا کر لیا۔

---

[1] IRRITATE [2] ایک نہایت حسین طوائف۔

ٹُنڈے کبابی سے میں نے کہا اپنی دُکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑے کر دو، آج یہاں ہم شراب پیئں گے۔ یہ سُن کر کبابی گھبرا گیا، اور، ہات جوڑ کر، اس نے کہا "خاں صاحب"۔ اس کی بات کاٹ کر، میں نے کہا میں سب جانتا ہوں، لیکن اس وقت ایک ایسی بات آن پڑی ہے کہ تُم کو یہ بند و بست کرنا ہی پڑے گا۔ ٹنڈے نے، انتظام کر دیا۔ بیٹھتے ہی میں نے اُن سے کہا۔ ابرار حسن خاں صاحب دیکھیئے میں آپ کو مُطلق "اڑی ٹیٹ"، نہیں کر رہا، بلکہ آپ کے اشاروں پر چل رہا ہوں۔ ابرار نے اپنا سَر میرے پاؤں کی طرف جھکا کر، کہا قُران مجید کی قسم، آپ کا سا شریف آدمی کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

انھوں نے دُکان پر دو پیگ پیئے، اور جیسے ہی تیسرا پیگ بنایا۔ میری جان نکل گئی اس لئے کہ میں نے دیکھا وہ ہیں ہیں مسکرا کر، اپنی ٹوپی کو کج کرنے کے لئے۔ ہات بلند کر رہے ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر، میں دُکان سے فوراً باہر آ گیا۔ اور، سامنے کی مسجد کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی مشکل سے ایک منٹ گزرا ہو گا کہ دکان کے اندر سے، ابرار کی آوازیں آنے لگیں "... مار دوں گا[1]۔ "..... مار دوں گا۔" "... مار دوں گا"، اور ان کی اس عمومی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر، میں نے یہ دیکھا کہ لوگ ٹنڈے کی دکان سے، اس سراسیمگی کے ساتھ، نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ گویا بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہے۔ اور ابرار کی آواز برابر گونج رہی ہے "مار دوں گا۔" "... مار دوں گا۔" اور کبابی کی دُکان کے سامنے آنے جانے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ وہ جھومتے جھامتے باہر آ رہے ہیں۔ انھوں نے جب دُکان سے باہر قدم رکھا تو پھر وُہی نعرہ لگا "... مار دوں گا" اور تمام مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

کسی نہ کسی طرح ان کو تانگے میں لاد کر وہاں سے چلا تو راستے بھر جو سواری بھی تانگے سے

---

[1] وُہ "مار دوں گا"، کے حرف گاف کو بالتشدید ادا کر رہے تھے۔

بل کر گزری اُنھوں نے "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردوں گا" کے برابر نعرے لگائے اور گھر آ کر جب تک سو نہیں گئے، یہی نعرہ لگاتے رہے اور جب صبح کو میں نے کہا آداب بجا لاتا ہوں ابرار حسن صاحب اثر ملیح آبادی، تو وہ پانی پانی ہو کر رہ گئے۔[1]

نورالحسن خاں نام تھا۔ نورالحسن خاں (ہائے ہر نام، آخر کار "تھا" بن جاتا ہے) مجھ سے ۲۰ برس بڑے، میری پھپی کے منجھلے بیٹے۔ نئے نئے الفاظ کے موجد، ہر شخص کی ہر اُفتاد پر یہ کہنے والے کہ "ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے"۔ دنیا کی ہر چیز کو "ٹکڑے اُڑا دینے" کی حد تک، برتنے والے، قہقہوں کے بادشاہ، مجلس میں تارون بارگاہ۔ بیماروں کے قرب سے گریزاں، اپنی بیماری میں تیمار داری کے خواہاں۔ کھانے پینے پر جان دینے والے۔ دوسروں سے مذاق کرنے پر ہمہ وقت طیار، دوسرے اُن سے مذاق کریں تو آمادۂ پیکار۔ شدید گرمی سردی کے وقت، اپنے ساتھ والوں سے، بلاوجہ، بیزار، صحت کے پرستار، درازئ عمر کے خواستگار، موت کے نام سے گرم فرار۔ بڑے کلّے ٹھلّے کے، موٹے تازے، دراز قامت، بلند آواز، گپھے دار مونچھوں، اور، چوڑی ہڈیوں کے جرنیل نما انسان تھے۔

---

[1] صد حیف کہ ان کی بے پناہ ذہانت اُن کو لے ڈوبی، اور وقت سے پہلے ہی ان کی جان بھی لے لی بلا کی ذہانت، بے حد خطرناک چیز ہوتی ہے۔ ذہانت کے منہ میں اگر عقلِ سلیم کی خاردار لگام نہ لگائی جائے تو وہ اپنے سوار کو زمین پر گرا کر، ٹاپوں سے کچل دیتی ہے ابرار کے پاس ذہانت تو تھی، لیکن عقلِ سلیم سے وہ محروم تھے، اسی لئے ان بیچارے کا یہ حشر ہوا۔

وہ اچھے شاعر بھی تھے، افسوس کہ اُن کے بیٹے اظہار ملیح آبادی نے ان کا تمام کلام ضائع کر دیا۔ ورنہ میں اُن کے شعر سنا کر آپ کو یہ تسلیم کرا دیتا کہ وہ بڑے خوش گو تھے۔ انھوں نے حیدر آباد میں دو نظمیں کہی تھیں:- "لو آ ہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی" اور "سیندھی نے تو اے یار عجب دھوم مچا دی"، جن میں نظیر اکبر آبادی کی سی روانی تھی، ایک شعر یاد رہ گیا ہے اُن کا:

زوالِ ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے
خرد کے چند فتنے، ذہن میں بیدار رہتے ہیں

اُن کی موت میرے دل کا زخم نہیں، ناسور ہے اور ایسا کہ زندگی بھر رِستا رہے گا۔ اور اُن کا اس دنیا سے اُٹھ جانا، میری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے، جو مرتے دم تک، پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم پٹھانوں میں بڑے بھائی کو "دادا" بھی کہا جاتا تھا۔

چھوٹے دادا کے جملہ خصوصیات کو میں نے ان چند سطروں میں بند کر دیا ہے، اب جو کچھ لکھوں گا، وہ اس اجمال کی تفصیل ہو گی۔

خدا جانے وہ کون ایسی قبولِ عام کی گھڑی تھی کہ میں نے اُن کو "چھوٹے دادا"، کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا کہ تمام ملیح آباد اور تمام لکھنؤ، ان کا نام بھول کر، انھیں اس طرح "چھوٹے دادا"، کہنے لگا کہ وہ جگت گرد کے مانند جگت چھوٹے دادا بن گئے۔ اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی ان کو "چھوٹے دادا"، کہنے لگے۔

اب تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ اُن کا تن درست رہنے اور زیادہ سے زیادہ جینے کا شوق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ امانی گنج کے میدان میں، ہر صبح وشام، میرے ساتھ ٹہلا کرتے اور ٹہلنے میں ایسے ایسے شندرے کرتے تھے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی

وہ اپنے دونوں ہات، بلند کر کے، چکرگھنّی کی طرح گھماتے، پھر، بھالو کی طرح، کودتے، گردن کو، دائیں بائیں گھما گھما کر، "یا علی"، کے نعرے لگاتے، درختوں کے نیچے جا کر، اس زور زور سے سانسیں لیتے تھے۔ گویا عالم نباتات کا تمام جوہر پی جائیں گے، اور پھر ہا ہا ہا ہا کی آوازوں کے ساتھ، اپنا مُنھ، طلسم ہوش رُبا کے حملہ آور دیو کے مانند، اس طرح پورا کھول کر دوڑتے تھے کہ میدان کی ہوا کے تمام اجزائے صحّت کو چبا کر رکھ دیں گے۔ اور جب ٹہل کر گھر آتے تھے تو، چارپائی پر چت لیٹ کر، اپنی دونوں کلائیوں کو بلا ناغہ، ناپا کرتے تھے کہ اب وہ کتنی اور موٹی ہو گئی ہیں۔

اسی ذوقِ صحّت اور تمنّائے درازیٔ عُمر نے اُن میں کھانا کھانے کا ہوکا بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ کھانے کی میز، یا دسترخوان پر اس طرح، خم ٹھونک کر بیٹھا کرتے تھے۔ گویا وہ میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں، اور اپنے شرکائے طعام کو بڑی ذلیل شکست دینے پر تُل گئے ہیں۔

وہ اپنے سامنے کی پلیٹیں اور پیالے، جلد جلد صاف کر کے، انتہائی بے تکلفانہ بے دردی کے ساتھ، ہا ہا ہا کر کے، دوسروں کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا کرتے، اور اُن کے شرکائے طعام، خالی معدوں کے ساتھ، دسترخوان سے اُٹھ جایا کرتے تھے۔

اور تو اور، وہ اس معاملہ میں، بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے، اور جب کوئی بچہ، اِدھر اُدھر، کسی گوشے میں اُن کو مل جاتا تھا، تو وہ اُس کو گود میں اُٹھا کر، گھر سے باہر نکل جاتے، اور، وہاں جاکر، اُس کے ہات کی چیز پھُسلا کر اس سے لے لیتے، اور، ہا ہا کر کے کھا جایا کرتے تھے۔

وہ میرے لڑکپن میں، میرے گنّے چھیلا کرتے، دو چار گنڈیریاں مجھے، دیتے، اور یہ کہہ کر، پورا گنّا خود کھا جاتے تھے کہ باقی سب گرہیں نکل گئیں۔ اور جب میرے واسطے بَرنی آتی تھی تو، دونا میرے ہات سے لے کر، کہتے تھے مولود شریف تو پڑھوالو اور، دونے کو، "مولود شریف، مولود شریف"، کہہ کر بلند کرتے، اور دو ڈلیاں میرے حوالے کر کے، ساری مٹھائی ہا ہا کر کے، خود کھا لیا کرتے تھے۔

ایک بار ابرار، سیخ میں لگا ہوا تیتر بھون کر لائے، اور کہا رئیس احمد خاں، آج ایسا تیتر بھون کر لایا ہوں کہ قرآن مجید کی قسم، آپ کو مزا آجائے گا، یہ کہتے ہی اُن کے ہات کو یکایک ایک جھٹکا لگا اور مڑ کر یہ دیکھا کہ چھوٹے دادا، اُس سیخ کو اپنے ہات میں لئے، ہا ہا کرتے، اپنے گھر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

ایک روز، میری کھانے کی میز پر کھانا چنا جا رہا تھا، اور وہ آستینیں چڑھائے بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر اُن کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی، میں اُداس ہو کر، کھڑا ہو گیا اور آدمی سے کہا کھانا بڑھاؤ، اُنھوں نے، بے حد نعلان ہو کر، مجھے دیکھا، میں سمجھا ماں کی خبرِ مرگ نے اُن کو غم گیں بنا دیا ہے، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ میں نے کہا چھوٹے دادا چلیئے، آخری دیدار کر لیں۔ انھوں نے کہا بھائی تبیر حسن خاں زندگی و موت پر کس کا قابو چلتا ہے، آخری دیدار سے پہلے کھانا تو کھالیں، بھوکے پیٹ سے تو رویا بھی نہیں جائے گا۔ میں، بڑی حیرت سے اُن کو دیکھنے لگا، اور انھوں نے :۔ ایک ہات مار چھیلا، دو ٹوکے ہو جائیں، کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ دیکھا آپ نے اُن کا ذوقِ طعام۔!

---

[1] اے چھیلا (بانکے محبوب) ایک ایسا ہات میرے مار کہ میرے دو ٹکڑے ہو کر رہ جائیں۔

اُسی تمنائے صحت نے اُن میں یہ بات بھی پیدا کر دی تھی کہ جب ہیں، یا میرے گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تھا۔ تو چھوت چھات کے ڈر سے، وہ مریض کے کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے اور دروازے کی دہلیز سے ناک پر رومال رکھ کر، دور ہی سے مزاج پُرسی کر کے فوراً چلے جاتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وُہ بے حد بخیل بھی تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ اُن کے کھانے پینے کے ذوق پر بھی وُہ بُخل حاوی رہتا تھا اور کبھی وہ اپنی جیب سے خرید کر دو پیسے کی چیز بھی نہیں کھاتے تھے۔

اُنھوں نے، زندگی بھر، کوئی محنت نہیں کی۔ اُن کی آمدنی کا تمام انحصار میری ذات پر تھا۔ میں جیب خرچ اور کپڑے لتے، جوتے ٹوپی وغیرہ کے واسطے جو روپیہ اُن کی خدمت میں حاضر کیا کرتا تھا وہ اس کو ایک پائی خرچ کئے بغیر، سیونگ بینک میں جمع کر دیا کرتے تھے۔

انتقال سے کوئی دو مہینے پیش تر، وہ بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے، مجھ سے رخصت لے کر، پونے سے، ملیح آباد چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

جب۔ اُن کے پُرسے کے لئے میں وطن گیا تو اُن کے چھوٹے بھائی محمد علی خاں نے مجھ سے کہا کہ جب چھوٹے دادا بیمار پڑ گئے اور حالت غیر ہونے لگی تو میں نے اُن سے کہا، چھوٹے دادا، میں بڑی اوچھی پونجی کا آدمی ہوں، آپ سیونگ بینک سے دو چار سو روپئے نکال لیں، تاکہ آپ کا علاج ہو جائے، یہ سُن کر وہ بگڑ گئے، کہنے لگے خاں صاحب آپ روپیہ نکالنے کا ہم کو مشورہ نہ دیں، ہمارا علاج ولاج کچھ نہ کریں، اور اگر ہمارے دُشمن مرجائیں تو ہماری لاش کو سِمرا[1] تالاب میں پھنکوا دیں۔ اب اُن کی خودداری کا حال سُنیئے۔ ایک بار کوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے، اُن کے سامنے حُقّہ رکھ دیا گیا، حُقّے کا دس پانچ کش لگا کر، انھوں نے وہ حُقّہ، اپنے ہات سے اُٹھا کر، چھوٹے دادا کے سامنے رکھ دیا۔ اور جب چھوٹے دادا حُقّہ پی چکے تو، جوتے کی نوک پر حُقّہ رکھ کر، اپنا پاؤں ڈپٹی کی طرف پھیلا دیا، اور

---

[1] ملیح آباد کے ایک تالاب کا نام

ڈپٹی بے چارہ مُنھ دیکھتا رہ گیا۔

ایک بار، ایک سہ منزلے کے اوپر کی دیوار پھلانگ کر، مجھے ایک نقشۂ روزگار سے مل کر، یہ کہنا تھا کہ

کودا، کوئی یوں گھر میں ترے، دھم سے نہ ہوگا
وہ کام کیا ہم نے، جو رُستم سے نہ ہوگا

میں دیوار پر چڑھ گیا، اور منڈیر پر بیٹھ کر کہا۔ چھوٹے دادا آپ بھی آجائیں، انھوں نے کہا بھائی شبیرّحسن خاں آپ دُبلے پتلے آدمی ہیں، آپ آسانی کے ساتھ دیوار پھلانگ سکتے ہیں۔ میں ماشاءاللہ موٹا آدمی ہوں، مجھے ڈر ہے کہ دیوار پھاندنے میں کہیں، خدانخواستہ ایسا نہ ہو جائے کہ میں سڑک کی طرف اُتر جاؤں۔

دیکھی آپ نے چھوٹے دادا کی خودداری، اپنے باب میں یہ نہیں کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سڑک پر گر پڑوں اس لیے کہ گر پڑنے کے لفظ کو اپنی طرف منسوب کرنا انھیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ میں نے کہا چھوٹے دادا، اس "اُتر جاؤں" کی بلاغت کی داد نہیں دی جاسکتی، یہ کیوں نہ کہا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں گر نہ جاؤں، اُنھوں نے کہا گرتے ہیں ڈھینپے جُلاہے ہم پٹھان گرتے نہیں فقط سڑک کی طرف اُتر جاتے ہیں۔ ہائے اُن کے علاوہ، سڑک کی طرف اُتر جانا، اس دُنیا میں اور کون کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی " فَقَط " کے ساتھ۔

اور اُن کی خودداری کا یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ ہے کہ وہ اپنے کو تو، بڑی کُشادہ دلی کے ساتھ، اس امر کا حق دیئے ہوئے تھے کہ وہ جس سے بھی چاہیں مذاق کر سکتے ہیں لیکن انھوں نے کسی کا، اپنی ذات پر یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی اُن سے مذاق کا تصوّر بھی کر سکے۔

اور اسی بنا پر، جب کوئی اُن سے مذاق کا، ارتکاب کر بیٹھتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر اُتر آتے تھے اور زندگی بھر کے لئے اُس سے تعلقات منقطع کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار، کاکوری کے عرس میں شاہ جہاں پور کے کسی مُعمّر و مُعزز پٹھان سے، بہت گھُل مِل کر، باتیں کر رہے تھے، اُن مُعمّر پٹھان نے ملیح آباد کے آموں کے تذکرے میں اُن سے پوچھا خاں صاحب آپ نے کبھی ہمارے شہر کا "بُلاغنڈ" بھی کھایا ہے، یہ سُن کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ "بُلاغنڈ" کسی عُضوِ فحش کا نام ہے، وہ جامے سے باہر ہو گئے، اور آستینیں چڑھا کر کہنے لگے "بلاغنڈ" آپ نے کھایا ہوگا، ہزار بار کھایا ہوگا، اور آج بھی کھا رہے ہوں گے۔ وہ تو کہیئے کہ ایک صاحب، فوراً چھوٹے دادا اور شاہ جہاں پور کے آمادۂ نبرد پٹھان کے درمیان آکر کھڑے ہو گئے اور کہا چھوٹے دادا شاہ جہاں پور میں بِیل کو "بُلاغنڈ" کہتے ہیں۔ اگر وہ عین موقع پر آکر رفعِ شر نہ کر دیتے تو دونوں لڑ مرتے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا معافی کے خواست گار ہوتے، مگر اُن کو "بلاغنڈ" سُن کر اس قدر غصّہ آچکا تھا کہ معافی طلب نہیں کی، اور تنتناتے ہوئے، باہر چلے گئے اللہ ری "بلاغنڈ" کی فحاشی آمیز، صوتی دھمک! ایک بار میرے بِکھانے پر اُن کا پانچ برس کا بھانجا، چوہے دان لیے ہوئے، گھر سے نکلا، اور دہلیز سے پُکار کر اُس نے کہا ماموں ماموں چھوٹے دادا نے کہا کیا ہے بیٹا، اُس نے، چوہے دان کی طرف اشارہ کر کے کہا ماموں، آؤ اس کے اندر آکر بیٹھ جاؤ، یہ سنتے ہی وہ ابے مردود کہتے اس کے پیچھے دوڑے، وہ بھاگا۔ وہ مکان کے اندر گھس کر اپنی نانی یعنی ان کی ماں کی پُشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھپٹے اُسے مارنے کے لئے، بچّے نے غُل مچایا، ان کی ماں نے پوچھا نورحسن کیا ہے، اُنھوں نے کہا میں اس کے ٹکڑے اڑا دوں گا، یہ مردود مجھ سے کہتا ہے ماموں آؤ، چوہے دان میں بیٹھ جاؤ، اُن کی ماں ہنسنے لگیں، وہ اُن کے ہنسنے پر بگڑ گئے، اور جیسے ہی اُنھوں نے چاہا کہ ماں کی پُشت سے لپٹے ہوئے بچّے کو کھینچ کر ماریں پیٹیں، اُن کی ماں، جھلّا کر، کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں، اگر بچّے کو ہات لگایا تو تیرے ہات توڑ کر رکھ دوں گی۔ دیوانہ ہو گیا ہے، معصوم بچوں سے لڑتا ہے آج کی اس نئی نسل کا کوئی بیٹا ہوتا، تو بھانجے ہی کو نہیں، ماں کو بھی دُھنک کر رکھ دیتا، مگر وہ تھے پُرانے دور کے شریف زادے،

ماں کی ڈپٹ سُن کر، باہر چلے گئے۔ لیکن بھانجے سے، اپنے نزدیک یہ انتقام لیا کہ اُس کے دوسرے روز جب اُس کا ختنہ ہُوا تو وہ شریک نہیں ہُوئے اور لکھنؤ چلے گئے۔

حیدر آباد کا ذکر ہے، ایک روز، رات کے بارہ بجے میں گھر آیا، ابرار میرے ساتھ تھے، پھاٹک پر آتے ہی موٹر رُک گئی۔ میں نے ابرار سے کہا اب موٹر خانے تک کیسے پہنچاؤں، ابرار نے، صحن میں لیٹے ہُوئے چھوٹے دادا کی جانب اشارہ کرکے، کہا یہ کیا قلی پڑا ہُوا ہے، اس سے ڈھکلوا لیجئے۔ یہ سُنتے ہی چھوٹے دادا نے، شیر کے مانند بستر سے جست کی، ڈنڈا اُٹھاکر، ابرار کی طرف، یہ کہتے جھپٹ پڑے کہ ابے مردود، گھُس کھُدّے، ہم کو قلی کہہ رہا ہے، ٹھہر جا، تیرے ٹکڑے اُڑا کر رکھ دوں گا، ابرار بھاگے، وہ ڈنڈا گھُماتے پیچھے دوڑے، ابرار گلی کے نکڑ پر پہنچ گئے، وہ راستے ہی میں کھڑے ہو کر، ہانپنے اور غل مچانے لگے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس والے سیٹیاں بجانے اور کُتّے بھونکنے لگے۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک دن رفیع احمد خاں کی انگنائی میں بیٹھے ہم لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ رفیع نے میرے کان میں کہا چھوٹے دادا سے مذاق کرنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ میں نے کہا وہ عمر بھر کے لئے دشمن ہو جائیں گے تمھارے۔ انھوں نے کہا اُن کی دوستی ہی کیا مجھے چھپّن ٹکے دیئے دے رہی ہے کہ اُن کی دشمنی سے خوف کھاؤں۔ یہ کہہ کر وہ بالاخانے پر، زینے کو اندر سے بند کرکے، چڑھ گئے، ایک منٹ کے اندر اوپر کی کھڑکی کھولی، اور اُس سے، مُنہ نکال کر کہا "ابے چھوٹے دَدوا"، اب کیا تھا، قیامت برپا ہوگئی۔ ڈنڈا اُٹھاکر، پھینکا، اور کھڑے ہو کر کہا ابے مردود اگر پٹھان کا نطفہ ہے تو نیچے اُتر آ۔ ابھی ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ کھڑکی بند ہوگئی۔ وہ زینے کے دروازے پر زور آزمائی کرکے، اول فول بکنے لگے۔ اتنے میں کھڑکی پھر کھُلی، اور پھر آواز آئی "ابے چھوٹے ددوا" اُنھوں نے جوتہ کھینچ کر مارا، جو نیچے گر گیا، اُنھوں نے، گرج کر، کہا ابے زنخے، تجھ پر لعنت، اگر مرد ہے تو آ جا نیچے۔ حرام زادے کہیں کے۔ ابے . . . . نیچے

اُترے گا کہ نہیں ؟ - جب اُوپر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ ، غُصّے میں بھرے وہاں سے چلے گئے - اور اس کے بعد ، مرتے دَم تک رفیع کا مُنھ نہیں دیکھا -

اسی طرح ، قہقہے لگانے میں بھی کوئی اُن کا نظیر نہیں تھا - اُن کے قہقہے پورے اُٹھارہ کھٹکوں کے ہوا کرتے تھے - اُن کا ہر قہقہہ ، زمین پر میل ، ڈیڑھ میل تک پھیل کر ، آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا - اُن کے قہقہوں کی آوازیں تو سُن لیجیے - قہَ - قہَ - قہ - قہَ قہَ - قہَ - قاہا ، قاہا ، قاہا ، قاہا ، قاہا ، قاہا ، ہاہا ، ہاہا ، ہاہا ، ہاہا ، ہاہا ، ہاہا - ہآہ !

میری کوٹھی ، آبادی سے ، تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی ، وہ ، راتوں کو جب قہقہوں پہ اُتر آتے تھے ، تو اُن کے قہقہے دادا جان کی بارہ دَری سے ٹکرا ٹکرا کر ، آبادی کے گلی کوچوں میں گونجنے لگتے تھے - اور قہقہے مار کر جب وُہ اَخ تھُو کرتے ، اور اُن کا تھُوک ، چار پانچ گز ، آگے جا کر ، گرتا تھا ، تو وُہ ، بڑے فخر سے کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں ، دیکھا میرے پھیپھڑوں کا زور - ؟

اُن کے الفاظ کی تراش خراش بھی دنیا سے نرالی تھی ، اُن کے سینکڑوں الفاظ میں چند یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سُن لیں - قَرول باغ دہلی کا واقعہ ہے ، حضرت آزاد انصاری میرے ہی ساتھ رہتے تھے ، وہ روز صبح اُن کے کمرے میں جا کر ، پوچھا کرتے تھے آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے ، وہ کہتے تھے اپنے دیوان کا مُقدمہ لکھ رہا ہوں - وُہ ہاہا کرتے ، اُن کے کمرے سے نکل جاتے تھے - جب یہ سلسلہ آٹھ دس روز تک جاری رہا تو ایک دن ، اُنھوں نے پھر پوچھا آزاد صاحب اب کیا لکھا جا رہا ہے ، اور جب آزاد صاحب نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مُقدمہ لکھ رہا ہوں تو اُنھوں نے ایسا خار اشگاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اُچھل پڑے ، اور کہا آزاد صاحب ، اللہ اللہ یہ مُقدمہ ہے کہ بلے میاں کی چھڑ - ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں ، مگر آپ کی مُقدمہ بازی اس قدر طویلُ القامت ہے کہ قُطب مینار اُس کے سامنے چڑ کٹے کا لونڈا معلوم ہو رہا ہے - ارے یہ پاتابہ سَقرلاتی ، اور قنتورہ زربفتی والا ، لمبا چوڑا ، جھبڑ جھاڑ ، جھاڑ جھنکاڑ

شُتر خوار مُقدمہ ۔ مُقدمہ ہے یا صدر پور کے بنی شیر خاں کے ناڑوں کا شرڑ رڑ رڑ شرڑ، رڑ، رڑ، شرڑ، رڑ، رڑ، تاہ، تاہ، تاہ، تاہ، تاہ، تاہ، تاہ ۔ آزاد کے ہات سے قلم چھوٹ گیا، اور لوٹنے لگے۔ ایک بار لکھنؤ کی ایک تنگ گلی سے ہم لوگ گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک مست سانڈ، رسّیاں تڑا کر، ہماری طرف سرپٹ دوڑتا چلا آرہا ہے، میں اور چھوٹے دادا، ایک چبوترے پر چڑھ گئے، اور شرر صاحب جب گلی کے ایک کنارے سے مل کر چلتے رہے تو انھوں نے، چیخ کر کہا ارے شرر صاحب چبوترے پر چڑھ آیئے، ورنہ یہ اُدھیایا ہوا مادہ دیوانہ سانڈ، اپنے سینگوں سے، آپ کے دونوں مُنیالوں کو پھاڑتا، اور آپ کے سارے جھولے کو رَوندتا ہوا نکل جائے گا۔

ایک روز میں نے پوچھا یہ آپ کی بھَویں کیوں ہلتی رہتی ہیں، اُنھوں نے، قہقہہ مار کر کہا بھائی شبیر حسن خاں جب سے میں بوڑھا ہو گیا ہوں، یہ خصماتی حرام زادیاں چھنال ہو گئی ہیں اور یاروں کو اشارے کیا کرتی ہیں۔

ایک روز کسی نے پوچھا چھوٹے دادا آپ نے شادی کیوں نہیں کی، اُنھوں نے، قہقہہ مار کر کہا۔ جناب یہ دَم بھر کی بلبلاہٹ، اور جیتے جی کی جھلجھلاہٹ آپ ہی کو مبارک ہو۔ یار لوگ ایسی بنجال نہیں پالتے، خاں صاحب ایک مادہ کا نر بن جانے کے بعد، دُنیا بھر کے نَردوں کی مادہ بن جانا کون گوارا کر سکتا ہے۔

ایک پلّا اس کاندھے پر، ایک پلّا اُس کاندھے پر، اور میانی کے گوے تھَر تھَر، تھَر تھَر۔ ہاہاہاہا، بھبوتیا کون بنے۔ اگر "دا شادی، ادمائی" کے نعروں میں، بَنّو کو گھر میں بیاہ کرے آتا، تو اس سارے ہاڑ سے ہات دھو کر، خاں صاحب، میں بھی آپ ہی کی طرح، لقّات اور لفّا جھُنّا بنا، ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ، کرتا پھرتا ہوتا۔

ایک بار میں اپنے نانا جان کے ساتھ، ریاست رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ میرے ماموں کے ایک بوڑھے اتالیق نے، جن کو "شاہ صاحب" کہا جاتا تھا، برآمدے میں بیٹھ کر بُری طرح کھانس رہے تھے ان کی کھانسی کی آوازوں کو سن کر، اُنھوں نے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں، سُن رہے ہیں آپ یہ آوازیں "دو بھوتنی والی دی،

بھونق والی دی ، ہاہا ، ہاہا ، ہاہا۔

ہائے اب بھی جب کوئی بُری طرح کھانستا ہے تو چھوٹے دادا "بھونق والی دی" یاد آجاتی ہے۔

وُہ عصرِ حاضر کی سپاٹ عمارتوں کو "حرام زادی" "کلین شیو" کہا کرتے تھے اور نئے فیشن کی لڑکیوں کو انھوں نے "لونڈا نیمیل" کا خطاب بخشا تھا۔ اور جب کسی موٹے تازے اَمرد کی پُشت پر وُہ نظر جماتے، تو قہقہہ مار کر، کہا کرتے تھے، بھائی شبیر حسن خان "ٹھاپ[1] دی بال"۔

اُن کے مزاج کی یہ بھی ایک ناقابلِ فہم خصوصیت تھی کہ جس وقت موسم میں غیر معمولی شدت آجاتی تھی۔ مثلاً شدید گرمی، یا شدید سردی پڑنے لگتی تھی، تو وہ اپنے ہم نشینوں سے اس طرح بگڑ جاتے تھے، گویا موسم کے شدائد کو انھوں نے ہی پیدا کر دیا ہے۔ ایک بار جب میں نے اُن سے پوچھا کہ چھوٹے دادا، سختی تو موسم کرتا ہے، اور بگڑ جاتے ہیں آپ ہم سب سے، آخر اس کی وجہ کیا ہے، تو ایک، روکھی "ہوں" کے سوا وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ اُن کا کوئی فعل "ٹکڑے اُڑا دینے" سے کم کا، کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مثلاً جب وُہ حمام سے نکلتے تو یہ کہتے نکلتے کہ بھائی شبیر حسن خاں، آج تو نہاتے نہاتے ٹکڑے اڑا دیئے میں نے، اسی طرح جب کھانے کی میز سے اُٹھتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیئے میں نے، اور جب ٹہل کر آتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو ٹہلتے ٹہلتے ٹکڑے اُڑا دیئے میں نے۔ یعنی وُہ دنیا میں جو بھی کام کرتے، اُسے "ٹکڑے اڑا دینے کی حد تک کیا کرتے تھے۔

اُن کی یہ بھی، ایک دُنیا بھر سے نرالی خصوصیت تھی کہ جس وقت کسی اللہ کے بندے کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا، تو وُہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے"، حالاں کہ وہ کبھی پہلے سے ایک حرف بھی نہیں کہا کرتے تھے۔ میں اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا

---

[1] یعنی جس طرح فُٹ بال پر ٹھاپ سے ٹھوکر لگاتے ہیں، اسی طرح تم بھی ایک ٹھوکر لگا دو۔

کہ جب کوئی سائیکل سے گر جاتا، یا پھل تراشتے میں کسی کی اُنگلی کٹ جاتی، کسی شخص کی ریل چھوٹ جاتی تھی، تو اُن تمام مواقع پر وُہ، بڑے پیمبرانہ انداز میں "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے" کا اعلان کیا کرتے تھے۔

آخر میں اُن کی ایک بات اور بھی سُن لیجیے، جس سے پتہ چل جائے گا کہ ساٹھ برس کی عُمر میں بھی، عورت نادیدہ چھوٹے دادا، کس قدر بے خبر انسان تھے۔

ایک روز وہ میرے پاس، غصّے میں بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے بھائی شبیّر حسن خاں، آپ نے اپنے دو کوڑی کے خدمت گار جگنو کو بے حد مُنہ چڑھا رکھا ہے، اگر آپ کا مُنہ نہ ہوتا تو آج، مار مار کے، سالے کے ٹکڑے اُڑا دیتا۔ میں نے پوچھا بات کیا ہے۔ اُنھوں کہا وہ مجھ سے بحث کر رہا تھا کہ بچّہ، مادہ کے آگے کے رُخ سے پیدا ہوتا ہے، اور جب میں نے اُس گاؤدی سے یہ کہا کہ تیرا خیال سراسر غلط ہے، بچہ، مادہ کے پیچھے کے رُخ سے پیدا ہوتا ہے، تو وُہ سالا مجھ پہ ہنسنے لگا۔ مجھے اُن کے اس بھولے پن پر، ہنسی آگئی، میں نے کہا چھوٹے دادا جگنو سچ کہتا ہے کہ بچّہ، مادہ کے اگلے حصّے سے پیدا ہوتا ہے تو اُنھوں نے، بڑے وثوق کے ساتھ کہا بھائی شبیّر حسن خاں میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے دن دہاڑے میٹھنیا کی بھینس کو خود جنتے دیکھ چکا ہوں کہ اُس کا بچّہ پیچھے کی طرف سے پیدا ہوا تھا، اور جب میرا قہقہہ نکل گیا تو وُہ "وزیرے جُنیں، شہر یارے چُناں" کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

مختار احمد خاں

میرے ساتھ کھیلے ہوئے پڑوسی، میرے باپ کے رفیق، مشیر احمد خان کے بیٹے، نسلی طور پر رام پوری وطنی اعتبار سے ملیح آبادی، عاشق مزاج و صوفی منش، دُبلے پتلے دھان پان، اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ ابرار اور چھوٹے دادا وغیرہ کے مانند خصوصیاتِ کثیرہ کے جامع تو نہیں تھے لیکن اُن کی ایک خصوصیت ایسی تھی، جو ہزاروں خصوصیات پر بھاری تھی۔ اور انسانی تاریخ آج تک اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکی ہے۔

اس سے بیشتر کہ میں اِس خصوصیت پر روشنی ڈالوں، یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ پڑھے کڑھے آدابِ مجلسی سے واقف، لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور اس اَمر کو بھی بدرجہ اتم سمجھتے تھے کہ بے محل بات کرنا یا کہنا آدمی کو سبک بنا دیتا ہے ___ لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود، وہ جب کسی ایسی قابلِ تعظیم ہستی سے دوچار ہو جاتے تھے، جس کی ذات سے کسی دینی احترام کا تصوّر وابستہ ہوا کرتا تھا اُس وقت ان کو بے اختیار ہنسی آنے لگتی تھی ___ ہر چند وہ صاحبان کشف و کرامات کے روبرو اِس امر کی انتہائی کوشش کرتے تھے کہ با ادب و سنجیدہ رہیں۔ اور بعض اوقات تو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں اُن کی جان تک پر بن جایا کرتی تھی۔ لیکن اِن تمام مساعی کے باوجُود اُن بزرگوں کے سامنے اُن کی چھاتی کو توڑ کر قہقہے بلند ہو جایا کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجیے، کہ وہ مُلحد نہیں، بلکہ دین دار آدمی تھے۔ اور تصوّف کی چاشنی ان کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ ان بزرگوں کا

احترام کرتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے روبرو سر جھکاتے اور ان کے ہاتھ چومتے ـ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ریم عالم اور خود اپنے عقائد کے خلاف وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے ۔

نفسِ انسانی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ۔ اور بعض اوقات تو یہ مسئلہ ایسی بھول بھلیاں بن جاتا ہے کہ اس میں داخل ہوکر باہر نکلنا بیحد دشوار ہو جاتا ہے

اب اُن کی زندگی کے چند واقعات سن لیجئے ۔ اور زندگی بھر غور فرماتے رہیئے کہ ان کی علّت کیا تھی ۔

پہلا واقعہ : ایک روز میں اپنے نانا کے انتقال کے غم میں ، چارپائی پر اداس لیٹا تھا اور وہ پائنتی کی طرف غمگین بیٹھے ہُوئے مجھے تسلّی دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک مولانا صاحب تعزیت کے لئے آگئے ۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا ـــــــ اور جب انھوں نے فاتحہ کو ہات بُلند کئے ، تو نیچے سے ، میری چارپائی اچھلنے لگی ۔ میں گھبرا گیا ۔ اور تھوڑا سا جھک کر جب چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ وہ چارپائی کے نیچے پڑے ہنسی کے مارے لوٹ رہے ہیں ۔ اور مولانا صاحب لاحول کہتے باہر تشریف لیے جا رہے ہیں ۔

دوسرا واقعہ : ایک بار امین آباد (لکھنؤ) کے چوراہے پر ہماری مڈبھیڑ ہوگئی ۔ شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلی سے ۔ ہم لوگ تانگے اور وہ گاڑی میں تھے مولانا کو دیکھ کر میں نے تانگہ ٹھہرا لیا اور مجھے دیکھ کر مولانا نے گاڑی روک لی ۔ صاحب سلامت و مزاج پُرسی کے بعد جب مولانا نے پوچھا : خاں صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ تو مختار نے قہقہہ مار کر جواب دیا ۔ حضور ۔ چوک جا رہے ہیں ۔ چوک ۔ گانا سننے کے واسطے تاتا ۔ تاتا ، تاتا ۔ ارے جوش ، جلدی تانگہ بڑھاؤ ۔ ہم مرے جا رہے ہیں ، یہ خلاف توقع بات دیکھکر ، مولانا نے ، کوچ بان سے بلند آواز میں کہا ۔ گاڑی بڑھاؤ ۔ اور مختار نے جھک کر کہا ۔ حضور آداب ۔ اور مولانا دور تک مڑ مڑ کر ، نہایت غصے کے ساتھ دیکھتے چلے گئے ۔

تیسرا واقعہ : یہ واقعہ غالباً ۱۹۲۰ء کا ہے ۔ جبکہ لکھنؤ میں ایک بزرگ

وارث حسن شاہ صاحب کے کشف وکرامات کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے۔ ان کے خاص مریدوں میں زیادہ تر وکلا، بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ وہ اُن سب کی شراب چھڑوا چکے ہیں۔ اس لیے کہ جب وہ پیگ بناتے تھے تو اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ جام کے اندر سینکڑوں سوّر کے بچے پیر رہے ہیں۔

ان کے عقیدت مندوں نے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کی مسجد کے جوار میں اُن کے واسطے ایک کوٹھی بھی تعمیر کروادی تھی اور، وہ، بڑی شان کے ساتھ وہاں رہتے تھے اسی اثنا میں ایک روز صبح کو مختار میرے پاس آئے، اور کہا چلو حضرت شاہ وارث حسن صاحب کی زیارت کر آئیں۔

ابھی ہم مسجد کی سیڑھیاں طے ہی کر رہے تھے کہ میں نے کہا۔ دیکھو مختار، شاہ صاحب کی ذات سے احترام کا تصور وابستہ ہے، خدا کے واسطے اُن کے سامنے جاکر ہنسنے نہ لگنا۔ وہ میری بات سن کر چوکنا سے ہوگئے۔ اور کہا خدا تمہارا بھلا کرے، بڑے موقع سے تم نے ہنسی کی بات یاد دلادی۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ شاہ صاحب کا تصور کرکے یہیں سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤں: وہ بیٹھ گئے اور اس زور زور سے ہنسنے لگے گویا ان کو ہنسی کا ہیضہ ہوگیا ہے

شاہ صاحب کے خادم ابوبکر نے اپنے کوارٹر سے جب اُن کا یہ عالم دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ اُن پر جن آیا ہوا ہے وہ، پانی بھرا ہوا بدھنا لے کر اُن کی طرف دوڑ پڑا، اور، کچھ پڑھ پڑھ کر، اُن کے منھ پر، زور زور سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس عمل نے اُن کی ہنسی میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اور وہ ہنسی کے مارے لوٹنے لگے۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹے کے بعد یہ بادل چھٹا اور ہنسی کا مینہہ تھم گیا۔ انھوں نے منھ دھو کر رومال سے پونچھا پانی پیا، گہری سانس لی، آسمان کو دیکھا، ٹوپی درست کی۔ پھریری لی اور مجھ سے کہا اب چلو، بڑے اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اس قدر ہنس چکا ہوں کہ اب سال بھر تک ہنسی نہیں آئے گی۔

اب ہم وارث حسن شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مختار اُن کے داہنے ہات پر اور میں اُلٹے ہات پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور وہ انتہائی عقیدت

کے ساتھ مکالمت کرتے رہے۔ اور میں مطمئن ہوگیا کہ اب کوئی بات خلاف تہذیب نہیں ہوسکے گی۔

باتوں باتوں میں شاہ صاحب نے پوچھا۔ مختار۔ تمھارے والد کا مزاج کیسا ہے۔
اِس سوال نے اُن کے صبر و تحمّل کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، وہ شاہ صاحب کے احترام کا بار پہلے ہی سے برداشت کئے بیٹھے تھے۔ اب شاہ صاحب کے سوال نے اُن کے دوش پر اُن کے باپ کا احترام بھی لاد دیا۔ یہ دُہرا بوجھ ان سے اُٹھ نہیں سکا۔ اور پہلو بدل کر انھوں نے کہا: "حضور"۔ میں سمجھ گیا کہ اِس حضور کے بعد اب کیا ہونے والا۔ اس لئے کہ میں بارہا تجربہ کر چکا تھا کہ جس طرح گالی دینے سے بیشتر ابرار مہین مہین مسکرا کر، اپنی ترکی ٹوپی کج کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مختار قہقہوں سے پیشتر لانبی آواز میں "حضور" کہا کرتے ہیں۔
شاہ صاحب نے یہ دیکھ کر کہ وہ "حضور" کہہ کر خاموش ہوگئے ہیں، پھر دریافت کیا کہ بتاؤ تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے ــ انھوں نے بھنچی سی ہنسی کی تھرتھراتی آواز میں کہا، حضور خیریت سے ہیں۔ اور ان کے شانے ہلنے لگے اور شاہ صاحب کے تیور بدل گئے۔

مجھ کم بخت میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب کوئی میرے سامنے ہنسنے لگتا ہے تو میں کسی طرح بھی ہنسی کو ضبط نہیں کرسکتا، میں نے فوراً کھنکھار کر اس طرح اٹھنا چاہا گویا باہر جاکر گلا صاف کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا۔ میاں اُگالدان آپ کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔ میں نے، منھ موڑ کر، اِس بڑے اگال دان میں، اپنی ہنسی خوب جی بھر کر تھوکی، اور اس قصد سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا کہ اب مردود مختار کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

اتنے میں شاہ صاحب نے بگڑ کر مختار سے کہا "اَودھ کے شریف زادوں میں اب کیا یہ ناشائستگی پیدا ہوگئی ہے کہ جب اُن سے اُن کے والد گرامی کا مزاج پوچھا جاتا ہے تو وہ حضور کہہ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ انھوں نے جھک کر شاہ صاحب کے قدم پکڑ لئے اور قہقہہ مار کر کہا۔ حضور میں بدتمیز نہیں ہوں۔ میرے پیر تھے دیوے شریف کے

حاجی وارث علی شاہ، حضور، پرسوں انھیں خواب میں دیکھا تھا۔ جب سے بیکار بیکار برابر ہنسی آتی رہتی ہے، قاہ، قاہ، قاہ، ۔۔۔ اور میں اپنی پسلیاں پکڑ کر، اگال دان میں دوبارہ ہنسی تھوکنے لگا۔

شاہ صاحب نے غصّہ بھری آواز سے کہا، مختار یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے کہ تم نے اپنے پیر کو خواب میں دیکھا، اور اس کا یہ اثر ہوا کہ تمھیں بیکار بیکار ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تمہارا قلب سیاہ ہوچکا ہے۔ میں تمھیں چالیس تعویذ دوں گا انھیں چالیس دن تک گھول گھول کر پینا اس سے جو شیطان تم پر مسلّط ہوگیا ہے۔ وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ مختار کے حواس بجا نہیں رہے تھے، انھوں نے، پھر قہقہہ مار کر کہا، اے حضور ایک تعویذ کو پورے چالیس دن تک کیسے پیتا رہوں گا۔ شاہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا، میں تمھیں چالیس تعویذ دوں گا، تم اسے ایک سمجھ رہے ہو۔ یہ سنتے ہی مختار نے قہقہے میں ڈھلی چیخ مار کر مجھ سے کہا۔ ارے جوش اپنا قلم دے دے، ترکیب استعمال لکھ لوں، قاہ، قاہ، قاہ، قاہ۔ میں نے قلم نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ ایک من کا ہوکر کانپنے لگا، اور، ایک زبردست قہقہہ میرا سینہ توڑ کر، ہوا میں گونجنے لگا، اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ شاہ صاحب اب یہ خاکسار چلا۔ اور مختار میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ارے قلم تو دے دو۔ اور اِسی عالم میں باہر آکر، ہم دونوں مسجد کے فرش پر گر کر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگے،

چوتھا واقعہ: وہ ایک زبردست عشق کے سلسلے میں بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ چلے گئے اور، وہیں پھر تجارت بھی کرنے لگے تھے، اور میں بھی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ عشق کو بہلانے اور بھلانے کی خاطر غالباً ۱۹۲۲ء میں کلکتہ چلا گیا تھا اور غالباً ڈھائی تین مہینے اُن کے ساتھ رہا تھا۔

میں اُن کی ناقابلِ شرح ہنسی کے تو بہت سے واقعات دیکھ چکا تھا، لیکن اُن کے ناقابلِ فہم رونے سے وہاں جاکر دوچار ہوا تھا۔

کلکتہ میں ایک فرنگی لڑکی پر جس کا نام تھا "مس ریبی"، وہ عاشق تھے اور وہ اس قدر

وفادار تھی کہ روز وقت نکال کر چار بجے سہ پہر سے آٹھ بجے رات تک وہ اُن کے پاس بلا ناغہ آیا کرتی تھی، لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ روز اس کے آتے ہی وہ رونے لگتے تھے، معشوق کی بے وفائی پر تو سب روتے ہیں، وہ معشوق کی وفاداری پر رویا کرتے تھے۔ اُن کی اس روش سے ان کی محبوبہ کو بھی تعجب ہوتا تھا، اور تاسّف بھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں مختار کو سمجھاؤں کہ وہ خوشی کے موقع پر رویا نہ کریں۔ میں نے انھیں سمجھایا بھی اور انھوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ اب نہیں روئیں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آئی اس اللہ کے بندے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ جب میں نے بہت غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ چوں کہ تصوّف کا جذبہ اُن کو اپنے باپ کے خون سے ملا ہے اور چوں کہ صوفیا کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ لذّات کی شیرینی میں غم کی چاشنی ملا دیا کرتے ہیں، اور یہاں تک کہ لذیذ کھانوں میں بھی پانی کی آمیزش کر کے ان کو بدمزہ بنا دیتے تھے، اس لئے مختار اپنی معشوقہ کے شربتِ دیدار میں اپنے آنسو گھول دیتے ہیں کہ مسرّت کی تیز دھار کند ہو جائے۔

وہ میرے ناقابلِ حل پیچیدہ عشق کو بھلانے کی خاطر، اکثر کلکتے کے حسینوں کے پاس مجھ کو لیجایا کرتے تھے، لیکن میرے دل میں کسی کی جگہ پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ — ایک روز وہ ایک نہایت حسین لڑکی کے کان میں کچھ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو وہ لڑکی میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی، میں مسکرا نہ سکا۔ پھر اس نے چٹ سے میرا بوسہ لے کر، میری گردن میں بانہیں ڈال دیں میں نے کہا۔ میں ان بانہوں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ اس نے جھینپ کر کہا۔ اللہ ری لکھنؤ کی نزاکت۔ ارے میں تو مختار کا چوتھا واقعہ بیان کر رہا تھا لے بیٹھا اپنا دکھڑا،

---

[1] وہ دور ایسا تھا کہ اپنے عشق کی بنا پر میرے دل میں تل بھر جگہ بھی خالی نہیں تھی، ورنہ "میبی" کے جمال کا وہ عالم تھا کہ اگر میرا دل "برائے کرایہ" خالی ہوتا تو میں اسے اپنے دل میں بسا لیتا۔ چلئے بہت اچھا ہوا ورنہ مختار کے سے جگری دوست سے تصادم ہو جاتا۔ اپنے اس عشق پر میں نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے ؂

تیرے پانے پہ بھی نہیں راضی ٭ تیرے کھونے پہ بھی نہیں طیّار۔

ہاں تو سنئے، اسی زمانے میں ایک دن مختار نے مجھ سے کہا۔ شبیر میں دنیا ترک کر کے اب اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ساری دکان فروخت کر کے اور زیبی کو اس کا روپیہ دے کر، ملیح آباد چلا جاؤں گا، اور کاکوری شریف کے سجّادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، وہیں کوئی حجرہ مجھے دلا دینا۔ وہاں بیٹھ کر ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دوں گا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا، ان کے سر پر ترک دنیا کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ نہیں مانے دکان کو غالباً ستّر ہزار میں فروخت کر کے انھوں نے اپنے پاس فقط دو تین سو روپے رکھ لئے اور باقی تمام روپیہ اپنی معشوقہ کے حوالے کر دیے، ہر چند وہ روپیہ قبول نہ کرنے اوران سے کلکتہ نہ چھوڑنے پر اصرار کرتی رہی، لیکن انھوں نے اس کی بات نہیں مانی، مجھے ساتھ لے کر ملیح آباد اور ملیح آباد سے میرے ساتھ، ٹمٹم میں سوار ہو کر کاکوری پہنچ گئے۔

خانقاہ کے گنبد پر نظر پڑتے ہی، میں نے کہا، دیکھو مختار۔ حبیب حیدر شاہ سے ہمارے تمہارے تین چار پشتوں کے تعلقات ہیں۔ اور پھر میں ان کا مرید بھی ہوں، اگر ان کے سامنے جا کر تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو یاد رکھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہ سنتے ہی مجھ سے لپٹ کر وہ اِس قدر روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں، اور جب ہچکیوں کا تار ٹوٹا تو، ڈبڈبائی آنکھیں اُٹھا کر، انھوں نے کہا، شبیر، تمہارا ہنسوڑ مختار تو اب مر چکا ہے، وہ اب جب تک جئے گا لگاتار روتا ہی رہے گا۔ اگر مزا ہے تو پچھلے پہر کے رونے میں۔ اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ میں ان کو حبیب حیدر شاہ کے پاس لے گیا، اُن کا اور ان کے باپ کا نام بتا کر درخواست کی کہ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرمایئے۔

شاہ صاحب ہر شخص کو مرید نہیں بناتے تھے لیکن چوں کہ میں نے درخواست کی تھی، اور وہ مختار کے پورے خاندان سے بھی واقف تھے، انھوں نے میری درخواست منظور کر کے ان کو حکم دیا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو۔ انھوں نے اس قدر طویل رکوع و سجود، اور اس درجہ اخلاص مندی کے ساتھ نماز پڑھی کہ عہدِ رسالت کے مسلمان یاد آ گئے۔ نماز پڑھ کر انھوں نے ان پورے روپوں کی مٹھائی منگائی جو کلکتہ کی دکان کے باقی رہ گئے تھے، اب مالِ دنیا میں ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں تھی۔

اب حبیب حیدر شاہ ان کو اپنے روبرو بٹھا کر، حسب دستورِ قدیم، ان کا ہات، اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام لے لے کر ان سے یہ کہلانے لگے کہ میرا یہ ہات فلاں فلاں بزرگوں کے ہات[1] پر ہے۔

غالباً تراب علی شاہ قلندر کا نام لے کر، شاہ صاحب نے مختار سے کہا اب کہو کہ یہ میرا ہات مجاً شاہ قلندر کے ہات پر ہے ۔ مجا شاہ قلندر کا نام سنتے ہی، مختار پر دفعتہ خاموشی طاری ہوگئی۔ شاہ صاحب، اس خیال سے کہ ان پر رقت طاری ہوگئی ہے دو منٹ کے واسطے، خاموش ہوگئے۔ اور جب ٹھہر کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا، ہاں تو کہو میرا یہ ہات مجاً شاہ قلندر کے ہات پر ہے۔ تو، انھوں نے، پھُریری سی لے کر، کہا حضور" اُن کے اس طویل الصوت" حضور" کو سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور سمجھ گیا کہ اب پل بھر میں کیا ہونے والا ہے ۔ اس لئے میں نے ٹھان لی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوں، ـــــــ لیکن یہ سوچا کہ اگر جوتے پہن کر جانے لگوں گا تو شاہ صاحب پوچھ بیٹھیں گے کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ اس لئے آؤ دیکھا نہ تاؤ،

اور ایک دقیقہ ضائع کئے بغیر، میں جھٹ سے اٹھا اور شاہ صاحب کی نظر بچاکر، ان کی بائیں ہات کے برآمدے میں گیا اور پاکھے سے لگ کر، چوروں کی طرح کھڑا ہوگیا وہ برآمدہ آٹھ دس فیٹ بلند تھا۔ اور جھانک کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگ سکتا ہوں کہ نہیں۔

اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ مختار میاں نماز میں تاخیر ہوجائے گی، جلد ان منازل سے گزر جاؤ اور کہو کہ میرا یہ ہات مجاً شاہ صاحب کے ہات پر ہے۔

شاہ صاحب کے ہونٹوں کی جنبش ابھی ختم ہوئی تھی کہ ان کے خارا شگاف قہقہے سے خانقاہ کے تمام سقف و بام گونج اٹھے ۔

شاہ صاحب نے گھبرا کر ان کا ہات چھوڑ دیا، اور تیز تیز قدم رکھتے مسجد چلے گئے

---

[1] تمام ناموں کے بعد حضرت علی کا نام لیا جاتا تھا۔ اور پھر بیعت مکمل ہوجاتی تھی۔

میں ننگے پاؤں دھم سے کود پڑا، اور اپنی باہر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کی طرف بھاگا۔ اُن کے قہقہے اور ان کے یہ الفاظ میرا تعاقب کرنے لگے کہ حضور، ایسا نام تو کبھی سُنا ہی نہیں تھا، اللہ اکبر، مجاؔ شاہ قلندر، ہاہا، ہاہا، ہاہا، ہاہا ۔ ارے شبیر، کہاں غائب ہوگئے ہو ارے مجھے سنبھالو۔ دم نکلا جارہا ہے میرا اُف۔ اُف مجاؔ شاہ۔ ارے توبہ قاہ، قاہ، قاہ، قاہ، قہا، ہا، ہا، ہا، ہا۔

قاضی خورشید احمد

ریاضی استاد، شاعر و نقاد، فارسی و سنسکرت ماہر، مکذب بدیہیات، طفل حرکات اخلاص شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امروپسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ، بباطن یگانہ اور :-

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

قسم کے ایک ایسے سنکی انسان تھے جن کو نفسیات کے ماہر غور و فکر کا ایک اہم موضوع بنا سکتے تھے، ان کے سے کثیر الجہات آدمی کے تمام خصوصیات اور گفتنی ناگفتنی حالات پر اگر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھاؤں تو ایک دفتر ہو جائے — لیکن چونکہ میں بڑی تیزی کیساتھ غروب ہو رہا ہوں اور اس جھٹپٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا۔ اس لئے اُن کی زندگی کے چند ہی پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

وہ جھانسی، اٹاوہ اور الہ آباد کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے، اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے بعد مسلمانوں میں ریاضی کے سب سے بڑے ماہر تھے — ریاضی دانوں کو بالعموم ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دریائے ادب کے بھی پیراک اور اس قدر زود گو شاعر تھے کہ جب کبھی اُن کے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک نشست

---

[1] قصبہ تھونہ ضلع سیتاپور کے باشندے تھے۔

ہیں ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ (Mass production) یعنی وافر پیداواری تکثرآفرینی یا انبار ابداعی میں بڑھیا مال تو پیدا نہیں ہو سکتا پھر بھی ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اچھے شعر بھی جھلک اُٹھا کرتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں وہ دو بار مجھ سے بگڑ بھی گئے تھے۔ پہلی بار تو شفق پر میری نظم سن کر انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جلدی جلدی کہا تھا۔ یہ مناظر کی شاعری انگریزوں کو مبارک ہو مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انگریزی پڑھ کر آپ نے اپنی شاعری خراب کر ڈالی ہے۔ بالکل خراب۔ اور دوسری بار۔ میری ایک فارسی آمیز غزل مسلسل کو سن کر انھوں نے کہا تھا۔ آپ مہربانی فرماکر ایران تشریف لیجائیں۔ ایران۔ آپ کو مطلق اردو نہیں آتی۔ مطلق، مطلق مطلق نہیں آتی۔ ہر چند میں نے اپنا اب تک کوئی تخلص تجویز نہیں کیا ہے، اس کے باوجود آپ سے بہتر، کہیں بہتر شعر کہتا ہوں۔

اس پر میں نے ہات جوڑ کر کہا تھا۔ ارے قاضی۔ خدا کے لیے تخلص نہ رکھ لینا ورنہ میں تو خاک میں مل کر رہ جاؤں گا۔

اب اُن کے انتقاد کی شان بھی دیکھ لیجیے، اُن کو جب یہ شعر سنایا گیا ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو انھوں نے زور سے منھ جھٹک کر کہا لاحول، بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے۔ شاعر صاحب اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے میں ہزاروں سجدے پھُدک رہے ہیں لیکن جب تک تو اطلاق و تنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھپن چھری یعنی چانکی بائی آف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آئے گا، میں تیری بارگاہ میں ایک بھی سجدہ نہیں کرونگا اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانتِ الٰہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ مجھے اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے، ذرا ان کو بھی پرکھ کر دیکھ لیجیے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو، ترے عفو بندہ نواز میں

اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے جس قدر بھی اودے، نیلے، پیلے، سفید اور دھانی گناہ کئے تھے وہ جب "عفو بندہ نواز" کے تنبو کے دروازے پر پناہ مانگنے آئے تو انھیں بھگا دیا گیا، لیکن شاعر صاحب کے جب حبشیوں کی طرح کالے کلوٹے گناہوں نے درخواست کی تو انھیں فوراً پناہ دے دی گئی۔

کاش کوئی اللہ میاں سے جا کر پوچھے کہ آپ کو انسان کے حبشی گناہوں پر کیوں پیار آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر کے پہلے مصرعے میں "جہاں" کا لفظ انتہائی حشو ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھئے ؎

کبھی قبلہ رُخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عراقی کے شعر کا پرتو ہے ؎

بحرم جو سجدہ کردم زحرم ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

اور دوسری بات یہ ہے کہ مصرعۂ اول کے جُزوِ اول یعنی "کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا" میں ایک ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے جس کو میں زبان پر نہیں لا سکتا۔ توبہ توبہ "کھڑا ہوا" ایسی فحاشی معاذ اللہ۔

ایک روز میں نے ان کو اپنا ایک مطلع سنایا ؎

حرم کو جاتا ہے کچھ دل سے ساز کرتا جا
طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا

انھوں نے منھ بنا کر کہا۔ میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں۔ اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر ہندوستان کی سکونت ترک فرما کر ایران تشریف لے جائیں۔ جی ہاں۔ ایران، ایران، ایران تشریف لے جائیں۔ اور وہاں جا کر "طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز" کی

فارسی خوب بگھارتے پھریں۔ اس کے علاوہ پہلے مصرعے میں "جاتا" کا الف گر رہا ہے۔ ہر چند قدما کے نزدیک حروفِ اصلی کے سوا اور تمام حروف گرائے جا سکتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ اس طرح اسقاطِ حروف سے شعر کی موسیقی خراب ہو جاتی ہے۔ اور ایک عیب اس شعر میں اور بھی ہے۔ "طواف کرنا" فصیح زبان ہے۔ آپ نے پہلے "طواف" اور بعد کو "کرتا جا" کہہ کر اس قدر تعقید پیدا کر دی ہے کہ شعر کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ اور ایک بڑی نازک بات اور کہتا ہوں۔ آپ نے "طواف" میں اضافت کا دم چھلا لگا کر "طواف کرتا جا" کو "طوافے کرتا جا" کی آواز میں مبدل کر دیا ہے۔ جو صحیح ہونے کے بعد سراسر مکروہ ہے۔

اُن کی ہیئت کچھ ایسی عجیب تھی کہ جب کسی اجنبی کی نگاہ ان کی طرف اُٹھ جاتی تھی تو وہ بھوچکا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ اُن کا قد لانبا تھا، رنگ سانولا، منھ پر ایک عجیب سی فرنچ کٹ داڑھی تھی، آنکھوں پر بھیانک سی عینک، ان کی ترکی ٹوپی اُن کے ماتھے پر اپنے پھندنے کی سونڈ ہلایا کرتی تھی، کسی سے گفتگو کرتے تھے تو اُن کا لعابِ دہن اُڑ اڑ کر سامع کے منھ پر آیا کرتا تھا۔ اور آواز کے ایسے متصل جھٹکوں، اور الفاظ کی ایسی مسلسل تکراروں کے ساتھ، گھبرا گھبرا کر جلدی جلدی باتیں کیا کرتے تھے، گویا گھانس کاٹنے کی مشین چل رہی ہے۔ یہ بھی اُن کی ایک خاص ادا تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی ہر بات کے ابطال پر ہر وقت تلے رہتے تھے۔

ہر چند وہ "آبِ حیات" کی زبان کے خود بڑے معترف تھے۔ لیکن ایک روز جبکہ میں اُن کے وہاں مہمان تھا، اور کسی صاحب نے اُن کے روبرو "آبِ حیات" کی زبان کی تعریف کی تھی تو انھوں نے حسبِ عادت اُن کی اس رائے کا ابطال کرتے ہوئے کہا تھا کہ محمد حسین آزاد کو تو زبان کی ہوا تک نہیں لگی تھی، وہ تو بالکل ہی بوڑم آدمی تھے۔ اور جب کسی نے اُن کے روبرو میرزا غالب کے باب میں یہ کہا تھا کہ غالب ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا تو انھوں نے بڑی برہمی سے کہا تھا کہ اجی غالب۔ وہ حضرت تو فارسی میں سوچتے اور اُردو میں شعر فرماتے تھے۔ لاحول ولا قوت۔

ان کے ابطال کی یہ لے یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ بدیہیات تک کی تکذیب پر اُتر آتے تھے۔ مثلاً ان سے اگر کوئی شدتِ سرما کی شکایت کرتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے

اجی سردی وردی کیسی، شاید آپ نے کسی اخبار میں پڑھ لیا ہے کہ سردی پڑ رہی ہے سردی کا تو کہیں نام بھی نہیں ہے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی بات بھول کر کہنے لگتے کہ یار آج تو ایسی سردی پڑ رہی ہے کہ دانت بج رہے ہیں۔

اُن میں ساری دُنیا سے جُدا ایک بات ایسی بھی تھی، جو اُن کے سوا میں نے اس دنیا کے کسی آدمی میں آج تک نہیں پائی ہے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ جب ان کا کوئی بچھڑا دوست برسوں کے بعد بھی ان سے ملنے آتا تھا تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، دوڑ کر گلے لگانا اخاہ کہہ کر خیر مقدم کرنا یا مزاج پوچھنا، یہ ساری باتیں ان کے معمولات سے یکسر خارج تھیں، اور برسوں کا بچھڑا چہیتا دوست بھی جب اُن کے گھر جاتا تھا تو وہ اس کو اس طرح دیکھتے تھے گویا وہ ایک گھنٹہ پیشتر ان کے پاس بیٹھا تاش کھیل رہا تھا، اور اب دوبارہ آگیا ہے۔

لگے ہاتھوں اُن کی سنک کے بھی چند واقعات سن لیجیے۔ ایک بار کوئی پانچ چھ برس کے بعد میں اُن سے ملنے جھانسی گیا دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا قاضی صاحب آداب، انھوں نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور بڑی سپاٹ سی آواز میں سلام کا جواب دے کر پھر لکھنے میں غرق ہوگئے۔ دوسرا ہوتا تو بگڑ جاتا کہ انھوں نے میری آمد ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ میں ان کا مزاج شناس تھا، میں نے بُرا نہیں مانا۔ اور وہ برابر لکھتے رہے۔

جب لکھ چکے تو میری طرف نگاہ اُٹھا کے کہا۔ جوش میاں! ہم ایک معمہ حل کر رہے تھے۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا کہ معمہ حل کر لیا۔ اب یہ بتاؤ کہ مزاج کیسا ہے؟ میری مزاج پرسی ان پر بہت گراں گزری، انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو میرے آنے سے پیشتر وہاں موجود تھے، میری جانب اشارہ کر کے کہا۔ آپ جانتے ہیں ان کو؟ یہ ہیں حضرت جوش ملیح آبادی، ان کے دوست ہڑ بڑا کر مصافحے کے لئے اٹھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا۔ نہیں، نہیں نہیں۔ ان سے ہرگز مصافحہ نہ کیجیے، ہرچند یہ میرے بہت ہی پرانے یار ہیں مگر آتے آتے انھوں نے مزاج پرسی کے ذریعے سے مجھ پر وار کر دیا ہے۔ میں نے کہا ارے قاضی وار کیسا؟ یہ کیا بک رہا ہے۔ انھوں نے کہا۔ کئی روز سے میری طبیعت خراب تھی، آج ارادہ کر چکا تھا کہ جلاب ضرور پیوں گا، لیکن معمہ حل کرنے میں جلاب پینا ہی نہیں یہ

بات بھی بھول گیا تھا کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے۔ اور اِس بھول کی بنا پر ناشتہ منگوانے ہی والا تھا کہ تم نے مزاج پُرسی کر کے یہ بات یاد دلا دی کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اگر میرا ناشتہ روک کر مجھ کو جلاب پینے پر مجبور کر دیا۔ یہ ہے تمہاری دوستی۔ اب تم مزے سے ناشتہ کروگے اور میں کم بخت رو رو کر جلاب پیوں گا۔

ابھی یہ سنک چل ہی رہی تھی کہ ایک نہایت خوش رو نوجوان اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے آیا۔ اور انھیں سلام کر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا، وہ اس خوبرو نوجوان کو اپنی داڑھی کھجا کھجا کر گھورنے لگے اور ایسا لگا جیسے وہ کوئی بات یاد کرنے کی سعی کر رہے ہیں — جب انھوں نے اس کو بار بار گھورا اور داڑھی کھجائی تو میں نے کہا۔ گھورے ہی چلے جاؤگے یا کوئی بات بھی کروگے۔ انھوں نے کہا۔ جوش میاں! اس سے تمہیں کیا غرض، کیا غرض، کیا غرض، میں تو ان نوجوان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ پھر پوچھتے کیوں نہیں؟ انھوں نے سہ بارہ داڑھی کھجا کر اس نوجوان سے کہا۔ میاں صاحبزادے۔ ہمارا حافظ بالکل بالکل بالکل خراب ہو چکا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کبھی آپ کو استعمال میں لا چکے ہیں کہ نہیں؟[1]

یہ سن کر وہ نوجوان نہایت غصہ میں بھرا اٹھا، بڑے کھڑاکے سے کرسی پیچھے ڈھکیل دی اور بڑے زور سے کھٹ کھٹ کرتا زینہ سے اُتر گیا۔

اس کے جاتے ہی انھوں نے کہا۔ اگر یہ کسی شریف خاندان کا آدمی ہوتا تو اس سنجیدہ بات پر کبھی نہ بگڑتا، ہو نہ ہو یہ بدقوما ہے، بدقوما ہے، بدقوما .... سالا بدقوما۔ کہیں کا۔ ہونہہ۔

ایک روز ایک نومشق و نوجوان شاعر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ انھیں ایک سہرا کہہ کر دے دیں، جس کو وہ کسی رئیس کے لڑکے کی شادی میں پڑھیں گے، اور ان غریب

---

[1] فاضی نے بڑے عُریاں الفاظ میں پوچھا تھا۔ میں نے اسے کسی قدر شائستگی کے سانچے میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

کو کچھ مل جائے گا؛ انھوں نے کہا؛ بہت اچھا۔ میں بہت تڑکے فکرِ سخن کرتا ہوں، آپ کل ٹھیک آٹھ بجے صبح کو آجایئے گا۔ سہرا طیار ملے گا۔ طیار ملے گا۔ طیار ملے گا۔ اُن بیچارے شاعر کی شامتِ اعمال کہ وہ صبح کو چھ بجے ہی آگئے۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا: میں نے تو آپ کو آٹھ بجے بلایا تھا۔ شاعر بیچارے نے دانت نکال کر کہا۔ میرا جی چاہا کہ یاددہانی کر دوں۔ انھوں نے بگڑ کر کہا۔ یاددہانی۔ یاددہانی۔ یاددہانی تو جھوٹوں کو کی جاتی ہے۔۔۔ آپ نے مجھے جھوٹا سمجھا۔ جھوٹا۔ جھوٹا۔ جھوٹا؛ یہ کہتے ہی انھوں نے وہ پرچہ جس پر وہ سہرے کے چند اشعار لکھ چکے تھے چاک کرکے فرش پر پھینک دیا؛ اور شاعر ماتھا پیٹتا ہوا چلا گیا۔

ایک روز میں ان کو اپنے ساتھ موٹر میں لئے باغ عامہ جارہا تھا کہ چوراہے پر میرے ایک مولانا قسم کے دوست نے موٹر ٹھہرانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹر روک لی۔ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ایں۔ موٹر کیوں روک لی۔ میں نے مولانا کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ آپ کے ایما سے۔ قاضی صاحب نے مجھ سے ان کا نام پوچھا۔ میں نے کہا۔ مولانا عبدالعزیز؛ انھوں نے کہا۔ مولانا عبدالعزیز۔ ہٹ جایئے۔ ہٹ جایئے۔ ہٹ جایئے۔ ہمارے پروگرام میں یہ بات داخل نہیں تھی کہ ہم اس چوراہے پر آپ کے لئے موٹر روک دیں گے، جایئے۔ جایئے۔ جایئے اور پھر مجھ سے کہا۔ فوراً موٹر اسٹارٹ کردو۔ اسٹارٹ کردو۔ ورنہ میں اُتر جاؤں گا۔ میں نے موٹر اسٹارٹ کردی اور مولانا بیچارے مُنہ دیکھتے رہ گئے؛

ایک بار میں اُن کے وہاں جھانسی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کو انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ جوش میاں۔ میرے ساتھ کالج چلوگے۔ کالج۔ کالج۔ کالج؟۔ میں نے کہا۔ ضرور چلوں گا۔ انھوں نے ملازم سے پکار کر کہا۔ ناشتہ۔ لاؤ ناشتہ۔ ناشتہ۔ ناشتہ؛

جب ناشتہ چن دیا گیا تو ان کے یہاں جو ایک دوسرے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی دسترخوان پر آکر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی انھوں نے کہا۔ نہیں نہیں نہیں آپ کا ناشتہ بعد کو آئے گا، بعد کو بعد کو بعد کو یہ فقط کالج۔ کالج۔ کالج جانے والوں کا ناشتہ ہے؛ اور وہ پانی پانی ہوکر دسترخوان سے اٹھ گئے۔

ایک روز میں اُن کے ساتھ کھانا کھارہا تھا۔ اثنائے طعام میں انھوں نے مجھ سے کہا جوش میاں تمھاری یہ برکت ہے کہ آج خالص گھی کا کھانا کھارہا ہوں۔ ورنہ چھ مہینے سے شبیر[1] مجھ کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا تھا۔ اور جب کھانا ختم ہوگیا تو شبیر نے قہقہہ مار کر مجھ سے کہا پورے چھ مہینے سے اعلیٰ سے اعلیٰ گھی لا لا کر کھانا پکوا رہا تھا۔ اور ہر بار قاضی صاحب یہی شکایت کرتے تھے کہ میں ان کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا ہوں۔ اور آج جبکہ میں نے تیل میں کھانا پکوایا ہے تو قاضی صاحب اس کو خالص گھی کہہ رہے ہیں۔

ایک بار کچھ ایرانی مذاق کے شکایات سے متاثر ہوکر محکمۂ تعلیمات نے اُن کو پرنسپلی کے عہدے سے ہٹا کر وائس پرنسپل بنا دیا لیکن تنخواہ وہی پرنسپل والی رکھی۔ اُنھوں نے اس خوشی میں کہ وائس پرنسپل بن کر اُن کی ذمہ داریاں تو بہت کم ہوگئیں، لیکن تنخواہ میں کمی نہیں ہوئی، بڑی دھوم سے ہم لوگوں کی دعوت کی۔ کھانا زیادہ تھا اور برتن کم تھے۔ اور جب اُن کے سالے نے کہا پلاؤ کاہے میں دیں برتن تو باقی نہیں رہے تو انھوں نے کہا کوئی بات نہیں چار پانچ کموڈ راکھ سے دھلوا کر لے آؤ۔ میں نے کہا گھانس کھا گیا ہے قاضی، اب کموڈ میں پلاؤ کھلوائے گا۔ انھوں نے بگڑ کر کہا، بس پتا چل گیا کہ تم ہو کیا، بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے ہو۔ تم سالے سو فی صدی بورژوا ہو۔ بورژوا ہو۔ بورژوا ہو۔ بورژوا۔ اس بات پر تمام مہمانوں نے کہا قاضی صاحب۔ فقط جوش صاحب ہی نہیں ہم سب کے سب بورژوا ہیں۔ بورژوا۔ ہم میں سے کوئی بھی کموڈ میں نہیں کھانے کا۔ انھوں نے کہا۔ جہنم میں جاؤ تم سب بورژواؤ اور وہ کموڈ میں پلاؤ کھانے لگے۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک بار حکیم آشفتہ مرحوم کی جو شامت آئی تو اُنھوں نے رفاہ عام کے ایک بہت بڑے مشاعرے کا قاضی کو صدر بنا دیا۔ اور جب ہال کھچا کھچ بھر گیا تو وہ صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے سب سے پہلے تو انھوں نے شاعری کی ماہیت بیان کی پھر فارسی عربی، سنسکرت اور انگریزی شعرا کے کلام پر سرسری سا تبصرہ کیا۔ اور بات جب اُردو غزل تک آئی تو انھوں نے کہا کہ پچانوے فیصد غزل گو نہ کسی پر عاشق ہوتے ہیں نہ رندی کے طریقوں سے واقف ہوتے ہیں نہ شراب پیتے ہیں اور نہ بے دین ہی ہوتے ہیں، مگر اُن سب

---

[1] ان کے سالے کا نام

کی غزلوں کا مدار ہوتا ہے عاشقی، رندی، شراب خوری اور کافری پر ان کی تمام شاعری فقط روایتی ہوتی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے سارے غزل گو چوتیے ہوتے ہیں۔ چوتیے۔ چوتیے۔ چوتیے اور دس منٹ کے اندر، تمام بھرا ہوا ہال خالی ہوکر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

اُن کی ایک انوکھی جنگ سننے سے پیشتر یہ بات ذہن نشین فرمالیجیے کہ وہ اپنے جنسی مشاغل کو ایک نہایت مقدس فریضۂ انسانی سمجھتے تھے۔ اگر اُن کے اس ایرانی مذاق کے خلاف کوئی ایک کلمہ بھی زبان سے نکلتا یا اس میں استہزار کا کوئی پہلو پیدا کرتا تھا تو وہ اس کو "مداخلت فی الدین" سمجھکر جامے سے باہر ہوجاتے تھے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد، اب سنیئے کہ شام کا وقت تھا، وہ اپنے لاٹوش روڈ والے مکان کی مہتابی پر میرے ساتھ بیٹھے بادہ خواری کا شغل کر رہے تھے کہ رفیع احمد خان آگئے اور چھوٹتے ہی پوچھنے لگے کہ قاضی صاحب۔ اب کبھی "انفعالیّت" کو بھی جی چاہتا ہے کہ نہیں۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا ـــــ بے شک۔ کبھی کبھی ضرور جی چاہتا ہے کہ اس چیز کو بھی برت کر دیکھ لوں رفیع نے کہا تو پھر بسم اللہ انھوں نے جواب دیا کہ فقط دو چیزیں مانع ہیں ایک تو تکلیف دوسرے اسکینڈل (رسوائی) اور جب رفیع نے ان دونوں کا حل پیش کر دیا تو انھوں نے کہا۔ اگر آپ اس کا ذمہ لیتے ہیں تو میں بڑی خوشی سے طیّار رہوں۔ اُن کی اس آمادگی پر رفیع کا قہقہہ نکل گیا۔ کہہ چکا ہوں کہ ان معاملات میں استہزار کو قطعی طور پر "مداخلت فی الدین" سمجھتے تھے۔ اس لئے رفیع کے قہقہے پر وہ جامے سے باہر ہوگئے، اور کہا۔ پہلے اپنی . . . . . خانم کا چال چلن درست کر لیجئے پھر مجھ پہ ہنسیے گا۔

رفیع پٹھان تھے۔ یہ سن کر آگ بگولا ہوگئے اور تڑ سے ان کو ماں کی گالی دیدی۔ قاضی نے گالی سنتے ہی اپنا سیدھا ہات بلند کرکے کہا غلط درغلط جوش میاں غور کرو انھوں نے مجھ کو گالی دی مجھ کو مطلق غصہ نہیں آیا اس لئے کہ گالی شدتِ غضب کی ایک مہمل اسی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کو میری بات پہ غصہ آگیا۔ اس لئے کہ وہ بات فیکٹ (حقیقت) ہے اور سچی بات پر لوگوں کو غصہ آجاتا ہے۔

رفیع نے پھر بآوازِ بلند ان کو ایک اور موٹی سی گالی دی۔ انھوں نے پھر اپنا سیدھا ہات بلند کر کے کہا۔ غلط در غلط۔ جوش میاں۔ مہلیّت ان کی طرف ہے اور واقعیّت میری جانب۔ اِس لئے میں اِن کی بات کا بُرا نہیں مان رہا ہوں۔ اور یہ انگارے کی طرح دہکتے چلے جارہے ہیں۔ رفیع ان کے اس طرزِ عمل سے سخت اُلجھن میں پڑ گئے کہ وہ مجھے حملہ کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ اُن کی ذہنی کوفت کو بھانپ کر میں ان کو وہاں سے اُٹھا کر۔ زبردستی نیچے لے آیا۔ اور جب ہم دونوں سڑک پر آگئے تو دیکھا کہ قاضی صاحب اُوپر سے جھانک رہے ہیں اور چاندنی رات میں ان کی فرنچ کٹ داڑھی کا عکس زمین پر پڑ رہا ہے ابھی ہم دو قدم ہی چلے تھے کہ اوپر سے ان کی آواز آئی۔ خاں صاحب اپنی.....خانم کا چال چلن درست کر لیجئے۔ پھر مجھ پر ہنسئے گا۔ رفیع نے مُنھ اُٹھا کر کہا ابے تیری تو ماں کی..... اور انھوں نے کوٹھے سے کہا۔ غلط در غلط۔ اور جب میں غصہ سے کانپتے رفیع کو گھر پہنچا کر پلٹا تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ جنگ۔ جس کے ایک سرے پر ماں کی گالی تھی اور دوسرے سرے پر غلط در غلط کے نعرے تھے۔ خون خچر کے بغیر ہی ختم ہوگئی۔

قاضی صاحب میں سنجیدگی اور مجلسی تہذیب کی مطلق صلاحیت نہیں تھی اور اس کرّہ ارض پر انھوں نے اس طرح زندگی کاٹ دی جس طرح لڑکے بورڈنگ میں رہا کرتے ہیں میرے اس قول کی تصدیق مندرجۂ ذیل واقعہ سے حرف بحرف ہوجائے گی:۔

ایک بار انھوں نے جبکہ۔ حیدرآباد دکن میں وہ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ میں اُن کو مہاراجہ کشن پرشاد صاحب سے ملا دوں۔ میں نے کہا قاضی۔ تم دونوں میں بُعدِ مشرقین ہے۔ تم اول جلول مطلق العنان اور آزاد رو انسان ہو اور مہاراجہ کا ہر بن مو تہذیب کے آئین و آداب میں گُندھا ہوا ہے۔ وہ مشرقی وضع داری کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس وقت اُن کی عمر ستّر سے متجاوز ہے۔ لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود کیا مجال کہ مجلس میں وہ صوفے سے پیٹھ لگا کر۔ یا پاؤں پر پاؤں رکھکر۔ یا ٹوپی اتار کر بیٹھ جائیں۔ یہ سنا تو انھوں نے کہا۔ کیا میں کوئی کنجڑا۔ قصائی۔ دُھنیا۔ جلاہا ہوں کہ تم مجھے اُن

مجھے اُن سے ملنے کے قابل نہیں سمجھتے ہو میں ہندوستان جنت نشان کا باشندہ ہوں، افریقہ کا رہنے والا نہیں مشرقی تہذیب تو میرے گھر کی لونڈی ہے تم مُخنّچو ہو، تم نے مجھے سمجھ کیا رکھّا ہے۔ میں نے کہا اچھا بھائی نہیں مانتے ہو تو کل ملا دوں گا دوسرے دن مہاراجہ کے دربار کے آداب سلام و اسالیبِ نشست و برخواست سے اُن کو بخوبی آگاہ کرکے انھیں مہاراجہ کے پاس لے گیا۔

مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی انھوں نے السّلامُ علیکم کا پتھر کھینچ مارا۔ تمام دربار میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے دل ہی دل میں کہا "وہ مارا"

مہاراجہ نے پوچھا قاضی صاحب کیا آپ پہلی بار حیدرآباد تشریف لائے ہیں؟ انھوں نے کہا۔ جی ہاں، پہلی، جی ہاں بالکل پہلی بار۔ بالکل پہلی بار۔ مہاراجہ نے پوچھا، دکن کو آپ نے کیسا پایا؟ قاضی نے کہا لاحول ولاقوۃ، یہاں کے لوگوں کو اردو نہیں آتی۔ بالکل اُردو نہیں آتی ریل سے اُترتے ہی تار گھر پر نظر پڑی دیکھا کہ اس کے بورڈ پر "تاریں" لکھا ہوا ہے ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ "تار مذکّر ہے اسمائے مذکّر کی جمع اس طور سے بن ہی نہیں سکتی اور پرسوں ایک صاحب جوش میاں سے خان ساماں کو لے کر آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے سو آج تک وہ پلٹ کر نہیں آئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے آدمی پرلے درجہ کے جھوٹے ہیں۔ جھوٹے۔ جھوٹے۔ جھوٹے ہیں۔"

اہلِ دربار میں یہ سن کر حیرت کی لہر دوڑ گئی اور مہاراجہ کے چہرے پر انفعال مچلنے لگا لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیسا جنا ور پکڑ لائے ہو۔ میں نے آنکھیں جھکالیں

مہاراجہ کی تہذیب دیکھئے کہ اُن کے مُنھ پر اُن کے وطن کو اور وہ بھی برسرِ دربار وعلیٰ رؤسُ الاشہاد بُرا بھلا کہا گیا لیکن ہر چند اُن کے چہرے پر تو پشیمانی کا رنگ دوڑا مگر زبان سے اُف تک نہیں کی۔

قاضی کی اس برّاں گفتاری کو ضبط کرنے میں دو تین منٹ لگ گئے مہاراجہ کو۔ اور انھوں نے اپنی خوش خلقی کا سہارا لے کر مجھ سے کہا —— جوش صاحب آپ کی زبانی یہ معلوم کرکے کہ قاضی فقط ریاضی داں ہی نہیں شاعر بھی ہیں مجھے اشتیاق پیدا

ہوگیا ہے کہ اُن کے کلام سے بہرہ اندوز ہوں قاضی نے کہا۔ نہیں، نہیں، نہیں، مجھے اپنا کلام یاد نہیں، مطلق، مطلق یاد نہیں یہ کہہ کر قاضی نے اپنا سید ھا ہات اُن کی طرف پھیلا دیا اور بار بار انگلیاں اُٹھا اُٹھا اور جُھکا جُھکا کر کہنا شروع کردیا۔ آپ کچھ سنائیں سنائیں، سنائیں۔ آپ کچھ سنائیں۔ ان کی اس لونڈوں کی سی حرکت پر میں عرق عرق ہوکر رہ گیا۔ دل میں سوچا کہ دنیا میں کلام سنانے کی کہیں اس طرح بھی فرمائش کی جاتی ہے۔ مگر اللہ ری مہاراجہ کی خوش خلقی، اس ادائے فرمائش کو بھی پی گئے، اپنی بیاض منگائی کہا کہ میں کل سے بیحد گلوگرفتہ ہوں۔ جوش صاحب آپ کوئی غزل اس بیاض سے سنادیں۔

ہرچند قاضی کی حرکتوں سے میں دریائے شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی موڈ پر قابو پا کر میں نے مہاراجہ کی دو غزلیں قاضی کو سنادیں۔ انھوں نے میز پر اپنی ٹوپی پٹک کر کہا۔ میاں جوش بہت غنیمت مہاراج نہ دہلوی ہیں نہ لکھنوی لیکن اچھے شعر کہتے ہیں۔ اور وہ بھی ہندو ہوکر ہندو ہوکر قاضی صاحب کے اس ریمارک سے مجھ پر اور پورے دربار پر بجلی سی گر گئی ہر طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اتنے میں سونے پر سہاگہ وہ ٹوپی تو اتار کر پھینک ہی چکے تھے اب انھوں نے پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیا اور جب میں نے آنکھ بچاکر ان کو ٹہوکا دیا تو وہ حسب عادت قدیم اوں اوں اوں اوں کرنے لگے۔ اب وہاں بیٹھا رہنا میرے لئے ناممکن ہوچکا تھا۔ اس لئے میں نے مہاراجہ سے جھینپے ہوئے چہرے، جھکی ہوئی آنکھوں اور رُندھی ہوئی آواز میں رخصت کی اجازت طلب کی اور رندھی ہوئی آواز میں ڈوبتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ نیچے آگیا۔ اور آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے اپنی موٹر کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس پر دھوآں سا چھایا ہوا ہے۔ میں لبصد ہزار دشواری موٹر کا دروازہ کھول کر ایک کراہ کے ساتھ گدی پر گر گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ابھی گاڑی نہ اسٹارٹ کروں ورنہ کہیں ٹکرا دوں گا ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں چوب دار ہانپتا آیا اور کہا کہ سرکار یاد فرمارہے ہیں یہ سنتے ہی جی سن سے ہوکر رہ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب مہاراجہ کو کس طرح مُنھ دکھاؤں گا۔ سیڑھیوں پر من من بھر کے قدموں سے چڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ میں اپنے کو نہیں پانچ

ہاتھیوں کو زینے پر چڑھا رہا ہوں۔

جھکے سر اور بوجھل پپوٹوں کے ساتھ جب مہاراجہ کے پاس گیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا کل رات کو آپ اور قاضی صاحب یہیں ماحضر تناول فرمائیں گے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا۔ مہاراج مجھ کو آپ کی اس سنّتِ جاریہ کا علم ہے کہ جب آپ کا کوئی نیازمند اپنے مہمان کو آپ کی خدمت میں لاتا ہے تو آپ اس کی میزبانی فرماتے ہیں۔۔ لیکن میری یہ استدعا ہے کہ۔۔ میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ مہاراجہ نے جلدی سے میری بات کاٹ کر فرمایا جوش صاحب آپ ہرگز شرمندہ نہ ہوں۔ میں قاضی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں، اس لئے کہ اس قیامت کا بے لوث، نڈر، بے جھجک اور صاف گو انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جن کو تہذیب ریاکار بنانے میں ناکام ہو کر رہ گئی ہے مہاراجہ کی ان باتوں سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا، اور اُن کی دعوت منظور کر کے گھر آگیا۔

گھر آکر میں نے قاضی سے شکایت کی وہ اُلٹے مجھ پر برس پڑے اور کہنے لگے اب تم نواب فقیر محمد خان بہادر کے پوتے نہیں جلی پیادے بن کر رہ گئے ہو تمہاری رگ و پے میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔ میں نے کہا قاضی اگر تہذیب کی نگہداری غلامی ہے تو میں غلام میری سات پشتیں غلام

انھوں نے کہا۔ اگر تم مناسب نہ سمجھو تو میں کل مہاراجہ کے پاس نہ جاؤں۔ میں نے کہا جانا تو پڑے گا لیکن یہ وعدہ کرو کہ کل شروع سے آخر تک خاموش رہو گے۔ انھوں نے کہا بہت اچھا آپ کی محبّت میں اسے بھی گوارا کریں گے اور حضرت چُپ شاہ قلندر، چُپ شاہ قلندر بنے بیٹھے رہیں گے۔

دوسرے دن جب ہم مہاراجہ کا زینہ طے کر رہے تھے، انھوں نے کہا۔ سنتا ہوں اربابِ دکن چپاتی نہیں کھاتے، چاول کھاتے ہیں میں نے کہا بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے لیکن شاندار دعوتوں میں چپاتیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر چپاتیاں نہ ہوں تو بھیا اعتراض نہ کر بیٹھنا۔ انھوں نے کہا ہم تو چپ شاہ قلندر بنے رہنے کا وعدہ کر کے آئے ہیں۔

جب ہم کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو پلیٹیں گردش کرنے لگیں۔ اور چپاتیاں بھی قاب میں لاکر سامنے رکھ دی گئیں۔ چپاتیوں کو دیکھتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا ارے چپاتیاں آگئیں میں نے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ چپ ہوگئے۔

اتنے میں کوفتوں کی ڈش آگئی۔ انھوں نے گن کر پانچ کوفتے اپنی پلیٹ میں رکھ لئے کوفتہ چکھ کر خوش ہوگئے اور یہ کہہ کر کہ جوش میاں۔ چکھ کر دیکھو کس مزے کا کوفتہ ہے ایک کوفتہ میری جانب لڑھکا دیا۔ وہ سفید میز پوش پہ ایک پیلی سی لکیر ڈالتا میرے ہات سے آکر ٹکرا گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھ پر بم پھٹ پڑا ہے۔

جب کھانا ختم ہوگیا تو ایسا لگا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانا مجھ کو کھا کر رخصت ہوگیا ہے۔

اب ہم سب رقص٭ و سرود کے جگمگاتے کمرے میں آگئے۔ تمام حاضرین مہاراجہ سمیت دوزانو بیٹھ گئے۔ میں نے کہا قاضی، دوزانو بیٹھنا ہوگا۔ انھوں نے بڑے اکراہ کے ساتھ کہا۔ تمہاری محبت میں یہ بھی بھگت لیں گے۔ اب گانا شروع ہوگیا اور تانیں ہوا میں بل کھانے لگیں۔ تھوڑی دیر میں قاضی نے میرے کان میں کہا دم نکلا جارہا ہے۔ دوزانو بیٹھنے سے۔ میں نے کہا برآمدے کے سوفے پر جاکر بیٹھ جاؤ۔ قاضی نے زور سے کہا وہاں سے رنڈی نظر نہیں آئے گی۔ تمام محفل میں یہ فقرا گونج اُٹھا اور وہ بڑے اطمینان سے پلتھی مار کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس حرکت پر لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ انھیں ٹہوکا دیا کہ دوزانو بیٹھ جائیں مگر وہ حسب عادت پھر اوں اوں، اوں، اوں کرنے لگے،

٭ گانے والیوں میں ایک "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" والی ایسی حسین لونڈیا تھی کہ میرا دل اس پہ ہلوٹ ہوکر رہ گیا تھا اور آخر کار اس کے دل کو میں نے جیت لیا تھا کیوں وہ صیاد کسی صید پر توسن ڈالے، صید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ سارنگی کی رؤں رؤں نے اُن کی اوں اوں جذب کرلی۔

اب اسی " برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن " والی طوائف کا مجرا شروع ہوا اللہ نے اس کو حسن کے ساتھ گلا بھی بہت اچھا دیا تھا اس نے بحرِ طویل میں خود مہاراجہ کی ایک غزل چھیڑ دی اس نازنین کے گلے کی چلت پھرت بحر کے پیچ و خم اور سازوں کی ہم آہنگی نے وہ طلسمی عالم پیدا کر دیا کہ لوگ سرشار ہوگئے اور مہاراجہ نے اپنی غزل کا پورا رس پینے کے واسطے آنکھیں بند کرلیں اور جھومنے لگے۔

یہ جادو کا سماں بندھا ہوا تھا کہ قاضی نے اپنے گھٹنے پر تال دیتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے ؟ میں نے کہا مہاراجہ کی یہ سنتے ہی قاضی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے سبحان اللہ کا ایسا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر کہ یکایک نظامِ دکن تشریف لے آئے ہیں دونوں ہات جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور جب قاضی نے دوبارہ سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا تو مہاراجہ یہ بات محسوس کرکے کہ وہ نظام کے بجائے قاضی کے روبرو ہات جوڑے کھڑے ہیں۔ جھینپ کر بیٹھ گئے اور پھر آنکھیں بند کرلیں [1]

اور جب گھر آکر میں نے کہا کیوں بے قاضی آخر کار مہاراجہ کو ہات جڑوا کر تو نے دم لیا تو وہ داڑھی کھجانے لگے۔

اب اُن سے میری آخری ملاقات کا حال بھی سن لیجیے ۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ میں رئیس احمد اور اپنے چچازاد بھائی مصطفٰے علی خان کے ساتھ لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور کھا پی کر بستر پر دراز ہو چکا تھا کہ برآمدے سے ہوٹل کے بوائے کی آواز آئی صاحب وہ سو چکے ہیں دروازہ اب نہیں کھلے گا۔ اور اس کے بعد جب یہ آواز آئی کہ " نہیں نہیں نہیں ہم تو ابھی ابھی ملیں گے تو میں نے کہا۔ مصطفٰے علی، دروازہ کھول دو قاضی آئے ہیں۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا تو کیا

---

[1] مہاراجہ کو یہ دھوکہ اس لئے ہوا کہ نظام کے علاوہ ان کی محفل میں کوئی زور سے بولتا نہیں تھا۔ اور نظام ہمیشہ بہت بلند آواز میں باتیں کیا کرتے تھے۔

دیکھتا ہوں کہ چار گر دے کی داڑھیوں والے دست بستہ اور سیاہی مائل احمقوں کے جلو میں کوئی سجّادہ نشین صاحب میری چارپائی کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں. میں نے کہا رئیس احمد، دوسری لائٹ بھی کھول دو دوسری لائٹ کھل گئی تو یہ سماں دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ قاضی صاحب چوگوشیا ٹوپی پہنے، اور عمامہ باندھے میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ میں اپنے بستر پر اچھل کر بیٹھ گیا اور " ارے قاضی اور اس ہیئت میں کہہ کر، میں نے مصطفےٰ علی کو آواز دی. قاضی درویش ہوگیا ہے اسے چونچ دکھاؤ اور جب انھوں نے کھڑے ہوکر قاضی کو چونچ دکھائی تو قاضی صاحب جلدی جلدی " ارے یہ کیا بیہودگی، یہ کیا، یہ کیا، یہ کیا بیہودگی کہنے لگے. قاضی کی یہ گت بنتے دیکھی تو ان کے چاروں خفیف الوجہ معتقدین بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اس قدر زور سے کہ لکڑی کا زینہ اُن سراسیمہ و پشیمان مفرورین کے بھدّے قدموں کی دھمک سے بجنے لگا.

جب معتقدین بھاگ گئے تو میری چارپائی پر بیٹھ کر انھوں نے کہا. میں غلام علی میاں کا مرید ہوچکا ہوں. میں نے کہا ارے دیوانے کیسی پیری اور کیسی مریدی، پڑھا لکھا آدمی ہوکر اس چوتیا چکر میں پڑ گیا. انھوں نے کہا تم کیا جانو ہمارے دل کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ بالکل بالکل بالکل کل رات کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے آنا.

دوسرے دن رئیس و مصطفےٰ کو لے کر اُن کی جائے قیام پر پہنچا. دیکھا کہ جلا ہوں کی سی شکل کے دس بارہ گھامڑ اُن کے سامنے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قاضی نے اُن کو اٹھا دیا۔ ان کے قریب گیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ ان کے داہنے طرف شراب کی لانبی سی بوتل رکھی ہوئی ہے اور بائیں طرف ایک چھریرا سا لونڈا بیٹھا ہوا ہے میں نے کہا کیوں قاضی اس درویشی میں بھی. . انھوں نے کہا. تم ارباب ظاہر ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہم کو میاں (پیر) یہ نکتہ سمجھا چکے ہیں کہ بحرِ معرفت اس قدر زخار ہے کہ ایک بوتل اور ایک لونڈا اس کو ناپاک نہیں کرسکتا۔ نہیں کرسکتا. نہیں کرسکتا. ناپاک نہیں کرسکتا. یاحق، یاحق، یاحق۔

حکیم صاحب عالم

زباں پہ ، بارِ خدایا ، یہ کس کا نام آیا ۔ لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب ، عربی و فارسی کے منتہی ، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر ، یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست ، مملکتِ شرافت کے تاجدار ، اقلیمِ خلوص کے شہریار ، اور کاروانِ زہد و اتقا کے سالار، صاحبِ عالم ۔ کیا بتاؤں کہ کس قدر خوش رو ، خوش وضع ، خوش طبع ، خوش فکر ، خوش اخلاق ، خوش پوشاک ، خوش گفتار ، خوش تبسم ، خوش اوقات ، خوش مدارات ، خوش میزبان ، اور خوش مطبخ تھے ۔

ان کا بوٹا سا قد تھا ۔ چھوٹے چھوٹے ملائم ہات تھے ، گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی تھی لکھنؤ میں ان کے تقوے کی اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑے سے بڑے رند کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کی محفل میں پی کر جائے یا ان کے سامنے خلافِ شرع زبان ہلائے ، لیکن اس قدر زبردست تقشف کے باوجود وہ مجھ رِندِ نامہ سیاہ کے دوست ، اور دوست بھی کیسے میرے پسینے پر خون چھڑکنے والے دوست تھے اور میرا اور ان کا یارانہ ، تقشف اور تردامنی کا ایک ایسا عجیب سنگم تھا کہ جو دیکھتا تھا انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا تھا ۔ اور جب کہ وہ میری صحبت ہائے شبانہ میں بھی شریک ہونے لگے ۔ اور میری بے پایاں محبت کے طفیل انھوں نے میرے شرکائے بزم کو بھی اپنے سامنے پینے کی اجازت دے دی تو لکھنؤ بھر میں چرچے ہونے لگے کہ حکیم صاحبِ عالم کا ساتقی بھی مے خوار بن گیا ۔ اور جب اُڑتے اُڑتے یہ خبر لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد ، سیّد ناصر حسین صاحب قبلہ تک پہنچی ، تو انھوں نے

صاحب عالم کو بلا کر یہ سمجھایا کہ وہ میری راتوں کی صحبت میں شریک ہونا ترک کر دیں۔ لیکن انھوں نے قبلہ وکعبہ کی بات بھی نہیں مانی، اور برابر میری صحبتوں میں شریک ہوتے رہے۔ ان کو میری شاعری سے عشق تھا، اور کہا کرتے تھے کہ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر بدنام ہوجانا اس امر سے بمراحل بہتر ہے کہ لوگ مجھ کو خاصانِ خدا میں شمار کرنے لگیں ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
ارے ارے می کنم، با خلق و عالم کار نیست

وہ اس بلا کے نکتہ سنج تھے کہ اچھا شعر سُن کر جھومنے اور سر دُھننے لگتے تھے۔ اور ایک بار تو میری ایک نظم سن کر ان کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ انتہائی مہذب ہونے کے باوجود وہ جست کر کے میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور میرا گلا دبا کر چیخنے لگے تھے کہ آج تجھ کو مار ڈالوں گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میری "ملحدانہ" نظموں کو سخت ناپسند کرتے، اور ان کی پیروڈی کہہ کر، خود مجھے سنایا کرتے تھے، اور میں ان کی داد دیا کرتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے کہا حکیم صاحب، پیروڈی کی جو نظمیں آپ مجھے سُناتے ہیں ان میں بڑی جان ہوتی ہے، اگر آپ اسی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری کی طرف بھی مائل ہوجائیں تو ڈنکے پٹ جائیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا بھائی میں غزل گوئی تو کر نہیں سکتا، اس لئے کہ میری زندگی اس قسم کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ آئمۂ طاہرین کی شان میں قصیدے کہنا شروع کر دوں۔ چناں چہ انھوں نے قصیدے کہنا شروع کر دیئے، اور ایسے ایسے بے مثال قصیدے[1] کہے کہ قاآنی سے ٹکر لینے لگے۔

وہ کھانا بھی بہت اچھا کھاتے اور کھلاتے تھے۔ نواب حامد علی خاں، والیِ رام پور کے کھانے کی یو پی بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی، میں نواب صاحب کے وہاں بھی متعدد بار

---

[1] افسوس کہ وہ نادر قصیدے اُن کے ان بیٹوں کے پاس ہیں جن کو علم وادب سے کوئی واسطہ نہیں ہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ انھیں چھپوا دو۔ وعدہ تو کر لیتے ہیں کہ چچا ضرور چھپوا دیں گے، مگر مجھے ایفائے وعدہ کی کوئی امید نہیں، اور افسوس کہ وہ متاعِ بے بہا کیڑوں کی غذا بن جائے گی۔

کھانا کھا چکا تھا۔ اس بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب کے مطبخ میں جو کھانا پکتا تھا اسکی لذت رام پور کے کھانوں سے کہیں زیادہ تھی۔

ان کا مطب تھا نخاس میں چڑیا بازار کے قریب جہاں کسی زمانے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں رہتا تھا۔ مطب کی چھت پر ایک چوکور بڑا سا ہال، ہال کے پہلو میں ایک کمرہ، مع غسل خانہ، اور چوڑا سا آنگن تھا۔ میں جب دہلی سے آتا تو کبھی کبھی ان کے اوپر کے کمرے میں ٹھہرا کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی رات کی محفل جما کرتی تھی، جس میں میرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ، مولانا ثاقب، سیّد غلام حسنین، علی عباس حسینی، مولانا اختر علی تلہری، سیّد اعظم حسین سابق مدیر "سرفراز"، سید احتشام حسین، نواب جعفر علی خاں اثر، مجاز، مخمور، سراج، قدیر، احسن طباطبائی، میرزا یگانہ چنگیزی اور صدیق حسن خاں (آئی سی ایس) وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے، اور آدھی رات تک شاعری ہوا کرتی تھی ــــ ہائے وہ صحبتیں جو اب خواب و خیال ہو کر رہ گئیں، اب ان کی یاد آتی ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ایک بار دہلی سے لکھنؤ آیا تو ان کے وہاں نہیں ٹھہرا، ایک ہوٹل میں قیام کیا، اور ادہر اگر انھیں اپنے آنے کی خبر بھی نہیں کی، تاکہ ان کے وہاں اچانک پہنچ کر وہ کھیل کھیلوں جس کو دہلی سے ٹھان کر آیا تھا۔

شام ہوتے ہی رئیس احمد سے ملنے بٹّن[1] کے وہاں پہنچا۔ اور حکیم صاحب سے جو کھیل کھیلنے والا تھا، اس کا طریقہ ان کو بتا دیا ــــ رئیس نے تانگہ منگایا، اس پر چادر باندھی، مجھے اندر بٹھایا، خود کوچ بان کے قریب بیٹھے، تانگہ حکیم صاحب کے مطب کے پھاٹک پر رکا، اندر گئے، حکیم صاحب سے کہا، ملیح آباد کی ایک خاتون کو کئی روز سے بخار آرہا ہے، میں انھیں تانگے میں لایا ہوں، آپ کو تکلیف نہ ہو تو مہربانی فرما کر اُن کی نبض دیکھ لیں۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے واسطے پردے میں ہات ڈالا، اور میں نے ان کے ہاتھ میں ..... تھما دیا۔ وہ اچھل گئے اور "ارے" کہہ کر اس زور سے ہاتھ باہر کھینچا گویا ان کا ہاتھ بجلی کے برہنہ تار سے مَس ہو گیا ہے۔ دو تین سیکنڈ

---

[1] رئیس کی معشوقہ، جو اب ملیح آباد میں انھیں کے ساتھ رہتی ہے۔

تک تو وہ دنگ ہو کر رئیس کا منہ تکتے رہے، اور پھر انھوں نے، قہقہہ مار کر کہا "تانگے سے اُتر آیئے جوش بیگم، میری جان" میں تانگے سے ہنستا ہوا کود پڑا، انھوں نے بَم مہاراج کہہ کر مجھے گلے لگا لیا اور اس قدر ہنسے کہ آنسو نکل آئے۔ لیکن اس تمام مسرت میں انھوں نے اپنا وہ ہاتھ، جس سے "نبض" دیکھی تھی، اپنے جسم سے دور رکھا، اور مطب آکر، جب اس کو تین بار خوب اچھی طرح صابون سے دھولیا تو اس گیلے ہاتھ سے، میرا منہ چھو کر اسے چوم لیا۔

ہائے، کل جس بات پر اس قدر ہنسے تھے، آج اس پر دل تھام کر رو رہے ہیں —— دنیا کی یہی ریت ہے۔ میری مہاجرت کے سال بھر بعد وہ بھی پاکستان آگئے تھے۔ ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا، اس لئے وہ میرے پاس آنے سے معذور تھے میں متعدد احباب کے ساتھ ہر ہفتے ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور چار پانچ گھنٹے کے لئے شاعری و لطیفہ گوئی کی محفل جم جاتی تھی اور لکھنؤ کا سماں بندھ جایا کرتا تھا۔

ایک روز، حسبِ معمول، ہم سب لوگ یعنی منوّر عباس، علی حسنین زیبا مرحوم —— سالک لکھنوی، میرزا عالم گیر قدر، قیصر مرحوم، میرزا ابو جعفر، اور نواب ابوالحسن بلگرامی مرحوم ان کے وہاں پہنچے۔ وہ، پھولوں کا سا شگفتہ چہرہ لئے، باہر آئے، میں نے سینے سے لگا کر ان کا ماتھا اور انھوں نے میرا منہ چوم لیا، اور کہا کہ آج اپنے ساڈی[1] سے ایسا قصیدہ سنواؤں گا کہ آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ میں نے کہا میرے پاؤں زمین پر رہتے ہی کب ہیں، میں تو عرش بریں پر قدم جمائے رہتا ہوں، وہ ہنسنے لگے۔

اتنے میں ان کے دونوں چھوٹے بھائی محمد نواب اور لڈّن صاحب بھی اپنی بیگموں سمیت آگئے، یعنی پاکستان میں ان کے جس قدر بھی چہیتے اور قرابت دار تھے، وہ اتفاق سے سب کے سب یک جا ہو گئے اور انھوں نے سب کو جی بھر کے دیکھ لیا —— ابھی چائے آہی رہی تھی کہ ان کو کھانسی آنے لگی۔ ان کے ڈاکٹر بیٹے نے کہا "گولی حاضر کروں، انھوں نے کہا "شاعری کے بعد" —— اور جب، تھوڑی دیر میں کھانسی بڑھ کر اچھو کی شکل

---

[1] ان کے عزیزوں میں ایک خوش گلو صاحب زادے، ان کا کلام سنایا کرتے تھے۔

اختیار کر گئی تو ان کی سانس گلے میں رُکنے لگی ـــــ اور پل بھر میں روح پرواز کر گئی۔ صاحبِ عالم میں مرجاتا، تم نہ مرتے ـــــ تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ ارے حیرت ہے کہ تم مر گئے اور میں ابھی تک جی رہا ہوں ؎

پس از معشوق جینا، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا، اور ہم کو مرنا ہے

رفیع احمد خاں

میرے آبائے اوّلیں کے ، چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان ، تمام دنیا کے نقش نگاروں کے سلطان ۔ علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم اے ، متعدد کالجوں کے پروفیسر ، آخری دَور میں لکھنؤ کواپریٹو سوسائٹی کے سکریٹری ۔ متوسط القامت ، شگفتہ پیشانی ، تماشں استاد ، سدا بشاش ، چوک رسیا ، پدر معتوب ، شہر محبوب ، جوانی میں امرد پرستار ، زوالِ جوانی میں طوائف گرفتار ۔ مرنجاں مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے ۔

ان کا مکان میرزا عالم گیر قدر کے مکان کے عین سامنے ، امین آباد سے بہت قریب اس سڑک پر تھا جس کو اب "کوئن روڈ" کہا جاتا ہے ۔ میں اپنے زمانۂ تعلیم میں ان کے مکان کے بالکل قریب ، راجہ ابو جعفر صاحب کی کوٹھی "جعفر منزل" میں رہتا تھا ، اسلئے میرزا عالم گیر قدر ، وہ اور میں ایک ایسا تکڈم بن گئے تھے ، جس کو ہمیشہ یک جا پایا جاتا تھا ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہم لوگ یوسف مرزا ، ابرار ، اور شوکت تھانوی کو ہم راہ لے کر شام ہوتے ہی لکھنؤ کی خاص خاص جوانی مدار ، پر اسرار و ثمر دار گلیوں میں ، بسلسلۂ "تلاشِ معاش"[1] گھوما کرتے تھے ۔ اور دن کے وقت ہمارے جاں نثار کارندے ، اس بات کی ٹوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری رچائی ہے ۔

---

[1] یہ ہماری چنڈال چوکڑی کی خاص اصطلاح تھی ، جس کے معنی تھے : جستجوئے لالہ رُخاں

ہم ان بوڑھوں کی فہرست طیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف و مشترک احباب کی وساطت سے ، ان بوڑھوں کے پاس جاتے ، ان پر اپنی پارسائی و دیں داری کے سکے بٹھاتے تھے۔ ان کی نظروں میں سماتے ، ان سے پینگ بڑھاتے ، اور اس طرح آخرِ کار ، ان کی بے آب و گیاہ دُھنوں تک آتے جاتے تھے۔

ان کے باپ کا نام تھا شفیع احمد خاں ، ان کی عقل آواز اور گردن بہت موٹی تھی داڑھی بے حد ڈراؤنی تھی۔ صبح جب وہ اپنی بھیانک آواز میں تلاوت کرتے تھے۔ تو میرے کمرے تک اس کی خوف ناک گونج آیا کرتی تھی اور میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا ۔

گر، تو۔ قرآں ، بایں نمط، خوانی
بَبَرد ، رونقِ مُسلمانی

خدا کی قسم ان کے گلے سے الفاظ اس طرح ٹھوکر مارتے نکلتے تھے ، گویا وہ ڈوبتے ستاروں کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔ ان کو رفیع سے بے حد نفرت تھی۔ میں نے آج تک دنیا کے کسی باپ کو اس قدر نا مہربان نہیں دیکھا۔

رفیع نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ بیٹا خراب نکل جاتا ہے تو اس کو" ناخلف" کہتے ہیں ، شبیر یہ تو بتاؤ کہ باپ خراب نکل جائے تو اسے کیا کہیں گے ، اور میں نے کہا تھا" ناسلف ؎۔ جب میری پہلی تصنیف" روحِ ادب "نکلی تھی ، اس پر رفیع نے مقدمہ لکھا تھا ، تو وہ "گلِ رعنا" کے مصنف حکیم عبدالحیٔ صاحب کے پاس اس کو لے کر گئے تھے اور کہا تھا" یہ دیکھئے ایک بدمعاش کی کتاب پر دوسرے بدمعاش نے مقدمہ لکھا ہے۔ چور کا بھائی گرہ کٹ ؎ اور سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں ہم سے نفرت کرنا ہی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ وہ بے حد کھرّنک مُلاّ تھے ، اور ہم سب لوگ بے حد آزادہ رو ، اور ان کے نقطۂ نظر سے ، پرلے درجے کے اوباش تھے۔

ایک بار رفیع احمد خاں کے ایک رشتے کے چچا نے ان سے کہا ، دس بارہ برس ہو چکے ہیں تمھاری شادی کو ، اب تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا ہے ، شاید تمھاری بیوی

؎ دیکھئے میری نظم ۔۔ یہ داستاں ہے جب کی ۔۔ جس وقت ہم جواں تھے

بانجھ ہے، تم دوسری شادی کرو نہیں تو نسل منقطع ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے جواب میں انھوں نے چچا سے کہا، اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹھے پر جاکر وہاں سے اس کا جواب دوں۔ چچا نے کہا کوٹھے سے جواب کا کیا تعلق ہے۔ انھوں نے کہا پٹنے سے بچ جاؤں گا، یہ کہہ کر وہ کوٹھے پر دوڑ کر چڑھ گئے، اور وہاں سے پکار کر کہا، چچا جان میں مر جاؤں گا، لیکن بچّے کا باپ نہیں بنوں گا، چچا آپ کو معلوم ہے کہ ہماری نسل کس قدر شقی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اشقیاء کی یہ نسل ہمیشہ کے واسطے منقطع ہو کر رہ جائے، چچا نے کہا تو بڑا مردود ہے، انھوں نے کہا تو کیا اپنے سے بھی ایک بڑا مردود اور پیدا کر دوں؟

ایک بار خدا کے وجود کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رفیع احمد خاں بڑے سکون کے ساتھ سن رہے تھے لیکن وہ بحث جب اس جانب مڑی کہ خدا کے وجود کے سینکڑوں مسکت دلائل تو ضرور موجود ہیں، لیکن شافی و منطقی دلیل ایک بھی نہیں۔ تو انھوں نے میز پر گھونسا مار کر کہا—— "شٹ اَپ (خاموش)، میرے پاس وجودِ باری کی شافی و منطقی دلیل نہ سہی، لیکن ایک دلیل ایسی ہے جو منکرین و متشککین کی کھوپڑیاں توڑ کر رکھ دے سکتی ہے، اور اس دلیل کا نام ہے، دلیلِ "ڈنڈا ادی"۔ مجاز نے کہا تو کیا ہمارے سروں پر ڈنڈا مار کر آپ خدا کے وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ —رفیع نے جواب دیا نہیں، ایسا نہیں کروں گا بلکہ آپ حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ تمام حضرات اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ خاکسار نہایت عمدہ سمجھ بوجھ کا آدمی ہے، صحت کے اعتبار سے بھی ہزاروں سے بہتر ہے، صورت بھی شریفوں کی سی ہے، مطالعہ بھی بہت اچھا ہے اور ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ، یہ فدوی ایم اے، اور گولڈ میڈلسٹ بھی ہے، اور اسی کے دوش بدوش، فدوی کی لیاقت کو تسلیم کر کے اسے متعدد کالجوں میں پروفیسری کے عہدے بھی بارہا دیئے جا چکے ہیں، لیکن تھوڑے ہی دن بعد اس ناچیز کو ہر کالج سے نکال دیا جاتا ہے، اور ان تمام حالات پر نگاہ کر کے میں آپ تمام حضرات سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر خدا موجود نہیں ہے، تو پھر یہ ڈنڈا کس کا ہے جو

رفیع احمد خاں کی . . . . میں گھسا ہوا ہے ؛ اور یہ ناچیز رفیع احمد خاں جس صوبے میں بھی جاتا ہے وہ نیبی ڈنڈا اس کے گھسا ہوا قطع منازل کرتا رہتا ہے جس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ وہ ہے اور ضرور ہے اور لگے ہاتھوں یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ صرف موجود ہی نہیں ، بلکہ حاضر و ناظر بھی ہے — اب بولو ملعونو !!

وہ فحش نگاروں کے بادشاہ تھے ، یاروں نے جسم انسانی کے اعضائے عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے ، ان کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے یا پوشیدہ اعضاء کے نام نظم کر دینے سے کام نہیں چلتا ، فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت و صلاحیت کا موجود ہونا اشد ضروری ہے ۔ انھوں نے فحش نگاری کو ادبِ عالی کا جو مقام بخشا تھا ، اور اس میں جو شعریت پیدا کی تھی وہ شیخ سعدی اور مُلّا عبید زاکانی کے درجے کی چیز تھی ، اور بعض اوقات تو وہ ان دونوں سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے ۔ افسوس کہ میری قوم میں ابھی تک " مَرْدُوا بِن " نہیں پیدا ہوا ہے ، ورنہ میں ان کے فحش اشعار نقل کر کے اپنے دعوے کو مُدلّل کر دیتا ۔

ان کی رگ رگ میں ایسی شوخی بھری ہوئی تھی کہ وہ ایک لمحے سنجیدگی کا بار بھی نہیں اٹھا سکتے تھے ۔ ایک رات کو ، لکھنؤ کی گلیوں میں انھوں نے ، ایک " جلوسِ خرام و دشنام " نکالا تھا ، اس کا ماجرا بھی سُن لیجئے — ایک دن رات کے دو بجے ، گانا سُن کر جب ہم سب چوک سے نکلے ، انھوں نے کہا ، میں نے یہ بات طے کی ہے کہ چوک سے امین آباد تک ملنے والوں کے جتنے بھی مکان پڑیں گے ، تانگے روک روک کر اور آوازیں بدل بدل کر ان تمام مکان والوں سے مذاق کروں ، اور گالیاں دوں گا ۔ میں نے کہا ، رفیع ، یہ بات آدابِ شرفاء کے خلاف ہے ۔ انھوں نے کہا ، ایسی تیسی آدابِ شرفاء کی — سب سے پہلے میرزا محمد ہادی رُسوا (صاحب " امراؤ جان ادا ") کا مکان پڑا ۔ ان کے مکان کے نیچے[1] ، تانگے روک دیئے گئے ۔ میں نے کہا دیکھو رفیع ، ان کو گالی نہ دینا ، یہ میرے استاد ہیں ، انھوں نے کہا ، اگر تم چُپ نہیں رہو گے تو تمہارا نام لے کر اُن کو گالی دوں گا ۔ میں

---

[1] میرزا صاحب بالاخانے پر رہتے تھے

خاموش ہوگیا۔ انھوں نے تانگے سے اتر کر آوازیں لگانا شروع کردیں "میرزا صاحب میرزا صاحب، جناب میرزا صاحب، جناب میرزا صاحب، جناب میرزا محمد ہادی صاحب قبلہ دس پانچ ہانکوں کے بعد میرزا صاحب کی باریک سی آواز آئی، کون صاحب ہیں؟" ان کی آواز سنتے ہی رفیع احمد نے کہا" میں ہوں امراؤ جان ادا کا ڈھگڑا۔ میرزا صاحب کی آواز آئی، آئیں آئیں" انھوں نے کہا جناب میں نے سُنا ہے کہ آپ نے اپنے کالج کے پرنسپل مسٹر میڈلی کا.... چھری سے کاٹ لیا ہے اور اسے گڑھئے[1] والی سرائے کے بینک میں، فکس ڈپازٹ کے طور پر جمع فرمادیا ہے۔" یہ سُنتے ہی میرزا صاحب نے اپنے ملازم سے پکار کر کہا، رمضانی، ذرا چھجے سے جھانک کر دیکھ تو یہ کون بدمعاش بے ہودگی کر رہا ہے، اتنے میں ہمارے تانگے حرکت میں آگئے، اور رمضانی کی آواز آئی، حضور وہ تو تانگوں میں بھاگ کھڑے ہوئے، پیر بخارا کے شہدے ہوں گے سرکار۔ اس کے بعد، دو تین اور مقامات پر گالیاں دیتا اور مذاق کرتا، یہ فحاشی کا جلوس جب امین آباد پہنچا، تو پرنس ہوٹل کے نیچے کھڑے ہوکر انھوں نے، ہانک لگائی جناب تصدق حسین صاحب، جناب قرار صاحب قرار صاحب، جناب تصدق حسین صاحب قرار، اوپر سے آواز آئی، کون پکار رہا ہے، انھوں نے کہا میں نے سُنا ہے کہ آپ کا لغت" قرار اللغات" اپنے تمام الفاظ کی پلٹن لے کر آپ کی والدہ کی .... میں داخل ہوگیا ہے۔ آواز آئی، لاحول ولاقوت، یہ کون بیہودہ آدمی ہے، بدتمیز کہیں کا۔ اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب سید جالب صاحب دہلوی مدیر" ہم دم" کے مکان پر جاکر، انھوں نے پکار، جناب سید جالب صاحب دہلوی ـــــ جالب صاحب، جالب صاحب، ارے جناب جالب، تھوڑی دیر میں ایک نہایت جلی ہوئی آواز آئی، کون ہے، کون ہے؟" انھوں نے کہا، جناب عالی، درِ دولت پر اس قدر عرض کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اے حضرت جالب صاحب دہلوی مدظلہ، آپ کی توماں کا .... " اندر سے آواز آئی، اُوف اُوف اُوف۔ اور ہم گھر جاکر سو رہے۔

---

[1] لکھنؤ کی ایک رنڈیوں کی سرائے۔

صبح جب رفیع احمد خاں، ہم لوگوں کو ساتھ لے کر، ایک نہایت شریف و مہذب انسان کے مانند، اپنے دُشنام خوردگانِ شبانہ کے پاس، ایک ایک کرکے پہنچے۔ کسی نے پچھلی رات کے واقعے کا ذکر نہیں کیا، البتہ جب ہم سیّد جالب کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا، جوشؔ صاحب، جس لکھنؤ کی تہذیب کے ڈنکے پیٹے ہوئے تھے اب اس کی یہ گت بن چکی ہے کہ کل رات کے تین چار بجے ایک شخص نے زور زور سے مجھے آواز دی، اور جب میں نے ڈانٹ کر پوچھا، کون ہے ؟ تو وہ گُنڈا، میری والدۂ معظمہ کی شان میں گستاخی کرکے بھاگ کھڑا ہوا۔ جالب صاحب کا یہ فقرہ سُن کر، رفیع کو اس قدر ہنسی آئی کہ اس کے ضبط کرنے میں ان کے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ آنکھیں اُبل پڑیں، ان کی ٹھُڈّی کانپنے اور ان کے دونوں گال پَر تولنے والی چڑیا کے مانند، پھُر پھُرانے لگے۔

پرنس میرزا عالم گیر قدر

خاندانِ تیموری کی یادگار، لکھنؤ کے باشندۂ باوقار، کچھ اوپر چالیس برس سے ضیق النفس میں گرفتار، پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار، زود اشتعال و شرارہ بار، میرے لڑکپن کے یار، موسیقی و مزامیر کے ماہرِ اسرار، کھانا پکانے میں یکتائے روزگار، سخن سنجوں کے شہر یار، اور معلوماتِ عامہ کے پروردگار، سانولے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کے، پوست استخواں اور کاغذی بدن کے آدمی۔

ان کے دادا جان کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ اللہ اللہ ان کا جاہ و جلال۔ وہ صبح شام ایک وقتِ معین پر کوٹھے کی بالائی منزل سے اتر کر ایسے وقار کے ساتھ حویلی میں جاتے تھے کہ مجھے اپنے دادا کی سلطان خرامی یاد آجاتی تھی۔ اور اُن کو اس قدر اعزاز حاصل تھا کہ گورنر جنرل تک ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

کوئن روڈ پر، رفیع احمد خاں کے مکان کے عین بالمقابل ان کی عالی شان حویلی[1] تھی۔ حویلی کے پہلو میں ایک دو منزلہ کوٹھی تھی۔ اور پشت پر بڑا سا پائیں باغ تھا۔ اور یہ جو امین الدولہ پارک کے آخری گوشے میں سنٹرل ہوٹل کی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے

---

[1] افسوس کہ ان کے بڑے بھائی، میرزا جہاں گیر قدر نے، وہ جائے داد جس کی قیمت اس دورِ ارزانی میں پانچ چھ لاکھ سے کم نہیں تھی، اپنی ڈپٹی کلکٹری کے شہرہ آفاق دورِ عیاشی میں اونے پونے بیچ کر خاندانی آثارِ امارت کو برباد کر ڈالا تھا۔ اس حویلی میں رہنے والے میرزا عالم گیر قدر اب ڈرگ کالونی کے ایک چھوٹے سے بھنچے ہوئے مکان میں تنہا رہتے ہیں۔ ہائے کیا پلٹا کھایا ہے روزگار نے۔ ہائے کس قدر ہر آن بشاش رہنے والے چہرے اب مستقل طور پر اداس رہنے لگے ہیں۔

وہ انھیں کے پائیں باغ کو قطع کر کے تعمیر کی گئی ہے۔ وہ اس قدر سخن سنج ہیں کہ شعر سنتے ہی، اس کے تمام محاسن و معائب کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور بعض اوقات تو شعر میں ایسے معنی پیدا کر دیتے ہیں کہ شاعر دنگ ہو کر رہ جاتا ہے کہ ارے یہ معنی کہاں سے نکل آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانا پکانے میں بھی ایسی دست گاہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رکاب دار ان کے سامنے کان پکڑتے ہیں کشمیری چائے ایسی بناتے ہیں کہ باشندگانِ کشمیر حیران ہو جاتے ہیں، اور طبلہ ایسا بجاتے ہیں کہ بڑے بڑے طبلچی ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن مغلوب الغضب اس قدر ہیں کہ ذرا سے مذاق پر جامے سے باہر ہو جاتے ہیں، اور بدگمانی کا عالم ہے کہ ایک سیدھی سی بات کو پُرپیچ و خم سمجھ کر ترکِ تعلق کر لیتے ہیں۔ اور دل اتنا اچھا ہے کہ کچھ روز روٹھے رہنے کے بعد پھر خود بخود من جاتے ہیں۔

اب رہا ان کے معلوماتِ عامہ کا مسئلہ۔ سو اس باب میں اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میرزا صاحب کو کیا کیا آتا ہے، تو میں اس سے کہوں گا یہ پوچھ کہ اس عالم کون و فساد میں وہ کون ایک ایسی بات ہے جو اُن کو نہیں آتی ع

ہر فن میں ہوں استاد مجھے کیا نہیں آتا

جنابِ والا، تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب، موسیقی، نقاشی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، اور طبِ یونانی کے سے بے شمار گمبھیر علوم کے دوش بدوش ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیر کا شکار کیوں کر کھیلا جاتا ہے، کون کون سی پیٹنٹ دوائیں کن کن امراض کے واسطے مخصوص ہیں، موٹر کا کون پرزہ کہاں مل سکتا ہے اور ریلوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات کیا ہیں۔ اجی آپ میرزا صاحب کو کیا سمجھتے ہیں۔ کان کھول کر سُن لیجئے کہ اس کرۂ ارض پر معلوماتِ عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ جہاں تک کہ جہاں علم و آگاہی کا سوال ہے، آسمان پر خدائے قدیر ہے اور زمین پر میرزا عالم گیر ہیں۔ وہ عرش پر عَلّام الغیوب ہے، یہ فرش پر عَلّام الشہود ہیں۔ یعنی ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

میرے مُونِسانِ طفلی و شباب میں سے اب صرف میرزا ہی باقی رہ گئے ہیں، وہ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کس قدر نازک اندام و حسین تھا اور جب میں جرنیلی ٹوپی کج کر کے اور سیاہ شیروانی پہن کر دو تین سپاہیوں کو جلو میں لئے، امین آباد پارک میں، اپنا سونے کا ڈُر ہلا ہلا کر ٹہلا کرتا تھا، تو میری سیاہ شیروانی پر میری گھڑی کی سنہری زنجیر ایسی لگتی تھی، جیسے کالے بادل میں بجلی چمک رہی ہے۔

میری محرابِ زندگی میں یہ میرزا ہی ایک دیا باقی رہ گیا ہے، اگر یہ بھی بُجھ گیا تو میں اندھیرے میں دفن ہو کر رہ جاؤں گا۔ میرزا مجھ کو مار کے مرنا!

مولانا سُہا بھوپالی

وہ اس قدر طفل قامت تھے کہ ان کے روبرو ٹھنگنے اور زیادہ دبتے ہوئے قد کے آدمی بھی بلغم باعور یا بابے میاں کی پھڑ نظر آتے تھے۔ جب ان کو "مولانا سہا" کے نام سے پکارا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ننھے سے بچے کو "مولانا تاڑ" کہا جا رہا ہے۔

لیکن ان کی ذرا سی جان میں قدرت نے علم و ادب کی ایک کثیر مقدار کو، اس طرح فشار دے کر بند کیا تھا جس طرح ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تیس چالیس مچھلیاں منقبض کر کے تلے اوپر بند کر دی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس بناء پر اُن کو "مجدّدی" کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کی لیاقت کا میں دل سے قائل ہوں۔ جب وہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر باتیں کرتے تھے، تو پتا چلتا تھا کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ پرانے رنگ کے شاعر اور نئے مزاج کے نقاد بھی تھے۔ اور اس کوتاہ قامتی کے باوجود حسینوں پر بے ساختہ دست درازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ عورت اور شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے۔ ان بے چارے کی عمر کا بہت زیادہ حصّہ افلاس میں گزرا لیکن امیروں کے آستانوں پر کبھی نہیں جھکے۔ امیروں کے دَر پر جھکنا تو درکنار، وہ انھیں ان کے منہ پر بڑی روانی کے ساتھ گالیاں بھی دے بیٹھتے تھے۔ ایک روز ایک راجہ صاحب کے دہاں ڈرنک اور ڈنر کی دعوت تھی ــــ جب سُہا صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو راجہ صاحب نے،

ایک دوسرے راجہ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ ان راجہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے واسطے ہات بڑھا دیا اور انھوں نے ان کو موٹی سی گالی دے کر کہا " ابے سالے بدتمیز شاعروں سے بیٹھے بیٹھے ہات ملاتا ہے۔ ان راجہ صاحب کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا ـــــ میزبان راجہ صاحب نے، جھٹ سے ان کو گود میں اٹھا کر کہا، آپ نے میری ناک کاٹ ڈالی، کہیں شرفاء بھی گالیاں دیتے ہیں۔ شہا نے ان کی گود میں بیٹھے ہوئے کہا راجہ صاحب کیا آپ ناصح مشفق کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، راجہ نے کہا یہی سمجھ لیجئے ؛ شہا صاحب نے کہا تو پھر تو ناصح مشفق کی بھی ماں کا ..... ۔ راجہ نے گھبرا کر، ان کو گود سے اُتار دیا، اور وہ بچوں کی طرح کھٹ کھٹ کرتے کمرے سے نکل گئے۔

وہ اختری فیض آبادی پر مرتے تھے، دونوں کا مکان لال باغ میں تھا، اور میں ان دونوں کے قریب بنارسی باغ کے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے مجھ کو اختری کے وہاں لے جاتے اور بچوں کی طرح، اس کی گود میں بیٹھ کر " سرکار ـــــ ایک پیار " کی درخواست کیا کرتے تھے۔

ایک شام کو وہ حسبِ معمول، اختری کی گود میں بیٹھے پیار مانگ اور شراب پی رہے تھے کہ اختری کی ماں نے کہا مولانا آپ جانتے ہیں، اختری نواب صاحب رام پور کی سرکار میں ملازم ہے اور ان کے سکریٹری صاحب یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں، آپ اختری کی گود سے اتر آیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دیکھ لیں۔ یہ سنتے ہی انھوں نے بگڑ کر کہا۔ نواب رام پور کی تو ماں کا ....." اختری کی ماں نے اپنا منہ پیٹ لیا ـــــ اور اختری نے ان سے کہا مولانا یہ بہت بُری بات۔ اس پر انھوں نے بے ساختہ کہا، اچھا تو، پھر تو سرکار کی بھی ماں کا ....."

اور تو اور، وہ اپنی بیگم کو بھی گالی دے بیٹھتے تھے، اور ان کی بیگم ان کو ایک اونچے سے طاق یا مچان پر بٹھا کر گھر کے دھندوں میں لگ جاتی تھیں اور مولانا اوپر سے چیختے رہتے تھے کہ خدا کے لئے مجھے اتار دو، اب گالی نہیں بکوں گا۔

ایک روز بنارسی باغ والے مکان میں وہ میرے پاس آئے، شام کا وقت تھا

دور چلنے لگا۔ انھوں نے رباعیوں کی فرمائش کی، میں رباعیاں سنانے لگا۔ ان کو میری ناچیز رباعیاں اس قدر پسند آئیں کہ دس پانچ رباعیوں کے بعد انھوں نے کہا جوش صاحب آپ کے سامنے تمام ہندوستان کے شاعروں کی ماں کا ....، اور سناؤ۔ اتنے میں کسی نے، ایک نہایت نام ور شاعر کا نام لے کر پوچھا، کیا ان کی بھی ماں کا ؟ انھوں نے ہاتھ بلند کر کے کہا، نہیں ان کو شامل نہیں کر رہا ہوں، جب دس بیس رباعیاں اور سُن چکے تو اس مستثنیٰ شاعر کا نام لے کر کہا۔ ان کی بھی ماں کا .....، اور جب چند رباعیاں میں نے اور پڑھیں تو بے قابو ہو کر انھوں نے بہت زور سے کہا، اب تو مولانا سہا مجددی کی بھی ماں کا ....،

ایک رات کو ہم لوگ چوک گئے گانے سننے کے لئے۔ مجاز ایک دکان پر پان کھانے کے لئے ٹھہر گئے، سامنے ایک بٹا خاسی چھوکری چھجے پر کھڑی ہوئی تھی، انھوں نے کہا سب سے پہلے اس کی بانگی دیکھیں گے، کچھ تو پان بننے میں دیر ہوئی، اور ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر رک گئے تھے، ان سے باتیں کرنے میں وقت صرف ہو گیا۔ اب ہم فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سُہا صاحب غائب ہو چکے ہیں اور بالاخانے سے آوازیں آرہی ہیں ارے امی جان دوڑیئے کوئی بھوت آکر مجھ سے چمٹ گیا ہے، ہائے اللہ، ہائے اللہ، ہائے اللہ۔ میں نے مجاز سے کہا ہو نہ ہو سُہا صاحب اوپر چڑھ گئے ہیں، اور جب ہم اوپر پہنچے تو دیکھا کہ اس چھوکری کی کمر سے لپٹے ہوئے، ایک بوسہ، ایک بوسہ، ایک بوسہ، کی درخواست کر رہے ہیں۔ اور وہ چھوکری اور اس کی ماں دونوں تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

غالباً یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ ایک روز وہ مجھے بمبئی میں مل گئے، اور دوڑ کر لپٹ گئے، میں نے پوچھا یہاں کیسے آنا ہوا، انھوں نے کہا لوہے کے کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں، میں نے کہا اللہ اللہ یہ موم کا پتلا اور لوہے کا کاروبار۔ کہنے لگے، میں نہیں میرا ایک ساتھی کام کرے گا۔ میں ان کو گھر لے آیا، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے کہا۔ جوش اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا ہے۔ ایک تو یہ دھندا ہاتھ آگیا ہے جس سے بھوجن چلے گا اور اسی بھوجن کے ساتھ رحمتِ الٰہی نے میرے .... کا بھی معقول بندوبست کر دیا ہے

اور ایک ایسی چاندسی بیوی دے دی ہے کہ چراغ گُل ہوجانے کے بعد اس کا مکھڑا اور بھی دمک اٹھتا ہے ، اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ نے یہ فضل کیوں کیا ہے ؟۔ میں نے کہا آپ بتائیں ! ، انھوں نے کہا ، وسکی اور برانڈی کو ہات نہیں لگاتا ۔ البتہ وائین کی دو ، اور بیئر کی چار بوتلیں روز شام کو پی لیتا ہوں ۔ میں نے کہا ، واقعی اسے کہتے ہیں ، توبتہ النصوح ۔

شام ہوتے ہی میں نے وائین اور بیئر کا بند وبست کر دیا ۔ وہ پی کر غسل خانے چلے گئے ۔ دس پانچ منٹ تک تو میں نے انتظار کیا اور جب وہ نہیں آئے تو غسل خانے کے دروازے پر دستک دی ، دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا اور یہ سماں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ فلش کے چبوترے پر چاروں خانے چت پڑے خرّاٹے لے رہے ہیں ۔

ایک بار یہ سن کر کہ وہ بہت سخت بیمار ہیں ، میں بھوپال گیا ، ان کو خیراتی وارڈ میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے ، سیدھا ، نواب صاحب بھوپال کے پاس پہنچا ، ان کو غیرت دلائی کہ ان کے بھوپال کی اتنی بڑی شخصیت خیراتی وارڈ میں دم توڑ رہی ہے ، انھوں نے فوراً کسی افسر کو بلا کر حکم دیا کہ سُہا صاحب کو ایک پرائیویٹ وارڈ میں رکھ کر سرکار کی طرف سے ان کا علاج کیا جائے ۔ مگر ، بعد کو معلوم ہوا کہ دفتری کارروائیوں کی بناء پر ، اس قدر دیر میں حکم نامہ جاری ہوا کہ جب ایک دروازے سے ان کے علاج کا حکم نامہ آیا تو دوسرے دروازے سے ان کی لاش باہر جا رہی تھی ۔۔۔ فردوسی کا سانحہ یاد آ گیا ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ڈاکٹر ایس، کے سکسینہ

نہ دُبلے، نہ دُھم دُھوسٹر، مزاج میں ذرا سی گڑبڑ۔ چہرے کا، ملگجا سا، گونگا، رنگ، لہجے میں بجتا چنگ۔ بدمزاج بیوی کے صیدِ زبوں، وُہ ظالم لیلیٰ، یہ مظلوم مجنوں۔ آنکھیں، ذہانت سے ضیا بار، معقولات کے علم بردار، فلسفے کا افتخار، منطق کا وقار، کاہلی کے پرستار، اور، بُزدلی کے، مہا اوتار۔

۱۹۳۶ء میں جب میں، محکمۂ اطلاعات عامّہ کے تین رسالوں "آج کل"، "ولبا عالم"، اور "کشمیر"، کا مُدیر تھا، وہ ہندو کالج میں فلسفے کے صدر شعبہ تھے۔ اُس وقت کے چیف کمشنر شنکر پرشاد، آئی سی، اُن کے بڑے پُرانے دوست ہیں، اور اُنھوں ہی نے مجھ کو اُن سے ملوایا تھا۔ اُس کے بعد، پھر وُہ میرے دفتر میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو گئے تھے، اور ہر وقت میری اُن کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اب "ہونولولو" میں فلسفے کے پروفیسر ہیں، کبھی کبھی دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کی ۱۹۶۷ء میں دہلی گیا تھا، اتفاق سے وہ آئے ہوئے تھے، بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے کہا "ہونولولو" میں لولو ہونے گئے ہو، وہ بہت ہنسے، بیوی آگئیں، ہنسی نے دم توڑ دیا۔

کاہلی اور بُزدلی کے علاوہ، میرے اُن کے مزاج میں، تقریباً سو فی صد اشتراک پایا جاتا ہے۔ مزاج کے ساتھ ساتھ، کائناتی مسائل میں بھی ہم دونوں کے جادۂ فکر میں، یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ اور، بفضلہٖ ہم دونوں وہ ہیں جن کو اوہام پرستوں اور عقل دشمنوں کے حلقے میں "کافر"، کہا جاتا ہے۔

وہ ہندوؤں کی حماقت کا رونا روتے ہیں، میں مسلمانوں کی بے عقلی پر آنسو بہاتا ہوں، اور پھر ہم دونوں مل کر، ہندوؤں، مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں، بودھیوں، سکھوں، اور جینیوں کی زبوں اندیشیوں پر ماتم کرتے ہیں۔ اب اُن کی بالیں پرست کاہلی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ میرے صدہا تقاضوں کے بعد، آخرکار، وہ اس بات پر رضامند ہوگئے کہ کل سے وہ میرے ساتھ صبح کو ٹہلا کریں گے۔

چناں چہ دوسرے ہی دن، صبح کو، میں اُن کے گھر پہنچا۔ اُن کو جگایا۔ وہ بستر سے اٹھے بڑی بے کسی کے ساتھ، مجھے دیکھا، چارپائی سے اُٹھ کر، غسل خانے کی طرف چلے۔ قدم، اس طرح اُٹھے، گویا وہ آندھی کے جھکڑوں میں پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں، اور ٹانگیں، داموں کے مانند، ہوا میں اُڑ رہی ہیں۔ غسل خانے سے نکلے تو، چارپائی پر، کراہ کر، بیٹھ گئے، میں نے کہا ان نخروں میں تو کرن پھوٹ جائے گی، اور دُھندے کا سہاگ ہی لٹ جائے گا، اُنھوں نے بڑی بےچارگی سے تھکی آواز میں کہا، چلتے ہیں، یہ کہہ کر وہ مُنھ بناتے اُٹھے، پھاٹک پر آئے اور، سر کھُجا کھُجا کر، باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا راستے میں باتیں کرتے چلیں گے، اُنھوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے، پاؤں کھلیں گے تو زبان بند ہو جائے گی میں نے کہا اور جھلّا کر کہا، ارے بھائی چلنا ہو تو چلیے، ورنہ سورج نکل آئے گا۔ اُنھوں نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ پرماتما نے ٹانگیں فقط اس لیے دی ہیں کہ یہ ہم کو غسل خانے تک پہنچا دیں، اور دفتر جانا ہو تو پھاٹک تک لے جاکر سواری میں بٹھا دیں۔ یہ ٹانگیں ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہیں کہ ہم خاک چھانتے، مارے مارے گھومتے پھریں، سنو، ہماری بہترین ٹہل یہ ہے کہ ہم دونوں پاؤں پھیلائے بستر پر چوبیس گھنٹے لیٹے رہیں۔ میں نے کہا مجھ سے ٹہلنے کا وعدہ کیوں کیا تھا، اُنھوں نے کہا ارے یار آپ کے آنے، اور اپنے وعدے کا یہاں تک تو احترام کر دیا کہ بستر سے اُٹھ کر، اُن لوگوں سے قطعی مختلف ہو گیا، جو بستروں پر اینڈ رہے ہیں، حالاں کہ آپ کی خاطر، میں نے اپنے کو، جن لوگوں سے مختلف بنالیا ہے وہ ہم دونوں سے بہت اچھے ہیں اور میں وہاں سے اپنا سا منھ لے کر، ٹہلنے چلا گیا، اور عہد کر لیا کہ اب سکینہ کے پاس صبح کے وقت کبھی نہیں جاؤں گا۔

ایک روز میں ان کے گھر گیا، کہا آیئے قطب چلیں۔ اُنھوں نے کہا تھک جاؤں گا۔ میں نے کہا ارے موٹر سے جانا ہے، اُنھوں نے، بات کاٹ کر، کہا، آپ بات سمجھتے نہیں، میل دو میل جانا ہو تو کوئی بات نہیں، سولہ، سترہ میل میں جو لیں ہل جائیں گی اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ "دل نہیں ہے آج تو مائل سفر"، میں نے کہا یہ "مائل سفر" کیا چیز ہوتی ہے، اُنھوں نے جواب دیا اضافت بریکٹ میں رکھ دی ہے۔

(ب) اُن کی بُزدلی کے، بہت سے واقعات میں سے دو قصے سماعت فرمالیجئے۔

پہلا واقعہ اُنھیں کی زبان سے سن لیجئے (ہر لفظ تو یاد نہیں مگر واقعہ سامنے آجائے گا۔)

"جوش صاحب، کل ہم ناشتہ کرکے، برآمدے میں، بڑے آرام سے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بیوی نے تیز تیز آواز میں کہا ادھر آؤ، ادھر آؤ، آپ جانتے ہیں کہ ہم بے حد بُزدل ہیں اور ہمارا قول یہ ہے کہ:۔ ہر دل میں تھوڑا سا بُز چاہیئے۔" بیوی کے اس گرم اور گھبرائے لہجے سے ہم ڈر گئے، کانپنے لگے، اُنھوں نے کہا میں کہہ رہی ہوں۔ ادھر آؤ، ادھر آؤ، ہم کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ جوتہ پہنے بغیر، بیوی کے پیچھے پیچھے ہولئے، اور ہر قدم پر دل بلیوں اُچھلتا رہا کہ دیکھیئے کیا چیز پیش آتی ہے۔ بیوی نے باورچی خانے کے دروازے پر ہم کو لے جاکر کھڑا کر دیا اور، اشارہ کرکے، کہنے لگیں، دیکھو یہ چار برتن ٹوٹے پڑے ہیں، اگر باورچی اسی طرح دھوتا رہا تو ایک برتن بھی گھر میں باقی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر ہمارے حواس بجا ہوگئے کہ گھر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے۔ ہم نے باورچی کو بلاکر کہا، ارے بابا، کان کھول کر یہ بات سن لو کہ تانبے اور پیتل کے برتن چینی کے برتنوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی سن لو کہ نیچر کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ جب قوی اور کم زور میں ٹکر ہوتی ہے تو کم زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے، کل سے ایسا کرو کہ قوی برتنوں کو کم زور برتنوں سے ملاکر دھونا چھوڑ دو۔ جب یہ سمجھا کر

ہم پھر اخبار پڑھنے لگے تو بیوی نے ، پیچھے سے آکر ہماری پیٹھ پر۔ اس زور سے دو ہتڑ مارا کہ ہمارے مُنھ سے چیخ نِکل گئی ، اور ہم ہائے رام ، ہائے رام ، کرنے لگے ۔ اُنھوں نے ہماری چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا کیا میں نے تم کو اس لئے ٹوٹے برتن دکھائے تھے کہ تم باورچی کے سامنے فلسفے پر لکچر بگھار کر ، باہر چلے آؤ۔

ہم نے کہا ارے پھر تم چاہتی کیا تھیں ، کہنے لگیں۔ ہم چاہتے تھے کہ تم نوکر کو مارد ہم نے کہا رام رام ، کیسی باتیں کر رہی ہو ۔ ہم مار کیسے سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کیا تمھارے ہات ٹوٹ چکے ہیں ۔؟

ہم نے کہا ارے بات سمجھنے کی تو کوشش کرو ۔ کہیں خالی ہات بھی کسی کو مار سکتے ہیں ، اُنھوں نے کہا یہ خالی بھرے ہات کی کیا بات کر رہے ہو ۔ ہم نے کہا ارے بی بی ، جب کھوپڑی میں غُصّہ بھر جاتا ہے ، تو کھوپڑی ہات کو مارنے کا حکم دیتی ہے ، ہماری کھوپڑی میں غصہ تھا ہی نہیں مارتے کیسے ؟ ، اب سمجھیں

میں نے گھر آکر یہ سارا واقعہ بیوی سے بتا دیا ، شام کو سکینہ آئے تو انھوں نے کہا سکینہ صاحب سنتی ہوں کہ آپ کی بیوی بڑی پاجن ہے (اور میں نے دل ہی دل میں کہا اور تم کیا کم ہو) ۔ سکینہ نے جواب دیا کہ اس پاجی پن میں میری بیوی کا رتی بھر قصور نہیں ہے ۔ اس میں تمام قصور ہے شادی کے رواج کا ، بھابی ، دراصل یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی کمینہ ہوتا ہے ۔ اور یہ جو کچھ ہوا وہ اسی کم بخت رشتے کا پاجی پن تھا اور کچھ بھی نہیں اور میری بیوی مُنھ پھلا کر ، اندر چلی گئی ۔ بیوی کے اندر جاتے ہی اُنھوں نے مجھ سے کہا ، اب ہمیں جانے دو ، میں نے کہا ابھی تو ایک پیگ باقی ہے ، اور پھر کھانا بھی کھانا ہے ، اُنھوں نے کہا اب نہیں ٹھہروں گا ، آپ کی بیوی بگڑ گئی ہیں ، ایسا نہ ہو مجھے ڈپٹنے سے آکر مارنے لگیں میں نے بہت سمجھایا ، لیکن وہ نہیں مانے اور بھاگ کھڑے ہوئے ۔

اب اُن کی بزدلی کا دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے ۔ دہلی کے قدسیہ باغ میں ، ایک روز شام کے وقت ہم لوگ موٹر میں بیٹھے پی رہے تھے کہ گشتی پولیس کے دو آدمی اُدھر آنکلے اور ہم سے کہا آپ لوگ پبلک مقام پر شراب پی رہے ہیں ۔ تھانے چلیئے ۔ تھانے چلیئے ۔ تھانے

کا نام سنتے ہی، سکینہ کے ہات سے گلاس چھوٹ گیا۔ میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر، کہا ہم تھانے وانے نہیں جائیں گے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کرکے، ہماری رپورٹ کردو۔

پولیس والے میرا مُنھ دیکھنے لگے۔ اور اُنھوں نے، بھرائی آواز میں، میرے ڈرائیور سے کہا بہاری[1]، گاڑی اسٹارٹ کردو۔ اور قدسیہ باغ کے پھاٹک سے نکل کر بہاری نے جب نئی دہلی کی طرف گاڑی موڑی، تو اُنھوں نے کہا نہیں، نہیں، سیدھے چیف کمشنر کے یہاں چلو۔ میں نے کہا ہم تو انڈیا گیٹ جانے کے لئے نکلے تھے، اس وقت چیف کمشنر کے وہاں جانے کا کیا تُک ہے۔ اُنھوں نے کہا اب انڈیا گیٹ نہیں جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے کہا گھانس کھاگئے ہو، پیدل پولیس والے موٹر کا تعاقب کریں گے۔ اُنھوں نے کہا یہ باتیں نہ کرو، پولیس سب کچھ کرسکتی ہے، بہاری گاڑی موڑ دو چیف کمشنر کی طرف۔ شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے وہاں جیسے ہی گاڑی رکی، وہ اس قدر زور سے کوٹھی کی طرف بھاگے کہ کُتے بھونکنے لگے، اور اندر جاکر اُنھوں نے چیف کمشنر سے کہا، شنکر پرشاد صاحب، خدا کے لئے ہم کو بچالیئے پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ شنکر پرشاد نے حیران ہوکر، پوچھا، مُعاملہ کیا ہے، میں نے، قہقہہ مارکر، سارا ماجرا بیان کردیا۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ ہم سب کو ہنستا دیکھ کر وہ جامے سے باہر ہوگئے اور کہنے لگے خطرناک موقع پر ہنستے نہیں ہیں، اس سے خطرہ اور قریب آجاتا ہے۔ شنکر پرشاد صاحب آپ فوراً چودھری (آئی جی) کو فون کردیں کہ وہ اُن دونوں پولیس والوں کو گرفتار کرلیں۔

شنکر پرشاد نے کہا ارے سکینہ کیسی باتیں کر رہے ہو، اُنھوں نے کہا یہ موقع مباحثے کا نہیں، پرماتما کا واسطہ ابھی فون کردو۔ شنکر پرشاد نے فون کرکے آئی جی کو اپنے گھر بلالیا اور ہنس ہنس کر سارا واقعہ بیان کرکے کہا چودھری صاحب اُن کی تسلی کردیجئے۔ چودھری نے ان کو لاکھ سمجھایا کہ آپ فکر نہ کریں، میں اُن پولیس والوں کو بخوبی تنبیہہ کردوں گا۔ لیکن ان کا خوف کم نہیں ہوا۔ اس کے بعد وسکی کا دور چلنے لگا۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو میں نے کہا آیئے

---

[1] ڈرائیور کا نام

سکینہ صاحب، آپ کو گھر پہنچا دوں، اُنھوں نے، تھہر کی نظر سے دیکھ کر، مجھ سے کہا آپ جائیں اور گرفتار ہو جائیں، اس پر میں نے اور شنکر، دونوں نے، بڑے زور سے قہقہہ مارا۔ اُنھوں نے کہا جتنا چاہو، دل کھول کر ہنس لو، ہم اس گھر سے قدم باہر نہیں نکالیں گے، شنکر پرشاد صاحب گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجیے۔

الغرض وُہ، دفتر میں رخصت کی درخواست بھیج کر، پورے ایک ہفتے شنکر پرشاد ہی کے گھر رہے۔ اور ساتویں دن، آئے تو، آئی جی کے ساتھ دفتر آئے۔

جب اُس واقعے، اور سکینہ کی زبان میں، اُس خوفناک حادثے کو آٹھ دس دن گزر گئے، مجھے شوخی سوجھی اور فون پر اُن سے یہ کہا سکینہ صاحب پولیس ہتھکڑیاں لئے ہوئے میرے کمرے کی طرف آرہی ہے، یہ سُنتے ہی میں نے اُن کی چیخ اور کھٹاک سے، فون گر جانے کی آواز سُنی۔ اتنے میں چند احباب آگئے، اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی میں باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرے دوست کنور مہندر سنگھ، سٹی مجسٹریٹ، میرے کمرے میں داخل ہوئے، اور مجھے دیکھتے ہی اُن کے مُنھ سے نکل گیا "آئیں"!

میں نے پوچھا کیا بات ہے، اُنھوں نے کہا یہ سکینہ بھی عجیب آدمی ہیں، اُنھوں نے ابھی مجھے فون کیا کہ فوراً آجائیے، جوش گرفتار ہو چکے ہیں، اور اب میری باری آرہی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا، میں نے تو اُن سے مذاق کیا تھا۔ کنور صاحب نے کہا اُن سے ایسا مذاق کرنا بے حد خطرناک ہے، وہ ایسے مذاق سے مر بھی سکتے ہیں۔ چلیئے ان کے کمرے میں چلیں۔ اور جب کمرے میں جا کر دیکھا اور اُن کو موجود نہیں پایا۔ تو میں نے کہا صرف دو باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو وہ آپ کے وہاں گئے ہوئے ہیں۔ یا شنکر پرشاد صاحب کے پاس کنور صاحب نے میرے کمرے میں آکر اپنے اجلاس پر فون کر کے پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں ہیں، اتنے میں شنکر پرشاد کا فون آیا کہ جوش صاحب مجھے بتائیے کہ ہوا کیا، میں نے کہا کچھ بھی نہیں ہوا، خالی مذاق کیا تھا سکینہ سے، اُنھوں نے کہا بڑا غضب کیا آپ نے، سکینہ کی حالت خراب ہے، وہ سات گلاس پانی پی چکے ہیں۔

کنور صاحب کو لے کر وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ سکینہ کا چہرہ سفید ہو چکا ہے۔ میں

قہقہہ مار کر ان سے لپٹ گیا، اور کہا ارے آتنی سی دل لگی میں دم نکل گیا۔ اُنھوں نے پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا، ایک حرف زبان سے نہیں کہا، اور، آنکھیں نیچی کرلیں۔

میں نے اور کنور صاحب نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ارے خدا کی قسم آپ سے مذاق کیا تھا، لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ شنکر نے کہا ارے بھائی اب تو حواس درست کرو، ہنسو بولو، اور مذاق کا لطف اُٹھاؤ۔ اُنھوں نے کہا شنکر صاحب، ہمارے گھر گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجیے، اب ہم آٹھ دس روز تک آپ ہی کے گھر میں رہیں گے۔ اور ہم لوگ جھک مار کر چلے گئے۔ اور جب خدا خدا کرکے، دس بارہ روز کے بعد، آئی جی کے ساتھ، وہ پھر دفتر آئے اور لنچ کے بعد، سبزے پر میرے ساتھ بیٹھ گئے، تو اُنھوں نے بڑی متانت کے ساتھ کہا۔ جوش ہمارے من کی بات سُنو گے، میں نے کہا ضرور سُنوں گا، تو انھوں نے کہا کہ جن پولیس والوں نے قدسیہ باغ میں ہم کو ٹوکا تھا، جب تک ہندوستان کے تمام اخباروں میں اُن کی موت کی خبر چھپ نہیں جائے گی، اُس وقت تک ہم اپنے کو سیف[1] (SAFE) نہیں سمجھیں گے۔

ہے دُنیا میں کوئی مثال اس بے پایاں بُزدلی کی۔؟

یہ میرے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، دیکھیے سکینہ سے اب کبھی مُلاقات ہو گی بھی کہ نہیں۔ میں مر جاؤں تو کوئی ان کو میرا سلام پہنچا کر، یہ کہہ دے کہ تمھارا سب سے بڑا چاہنے والا اس دُنیا سے اُٹھ گیا۔ بَرشُما خوش باد، نا خوش ہلئے دنیائے دَنی!

---

[1] محفوظ

مانی جائسی

گورے رنگ اور متوسط قامت کے، خوش رو، بدگمان، سریع الغضب، خدمات فراموش، پریشاں روزگاری میں کامل دوست، فراغت میں قطعی اجنبی، اوہام کی حد تک، راسخ العقائد، بدرجۂ اُتم نکتہ سنج، قیامت کے ذہین، نہایت خوش فکر غزل گو، بلا کے عاشق مزاج، اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو صبح ازل سے شامِ ابد تک برابر پھٹتا ہی چلا جائے گا، اور لہجے میں ایسی دل کش موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جا رہے ہیں۔

میری نوعمری کے زمانے میں وہ میرے چچا نواب محمد علی خاں کی سرکار میں بطور مُنشی ملازم، میرے پرائیوٹ ٹیوٹر اور کچھ روز کے بعد میرے بڑے بے تکلف دوست بھی ہو گئے تھے۔ اور ایسے دوست کہ ایک مدت تک میں ان کو، اپنے تمام دوستوں سے زیادہ چاہتا رہا تھا۔

وہ ملیح آباد کے اثنائے قیام میں میرے چچا کی فرنگی بیوی کے بھائی پر مرمٹے اور ہر آن اسی کا نام رٹا کرتے تھے اور، جب اس سے ان کا دل بھر گیا تو لکھنؤ کی ایک خوبرو طوائف پر جس کا نام غالباً مہدی جان تھا، مرنے لگے تھے اور اس کے عشق میں جب ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی تو میں نے اس طوائف کو ملیح آباد طلب کر کے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے جھانکا تو یہ دیکھا کہ وہ اس کے پاؤں دبا دبا کر

بری طرح رو رہے ہیں ۔

میں نے ان کو بلا کر کہا ، یہ آپ کیا کر رہے ہیں ، یہ پاؤں دبانے اور آنسو بہانے کا موقع نہیں ہے ، جائیے اور خوش فعلیاں کیجیے ۔ انھوں نے بھرائی آواز میں کہا " اچھا " اور اندر جاتے ہی پھر اس کے پاؤں دبا دبا کر رونے لگے ۔ اس بات کا لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا ۔ لیکن یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے کہ وہ میرے بار بار سمجھانے کے باوجود اس طوائف کے پاؤں رات بھر رو رو کر دباتے رہے ، یہاں تک کہ صبح ہو گئی ۔ جناب والا ، اس کم بخت عشق کی بھی ہزاروں شانیں ہوتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ جذبہ انسان کو اس طرح دبوچ لیتا ہے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا ۔

یہ غالباً ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ میرے کل کے یار اور آج کے اجنبی دوست مخمور اکبرآبادی نے آگرے سے مجھ کو اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور مانی سے میری شیفتگی پر نگاہ کر کے مجھ کو چلکھی دینے کی خاطر ، یہ بھی لکھا تھا کہ مانی بھی ان کی شادی میں شریک ہونے والے ہیں ۔۔۔ تو میں چالیس فی صد مخمور کی شادی میں شریک ہونے ، اور ساٹھ فی صد مانی سے ملنے کے لئے ، اتنا بڑا سفر اختیار کر کے حیدرآباد دکن سے آگرے گیا تھا ۔۔۔ لیکن میں جب قیصر باغ میں اس وقت ان سے ملنے گیا ، جب کہ وہ راجہ صاحب محمودآباد کی سرکار میں ان کی بیگم کی ریاست "بلہرہ" کے مینیجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے تو انھوں نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی اور میرے منہ پر یہاں تک کہہ دیا کہ جوش صاحب میں ضیاء عباس کے علاوہ اس دنیا میں کسی اور کو اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا ۔ اس بات نے میرا دل اس قدر توڑ دیا کہ میں نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا ۔

لیکن اس واقعے کے کئی برس کے بعد جب حکیم صاحب عالم نے مجھے اس امر سے آگاہ کیا کہ مانی کو راجہ صاحب محمود نے چھڑا دیا ہے اور وہ بے چارے کٹرہ ابوتراب خاں کے ایک ٹوٹے سے مکان میں بڑی عسرت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہیں گیا ۔ میں نے دوپہر کی پروا نہیں کی ، سیدھا ان کے پاس پہنچا ۔ مجھ کو دیکھ کر وہ پانی پانی

ہوگئے، اور جب میں، دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا اور کہا جب تک میں زندہ ہوں، آپ پریشان نہیں رہ سکتے، تو شدید حیرت، بے پایاں شرمندگی، اور لامحدود تشکر کے باعث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور جھکی آنکھوں کے ساتھ انھوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ سے بڑا غیر شریفانہ برتاؤ کیا تھا۔ اگر کسی اور سے میں وہ برتاؤ کرتا تو عمر بھر وہ میری صورت نہ دیکھتا۔ میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔ بس بس، مانی صاحب، مجھے شرمندہ نہ کیجئے ـــ اور ہماری دوستی پھر بحال ہوگئی۔

اور جب معاشی پریشانی میں گھر کر غالباً ۱۹۵۵ء میں وہ میرے پاس دہلی آئے، اور انھوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں سرکارِ ہند سے ان کا ادبی وظیفہ مقرر کرادوں ـــ تو میں سیدھا مولانا ابوالکلام کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کردیں انھوں نے کہا، میں تو ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ آپ کا سا بالغ النظر آدمی بھی یہی سمجھتا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ یگانگت کی بنا پر آپ سفارش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مولانا وقتِ واحد میں آپ نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں، ایک معنوی اور ایک لفظی، معنوی ٹھوکر تو یہ ہے کہ آپ مانی صاحب کو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے، یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہیں، اور کوئی غزل گو بڑا شاعر نہیں ہو سکتا مگر ہمارے یہاں جو شعر کا معیار ہے اس پر نگاہ کر کے، میں ان کو ہزاروں غزل بافوں پر ترجیح دوں گا، اور "یگانگت" کا لفظ استعمال کر کے آپ نے لفظی ٹھوکر کھائی ہے۔ فارسی لفظ "یگانہ" میں یہ تائے عربی کہاں سے آگئی۔ مولانا کے چہرے پر شدید انفعال دوڑ گیا۔ پھر بھی انھوں نے سنبھل کر کہا یہ غلط العام ہے ـــ میں نے کہا جان کی اماں پاؤں تو یہ بات زبان پر لاؤں کہ یہ غلط العام نہیں، غلط العوام ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر مسکرانے لگے۔ اور میں پنڈت جی کے پاس چلا گیا۔

ان کے سکریٹری نے کہا جوش صاحب، پنڈت جی اس وقت ایک نہایت ضروری کام کر رہے ہیں انھیں بالکل فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا تو پھر آپ میرا نام لے کر یہ پوچھ آئیں کہ میں کب آؤں۔

سکریٹری نے آکر کہا پنڈت جی سے آپ ابھی مل سکتے ہیں۔ میں پہنچا تو وہ ایک اونچے سے ڈسک پر کھڑے لکھ رہے تھے، میں نے کہا اپنے استاد حضرتِ مانیؔ جائسی کو آپ سے ملانے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا آپ کا بھی کوئی استاد ہو سکتا ہے؟ بلا لیجئے — مانی نے اپنا دیوان پیش، پنڈت جی نے کہا میں آپ کا بہت مشکور ہوں، میں نے کہا شاکر کہیئے — ایسے مواقع پر "مشکور" غلط ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا آپ کہاں تک میری زبان درست کریں گے۔ میں نے مانی صاحب کے ادبی وظیفے کی درخواست پیش کر دی۔ انھوں نے فوراً منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے، پنشن جاری ہوگئی اور مانی صاحب نے مجھ سے ملنا ترک فرما دیا۔

لیکن اگر آپ مجھ سے میرے دل کی بات پوچھیں تو میں بتاؤں کہ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو دیر تک روتا رہا اور آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ ہائے مانی — ہائے مانی۔

منے میرزا اشرؔ لکھنوی

نہایت گورے رنگ، بڑی بڑی بھوری مونچھوں، کرنجی آنکھوں، اور سُبل ناک نقشے کے اس قدر شگفتہ مزاج، اور مخلص انسان تھے کہ ان سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اور، اُسی کے ساتھ ساتھ، وُہ ایسے خوش فکر مرثیہ و غزل گو شاعر بھی تھے کہ اگر شدید قسم کی تُنک، اُن کا راستہ نہ روک لیتی تو، اساتذۂ لکھنؤ میں وہ نہایت نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔

وُہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے اور میرے باپ کے ملنے والے تھے، لیکن میری مُہکتی جوانی کی بے پایاں شوخی، اور ان کی ڈھلتی عمر کی شدید تُنک نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں کہ ہم دونوں میں، ہم عمروں کی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

جب، کبھی کبھار میں دس پندرہ روز لکھنؤ نہیں جاتا تھا، وُہ، مجھ سے ملنے ملیح آباد آجایا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک روز وُہ ملیح آباد آئے ہوئے تھے، اور ہم لوگ، اپنے احاطے کی انگنائی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اُنھوں نے کہا۔ سُنیئے ایک تازہ غزل کہی ہے؟" قیدِ رسم و رواج کیا کیجے،، کی طرح پر۔ جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں!۔

ہوسِ زر، بُری سہی، لیکن
ہو اگر احتیاج کیا کیجے
ہم نے مانا کہ وہ کل آئیں گے

عقل حیــراں ہے آج کیا کیجے

دوسرا شعر سُن کر، میں نے کہا میں آپ کے اس "آج کیا کیجے" کا حل آپ کو بتا دوں؟ انھوں نے میرے مسکراتے چہرے کو، گھور کر دیکھا میں نے اپنے سیدھے ہات کی مٹھی بند کرلی اور ہات ہلا ہلا کر کہا کہ شرر صاحب آج یہ کیجیۓ - وہ بگڑ گئے۔ "اور کہنے لگے خدا ہماری سُنک کا بیڑہ غرق کرے، جو ہم کو لونڈوں کی صحبت میں لاکر بٹھاتی، اور ایسے ایسے فحش اشارات دکھاتی ہے - یہ کہہ کر وُہ اُٹھ کھڑے ہوئے، اور کہنے لگے، بس مُلاقات ختم" ہم ابھی لکھنؤ جا رہے ہیں - بڑی مشکل سے میں نے اُنھیں روکا - اور تھوڑی دیر میں وہ من گئے - اور جب ان کا مزاج نارمل ہو گیا تو میں نے کہا شــرر صاحب ایک مصرع کہتا ہوں "سینۂ بلبل میں چھالا پڑ گیا،" اس پر ایک شعر کہہ دیجیۓ "چھالا" قافیہ ہوگا - اُنھوں نے دو منٹ تک سوچا، اور، اُچھل کر کہا، لو، میسی طرح ہے، ویسا ہی لونڈھیائی شعر سُن لو۔

لیٹنے میں - پھینک کر دل - یہ کہا

"وُہ پڑا ہے - جا اُٹھا لا" - پڑ گیا

چھوٹے دادا نے، قہقہہ مار کر کہا واہ کیا "بندۂ رشیدی کندھور" شعر کہا ہے۔ وہ ہنسنے لگے - اور جب میں نے یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں ردیف مُہمل اور گونگی ہو کر رہ گئی ہے - تو، انھوں نے کہا، ردیف نہ مُہمل ہے، نہ گونگی، بامعنی ہے اور آواز بھی دے رہی ہے صاحب زادے، یہ ڈرامائی شعر ہے، اندر چلو، میں تخت پر بیٹھ کر، اس شعر کو، آنکھوں سے دکھا کر، سمجھا دوں گا - وہ اندر جا کر، تخت بیٹھ گئے، سیدھے ہات کی مٹھی بند کر کے کہا دیکھو، اس مُٹھی میں عاشق کا دل ہے - یہ کہہ کر، وہ آہستہ آہستہ لیٹنے لگے، ابرار سے کہا تُم عاشق بن کر، سامنے کھڑے ہو جاؤ، اور جب ابرار، عاشق بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو لیٹتے لیٹتے، اُنھوں نے، اپنی مٹھی کھول کر اس کو اس طرح جھٹکا دیا، گویا اُنھوں نے فرش پر اُن کا دل پھینک دیا ہے اور دل پھینکتے ہی، وہ ابرار کی طرف نگاہ کر کے یہ کہتے ہوئے کہ "وہ پڑا ہے جا، اُٹھا لا، دَھم سے لیٹ گئے۔ اور کہنے لگے، بتاؤ۔ اب "پڑ گیا" یعنی لیٹ گیا، میں ردیف چسپاں ہوئی کہ نہیں؟۔

اب ان کی سَنک کے دو واقعے بھی سُن لیجئے۔ میرے باپ کی زندگی کا واقعہ ہے، ایک روز وہ خاصہ تناوُل فرما کر، لیٹے اور شررؔ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، کہ میرے باپ کے ایک شاگرد شبابؔ لکھنوی، اصلاح کے لئے ایک غزل لے کر آگئے، میرے باپ پر غنودگی طاری تھی، اُنھوں نے فرمایا شرر صاحب آپ اصلاح دے دیں، اُنھوں نے، بڑی بے چارگی سے، کہا، خاں صاحب میں کیوں کر اصلاح دے سکتا ہوں، میرے پائنچے میں تو، گھٹنے کے اوپر، کھونچا لگ گیا ہے۔ اُن کا یہ نرالا مُعذر سن کر، میر باپ نے، قہقہہ لگا کر، فرمایا کہ اگر مجھ کو اس حادثے کا علم ہوتا تو میں آپ سے اصلاح کے لئے ہرگز نہ کہتا، اس لئے کہ یہ ایک مُسلمہ امر ہے کہ جب کسی شاعر کے پائنچے میں، اور وہ بھی، گھٹنے کے اوپر، کھونچا لگ جاتا ہے، تو اُس میں اصلاح دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اور شررؔ یہ سمجھ کر کہ میرے باپ ان کا مذاق نہیں اُڑا رہے ہیں، بلکہ ان کی تائید کر رہے ہیں، بے حد خوش ہو گئے تھے

جب میں سینٹ پیٹرز کالج میں پڑھتا، اور، لکھنؤ میں تعطیل کا زمانہ گزار کر، آگرے جانے والا تھا تو میں نے شرر صاحب سے یہ مُحکم وعدہ لے لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ آگرے چل کر، دو ایک مہینے گزاریں گے۔

لیکن جب میں ابرار اور رئیس کو ساتھ لے کر، تانگے میں لدا پھندا وزیر گنج پہنچا اور ان کے مکان پر دستک دے کر پوچھا کہ شرر صاحب ہیں کہ نہیں، تو، ان کی بیگم نے کہا جی ہاں ہیں، اور پھر اُس "جی ہاں ہیں" کے ایک سیکنڈ کے بعد، آواز آئی۔ اچھا، نہیں ہیں۔ اس "ہیں"، اور "اچھا، نہیں ہیں" سے میں سمجھ گیا کہ وہ گھر میں چھپے ہیں اور یہ "اچھا، نہیں ہیں" انھیں کے اشارے پر کہا گیا ہے۔ اتنے میں اُن کے دروازے کا پردہ ہوا سے جنبش میں آگیا، اور میں نے دیوار کے قدِ آدم آئینے میں دیکھ لیا کہ شررؔ، اپنی بیگم سے، منھ پر اُنگلی رکھ کر، خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ میں نے پکار کر کہا شرر صاحب، خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً باہر آجائیں، ورنہ میں ایک، دو، تین، کہہ کر، گھر میں گھس پڑوں گا۔ اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو، لونڈے پن کا تو زمانہ تھا ہی، میں، ایک، دو، تین کہہ کر، اُن کے گھر میں گھس گیا، وہ آئیں آئیں کرتے رہے، اور میں

اُن کو کھینچ کر، باہر لے آیا۔ اُن کی بیگم کی آواز آئی اور کرو پٹھانوں سے دوستی، اور اندر سے دروازے میں زنجیر لگا لی۔

میں نے کہا آپ نے تو آگرے چلنے کا وعدہ کیا تھا، انھوں نے جواب دیا ہاں ہاں گلے گلے وعدہ کیا تھا، لیکن یکایک ایک بڑا ضروری کام نکل آیا ہے، کل اُسے نمٹا کر، پرسوں شام تک آگرے آجاؤں گا۔" میں نے کہا ضروری کام کی ایسی تیسی، میں تو اسی وقت ساتھ لے جاؤں گا، اُنھوں نے کہا حضرت عبّاس کی قسم آج نہیں جا سکتا، خواہ آپ مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔ میں نے کہا تو اچھا ہم کو اسٹیشن تک تو پہنچا دو۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے، میں نے، تانگے میں کہا چلے چلیے نا۔ اُنھوں نے کہا، خونِ حسینؑ کی قسم بالکل مجبور ہوں، ورنہ ضرور چلتا۔ اب تانگے سے ہمارا سامان اُترنے لگا، اور ابرار کو روپئے دے کر، میں نے کہا کہ ہمارے ٹکٹ لے آؤ اور ایک پلیٹ فارم ٹکٹ شرر صاحب کے لئے بھی لیتے آنا، اور جب ابرار بکنگ آفس کی طرف روانہ ہونے لگے، تو حیرت ہو گئی اس بات پر کہ شرر صاحب نے پکار کر کہا، ابرار پلیٹ فارم کا نہیں، ہمارا ٹکٹ بھی آگرے ہی کا لے آؤ۔ دیکھی ہے آپ نے کبھی ایسی تگڑی سنک ہے، یہ تھا تماشا شرر لکھنوی کی!

آگرے کا ذکر ہے، ایک روز شرر، ابرار، رئیس اور میں سب مل کر، میرزا محمد زکریا صاحب ملک کے وہاں گئے، ملک صاحب، میرے باپ کے ننہالی بھائی، اور آگرے کے رئیسِ اعظم و نامور غزل گو شاعر میرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی کے، بڑے تیکھے اور بانکے فرزند تھے۔ میں نے راستے میں کہا شرر صاحب اس قدر عنایت ضرور کیجیے گا کہ، کم سے کم، پہلی ہی ملاقات میں ملک چچا کو اس بات کا پتا نہ چل جائے کہ آپ سنکی ہیں۔ اُنھوں نے کہا اور آپ بھی اپنی سنک کو ظاہر نہ ہونے دیجیے گا۔ میں نے کہا، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا، اور آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟ اُنھوں نے سینے پر ہات رکھ کر، بڑے اعتماد کے ساتھ، کہا قولِ مرداں جانِ دارد۔ اب ہم ملک صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے، انھوں نے، ہم لوگوں کو، بڑی شفقت کے ساتھ، گلے لگایا، میں نے شرر صاحب کا تعارف کرایا۔ اُنھوں نے، بڑے تپاک کے ساتھ، اُن سے ہات

ملایا، اور صدر مقام پر بٹھا دیا۔ اور، اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ملک صاحب نے چونک کر کہا، معاف کیجیے گا، شرر صاحب میں چائے بھول گیا، ابھی حاضر کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنے ملازم کو آواز دی۔ شرر نے کہا میرزا صاحب چائے کی قطعی زحمت نہ فرمایئے ملک صاحب نے کہا جناب والا، بھلا چائے میں زحمت ہی کیا ہوتی ہے، شرر صاحب نے کہا بات یہ ہے میرزا صاحب کہ میں چائے قطعاً پیتا ہی نہیں ہوں، اس لیے وہ ضائع ہو جائے گی۔ ملک صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اب شاعری شروع ہو گئی۔ ملک صاحب نے پہلے اپنا کلام سنایا، پھر شرر صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی، انھوں نے کہا میرزا صاحب، مجھ ناچیز کا کلام سننے سے پیشتر، چائے تو پلا دیجیے۔ یہ انوکھی بات سنتے ہی، میرزا صاحب کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور چائے آگئی تو اُنھیں، بڑے شوق سے چائے پیتے دیکھ کر، وہ ہم سب لوگوں کو بار بار دیکھنے لگے۔

گھر آتے ہی میں نے اُن سے کہا، کیوں شرر صاحب آخر آپ نے ہم سب کی ناک کٹوا دی نا۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ ظاہر کر دیا کہ آپ، معمولی، نہیں، پرلے درجے کے سنکی ہیں، انھوں نے، بات کاٹ کر کہا، سنکی ہوں ہمارے دشمن، ہم نے بفضلہ، کوئی سنک کی بات نہیں کی ہے۔ میں نے کہا دیکھیے خیریت اسی میں ہے کہ قائل ہو جایئے، اُنھوں نے کہا قیامت تک قائل نہیں ہوں گا۔ میں نے پوچھا پرانی قائل کر دینے والی صورت پر عمل کر دوں؟ اُنھوں نے کہا سو بار عمل کر دیکھیے بندہ قائل نہیں ہونے کا۔ میں نے کہا رئیس، وہی پرانا عمل۔ یہ سنتے ہی رئیس نے، اُن کو چارپائی پر گرا کر، اپنا پہلوانی گھٹنا اُن کے سینے پر رکھ کر پوچھا قائل ہوئے کہ نہیں، اُنھوں نے کہا نہیں، ہرگز نہیں، اب اور گھٹنا دبا کر پوچھا اب؟ کہا اب بھی نہیں، قطعی نہیں۔ اور اب سہ بارہ، جب رئیس نے اپنا گھٹنا۔ ان کے سینے پر بہت زور سے، دبا کر پوچھا اور اب، تو وہ چیخ چیخ کر، کہنے لگے۔ قائل، قائل قائل۔ اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور لطف یہ کہ، تھوڑی دیر میں، وہ بھی قہقہے لگانے لگے۔

اب ایک آخری بات سنا کر جو آج تک فراموش نہیں ہو سکی ہے۔ اُن کی داستان

کو ختم کر رہا ہوں ۔

ایک روز، آغاز بہاراں کے۔ جادو بھرے۔ گنگا جمنی، دھندلکے میں ۔جب کہ آسمان سے، زمین کے منھ پر، مٹھاس اُتر رہی تھی ۔ ہم لوگ ۔ مُرغانِ سحر کی بانگوں، آمادۂ سفر تاروں اور ترانہ خواں جھونکوں میں ڈوبے ہوئے۔ گومتی کے ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ کہ، ایک دور کے مندر کے چراغ کی سہانی روشنی، اور، گھنٹیوں کی ملائم جھنکار نے، ہم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مندر کے دروازے پر، کھڑے ہوکر، ہم جھومنے لگے ۔ اور، ایسا محسوس ہونے لگا کہ فرشِ زمین بڑی آہستگی کے ساتھ جُھکتا ہوا عرشِ بریں کی جانب، اُٹھتا چلا جا رہا ہے۔ اور کائنات، بھیرویں میں ڈوب کر، یہ رُباعی گنگنا رہی ہے:۔

آتش پہ، مُغاں نے، راگ گایا تیرا
ہندو نے، صنم میں، جلوہ پایا تیرا
دہری نے کیا، دَہر سے تعبیر تجھے
انکار، کسی سے بن نہ آیا تیرا

کہ اتنے میں ایک لالہ رُخ طفلِ برہمن ۔جس کا بھرا بھرا چہرہ۔ پگھلے ہُوئے سونے سے، اُبل اور چھلک رہا تھا جس کی خواب آلودہ آنکھوں میں، شامِ اودھ کروٹیں لے رہی تھی۔ اور، جس کے ماتھے کے قشقے سے صبح بنارس طالع ہو رہی تھی اپنے پھول سے گلے میں، خیطِ ابیض اور قوسِ قزح کی سی آڑی زُنّار ڈالے، ایسی مندا سی ٹلک کے ساتھ، مندر سے برآمد ہُوا۔ جیسے کُہرے کے بیچ در بیچ بھورے نم ناک، پَچھوں میں، کنوار کی شعاع آویں، مچلتی نظر آتی ہے ۔ میں نے شفقِ صبح کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اُس طفلِ نوزاد کو دیکھا تو یا ہُو کا نعرہ لگا کر سَر دُھننے لگا، اور، شررؔ نے، کلیجہ تھام کر، آنکھیں بند کر لیں، اور تھوڑے سے وقفے کے بعد، انھوں نے میری طرف نظر اُٹھا کر، کہا سُنیے ابھی ابھی اس فتنۂ دہر پہ ایک شعر کہا ہے:۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے
نکلے جب، رات کا جاگا ہوا، بُت خانے سے!

لہ شررؔ صاحب اودھ میں۔

ہائے وہ دُھندلکا۔ ہائے وہ بالکا۔ ہائے وہ شرر، ہائے وہ سماں، اس گھڑی کا ایک ایک لمحہ، میرے دل میں، آج تک، برچھی کی طرح چُبھا ہوا ہے۔

رنگِ گُل، سینے میں چُبھتا ہے کبے آوازدوں
بُوئے گُل دل میں کھٹکتی ہے، الٰہی کیا کروں!!

شاہ دل گیر اکبر آبادی

رسالہ "نقاد" کے مدیر، خاندانِ مشایخ کے چشم و چراغ، دراز قامت، دراز ریش دراز دست، کوتاہ ہمت، بخل پسند، پُر کیسہ تہی دست، کثیر السّواد، قلیل الرّماد، بخوشی میہمان، بکراہت میزبان، عقاب پنجہ، کبوتر مزاج، خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب، کیا کیا خصوصیات بیان کروں شاہ صاحب کے۔

وہ اس قدر تلملا جاتے تھے ماہ جبینوں کو دیکھ کر کہ ان کے حواس بجا نہیں رہتے تھے راہ گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا، اس لئے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی تھی، وہ اپنے ساتھی کی پسلیوں پر اس قدر زور سے کہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ اسی طرح، جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے تو زور زور داد دینے والے کی ران پر اپنا پہاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارتے تھے کہ وہ غریب اچھل جایا کرتا تھا۔

ایک بار وہ ٹونڈلہ جنکشن تک مجھے پہنچانے گئے تھے، میری گاڑی کے بالمقابل ایک دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں ایک نہایت قبول صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی، شاہ صاحب نے اسے دیکھ لیا، وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔ اور میری پسلیوں پر برابر کہنیاں مارنے لگے۔ میری پسلیاں پھوڑا ہو گئیں تو میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر، اپنے قلی کو ان کے پہلو میں کھڑا کر دیا، وہ اس قدر محو تھے کہ انھیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوئی ــــ اور اب انھوں نے پھر بڑے زور سے کہنی ماری، کہنی قلی کی پسلیوں میں لگی، اس کے سر سے میرا

بکس اور بستر گر پڑا، اس نے ہائے رام کہا اور اپنی پسلیاں پکڑ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا اور مجھ دکھتی پسلیوں کے درد رسیدہ بدبخت کی گاڑی چھوٹ گئی۔

آگرے کے اثنائے قیام میں ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ فانی و مانی کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کے وہاں پہنچا، ان دونوں کو شاہ صاحب کے داہنے بائیں بٹھا کر خود ایک گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی۔ فانی و مانی فوراً تاڑ گئے میری شرارت کو۔ انھوں نے کہا جوش صاحب اپنی کرسی ہم دونوں کے درمیان لے آیئے۔ میں سمجھ گیا ان کی نیت اور اپنی جگہ سے یہ کہہ کر نہیں ہلا کہ ادھر ہوا خوب آ رہی ہے۔ اب شاہ صاحب نے شعر خوانی شروع کر دی۔ فانی و مانی، بڑی آہستگی سے داد دینے لگے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر زور سے داد دیں گے تو شاہ صاحب کا بھاری ہات پڑنے لگے گا ان کی رانوں پر۔

اتنے میں جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل جو شہیدِ جفا ہوا

تو ان دونوں کی چالاکی کا توڑ کرنے کے لئے میں نے ایک خارا شگاف نعرے کے ساتھ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ۔ شاہ صاحب نے بڑے زور سے جھوم کر فانی کی ران پر تڑاق سے ہات مار دیا۔ فانی کانپ اٹھے۔ میں نے کہا، شاہ صاحب مکرر ارشاد ہو ــــ اور انھوں نے جھوم کر دوبارہ شعر پڑھا ؎

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل، جو شہید وفا ہوا

اب انھوں نے مانی کی ران پر اس زور سے ہات مارا کہ وہ بلبلا کر رہ گئے۔

میں نے کہا شاہ صاحب خدا کے واسطے ایک بار اور۔ فانی و مانی نے مجھ کو گھور کر دیکھا اور شاہ صاحب نے سہ بارہ ؎ ارے تم کو نہیں، ارے تم کو نہیں، ارے تم کو نہیں ــــ مجھے تو، ارے مجھے تو نہایت عزیز تھا۔ اب دونوں کی رانوں پر، تڑاتڑ

تڑاتڑ ہات پڑنے لگے ، اور میں ہنسی چھپانے کے لئے منہ پر ہات رکھ کر جھومنے لگا ۔
وہاں سے گھر آئے تو شاہ صاحب کے دونوں مضروب مجھ پر برس پڑے ـــــ دونوں نے اپنی رانیں کھول کر دکھائیں ، جن میں نیل پڑ چکے تھے اور شاہ صاحب کی موٹی انگلیاں بنی ہوئی تھیں ۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حضرت عزیز لکھنوی کے قابلِ ناز شاگرد، مُجھ، ہیچ مداں کے اُستاد بھائی، علمِ عروض و فنِّ شاعری کے مرکزی استاد، فارسی و انگریزی ادب کے زبردست نبّاض، قلزمِ انسانیت کے مَنارۂ ضوبار، ممبرِ انتقاد کے خطیبِ اعظم، مَسندِ زبان کے قاضی القضات اور مدینۂ تہذیبِ لکھنؤ کے طاقِ زرّیں کے، ہزاروں بُجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں، ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے، جن کے گُل ہو جانے سے، تمام شہر پر، مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ہر ذرّہ، کراہ کراہ کر، فریاد کر رہا ہے کہ :۔

اک شمع رہ گئی تھی، سو وُہ بھی خموش ہے!

اُن کی موت، ایک فرد کی موت نہیں، ایک پوری صدی، ایک پورے طرزِ معاشرت کی موت ہے۔ اور نصیر الدین حیدر سے لے کر حضرت جان عالم کے زرّیں دور تک، لکھنؤ کے اولیائے علم و آئمۂ ادب نے، شائستگی، تہذیب، نفاست، لطافت، اور آداب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا، اور، اس کے دوش بدوش اُنھوں نے، جس وضع داری ایثار پسندی، تواضع شعاری، نرم گفتاری، شیریں لہجگی اور بلور مزاجی کو فروغ بخشا تھا، اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

سُنسان مثلِ وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ آتشؔ آج وطن سے نکل گیا

میں نے جب حضرتِ عزیز کے مکان پر، سب سے پہلے، اُنھیں دیکھا تھا، اُس

وقت میری جوانی کی پہلی کرن پھوٹی تھی، اور وہ جوانی کی دوپہر سے گزر رہے تھے۔ میرے اُن کے مابین چھوٹے اور بڑے بھائی کا سا برتاؤ تھا۔ اور چوں کہ وہ انتہائی راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اس لئے میری آزاد خیالی پر وہ ناک بھوں چڑھانے اور اکثر مجھ کو ٹوکا کرتے تھے۔

اور، رفتہ رفتہ جب میرے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پیدا ہوگئی تو ایک روز میں نے کہا۔ اثر صاحب، اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں، اُنھوں نے کہا بڑے شوق سے کہیئے۔

میں نے کہا تمام ہندوستان، آزادی حاصل کرنے کے لئے، فرنگی کے روبرو، خم ٹھونک کر میدان میں آچکا ہے محبّانِ وطن، دھڑا دھڑ نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر، کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں، اور آپ حسینؓ کے پرستار ہونے کے باوجود، ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھے، عصرِ حاضر کے یزید فرنگی کا ساتھ دے رہے ہیں، کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس؟ میری یہ بات سن کر اُن کے چہرے کا رنگ مٹیالا سا ہو گیا، کوئی چیز اُن کی پتلیوں میں چبھنے سی لگی اور اُنھوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور میں نے اُن کے چہرے پر اس قدر کرب آمیز شرمندگی دیکھی کہ پھر تمام عمر اُن سے اس موضوع پر بات کی ہی نہیں۔ اُن کی شاعری کا میں کبھی قائل نہیں رہا۔ لیکن اُن کی بے پایاں شرافت، اور بے کراں زبان دانی کا ہمیشہ لوہا مانتا رہا۔ ان کی تمام بے شمار خوبیاں سر آنکھوں پر، لیکن، اُن کو اپنا کلام سنانے کا اس قدر ہَوکا تھا کہ سامعین کی قوتِ برداشت کی ہڈیاں بولنے لگتی تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ معرضِ تحریر میں لا رہا ہوں، جس کو پڑھ کر، مجھے یقین ہے کہ آپ بھی، اوبھی اوبھی سانسیں لینے لگیں گے۔

ایک بار مجازؔ کو ساتھ لے کر، میں کشمیر گیا۔ اس دور میں مہاراجہ کشمیر حکم راں، اور اثر صاحب، کسی شعبے کے، وزیر تھے۔ میں وہاں گیا تو تھا، یہ نعرہ لگاتا ہوا کہ:۔

عصیاں کی گھٹا کی چھاؤں میں دم لینے
"ممنوعہ شجر" سے لطف پیہم لینے

آواز دو کا شمیر آ پہنچا جوشؔ
اللہ سے، انتقام آدم لینے

لیکن وہاں پہنچا تو نواب جعفر علی خان اثرؔ کے ذوقِ غزل سرائی کی، آہنی پھٹکی میں بند ہوگیا۔

ہاں تو سنیئے کہ ہم کشمیر پہنچے تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں نے کہا مجازؔ، اس وقت تو یہ مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ ہم شیخ عبداللہ اور اثرؔ صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دیں، اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ ہوٹل میں ہم نے اپنا شغل شروع کر دیا۔ اور جب مجاز نے، برآمدے میں کھڑے ہو کر، سری نگر پر نگاہ ڈالی تو کہا جوش صاحب یہ شہر تو ایسا ہے گویا ہم مارہرے آگئے ہیں۔ اس لطیفے پر، ہنس ہنسا کر، ہم سو گئے۔

بہت تڑکے میں نے مجاز کو جگایا، انھوں نے لیٹے لیٹے، آنکھ کھول کر کہا، معاف کیجیے یہ وقت کوؤں کے جاگنے کا ہے۔ میں بستر نہیں چھوڑوں گا، میں نے، اُنھیں جھنجھوڑ کر کہا اے کم بخت، دم بھر میں صبح کا گنگا جمنی جلوس گزرے گا، اور تو اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر سے اُس جلوس کو گزار دے گا، یہ کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے، ارے کشمیر میں صبح کیوں کر ہوتی ہے، یہ تو دیکھ لے۔ الغرض، مجاز کو زبردستی ساتھ لے کر، ٹہلنے چلا گیا۔ ابھی مشکل سے دو میل ٹہلا ہوں گا کہ دیکھا ایک کوٹھی کے پھاٹک کے ستون پر، "نواب جعفر علی خاں"، کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔ ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں، پھاٹک کی طرف منھ کئے کھڑے ہیں اُنھوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا۔ وہ، لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے، ہم سے بغل گیر ہوئے، پوچھا یہاں کب آئے، میں نے کہا شام کو، انھوں نے کہا۔ ٹھہرے کہاں ہیں، میں نے کہا ہوٹل میں، اُنھوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا، میرے وہاں سیدھے کیوں نہیں چلے آئے، کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے آواز دی، کوئی ہے، آردلی دوڑا آیا، اُنھوں نے اس کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے، اور بل ادا کر دے۔ میں نے کہا بل میں ادا کروں گا۔ اُنھوں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس مرحلے کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر، فوراً

کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر، ایک موٹی سی بیاض لئے باہر آ گئے، اور ایک دم سے غزلوں کی گولیاں، دنادن، دنادن، دنادن چلانے لگے۔

جب اس طرح ڈیڑھ، دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا، کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے نہ حمام و ناشتہ ہی کیا ہے۔ میں نے مجاز کو، اور مجاز نے مجھے، بے کسی کے ساتھ دیکھا۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے۔ کہ اتنے میں سکریٹری نے آکر کہا کہ سرکار، ساڑھے نو بج چکے ہیں، دس بجے مہاراجہ کی ڈیوڑھی پر آپ کو تشریف لے جانا ہے۔ اُنھوں نے، بڑی بے لطفی کے ساتھ، بیاض بند کر دی۔ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراجہ کے پیلس چلے گئے۔ اُس، غزلوں کے دو نگڑے کے بعد، ہم نے خط بنایا، اور حمام و ناشتہ کرکے لیٹ گئے۔ اور مسلسل غزلیں سُننے، اور پیاپے داد دینے کے تکان کی بنا پر، ہم کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹے تک برابر ہم سوتے رہے، اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا گھڑی ایک بجا رہی ہے۔ اور حضرتِ اثرؔ ایک لنبوترا سا رجسٹر بغل میں دبائے، کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے کہا، آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں، میں نے کہا تو اتنا وقت دیجئے کہ دوبارہ نہا دھو کر، کپڑے پہن لوں، اُنھوں نے کہا میں آپ کو، اسی طرح کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کراؤں گا۔ اور یہ کہتے ہی اُنھوں نے وہ لنبوترا سا رجسٹر کھول لیا۔ اُنھوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آکر کہا، سرکار لنچ طیار ہے۔ اُنھوں نے کہا آیئے لنچ کر لیں۔ لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دُہرے مشاغل، بیک وقت، جاری ہو گئے۔ اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا، کانوں میں (مناظرِ کشمیر پر) نظمیں منہ میں نوالے، اور ہونٹوں پر، سبحان اللہ کے جھوٹے نعرے۔ اور اس طرح وہ لنچ، ہم دونوں کو تناول فرمانے لگا۔

اور خدا خدا کرکے، جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ، ہم کو کھا کر ختم ہوا تو، ہات دھو کر، ہم اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئے، اور شاید ابھی مشکل سے دو تین ہی کروٹیں لی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لئے آ گئے۔ اور یہ کہہ کر نظمیں سُنانے لگے کہ دیکھئے بد نصیب

شاعرہ ''سیفو'' کی ناتمام نظموں کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر، یہ نظمیں کہی ہیں ۔

اور جب، نظمیں سنتے سنتے، پانچ بج گئے، تو میرا دماغ سنسنانے لگا، میں نے کہا۔ میں دونوں وقت حمام کرتا ہوں، آپ اجازت دیں کہ حمام کر کے چائے پی لوں، تاکہ، تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں، میں غسل خانے چلا گیا، وہ مجاز کو، کلام سناتے رہے، اور مجاز کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی ''واہ واہ'' ہوا میں تیرنے لگی۔ واٰ، اے، اے، اے، ''واٰہے، اے، اے، اے''، میں حمام کر کے نکلا تو انھوں نے کہا، میاں مجاز تم بھی حمام کر آؤ، انھوں نے کہا میں تو صبح کو بھی نہیں نہاتا۔ یہ دونیترا غسل جوش صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آگئی، اور، چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی پی کر، وہ ''سیفو'' کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں، بڑی کراہ کے ساتھ، آفتاب ڈوب گیا، فضا سانولی سلونی ہوگئی۔ اثر صاحب نے ہم دونوں، قربانی کے بکروں کو، بڑے شان دار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا، بلب روشن کر دیئے، ہیٹر جلا دیا، اعلیٰ درجے کی وسکی کی بوتل، نہایت خوب صورت گلاس اور تلے کاجو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت سی اگر بتیاں جلوا دیں۔

اب ہم، دن بھر کے جھنجھوڑے، بھنبوڑے اور روندے ہوئے، تھکے ماندے بندوں نے ''اپنے اپنے پیمانے بھرے، ''الحمدللہ'' کہہ کر، دو دو گھونٹ پیے، مجاز نے سگریٹ، اور میں نے سگار جلا لیا۔ اور وہ ایک بغلی کمرے سے نکل کر آئے، ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور میر تقی میر کے رنگ کی غزلیں، سنانے لگے۔ اور، میدانِ داد کے ہم دونوں کرائے کے ٹٹو، پھر دلکی، پوئیہ، لنگوری، قدم اور سرپٹ کے جوہر دکھانے لگے۔

اور جب رات کے گیارہ بج گئے، تو مجاز کو، اُل اُلا کے، قے ہوگئی۔ دو اردلی ان کو پکڑ کر خواب گاہ لے گئے، دو فرش صاف کرنے لگے، اثر نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر، مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میر کے رنگ کی غزلیں پھر سنانے لگیں، میں نے ان کے ارادے کو بھانپ کر، گردن ڈال دی، اور محفل برخواست ہوگئی۔

اور صبح کے چار بجے میں نے جب مجاز کو جگایا، تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثر صاحب آگئے،

اُس نے، آنکھیں کھولے بغیر، کہنا شروع کر دیا کہ سُبحان اللہ جواب نہیں ہے اس شعر کا ،! اس کی اس داد پر جب میں ہنسنے لگا تو اُس نے، آنکھیں پھاڑ کر، مجھے دیکھا، اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ، جعفر علی خاں نہیں، جوشؔ صاحب آپ ہیں۔ اور ہم دونوں اس وقت زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوشؔ صاحب کیا میری ماں نے مجھ کو صرف اتنے کے لئے پیدا کیا تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں تو آپ کے ساتھ کشمیر جاؤں، اور کشمیر کی سیر کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آپ میری بات مانیں، ابھی سویرا ہے، اس وقت یہاں سے، چُپ چپاتے بھاگ کھڑے ہوں اور کسی دُور کے ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو جائیں، میں نے کہا اور یہ تمام سامان کیا ہم اپنے سَروں پر لاد کے لے جائیں گے، اُس نے کہا جس ہوٹل میں ہم نے کل کی رات بسَر کی تھی، وہیں ٹیکسیوں کا اڈّا ہے، میں ٹیکسی کے ساتھ مزدور بھی لاؤں گا، ٹیکسی کو پھاٹک کے باہر ٹھہرا دوں گا، اور مزدور یہاں سے سامان لے جا کر ٹیکسی میں رکھ دیں گے۔ میں نے کہا بڑی اچھی تدبیر ہے، دیر نہ کرو، ابھی جاؤ۔

جب ٹیکسی آگئی اور سامان رکھ دیا گیا۔ میں نے کہا ڈرائیور صاحب ہم کو کسی ایسے ہاؤس بوٹ تک پہنچا دو، جو یہاں سے دور ہو، اور، ڈھونڈنے والے کو، آسانی سے نہ مل سکے۔

ٹیکسی والے نے ہم کو غالباً ہائی کورٹ کی پشت کے ایک ایسے ہاؤس بوٹ میں، لے جا کر، ٹھہرا دیا، جو گزرگاہِ عام سے دور تھا، وہاں پہنچ کر، ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے خط بنایا، حمّام کیا، اور، غسل خانے سے نکل کر، جب ناشتے کی میز پر بیٹھا تو دیکھا مجازؔ سو رہا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اُس کو جگاؤں، تنہا ناشتہ کیا، اور ٹہلنے نکل گیا۔ ٹہلنے میں زیادہ لطف نہیں آیا، اس لئے کہ حضرتِ اثرؔ کے کلام کی لگاتار بارش سے، میرا کیوڑہ چُک چکا تھا۔ ہاؤس بوٹ میں جا کر سو گیا۔ دن کے ایک بجے آنکھ کھُلی، دیکھا مجازؔ سو رہا ہے، اُسے جگایا، دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا۔ مجازؔ سے کہا جلدی جلدی خط بنا کر نہا ڈالو، مجاز نے کہا کل خط بناؤں گا، میں نے کہا اچھا تو پھر حمام ہی کر آؤ، اُس نے، مسکرا کر، کہا جوشؔ صاحب، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں پنڈت دوار کا پرشاد نہیں کہ اشنان

کریں۔ میں نے کہا، یوں کہو کہ ہم گندے مَشلے ہیں۔ ہم کو حمّام سے کیا کام۔ اور مجاز نے، نقط دو چھوٹی کُلیاں کر کے ناشتہ شروع کر دیا، اور مجھ کو گھن آنے لگی۔

کوئی چار بجے کے قریب جب میں نے دریا کا لُطف اُٹھانے کے لئے" شکارا" بُلایا، اور شکارے پر اپنا افطار کا سامان رکھوا دیا، تو مجاز نے، بڑی بھیانک آواز سے کہا، جعفر علی خاں کی سی صورت کے کوئی صاحب، ہائی کورٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا ایسی بھکیا نہ نکالو مُنھ سے، کوئی اور ہو گا۔ مجاز نے کہا، ارے جوش صاحب سچ مچ جعفر علی خاں چلے آرہے ہیں، آیئے، سوفوں کے نیچے لیٹ جائیں، میں نے کہا یہ تو شُترمرغ کی سی حرکت ہو گی، جو طوفان کے وقت، ریگ میں اپنا مُنھ چھپا کر، یہ سمجھ لیتا ہے کہ طوفان گزر گیا۔ اتنے میں، دو تین وردی پوش آدمیوں کے ساتھ، جعفر علی خاں ساحل پر آگئے، اور اُن کے آدمی کشتی بانوں سے ہمارے قیافے بتا کر پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کس ہاؤس بوٹ میں ہیں۔

ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ ہمارے ہاؤس بوٹ کا ملاح، جو سامان لینے باہر گیا ہُوا تھا، وہ کم بخت اُدھر سے گزرا، اور جب ہمارے قیافے بتا کر، ہمارا پتا پوچھا گیا، تو اُس نے کہا آیئے میرے ساتھ، وہ ہمارے ہی ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے اُن کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تو ہم اس طرح سراسیمہ ہو گئے، جس طرح جیل سے بھاگے ہوئے چور، پولیس کو، تعاقب میں آتا دیکھ کر، کانپنے لگتے ہیں۔

اتنے میں وہ آگئے، اور، چھوٹتے ہی اُنھوں نے کہا۔ کیوں جوش صاحب، دوستوں کے گھر سے کوئی یوں بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر میرے یہاں کوئی تکلیف تھی، مجھ سے کہہ دیتے، میں اُسے رفع کر دیتا، آپ کو معلوم نہیں، صُبح جب میں آپ کے کمرے میں گیا اور کمرے کو خالی پایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے آدمی، آپ کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیئے، اور جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، وہاں کے ایک ٹیکسی والے سے جب یہ پتا چلا کہ آپ ہائی کورٹ کی پشت کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں خود، آیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔

ان کی شکایت سے میں شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔ اور کہا اثر صاحب یہ مجذوا (مجاز) ہے جو مجھے آپ کے دولت کدے سے بھگا کر یہاں لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا، کشمیر آنا اور ہاؤس بوٹ میں نہ ٹھہرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ انھوں نے کہا مجھ سے کہتے میں، سرکاری ہاؤس بوٹ کا بندوبست کردیتا۔ میں نے، آنکھیں جھکا کر، کہا، بڑی غلطی ہوئی مجھ سے، میرا مزاج تو" دیوانہ را، ہوئے بس است" کا ساہے، مجاز نے "ہو" کہا، اور میں دیوانہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں دست بستہ آپ سے معافی کا طالب ہوں، آپ کریم ہیں، معاف فرمادیں۔

اثر صاحب نے مسکرا کر، مجھے گلے لیا۔ مجاز سے کہا تم بڑی بس کی گانٹھ نکلے۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اثر صاحب نے، ایک وردی پوش کو آواز دی، وہ آیا، انھوں نے کہا بوتل لاؤ، اُس نے بوتل سامنے رکھ دی۔ مجاز، بوتل کی طرف، ہڑبڑا کر جھکے، میں نے کہا، آفتاب ڈوبنے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی ہیں، ٹھہر جاؤ، مجاز منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اثر صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کردیا۔ اور ہماری سیرِ دریا کی تمنا پر پانی پھر گیا۔

دوسرے دن، صبح کو ٹہل کر، جب میں ہاؤس بوٹ میں آیا تو مجاز نے کہا، اب کیا کریں اثر صاحب نے تو گھر دیکھ لیا ہے، کسی اور ہاؤس بوٹ میں چلے چلیں۔ میں نے کہا وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم اُن سے منہ چھپا رہے ہیں۔ اس پر مجاز نے کہا تو پھر آج، ذرا جلدی کھانا کھا کر، دو بجے ہی شکارے پر بھاگ کھڑے ہوں اور گھوم گھام کر "ستھری اوک" والے جزیرے جائیں اور وہیں بیٹھ کر شغل کریں۔

اس تجویز پر عمل کر کے، ہم لوگ دو بجے ہی شکارا منگا کر، نکل گئے اور بہت سے مقامات کی سیر کر کے، "ستھری اوک" کے جزیرے میں، شام ہوتے ہی پہنچ گئے، بساطِ بادہ خواری بچھا دی گئی، اور ماہِ یک ہفتہ کو سلام کر کے، پیمانے بھر لئے۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگے۔ اور مجاز نے، بڑے ولولے کے ساتھ کہا، اب پکڑ لیں ہم کو نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اُن کی یہ آواز ابھی گونج ہی رہی تھی کہ دیکھا ایک شکارا، دور سے، ہماری طرف چلا آ

آرہا ہے۔ اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہوگئی۔ دریا کا پانی جھلکنے اور گُڑم گُڑم کرنے لگا اور شیشوں کی آگ ہمارے جسم میں دوڑنے لگی۔ کہ اتنے میں وہ دور کا شکارا قریب آگیا۔ مجاز نے شکارے کو غور سے دیکھا، اُن کے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھ سے کہا۔ ارے جعفر علی خاں چلے آرہے ہیں، میں نے کہا دیوانے ہوگئے ہو۔" اُنھوں نے کہا۔ ارے وُہی عینک، ارے وُہی پرتین کیپ۔ ارے وُہی شیروانی، ہائے رام، ہائے رام!

اتنے میں شکارا ہمارے جزیرے سے آکر لگ گیا۔ اور اثر صاحب اُتر کر، ہماری طرف آنے لگے۔ ہم کھڑے ہوگئے، اُنھوں نے کہا:۔ تُو جہاں جاکے چُھپا، ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ اور یہ مصرع سُنا کر اُنھوں نے اپنا کلام سُنانا شروع کردیا۔

حکیم آزاد انصاری

رقت انگیز حد تک نحیف الجثہ۔ چیٹ کی طرح لانبے۔ ٹھوڑی پر، سفید فرنچ کٹ، داڑھی۔ سر پر بے پھندنے کی، ترکی ٹوپی۔ چہرہ لانبا۔ نقاذ آنکھوں پر، موٹے نالوں کی عینک سُخن سنجوں کے امام، مولانا حالیؔ کے شاگرد، اور سہلِ ممتنع کے وحدہٗ لاشریک شاعر۔

حیدر آباد دکن میں اُن سے تعارف ہوا تھا۔ اور پہلی ملاقات، کس قدر، پھیکی سی رہی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ جب اُن کے جوہر کھلنے لگے تو ہمارے مابین پینگ بڑھتے گئے۔

وہ، اوپر سے خشک، بے رنگ نظر آتے تھے، لیکن اندر سے بے حد تروتازہ اور رنگین تھے۔ اور اسی رنگینی کی بنا پر، وہ اپنے بیٹے، احسان احمد سے ناخوش ہو کر، جو کٹھ مُلّا، اور اپنے باپ سے کُنسانے والی بیوی کے اشاروں پر چلتا، اور بیوی کو باپ پر ترجیح دیتا تھا مستقل طور پر، میرے پاس رہنے لگے تھے۔

ابرار اُن کو چھیڑ کر، لطف اُٹھاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ آزاد صاحب اگر آپ اپنی زبان کی موچ نکالنا چاہتے ہیں تو خدارا لکھنؤ جا کر، وہاں، سال، دو سال قیام کیجئے۔ اور یہ ممکن نہیں تو ایک روز لکھنؤ کا ٹکٹ لے کر جایئے، چار باغ اسٹیشن پر اُتریئے اور وہاں کی کسی دیوار کو چھو کر ہی پلٹ آیئے، زبان آجائے گی آپ کو۔ اللہ، آزاد، صاحب، آپ تو آپ، زبان تو آپ کے اُستاد حالیؔ کو بھی نہیں آتی تھی اور وہ جو بُرے گا پانی تو جائے گا دُھل،، کی حد تک، تعقید کے مرض میں گرفتار، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ

مملکتِ تنقید کے وہ مُطلق العنان بادشاہ تھے ۔ اور، آزاد صاحب، بگڑ جاتے اور دو دو تین تین دن تک اُن سے بات نہیں کرتے تھے ۔ ایک بار اُنھوں نے کسی "خدیجہ بی" کی لوحِ قبر کے واسطے ایک قطعہ کہ کر، ابرار کو سُنایا، جس کا قافیہ و ردیف تھا "عزت خدیجہ بی" "تُربتِ خدیجہ بی" اور جب اُنھوں نے یہ شعر سُنایا:

دل سے، سارے عزیز۔ کرتے تھے

عزت و حُرمتِ خدیجہ بی

تو ابرار نے، قہقہہ مار کر کہا، "قرآن مجید کی قسم" اب تو آپ گالیاں بھی بکنے لگے ہیں، اُنھوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا بھلا اس میں گالی کی کیا بات ہے ۔ ابرار نے کہا، پہلے مصرعے ہی میں ایک تگڑی سی گالی بن گئی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں: "دل سے۔ سارے۔ عزیز۔ کرتے تھے" یعنی، بڑے وڈے کے ساتھ، اُن مرحومہ کے، ایک دو نہیں، سارے عزیز ان کے ساتھ "کرتے تھے"۔ جنابِ والا "اس کرتے تھے" سے ذہن جس طرف منتقل ہوتا ہے ۔ آپ اُس سے واقف نہیں، خدیجہ بی کا بیٹا آئے گا، تو اُس سے کہوں گا کہ بھائی اپنی ماں کی لوحِ مزار پر یہ قطعۂ تاریخ ہرگز نہ کھُدوانا، ورنہ تمھاری والدۂ مرحومہ کی ناک کٹ کر رہ جائے گی۔

اُنھوں نے کہا لکھنؤ والوں کا مذاق مبتذل ہے ۔ اس لیے، آپ کو میرے مصرعے میں ذم کا پہلو نظر آ رہا ہے ۔ ابرار نے کہا جی ہاں یہ تو وہی بات ہوئی کہ اگر کسی حبشن کے گُردے کے سے موٹے ہونٹوں کو، دیکھ کر ہم قہقہہ ماریں تو افریقہ والے یہ ارشاد فرمانے لگیں کہ تمھارا مذاق مبتذل ہے ۔ حضورِ والا مبتذل چیز کو سُن یا دیکھ کر، اعتراض کرنا تو اس امر کی دلیل ہے کہ اعتراض کرنے والا ابتذال سے کوسوں دور ہے ۔ میں آپ کے اس مصرعے کے خاندان کے چند شعر اور مصرعے سُناتا ہوں، آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا اعتراض کس قدر دُرست ہے ۔ سُنیے، ایک صاحب فرماتے ہیں "کھڑا ہے دیر سے در پر ترے ۔ عشاق کا ۔ مجمع"، خُدا لگتی کہیے گا آزاد صاحب لفظِ "مجمع" سے پہلے ہی ذم کا پہلو نکل آیا ہے کہ نہیں؟۔ اسی طرح ایک صاحب فرماتے ہیں:۔

دل کو ہم اپنے، تسلی، شبِ غم دیتے ہیں

جس کو تم "دے" "نہیں سکتے"، اُسے ہم "دیتے ہیں"

آپ سمجھے " لینے ، دینے ، کرنے ، اور کرانے " میں کس قدر ذم کے پہلو ہیں ؟

ایک اور مصرع سنیئے :- " قید میں - یعقوب نے لی - گو نہ یوسف کی - خبر " خیال تو کیجئے - " خبر " تک آتے آتے ، مبتدا ہی میں ، ایک فحش بات نکل آئی کہ نہیں ؟ یونہیں ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں :- " جو ، روح کو گرمادے ، جو قلب کو " تڑ " - پادے " آپ نے " پادے " کے ساتھ یہ " تڑ " کی آواز سنی ، فرمایئے کیا ارشاد ہے - لیکن پہلے منھ پر رومال رکھ لیجئے -

اسی طرح ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں :- ساقی - مجھے - کوتر پہ - کھڑا کرکے دکھا دے -" حضور والا ، یہ فحش التجا کی جا رہی ہے کس سے ؟ حضرت علیؓ کے سے جلیل القدر امام سے استغفراللہ بس ایک شعر اور سن لیجئے :-

خدا کے واسطے - جلدی سے اب کہیں ، گردن
کوئی - ملول کی - اس رہ گزار میں - مارے

ارے دہائی لاٹ صاحب کی - حد کردی ملول صاحب نے - ذرا دیکھئے تو حضرت ملول کس امر قبیح کی التجا فرما رہے ہیں ، اور وہ بھی خدا کا واسطہ دیکر - انتہا کردی بے شرمی و بے ادبی کی -

اب ان مثالوں کی روشنی میں اپنا مصرع خود ملاحظہ فرمایئے " دل سے - سارے عزیز - کرتے تھے " ہائے مر جانے کے بعد خود خدیجہ بی ، اور ، ان کے ساتھ ساتھ ، ان کے سارے عزیزوں کے ایک پوشیدہ شرمناک راز کو آپ نے افشا فرما دیا ، انھوں نے کہا سمجھ میں آگئی بات ، واقعی بیہودہ مصرع ہے ، بدل دوں گا اسے - یہ تھی انصاف پسندی حضرت آزاد کی -

میں غزل کا مخالف اور وہ غزل کے شیدائی تھے - اس سلسلے میں اکثر میری ان کی دو دو چونچیں ہوا کرتی تھیں - اور میری باتوں سے جل کر انھوں نے ، میرے خلاف ایک بڑی اچھی رباعی کہی تھی - آپ بھی سن لیں :-

کہتے ہو کہ جچتی نہیں اب شانِ غزل
ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل
سرکارِ غزل میں پل کے ، غزلوں سے یہ بَیر
افسوس ہے ، اے نمک حرامانِ غزل

اور، میں نے، اس قافیہ و ردیف میں، ایک جوابی فحش رباعی کہی تھی جس کو اپنی تہذیبی قوم کے گوش گزار نہیں کر سکتا۔ ایک روز، شام کے وقت، جب کہ آزاد اور رشید علی اختر، اختر، حیدر آبادی، میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میرا خانہ زاد سخاوت، مینا خانوں اور گلاسوں کو، ایک جھلجھلاتی ٹرے میں لے کر آ گیا، اگر بتیاں جلا دیں۔ میں نے اپنا گلاس بنانے کے بعد، مزاحاً دو گلاس اور بھرے اور آزاد و اختر کے سامنے رکھ دیئے۔ اختر، گلاس سے ہٹ کر اس طرح پیچھے ہٹ گئے کہ اگر نہیں ہٹے تو وہ ڈنک مار دے گا۔ لیکن آزاد جمے بیٹھے رہے۔ میں نے اختر کے سامنے کا گلاس، یہ کہہ کر اُٹھا لیا کہ :-

مے، بزہاد، مکن عرض کہ ایں جوہر ناب

پیش ایں قوم، بشورابہ زمزم نرسد

اور آزاد سے کہا بسم اللہ۔ اختر نے کہا خدا کے واسطے یہ اُمّ الخبائث ان کے سامنے سے ہٹا لیجئے۔ میں نے آزاد سے پوچھا کیا آپ بھی اس جوہرِ ناب کو اُمّ الخبائث سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا نعوذ باللہ، میں تو اس کو معشق را پردہ دار اے حسن را مغبچہ سمجھتا ہوں۔ اختر نے کہا آزاد صاحب، غالباً آپ مزاحاً ایسا کہہ رہے ہیں۔ دل سے ایسا نہیں سمجھتے ہیں اس لئے کہ آپ خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔

اُنھوں نے کہا اختر صاحب، میرا لڑکا مسلمان اور کٹّھ ملّا ہے اور شاید اسی خطا پر حشر میں پکڑا بھی جاؤں گا۔ آزاد نے یہ کہا اور پیمانہ مُنھ سے لگا لیا۔ اختر اس طرح اُچھل پڑے گویا بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہے، اور ارے، ارے، رے، رے، رے، کہتے ہوئے، بھاگ کھڑے ہوئے۔

اُس روز کے بعد وُہ میرے ساتھ برابر پینے لگے۔ پینے کے بعد، وہ کبھی بگڑتے نہیں، بشاش سے بشاش تر ہو جایا کرتے۔ اور بسا اوقات، دو پیگ پی کر، کھڑے ہو جاتے اور، پینے والوں کو چونچ دکھا دکھا کر، توں، توں، توں، توں، "کی آوازیں نکالنے لگتے تھے۔

ایک بار جب وہ میرے ساتھ بمبئی گئے، اور اصغری بیگم کے وہاں ٹھہرے ہوئے

تھے، میں ان کو ساتھ لے کر سیر کو نکلا، اور دن بھر گھوم گھام کر سہ پہر کو گھر پلٹا، اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد، جب باہر جانے لگا تو میں نے کہا آزاد صاحب آپ بوڑھے آدمی ہیں، اب میرے ساتھ نہ چلیں، گھر ہی میں آرام کریں تو اُنھوں نے کہا بوڑھے تھوڑے ہوں گے آپ، میں تو بہتر سال کا نوجوان ہوں، آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اور جب مالابار کے باغ میں اُنھوں نے حسینوں کے ایک پرے کو دیکھا تو چیخ ماری "ارے مرگئے" تمام مجمع میں کھلبلی مچ گئی، لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، چاروں طرف دیکھنے لگے، ہر شخص ان کی طرف دیکھتا کہ چیخ کی آواز اُنھیں کی جانب سے بلند ہوئی تھی، مگر اُن کی سفید داڑھی دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا، اور یہ خیال کرتا کہ اس عمر کا شخص، جو، بڑی سنجیدگی کے ساتھ، اپنی فرنچ کٹ داڑھی کھجا رہا ہے بھلا اس طرح چیخ مار سکتا ہے۔

افسوس کہ ہندوستان میں جیسی ہونا چاہیے تھی، اُن کی قدر نہیں ہوئی۔ ہرچند وہ اپنے عصر کے بڑے بڑے مشہور شاعروں سے، بمراحل بلند تھے۔ لیکن گمنام رہے، اور آج تک گمنام ہیں

وہ الفاظ کی نثری ترتیب کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ اور اس ترتیب کے باوجود وہ اپنے افکار کی بلندی اور شعریت کی رنگینی کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ نثری ترتیب کی پابندی کے ساتھ کہنے والے اور شعرا بھی گزرچکے ہیں مگر ان کی شاعری بول چال سے آگے نہیں بڑھ سکی مثلاً:۔

جو دِل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں ———— وُہ ترکیب، وُہ ترکیب سب جانتے ہیں
یار کا، سر چڑھ کے، بوسہ لے لیا ———— آج تو ہم بھی بڑا جی ———— کر گئے
ڈھلے لب تمھارے وعدے پر ———— وہ تمھاری زبان سے نکلا
جب کہا ہائے دِلِ زار تو اس نے یہ کہا ———— جی دِل زار، دِل زار کے ٹکڑے کر دے
ایک، دو، تین، چار، پانچ نہیں ———— سب خطائیں مری مُعاف کرد
کہا خلوت میں مِل بیٹھیں، کہا خلوت میں مَل بیٹھو ———— کہا، ہیجان کا ڈر ہے، کہا ہیجان تو ہو گا
میں نے کہا علاجِ دِل درد مند کر ———— کہنے لگا وہ شوخ کہ بکواس بند کر

آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ ان اشعار میں رکھا ہی کیا ہے۔ لفظوں کے طوطے آڑا ئے گئے ہیں در اصل۔

اب نثری ترتیب میں آزاد صاحب کے اشعار آب دار ملاحظہ ہوں (طرح تھی "زماں اور بھی ہیں، امکاں اور بھی ہیں)

کبھی مَے، کبھی دُردِ مے کے علاوہ ... مراعاتِ پیرِ مغاں، اور بھی ہیں
فقط، وجہِ قُربِ خدا ہی نہ سمجھو ... مفاداتِ عشقِ بتاں، اور بھی ہیں

اگر ارشادِ عالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں ... بہت، اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

اگر آزادِ سادہ دِیش، نظروں میں نہیں جنچتا ... تو جا، اور جا کے، اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

دیکھنا، حضرتِ آزاد تو محفل میں نہیں ... کہ ہمیں بوئے نفوسِ فُقَرا، آتی ہے

اک پائے مال جور سے، اُمیدِ شکرِ جور ... جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی

فانی بدایونی

تاج باختہ بادشاہوں، روزگار گزیدہ فن کاروں، امید بریدہ مریضوں، شیب دریدہ محبوبوں، معشوق سوختہ عاشقوں، پریدہ رنگ بیوہ نوعروسوں، پسر مُردہ باپوں، اور پدر گم کردہ یتیموں کے خیمۂ سوگواری میں بیٹھ کر ــــ مغموم قدرت نے ــــ غمِ دوران و غمِ جاناں کے آفات، دربدر کے مصائب اور شورِ پنہار کی نامرادی کے طشت میں ــــ دیوارِ گریہ کی مٹی کو ــــ میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کرکے، گوندھا ــــ اس مٹی سے ایک دُبلا پتلا، گندمی رنگ کا پُتلا بنایا۔ اُس پُتلے کے دھڑکتے دل میں تمنّائے مرگ کی روح پھونک دی۔ اور نام رکھ دیا اس کا فانیؔ بدایونی۔

میں سب سے پہلے اُن سے لکھنؤ میں ملا تھا، جہاں وہ اس طرح وکالت کرتے تھے کہ ہفتے میں، بمشکل دو ایک بار عدالت جاتے، زیادہ وقت محبوبہ کے گھر میں کھپاتے، اور، فرصت کے اوقات میں، مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض، مجھ کو، اپنی معشوقہ کی تصویر دکھاتے، اور پہروں اس کی داستانیں سناتے تھے۔

میں بھی اسی دَور میں، خیر سے، عاشق تھا۔ اس لئے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان کی محبوبہ، لکھنؤ چھوڑ کر، جب آگرے چلی گئی تو وہ بھی "وکالت" کرنے آگرے چلے گئے۔ اور میرے حالات نے مجھ کو حیدرآباد دکن پہنچا دیا۔ او، بصحرا رفت دمن در کوچہ ہا رسوا شدم! کچھ روز کے بعد، وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے ستائے ہوئے حیدرآباد آئے۔ مہاراجہ سے ملا کر، میں نے ان کی، ملازمت کی سبیل نکال دی۔ اور وہ، کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے، اور قیس عامری نے معلّم کا لباس پہن لیا۔ لیکن مُعلّمی زیادہ دن چلی نہیں اور جب وہ ملازمت

ے سُبک دوش ہو گئے تو مہاراجہ کشن پرشاد نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا ——— اس زمانے میں وہ شاہ زادۂ معظم جاہ کی سرکار میں بھی جانے لگے، لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اور انھوں نے وہاں اپنا وقت مفت ہی گنوایا۔

میرے تمام معاصرین میں وُہ سب سے بڑا حل بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے۔ میں اُن کی غم پرستی کا قائل نہ سہی لیکن یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ اُن کی غزل کا، قافیہ پیمائی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان کی ہر غزل ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص طرزِ فکر کی حامل ہوتی تھی جس کی آج تک کوئی نقل بھی نہیں کر سکا ہے۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے اُن بے چارے کو اس قدر اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا کہ زندگی کے دورِ آخر میں، اُن کو اپنے انتہائی وفادار دوستوں پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اور وہ صرف یہیں تک آکر ٹھہر نہیں گئے تھے، بلکہ یہاں تک سمجھنے لگے تھے کہ اُن کے تمام دوست، اُن کی دشمنی پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور تو اور، انھیں میری طرف سے بھی بدگمانی پیدا ہوگئی تھی کہ میں بھی اُن کے درپئے آزار ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں ان کا عاشقِ دوست تھا۔

ان کی بدگمانی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اگر وہ کسی مچھر کو اپنی طرف آتا دیکھ لیتے تھے، تو کہتے تھے ہو نہ ہو، یہ ملیریا کا مچھر میرے کسی دیرینہ رفیق نے اس لئے بھیجا ہے کہ یہ مجھے کاٹ لے، اور میں ملیریا میں گرفتار ہو جاؤں۔ وہ طبعاً غم دوست، اور نشاط دشمن انسان تھے، اور معاشقہ و معاش کی پیہم ناکامیوں نے اُن کو اس عقیدے پر قائم اور اس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہنسنا یا قہقہہ لگانا ایک ناقابلِ عفو، گناہ ہے، اور حیاتِ انسانی ایک بے گور و کفن لاش ہے، اور لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر ہنسنا سب سے بڑی شقاوت کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ جہاں تک کہ انسان کی دردمندی کا سوال ہے، میں اُن کا، سو فیصد، ہم خیال ہوں، اور کس کی یہ مجال ہے کہ وہ:
"قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں" کا انکار کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود، میرا یہ خیال ہے کہ دانائی اور ذہن کی توانائی کا یہ فرمان ہے کہ غم جب دل پر دستک دے، ہم اس کے واسطے دروازہ کھول دیں، اس کو مہمان ٹھہرائیں ——— لیکن، دوسرے دن، کرن پھوٹنے سے بہت پیش تر ہی، ہم اس کو اپنے دل سے رُخصت کر دیں۔

اس لئے کہ :- غم نہیں ہوتا ہے، آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمعِ ماتم خانہ ہم

افسوس کہ میرے دوست فانی کو جینے، اور بہرحال خوش رہنے کا یہ گُر معلوم نہیں تھا۔
وہ غم کو پالتے پوستے، پروان چڑھاتے، چھاتی سے لگائے رہتے، اور دودھ پلاتے تھے۔ اور اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ وہ "ابوالحزن" نہیں، "امّ الحزن" تھے۔ اُن کے تمام احباب میں صرف ایک میں تھا کہ انھیں گاہ گاہ مُسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ورنہ کہاں ہنسنا، کہاں فانی۔
ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ کسی داڑھی والے کے ساتھ، موٹر میں جارہے ہیں۔ ہرچند میں سُن چکا تھا کہ کل اُن کا دڑھیل بیٹا بدایوں سے آچکا ہے، لیکن شام کو جب اُن کے پاس پہنچا، تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ، میں نے پوچھا فانی صاحب کیا آپ کے والد ماجد تشریف لے آئے ہیں؟ انھوں نے کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں، اُن کے انتقال کو تو ایک زمانہ گزر چکا ہے، میں نے کہا پھر یہ آج کس کے ساتھ آپ ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے، موٹر میں بیٹھے جارہے تھے، انھوں نے کہا ارے بھائی وہ تو میرا بیٹا ہے۔ میں نے کہا مبارک ہو پسرِ پدر نُما، اور وہ ہنسنے لگے
لیکن ہنسنے کے بعد، ان کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا کہ اب اس ہنسنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اور جس قدر ہنسا ہوں، اسی قدر مزید رُلایا جاؤں گا۔
ایک بار ہم لوگ شغل کر رہے تھے۔ میں نے کہا ارے فانی کبھی کبھار تو ایک آدھ پیگ پی لیا کرو۔ خدا جانے وہ اُس وقت کس موڈ میں تھے، انھوں نے ایک گلاس پی لیا۔ لیکن جب میں نے اُن کے گلاس میں دوسرا پیگ ڈال دیا، تو انھوں نے کہا بس۔ میں نشاطی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ اشارے سے مجھے بلایا۔ کہا، ذرا سا جھک کر میری بات سنو، اور جب میں اپنے کان اُن کے لبوں کے قریب لے گیا، تو انھوں نے، بڑے پیمبرانہ انداز میں، بڑی آہستگی سے، کہا دیکھو جوش، تم شراب پی کر غم غلط کرتے ہو، غم اللہ کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی دولت، اور ایک گراں قدر امانت ہے۔ اور اس کو غلط کرنا، کفرانِ نعمت ہے۔ حشر کے دن یہاں تک تو ہو سکتا ہے کہ اللہ مشرکوں تک کو بخش دے، لیکن یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غم غلط کرنے والوں کو بھی مُعاف فرما دے۔ وہ، پلان چٹ کے ذریعے سے "روحیں" بلایا کرتے

تھے ۔ اور کچھ دن کے لئے انھوں نے مجھ کو بھی اُس ڈھرے پر لگا دیا تھا۔ پلان چٹ لکڑی کا ایک قلب صورت، آلہ ہوتا ہے، جس کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے پہیے، اور ایک طرف، پنسل لگانے کا سوراخ ہوتا ہے، اور جب کسی کی "روح" بلانے کے واسطے، ذہن پر زور ڈالا جاتا ہے تو، وہ آلہ خودبخود معرضِ حرکت میں آجاتا اور کاغذ پر جوابات لکھنے لگتا ہے۔

ایک بار، فانی، آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی "روح" کو بلا کر کہا تھا، اپنا اسم گرامی لکھ دیجئے۔ پلان چٹ نے "غالب مغلوب" لکھ دیا، میں نے کہا یہ مغلوبیت کیسی، پلان چٹ نے جواباً یہ لکھا، اہلِ دنیا کی ناقدر شناسی کے باعث، اب تک اپنے کو مغلوب سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا میں پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا، "انھوں" نے لکھا میرا قیام مزار میں نہیں ہے، میں نے پوچھا پھر کہاں ہے، "انھوں" نے لکھا، اس مقام پر، جس کا کوئی نام نہیں۔ میں نے پوچھا شراب کے باب میں اب کیا ارشاد ہے، "انھوں" نے لکھا، "ظرف لازم ہے" میں نے، آزاد انصاری کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ میرے داہنے طرف کون صاحب بیٹھے ہیں، "انھوں" نے لکھا "میرا پوتا ہے" میں نے کہا آپ سنی ہیں، اور یہ انصاری، آپ کے پوتے کیسے ہو سکتے ہیں، "انھوں" نے لکھا یہ میرے شاگرد حالی کے شاگرد، اور اس رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں۔ ایک بار فانی نے ایک طوائف کی "روح" کو بلا کر مزاج پوچھا، "اس نے" لکھا، آپ بے وفا کو میرے مزاج سے کیا سروکار، آپ تو مجھ کو چھوڑ کر ایک قطامہ پر مرنے لگے تھے، اچھا ہوا کہ اس نے آپ سے دغا کی، اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ ڈاکٹر داگرے نے، ایک روز مجھ سے کہا گنگا دھر تلک کی "روح" کو بلا کر اُن سے پوچھئے ہندوستان کب آزاد ہو گا۔ "تلک" نے ہندی میں جواب لکھا۔ میں نے کہا داگرے صاحب ہندی میں نہیں جانتا، آپ پڑھ کر بتائیں، ڈاکٹر نے کہا اس میں لکھا ہے "بیس برس کے بعد"۔

فانی صاحب نے ایک رات کو، میر تقی میر کی "روح" کو بلا کر پوچھا اقبال کیسے شاعر ہیں، پلان چٹ نے لکھا "میں اُن کو آدھا شاعر مانتا ہوں" اس لئے کہ وہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ان کی ذاتی پونجی بالکل اوچھی ہے۔

ایک مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد نے مجھے اور فانی کو پلان چٹ سمیت بُلا کر یہ کہا میں نام نہیں

لہ وہ سوال غالباً ۱۹۲۶ء میں کیا گیا تھا۔

بتاؤں گا۔ آپ میری ذات میں ڈوب کر، میرے مطلوب بزرگ کی روح کو بلائیں۔ فانی نے کہا یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، جوش صاحب آپ کی مشق اب مجھ سے بڑھ چکی ہے، آپ ہی بلائیں میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ اور، خلافِ معمول، تاخیر کے ساتھ، آلے میں حرکت پیدا ہوئی، مہاراجہ نے کہا میرا اسلام کہہ دیجئے، آلے نے لکھا "خوش باش"، اور، مہاراجہ رونے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ رو کیوں پڑے، انھوں نے کہا میں نے اپنے باپ کی روح کو بلایا تھا اور اب میرے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ وہ میرے سلام کے جواب میں ہمیشہ "خوش باش" کہا کرتے تھے۔ اگر آپ میرے دل کی بات پوچھیں، تو میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک روح کی حقیقت کا مکمل طور سے انکشاف نہیں ہو جائے گا، اور دو دو چار کی طرح، یہ بات بھی ثابت نہیں ہو جائے گی کہ روح، در اصل ایک لافانی شے ہے، اور وہ بعض معلوم یا نامعلوم اسباب کی بنار پر، خارج سے آکر، انسانی جسم میں داخل ہو جاتی، یا داخل کر دی جاتی ہے اور وہاں کچھ روز قیام کرنے کے بعد، جسم سے پرواز کر کے، پھر خارج میں چلی جاتی ہے، اس وقت تک یہ مسئلہ، قطعی طور پر، ایک غیر علمی اور نامُعتبر مسئلہ بنا رہے گا۔ اور بلان چٹ، یا دیگر عملوں یا منتروں کی وساطت سے، "روحوں" کا اس زمین پر طلب کیا جانا، اور ایک ذی شعور کے مانند اُن کا باتیں کرنا، سُوالوں کے جواب دینا، یا معاملاتِ دنیا پر متصرف و اثرانداز ہونا قابلِ تسلیم نہیں سمجھا جائے گا۔

ایک طرف اربابِ نقل و روایت کا گروہ روح کے لافانی ہونے اور اس کے تصرفات کا قائل ہے، اور دوسری طرف اربابِ عقل و درایت کی جماعت ہے، جس کا یہ خیال ہے کہ اعضائے انسانی اور ان کے وظائف کے توازن و ہم آہنگی سے جو حرارتِ عزیزی معرضِ وجود میں آتی ہے، اسی کو روح کہتے ہیں، اور انسان کی موت کے بعد وہ، وہ ٹکرائے ہوئے ریلوے انجنوں کی اسٹیم کے مانند، ہوا میں منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔

الغرض جتنے منھ ہیں، اتنی باتیں ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ اربابِ نقل "کانوں" کے سہارے اور، اربابِ عقل "کھوپڑی" کے بوتے پر رائے قائم کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کھوپڑی کے مقابلے میں کان کوئی وقعت نہیں رکھتے، اس لئے معقول آدمی اربابِ عقل کی باتوں کو وزنی سمجھتے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ بلان چٹ پر اگر ارواح کا تصرف نہیں ہوتا، تو پھر اس کی جنبش و نویسندگی

کی علت کیا ہے؟ سو میں یہ جواب دوں گا کہ اس کی علت ہے، خیال کی مرکوزیت کا دباؤ، اور دماغ کے امواجِ برقی کا تموّج وارتعاش۔ اور یہ جواب کوئی انوکھا جواب نہیں ہوگا، اس لئے کہ ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ، نظر بھر کر دیکھتے ہی، پیپرویٹ معلّق ہوجاتا، اور کرسی چھت سے جاکر لگ جاتی ہے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ خیال، مادے پر تصرّف کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اگر میرا یہ جواب سن کر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اگر یہ سارا کھیل ہمارے دماغ ہی کا ہے تو پلان چٹ کو ہمارے دماغ کے حلقۂ معلومات تک محدود و محصور رہنا چاہیئے تھا، لیکن بعض اوقات وہ آلہ ایسی باتیں بھی معرضِ تحریر میں لے آتا ہے، جو ہمارے دائرۂ علم سے قطعی خارج ہوتی ہیں، اس بنا پر تصرّفِ ارواح کے سوا اس کی اور کیا علت ہوسکتی ہے۔ ؟ ۔ تو میں یہ عرض کروں گا کہ انسانی دماغ کے گوشوں، اور تحتِ شعور کے تہ خانوں میں دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو موجود نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم کو اب تک اُس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

صد حیف کہ ابھی تک نفسِ انسانی کا غُرفہ ایک رُبع سے زیادہ نہیں کھلا ہے، اس لئے ہم اپنے علم اور اپنی ذات کو محدود سمجھ رہے ہیں۔

لیکن جب، لاکھوں یا کروروں برس کے بعد غُرفۂ نفس، پورے طور پر کھل جائے گا اور غنچۂ انسانیت کھل کر گلِ شاداب بن جائے گا تو اس کی خوشبو آفاق کا محاصرہ کرلے گی۔ اور ہم کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ تمام کائنات ہمارے نفس کے اندر سانس لے رہی ہے، اور یہ پورا نظامِ شمسی، ہمارے کاسۂ سر کا طواف کر رہا ہے۔

آغا شاعر قزلباش

داغ کے ممتاز شاگرد، دہلی کے نامور استاد۔ روایات کے بندے، اوہام کے پتلے بھوتوں چڑیلوں کے تصور سے لرزاں، بلند آوازوں سے ترساں۔ حقے کے دشمن، سگریٹ بازوں سے اَن بن۔ آغاز میں زردار، انجام میں پریشاں روزگار۔ جوانی میں یوسفِ کنعاں، بڑھاپے میں آئینہ پریشاں۔ بہرنفس کراہ، تحت اللفظ کے بادشاہ۔ اوّل اوّل رندِ خرابات، آخر آخر مبتلائے صوم وصلوٰۃ، پھر بھی پرستارِ خوباں، شیریں حرکات۔ ایک روز، وہ میرے دریا گنج (دہلی) کے مکان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، سر پہ جرنیلی ٹوپی، اور اس پر لٹ پٹی، دستار بندھی ہوئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوجی کپتان بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں چھوٹے دادا نے کھیر کھا کر، اُس کا خالی تھلوا سنگین فرش پر تڑ سے ٹیک دیا، وہ اُچھل پڑے، مجھ سے، کان میں کہا ذرا چھوٹے دادا کو سمجھا دیجیے کہ میں یہ کریہہ آوازیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے چھوٹے دادا کو سمجھا دیا۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے، دوسرا تھلوا بھی خالی کر کے، تڑاق سے فرش پر دے پٹکا، آغا صاحب پھر، زور سے اُچھل گئے۔ کہا اب یہاں نہیں بیٹھوں گا، میں نے بہت روکا، وہ نہیں مانے، اور جب تانگے پر بیٹھ کر جانے لگے تو، جھک کر، مجھ سے کہا اپنے ان گھامڑ چھوٹے دادا سے، گھر جا کر، پوچھیے گا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ انھوں نے "چھوٹے دادا" اس طرح دانت پیس کر کہا کہ ہر چند میں نے ضبط کیا، لیکن قہقہہ نکل ہی گیا، اور وہ، تا حدِ نظر مجھے گھورتے چلے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ایک روز میں، دوپہر ڈھلے، اُن کے وہاں پہنچا، معلوم ہوا

محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں، ابھی آجائیں گے۔ مجھے شرارت سوجھی، ان کے بستر پر، سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ کر، لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ آئے، بستر کی جانب دیکھا، سمجھے اُن کا کوئی بیٹا سو رہا ہے، وہ تخت پر، آہ آہ کرکے، بیٹھ گئے۔ میرے لحاف کے اندر سے بھی آواز آئی "آہ آہ"، وہ چونکتا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے، اور یہ سمجھ کر کہ میرے کان بج رہے ہیں۔ اُنھوں نے موزہ اُتارتے ہوئے، حسب عادت "دوبارہ آہ آہ کی آواز نکالی اور جب میرے لحاف سے اُس کے جواب میں پھر، آہ آہ کی آواز بلند ہوئی تو وہ، یہ خیال کرکے ہو نہ ہو، کوئی جن یا بھوت اُن کی چار پائی پر پر درانہ ہے، چیخ مار کر، کمرے سے باہر نکل گئے، اور دعائیں پڑھنے اور مولیٰ مُشکل کُشا مدد دے کا نعرہ لگانے لگے۔

اور، لحاف اُلٹ کر جب میں نے پوچھا ارے آغا صاحب ہُوا کیا، وہ میری آواز پہچان کر، دوبارہ کمرے میں آئے اور کہنے لگے تُو ایک دن، دہلا کر، مجھے مار ڈالے گا۔

ایک روز، جھٹپٹے کے وقت بوتل جیب میں رکھ کر، میں اُن کے وہاں پہنچا۔ زینے کی زنجیر کھڑکائی، ایک چھوکرا آیا۔ میں نے کہا آغا صاحب سے جاکر کہہ دو کہ ایک شاعر اپنی غزل پر اصلاح لینے آیا ہے۔ اُس چھوکرے نے آکر جواب دیا کہ آغا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ "کل آیئے گا۔ میں نے لڑکے سے کہا۔ کاغذ اور پنسل لا دو۔ وہ لے آیا۔ میں نے لکھا آغا صاحب قبلہ، میرا نام ہے عبدالصمد خاں، پشاور کا رہنے والا ہوں، آج رات کے دس بجے مشاعرہ ہے، خدا کے واسطے میری غزل بنا دیجئے، میں اُس کا فوری نذرانہ بھی پیش کروں گا۔ اور اگر آپ نے مجھے فوراً اوپر نہیں بلایا تو، میں، آپ کی تاک لگائے بیٹھا رہوں گا، اور جب آپ نیچے اُتریں گے تو خُدائے بزرگ و برتر کی قسم، آپ کو جان سے مار ڈالوں گا۔ سمجھے آپ؟

میرا پرچہ پڑھتے ہی اُنھوں نے اُس خادم زادے سے کہا، ابے جلدی سے زینے کے دروازے میں زنجیر لگا دے۔

جب دروازہ دھڑام سے بند ہو گیا تو، اوپر منہ اُٹھا کر، اور، آواز بدل کر، میں نے پُکارا آغا صاحب، آغا صاحب، میری آواز بلند ہوتے ہی، بالاخانے کے برآمدے میں کھٹ پٹ

سی ہوئی اور یہ دیکھا کہ وہ، اس زاویے کے ساتھ، چھجّے پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر میں گولی ماروں تو اُن کے نہ لگ سکے۔

میں نے، بدلی ہوئی، بھیانک آواز میں کہا کیا آپ آغا صاحب قبلہ ہیں، یہ سنتے ہی وہ فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ اور اپنی باریک آواز میں پوچھا، عبدالصمد خاں، کیا واقعی آپ مجھ کو مار ڈالیں گے؟ میں نے جواب دیا بے شک۔ آپ ایک آفریدی پٹھان کی بے عزتی کر کے، زندہ نہیں رہ سکتے۔ دو اُستادوں کو جان سے مار چکا ہوں، اب آپ کی باری ہے۔ یہ سنتے ہی اُن کے رُندھے ہوئے گلے سے "اَیں۔اَیں۔اَیں"، کی صدا کچھ اس بے کسی کے ساتھ نکلی کہ میرا قہقہہ نکل گیا۔ قہقہے سے وہ مجھے پہچان گئے۔ جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی دھڑام سے چارپائی پر گر گئے۔ میں دوڑ کر، اُن سے چمٹ گیا، اور، وہ، ادھی اوکھی سانسیں لے کر، کہنے لگے ذرا میرے سینے پر ہات رکھ کر تو دیکھ، دل کیسا دھڑ دھڑ ہو رہا ہے تیرا مذاق ایک دن میری جان لے لے گا اور تو دل تھام کر رہ جائے گا کہ ہائے میں نے کیوں ایسا مذاق کیا تھا۔ آہ، آہ، آہ، آہ۔

ایک روز کوئی چار بجے اُن کے وہاں پہنچا، دیکھا کہ وہ، رومال مُنھ سے ڈھانپے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا ارے دُہی آٹھ پہر کا رونا دھونا، یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ پورا عالم کون و فساد ایک دیوار گریہ ہے، آپ اور فانی دو یہودی ہیں، جو اس دیوار کے سائے میں بڑے استقلال کے ساتھ، بیٹھے مسلسل رویا کرتے ہیں۔ اور یہ کرۂ ارض، ایک دائمی یومِ عاشور ہے، جس میں آپ اور فانی، علی الاتصال، ماتم فرمایا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ڈبڈبائی آنکھیں اُٹھا کر، کہا میرے رونے کی ہنسی نہ اُڑاؤ، میرا شباب میں وہ عالم تھا کہ ہزاروں حسین عورتیں میرے چاروں طرف منڈلایا کرتی تھیں، اور ایک رات کو تو ایک عورت چھری لے کر آ گئی تھی کہ اگر مجھ سے مُنھ چُرا اُگے تو تمھاری گردن کاٹ دوں گی، اور پھر اُسی چھری سے خودکشی کروں گی۔ لیکن اب . . . . یہ کہ کر وہ پھر رونے لگے۔ میں نے تسلّی دی، لیکن وہ روتے ہی رہے، اور پھر کہنے لگے، جوانی میں جی بھر کے ہنسا تھا اب اس کا جرمانہ ادا کر رہا ہوں۔ کیا خوب کہا ہے میرا نیسؔ نے :۔ روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

پھر، اُنھوں نے مجھ کو قریب بُلاکر، نہایت دھیمی آواز میں کہا یہ ہمارے محلّے کا گرجا تُم نے دیکھا ہے ؟ اُس گرجا گھر میں، ایک اَدھیڑ سی میم صاحب رہتی ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے چور، چوری سے گیا، کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ میں آتے جاتے، اس اُمیّد میں کہ شاید یادُاللہ کی کوئی صورت نِکل آئے، اور، بُڑھاپا مزے سے کٹ جائے، اُن کو گھورا کرتا تھا۔ اور، وُہ آنکھیں جھکا لیا کرتی تھیں، لیکن آج، آج، یہ کہہ کر وُہ پھر رونے لگے۔ میں نے کہا پہلے بات ختم کر لیجئے، پھر، جی بھر کر رو لیجئے گا، اُنھوں نے، آنسو پونچھ کر کہا آج جب میں نے، گلی میں کھڑے ہو کر، اُس میم کی طرف آنکھ اُٹھائی تو . . . اُن کی آواز میں رقّت پیدا ہو گئی، میں نے کہا آغا صاحب بات تو پوری کر دیجئے، اُنھوں نے کہا جب نکڑ سے میں نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھائی، تو اُس نے میری طرف مُنھ کر کے، تھوک دیا۔ ہائے تھوک دیا اتنا کہ، وُہ پھر رونے لگے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس بات پر ہنس پڑتا، لیکن مُجھ پر رقّت طاری ہو گئی، میں نے سوچا قُدرت کس قدر سفّاک ہے، ہم کو پھول سا چہرہ دے کر پھر اُسے بتورے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کوئی حد بھی ہے اس بے کراں شقاوت کی۔

سردار رُوپ سنگھ

گورے چٹے، بالا بلند، کھڑے ناک نقشے کے، خوش چشم، ہنس مکھ، لطیفہ سنج، سُخن شناس، انجمن آرا، میہمان نواز، یار باش، دوست پرور، اور خوباں نشیں روپ سنگھ۔

سارنگیوں کی رُوں رُوں، طبلے کی تھاپ، مینا کی قلقل، مجیرے کی کھُن کھُن گھنگروؤں کی چھم چھم، حسینوں کے خم وچم، راگنیوں کے زیر وبم اور یاروں کے اُدھم کے رسیا، اور اپنے دور کے کنہیا تھے۔

وُہ، میری ننہال، ڈھول پور کے جاگیردار، مہاراجہ کے پرانے یار، لیکن، آگے چل کر، مہاراجہ کے معتوب سردار شراب خانہ ساز کے پرستار اور خرابات کے اتنا لیتھے

آفتاب غروب ہوتے ہی اُن کی انجمن میں صبح طالع ہو جاتی، اور پیمانوں سے کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں اور ڈاکٹر سورج مل، سردار تارا چرن، رن بیر سنگھ محسن، سردار پتا کول صاحب، خوش حال چند نگم (عرف ''بغبغا'') اور ترسیجائی (عرف ''تیری بھائی'') وغیرہ کے قہقہے اور اختری، مشتری، اور چھوٹی کے زمزمے گونجنے لگتے تھے۔

ہرچند انگریز کا لگایا ہوا، ہندو مسلم منافرت کا پودا تناور ہو چکا تھا، لیکن روپ سنگھ پر اس منحوس درخت کی چھاؤں تک نہیں پڑی تھی۔ اُن کے زیادہ تر دوست مسلمان

ان کا اس سے بیشتر بالتفصیل ذکر آچکا ہے اس لئے اختصار سے کام لوں گا ان کے پاس شراب کا ایسا نایاب نسخہ تھا کہ ان کی شراب کے آگے، ولائتی شراب پانی بھرتی تھی طوائفیں۔

تھے، چھوت چھات سے اُنھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر، کھانا کھاتے اور اُنھیں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔

سردار اجمیر سنگھ، انسپکٹر جنرل اُن کے چھوٹے بھائی، پوجا پاٹ کے اتنے پابند تھے کہ اُنھوں نے کوٹھی کے ایک کمرے کو بُت خانے میں تبدیل کر دیا تھا، روپ سنگھ اور میں دونوں اُن کا مذاق اُڑاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ وہ کون ایسی شبھ گھڑی آئے گی کہ تم بُت خانے سے نکل کر شراب خانے میں داخل ہو جاؤ گے۔

ہر صبح کو اجمیر سنگھ اور اُن میں کھانا پکوانے کا اس قدر زبردست ہنگامہ ہوا کرتا تھا کہ اللہ کی پناہ بلاناغہ اجمیر سنگھ اُن سے آکر پوچھا کرتے تھے کہ بھائی صاحب آج کیا کیا پکے گا، اور اس پر دونوں بھائیوں کے درمیان آدھ گھنٹے تک مکالمت ہوا کرتی تھی کہ بکری کا گوشت نہیں، تیتر پکے گا، نہیں نہیں تیتر کے عوض آج بٹیر پکیں گے، ترکاریوں میں آلو، نہیں نہیں، آلو کے عوض گوبھی آئے گی، ارے گوبھی نہیں شماٹر، اور میں اس مکالمت سے تنگ آکر بھاگ کھڑا ہوتا۔

ان کی صحبت کی ایک رات اب تک یاد ہے، جو بلا کی دل کش تھی، اور قیامت کی بھیانک بھی۔ غالباً وہ ہولی یا دوالی کے جشن کی رات تھی۔ دھول پور کی اختری، مشتری اور "چھوٹی" کے علاوہ آگرے سے بھی چار پانچ حسین اور سُریلی طوائفیں بلائی گئی تھیں، اور دو بجے رات تک گانے بجانے، پینے پلانے کا سلسلہ قائم رہا تھا۔ اور طوائفوں کے ساتھ، تمام بادہ خوارانِ کرام نے بھی رقص فرمایا، اور، ہر نوعیت کا لطف اُٹھایا تھا۔

اُس جشن میں گوالیار کے ایک دیو ہیکل سردار بھی شریک تھے، جو، صبح سات بجے سے آدھی رات کے بعد بھی، مسلسل پی رہے تھے اور، دو بجے رات کے قریب، ا دبھی او بھی سانسیں لے رہے تھے۔ ابھی محفل جمی ہوئی تھی کہ وہ گوالیار کے سردار صاحب اُٹھے، غسل خانے کی طرف دو قدم لڑکھڑاتے چلے، اور، دھڑام سے فرش پر گر پڑے، اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ اللہ اکبر، ان کے دم توڑتے ہی، وہ جشن، جو ابھی نغموں کے دریا میں تیر رہا تھا اس قدر بھیانک ہو گیا کہ میں نے رئیس احمد سے کہا، آؤ اب یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں، ہم دونوں بھائی روپ سنگھ

کے باڑے سے ، اپنے نانا کے باڑے کی طرف جانے کے لئے جو وہاں سے فقط چند قدم کے فاصلے پر تھا، باہر نکلے ۔ باہر آتے ہی جب ہوا لگی اور سڑک کے ہر بلب میں دو دو بلب نظر آنے لگے تو ، میں سمجھ گیا کہ آج نشہ بے حد تیز ہو گیا ہے ، رئیس کو دیکھا ، وہ بھی بری طرح لڑکھڑا رہے تھے ۔ میں نے رئیس سے کہا آج بڑا ہاتی پچھاڑ نشہ ہے ، آؤ ، ہم ایک دوسرے کا ہات پکڑ کر چلیں ۔ لیکن نشہ اس قدر شدید تھا کہ بار بار ہم بری طرح لڑکھڑاتے اور بار بار ہمارے ہات چھوٹ چھوٹ جاتے تھے ۔ رئیس داہنی طرف ، اور میں ، سڑک کے بائیں طرف پہنچ جاتا تھا ۔ دو تین منٹ کا راستہ ، دس بارہ منٹ میں طے کر کے ، جب ہم نے حویلی میں قدم رکھا ، تو میں نے کہا دیکھو رئیس ، نشہ اس وقت اس قدر گھٹا ٹوپ اور گھنگھور ہے کہ ہم تم زینے پر چاروں ہات پاؤں سے گھوڑے بن کر ، چڑھیں گے ۔ ورنہ ہمارے سر پاش پاش ہو کر رہ جائیں گے ۔

میری زندگی کا وہ پہلا اور آخری مرد افگن نشہ تھا ۔ صبح کو ، جب پہاڑ سا سر اور الاؤ کی طرح بھڑکتا سینہ لئے بیدار ہوا ، کلیاں اور غرارے کر کے لیمو کا ایک پورا گلاس پیا ۔ اور قسم کھائی کہ اب جب تک جیوں گا ، چار پیگ سے زیادہ کبھی نہیں پیوں گا ۔ اور ، اس قسم پر آج تک قائم ہوں ۔ اور مرتے دم تک قائم رہوں گا ۔

ایک بار ، ابرار دھول پور آئے اور روپ سنگھ کی صحبت میں شریک ہوئے اس وقت تک انھوں نے ، پی کر ، گالیاں دینا شروع نہیں کیا تھا ، لیکن بگڑنے لگے تھے ۔ جب محفل برخواست ہوئی ، میں اور رئیس دونوں ، روپ سنگھ کی خواب گاہ میں لیٹ گئے ، اور ، ابرار سے کہا گیا کہ وہ زنانے مکان کے دروازے کے سامنے کی کوٹھی میں جا کر سو رہیں ۔

ابھی ہم لوگ کروٹیں بدل ہی رہے تھے کہ ابرار کی ، انتہائی نشے میں ڈوبی ہوئی یہ آواز گونج اٹھی کہ ہر شخص اپنا ایڈوانٹیج[1] خوب جانتا ہے ۔ روپ سنگھ نے کان کھڑا کر کے مجھ سے پوچھا یہ آدھی رات کو ایڈوانٹیج کی کیا بات ہو رہی ہے ، ابھی میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ روپ سنگھ کا پرانا خادم مدانتا ، ہانپتا آیا ، اور کہنے لگا سردار صاحب بڑا غضب

---

[1] موقع سود مندی

ہوگیا، اب ہم سب ہڑبڑا کر، اُٹھ بیٹھے، روپ سنگھ نے پوچھا ارے کیا غضب ہوگیا، انتا نے کہا کہ دُلاری[1] زنانی ڈیوڑھی میں جا رہی تھی کہ ابار خاں (ابرار خاں) نے دوڑ کر، اُس کی کلائی پکڑلی، اور جب وہ کلائی چھڑا کر، بھاگی، ابار خاں اس کے پیچھے دوڑے، اس نے، جب، بھاگ کر، دروازہ اندر سے بند کر لیا تو اَبار خاں نے، پُکار کر کہا، "ہائے جانی مار ڈالو۔" اور جب میں نے سمجھایا تو انگریزی بولنے لگے۔ یہ سُنتے ہی روپ سنگھ نے ماتھا پیٹ کر، پوچھا۔ "انتا ہمارے سر کی قسم، یہ بھی ہوا؟"، اب میں گھر میں کیسے منہ دکھاؤں گا۔ انتا، ہمارے سَر کی قسم یہ بھی ہوا۔ اس انتا ہمارے سَر کی قسم یہ بھی ہُوا" پر میرا قہقہہ نکل گیا۔

میں نے کہا، بات تو واقعی بہت ہی بُری ہوئی، جس کا مجھ کو بے حد افسوس ہے لیکن اس "انتا، ہمارے سَر کی قسم" کے ساتھ ساتھ "یہ بھی ہُوا" کا اضافہ، ارے اس پر کون ہنسی ضبط کر سکے۔ روپ سنگھ، ہر چند بہت پریشان ہو چکے تھے، پھر بھی میری بات پر، بے ساختہ ہنسنے لگے۔

اور اب میں نے اُن کی یہ چڑھ بنالی۔ جب کوئی ایسی ویسی بات پیش آتی تھی، میں، اپنا ماتھا ٹھونک کر، کہا کرتا تھا "انتا۔ ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہُوا۔"

روپ سنگھ، تم مجھ سے پہلے چلے گئے، یہ بڑی دغا کی تم نے میرے ساتھ۔ تمہارے بعد، ایک بار میں دھول پور گیا تھا۔ تمہارے اُداس پھاٹک کی طرف میں نے کیوں کر نظر اُٹھائی تھی، یہ میرا ہی جی جانتا ہے۔ میرے روپ، بدمزہ ہو کر رہ گیا جینا تمہارے بعد۔ ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں!!

---

[1] نوجوان ملازمہ

وصل بلگرامی

انگریزوں کی طرح گورے، بلند پیشانی، متوسّط القامت، نورانی چہرے، اور گھنی لال داڑھی کے، فرشتہ صورت، اور نپولین سیرت، انسان تھے۔

میری اتنی عُمر آچکی ہے، لیکن میں نے اُن کا سا آہنی عزم و شیر دِل انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔ وہ جب کسی بات پر کمر باندھ لیتے تھے، تو وہ تمام اُمور جو دنیا بھر کے لئے ناممکن ہیں، اُنھیں پل بھر میں ممکن بنا دیا کرتے تھے۔

اگر وہ اس عہد میں پیدا ہوتے جب کہ ایک فرد کی حوصلہ مندی، مُلکوں کے نقشے بدل دیا کرتی تھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی بنا، ڈال کر، سکندرِ اعظم سے ٹکر لے سکتے تھے۔

حافظہ بے حد کمزور ہو چکا ہے، اُن کے صرف چند کارنامے یاد رہ گئے ہیں، اُن کو پڑھ کر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا تھے۔ اس دور میں جب کہ فرنگی حکومت کا رُعب ہر طرف چھایا ہوا تھا، اور اس کا غرور، زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ ہم دونوں غالباً بمبئی کے ایک بہت شاندار ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور بڑی بڑی مونچھوں کا ایک دھم دھوسڑ جُغادری انگریز، ہمارے سامنے کی میز پر شراب پی رہا تھا۔ میں نے وصل صاحب سے کہا جب جانیں کہ آپ اس گڈا ٹیر انگریز کو پان کھلا دیں۔ وہ گلوری، پشتی میں دبا لے۔ اس کے پاس گئے، اور اس سے کہا۔ آپ کی صورت دیکھ کر، مجھ کو اندازہ ہوا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ لیکن دُنیا آپ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی

ہے۔میں، مسلمانوں کا ہڈ پوپ ہوں، چاہتا ہوں آپ سربلند ہو جائیں، آپ منہ کھول دیں اس انگریز پر اُن کی صورت، اور اُن کی باتوں کا اس قدر اثر پڑا کہ، بے سوچے سمجھے اس نے اپنا منہ کھول دیا، اور اُنھوں نے، اس کے مُنھ میں گلوری رکھ کر، اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا، اور خدا آپ کا بھلا کرے گا۔" کہتے ہوئے، میرے پاس آگئے، وہ سٹپٹایا ہوا انگریز، اُن کو، غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا، سر کو جنبش دے کر، "تھینک یو" کہا، اور غسل خانے چلا گیا۔

وہ راجہ صاحب کٹھوارا کی، قیصر باغ والی کوٹھی کی، نچلی منزل میں، رہتے تھے اور میں ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز، جھٹپٹے کا وقت تھا کہ میری نظر پڑی ایک، مُرمُرے کے تھیلے کی سی، بوڑھی میم صاحب پر، جو سامنے کی سڑک سے، حد سے زیادہ آہستہ خرامی کے ساتھ، بارہ دری کی طرف، چلی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا وصل صاحب کیا آپ میں یہ طاقت ہے کہ آپ ان تھیلا جان کی سُست گامی کو، برق خرامی میں تبدیل کر دیں؟

اُنھوں نے کہا بے شک۔ یہ کہ کر وہ اپنے کمرے کے سامنے کے کنوئیں کی جگت پر، جو گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور میم صاحب کا انتظار کرنے لگے، جب وہ رُنگش رُنگش کرتی، گھنے درختوں کے نیچے سے گزرنے لگیں تو اُنھوں نے بڑے زور سے الاّ اللہ کا نعرہ لگا کر، اور، اپنے مصنوعی دانتوں کو ذرا سا آگے نکال کر، اس طرح کٹ کٹ، کٹ کٹ بجانا شروع کر دیا کہ وہ میم صاحب "او مائی گاڈ" کہتی ہوئی، بھاگ کھڑی ہوئیں سرپٹ۔ اور سڑک کے لونڈے، قہقہے مار مار کر، تالیاں بجانے لگے

ایک روز، شام کو، وہ ملیح آباد آئے۔ کہا دیا نرائن نگم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو، صبح کی گاڑی سے کان پور لے جاؤں۔ کل رات کو اُن کے وہاں آپ کی دعوت ہے جس میں آپ کے دوست جگت موہن لال رواں، تیج بہادر سپرو اور جسٹس شاہ سلیمان بھی موجود ہوں گے۔ میں نے بیوی سے اجازت طلب کی، وہ بگڑ گئیں کہنے لگیں ابھی پرسوں ہی لکھنؤ سے آئے ہو، چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں تم کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی

میں نے وصل سے اپنی مجبوری ظاہر کردی، اور کہا تم صاحب سے معذرت کر دیجیے گا، اُنھوں کہا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ کل جانا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ میری بیوی کے مزاج اور ان کی ہٹ سے واقف نہیں، وہ مجھے کسی طرح جانے نہیں دیں گی اُنھوں نے سینہ ٹھونک کر کہا اجازت میں دلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کوٹھی سے باہر نکل گئے، میں نے کہا کدھر، اُنھوں نے کہا "پتھر" وہ باہر جاکر ایک بہت بڑا نکیلا پتھر اُٹھا لائے، اور، زینے کی آخری بالائی سیڑھی پر کھڑے ہو کر اُنھوں نے آواز دی، میری چھوٹی بھاوج، ذرا آپ دروازے کے پٹ کی آڑ سے دیکھ لیں کہ میں کس طرح دم توڑتا ہوں۔ بیوی نے، پٹ کی آڑ سے کہا۔ کیا بات ہے وصل صاحب، اُنھوں نے، بڑا اس نکیلا پتھر، ہات میں بلند کر کے کہا دیکھیے میں اس سے اپنا سر پھوڑ کر مر جانے پر تُل گیا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں سیّد ہوں، سُنتا ہوں پٹھان سادات کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ جوشؔ صاحب کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیں گی، تو میں پتھر اپنے سر پہ مار کر، خودکشی کر لوں گا، اور آلِ رسول کا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ یہ کہ کر، وہ اپنے ماتھے کے عین سامنے پتھر کو لے آئے، اور، رد رد کر کہنے لگے آپ اجازت دیتی ہیں کہ نہیں، میں ایک "دو" تین کہوں گا۔ اگر تین سُنتے ہی آپ اجازت نہیں دیں گی تو سَر پھوڑ کر آپ کے زینے پر ابھی ابھی شہید ہو جاؤں گا۔ دیکھیے۔ ایک۔ دیکھیے دو۔ اور دو کہتے ہی، جیسے وُہ پتھر اُٹھا کر، اپنے ماتھے پہ مارنے والے تھے کہ بیوی نے کہا کہ بہت اچھا، آپ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں، مگر کل ہی واپس بھیج دیں۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے پتھر پھینک دیا، سیڑھی پر شکریے کا سجدہ کیا، اور مجھے آنکھ مارتے ہوئے، نیچے اُتر گئے

ایک بار ہم لوگ، ریل میں سفر کر رہے تھے کہ کسی جنکشن پر، ایک دولھا، اپنی دُلھن اور مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ، ہمارے درجے میں آکر، ایک کونے میں، بیٹھ گیا۔

شوکت تھانوی نے مٹھائی کی طرف اشارہ کیا۔ وصل نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے، وعدہ کر لیا۔ اتنے میں، بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ دولھا نے دُلھن سے چہل بازی شروع کر دی، اُن کو موقع مل گیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھے، دولھا سے جاکر کہا تو شریف گھرانے کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں تیرے دادا کے برابر ہوں اور تو میرے

سامنے اپنی دُلھن سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے، اس کا شانہ پکڑ کر، اُنھوں نے اُسے دُلھن سے جدا کر کے بٹھا دیا، وہ نوجوان، ادب سے بیٹھ گیا۔ اب اُنھوں نے مٹھائی کے ٹوکرے میں ہات ڈال دو لڈّو نکلے اور دولھا سے کہا بیٹا اسی بات پر، یہ ایک لڈّو تو کھا لے، ایک میری بہو کو کھلا دے، اور میں باقی لڈّو، تیری اور تیری دُلھن کی طرف سے تیرے ہم سفروں میں بانٹے دے رہا ہوں، وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ اُنھوں نے ایک دولھا دُلھن کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اور یہ کہہ کر، اُنھوں نے سارا ٹوکرا ہم سب کو کھلا دیا۔ گڑُم۔ دُھم۔

وہ تمام شعرائے لکھنؤ کی دوا اماں تھے۔ جب کہیں کوئی بڑا مُشاعرہ ہوتا تھا، بانیانِ مشاعرہ اُن کے پاس شعرا کی فہرست اور اُن کا کرایہ بھیج دیتے اور وہ سب کے گھروں پر جا کر اُنھیں مدعو کرتے، ایک مرکز پر سب کو جمع کر کے، اپنے ساتھ اسٹیشن لے جاتے اور ٹکٹ لے کر، اپنی جیب میں رکھ لیا کرتے تھے۔

ایک بار وہ اس قدر تاخیر کے ساتھ، اسٹیشن پہنچے کہ گاڑی چھوٹ رہی تھی، انھوں نے سارے شعرا کو بے ٹکٹ ہی ریل میں سوار کرا دیا۔ اور کہا آگے چل کر کسی بڑے اسٹیشن پر گارڈ کو آگاہ کر دیں گے۔ دو چار اسٹیشنوں کے بعد، ایک نوجوان ٹکٹ چیکر نے، ہمارے درجے میں داخل ہو کر، ہم سے ٹکٹ طلب کیے، ہم سب نے دُور بیٹھے ہوئے، وصل صاحب کی جانب جو ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی تسبیح پڑھنے لگے تھے، اشارہ کر دیا، اور سوچنے لگے کہ دیکھیں اب کیا گل کھلے گا۔ ٹکٹ چیکر کو کن انکھیوں سے، اپنی طرف آتا، دیکھ کر اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے، سَر جھکا لیا۔ صورت اُن کی خاصانِ خدا کی سی تھی، وہ اُن کے سامنے آ کر کھڑا تو ہو گیا لیکن ٹکٹ مانگنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

اتنے میں، پٹری بدلنے سے گاڑی کو جھٹکا لگا، اُنھوں نے آنکھیں کھول دیں، اور جب بڑے اشراقی انداز میں اُنھوں نے ٹکٹ چیکر کی طرف نگاہ اُٹھائی اور اس نے کہا ٹکٹ، تو انھوں نے اس کے مُنھ پر تھپڑ مار دیا اور پوچھا، پہلے اپنے باپ کی خیریت بتا پھر مجھ سے ٹکٹ مانگ، میرا نام ہے وصل بلگرامی۔ ٹکٹ چیکر نے، بڑی غم ناک آواز میں کہا، کوئی ایک مہینہ ہوا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں، یہ سُنتے ہی وصل صاحب رونے لگے

اور اس کو گلے سے لگا لیا - اور وہ بھی رونے لگا۔

اب ٹکٹ چیکر کی کیا مجال تھی کہ اُن سے ٹکٹ مانگتا ، الہ آباد اسٹیشن پر اُس نے ہم سب کو چائے پلائی ، اور ، اپنے ساتھ لے جاکر ، ہم کو باہر پہنچا دیا۔

جنگِ عظیم کے خطرناک دور میں ، ہم لوگ ، وصل صاحب کی سرکردگی میں ، گوالیار سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ اور ہم سے ملے ہوئے فرسٹ کلاس کے ریزرو درجے میں ایک بڑا لانبا تڑنگا ادھیڑ انگریز فوجی افسر بھی اُسی گاڑی سے سفر کر رہا تھا - اور اس کی یہ شان تھی کہ ہر بڑے اسٹیشن پر ، چار پانچ گورے اس کے درجے کے سامنے ، کھڑے ہو کر ، پہرہ دینے لگتے تھے ۔اس فوجی افسر کے ساتھ ، اُس کی نہایت پری پیکر لڑکی بھی سفر کر رہی تھی (ہم نے اس کو اس فوجی افسر کی لڑکی اس لئے سمجھا کہ وہ اس سے "ڈیڈی" کہہ کر ، باتیں کر رہی تھی۔)

جب کسی جنکشن پر گاڑی رُکی تو وہ لڑکی اُتری ، اور وھیلر بک اسٹال پر کتابیں دیکھنے لگی - نیاز فتح پوری نے کہا ہم آپ کو سورما تسلیم کریں گے مگر آپ اس لڑکی کا بوسہ لے لیں۔

وصل نے کہا شرط بدلو اور جب پچاس روپے کی شرط بدلی گئی ، تو وہ نیچے اُترے ، اور وھیلر کی دُکان پر جا کر اُسے گھورنے لگے ، اور جب اُس ماہ جبیں نے ، تیور بدل کر کہا کہ تم کون گستاخ بوڑھے ہو ، تو ، اُنھوں نے ، آؤ دیکھا نہ تاؤ ، اُس کو گلے لگا کر ، جھٹ سے ، اس کا بوسہ لے لیا۔ لڑکی نے چیخ ماری ، اُس کا باپ بھرا ہوا پستول لے کر جھپٹ پڑا ۔ پہرہ دینے والے گوروں نے بھی ، بڑھ کر ، اُنھیں حلقے میں لے لیا ، اور وصل صاحب نے رو رو کر کہنا شروع کر دیا ۔ ہائے میری بیٹی ہائے میری جواناں مرگ بیٹی کا چہرہ بالکل اس بچی کا سا تھا ۔ ہائے میری بیٹی ، ہائے ، وہ بالکل ایسی ہی ، بالکل ایسی ہی تھی ، یہ سن کر اس فوجی کا دل پسیج گیا ، اُنھیں اپنے درجے میں لے گیا کیک کھلائے چائے پلائی اور اپنی بیٹی کو اُن کے پہلو میں بٹھا دیا ، اور جب تک وہ جیا ، ان کی دوستی کا دَم بھرتا رہا ۔

ڈاکٹر کرنل اشرف الحق

متوسطؔ القامت، نہ دُبلے، نہ موٹے، سر اور مونچھوں کے بال کھچڑی، کبھی گورے جل گئے۔ اب جل کر رنگ، مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ گول کُنڈے (حیدر آباد دکن) کے سرکاری فوجی اسپتال کے انچارج۔ دہلی کے باشندے، مولوی عبدالحق محدّث دہلوی کے پوتے، مولوی نذیر احمد مُفسّرِ قرآن کے نواسے۔ اور اس کے باوجود، بادہ خوار، فحش نگار، اور پھکڑ بازی میں یگانۂ روزگار۔

اُن کا سا، آٹھوں گانٹھ کُمیت آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ کسی خانے بھی بند نہیں تھے۔ وہ فحشیات کے شاعر تھے، اور تخلص تھا عُریاں، "دیوانِ عریاں" کے نام سے اُن کا کلام چھپ چکا ہے۔

وہ سونے کا وقت نکال کر، ہر وقت آدھے، آدھے پیگ کے حساب سے، پیتے رہتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک وہ سوتے، اور گھِس گھِس کر، بڑی سی انگنائی، بیٹھے بیٹھے، طے کرکے، بیت الخلا جاتے، اور وہاں سے آکر پینا شروع کر دیا کرتے تھے۔ لیکن، بادہ خواری کے اس تواتر کے باوجود، کیا مجال کہ وہ بہک جائیں، یا لڑکھڑانے لگیں ــــ

ہر چند اسپتال دروازے کے سامنے ہی تھا، لیکن وہ ہفتے بھر میں دو ایک دن کے علاوہ کبھی وہاں جاتے ہی نہیں تھے۔ اُنھوں نے اسسٹنٹ ڈاکٹر پر تمام کاروبار چھوڑ رکھا تھا۔

اور جب بھی اُن کا اسسٹنٹ ڈاکٹر ان کے مکان پر آ کر کسی مریض کا حال بیان کرکے اُن سے اُس کی دوا پوچھتا تھا تو وہ ہمیشہ "ڈی، ٹی" بتا دیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ "ہر مرض کی دوا، دُرود شریف" قسم کی کون دوا ہے "ڈی۔ ٹی" کہ آپ ہر مریض کے واسطے اسی کو تجویز کیا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے تہقہہ مار کر کہا میاں اس کے معنی ہیں "Any dam thing" یعنی جو بھی لغو چیز چاہو دے دو۔

وحیدالدین صاحب سلیم، عُثمانیہ یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر، سید احمد خاں کے سابق سکریٹری اور بڑے مدبھیڑو آدمی تھے۔ ایک دن اُنھوں نے کہا چلیے سلیم صاحب کے وہاں، بڑا فقرہ باز بنتا ہے۔ آج اُس کو پیدل کا مات دوں گا۔

سلیم صاحب کے وہاں پہنچتے ہی، وہ اُن کی طرف، تھرکتے دوڑے، فوراً اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اُن کو اس طرح ہلا ہلا کر جیسے کسی درخت کو جڑ سے اُکھاڑا جاتا ہے، بڑے زور سے کہنے لگے ہائے میرا نیچری سانڈ۔ جوش، یہ نیچری سانڈ، سر سید کے مرتے ہی، رسیاں تڑا کر، بھاگ کھڑا ہوا تھا، برسوں کے بعد آج اسے پکڑ پایا ہوں، اب نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہتے ہی اُنھوں نے اُن کا بوسہ لیا اور پھر وہی رٹ لگا دی وہ ہائے میرا دم کٹا نیچری سانڈ۔ اور سلیم صاحب اس قدر حواس باختہ ہوگئے کہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

ایک بار ایک نوجوان، غالباً "پھول" کا مُدیر، میرے دفتر میں بیٹھا، مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ آ گئے۔ میں نے تعارف کرایا، اور، اُنھوں نے ہات ملاتے ہوئے، اس کی ہتھیلی میں اُنگلی چبھو دی۔ اُن کی اس حرکت سے وہ نوجوان بپھر گیا، اور آمادۂ نبرد ہو کر پوچھا کیا آپ نے مجھ کو آوارہ لونڈا سمجھ رکھا ہے اور اُنھوں نے مسکرا کر کہا جانی اگر یہ نہ سمجھتے تو یہ بات کرتے ہی کیوں۔

وہ نوجوان لڑنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے، شانہ دبا کر، اُسے بٹھا دیا، اور اشارے سے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب پیے ہوئے ہیں۔

لہ سید احمد خاں اور ان کے رفقا کو۔ ان کے دور میں "نیچری" یعنی خدا کے منکر اور نیچر کے ماننے والے کہا جاتا تھا۔

میرے دفتر دارالترجمہ کے ایک رکن ، مولوی فداعلی صاحب ان کے بڑے دوستوں میں تھے ایک دن وہ میرے پاس آئے تو فداعلی صاحب کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر، حسبِ رسمِ قدیم اُنھوں نے فداعلی صاحب کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔ جوش صاحب یہ کون جان وَر ہے ؟ فداعلی صاحب اس وقت بڑے موڈ میں تھے، انھوں نے چھوٹتے ہی کہا " میرا نام ہے ڈپٹی نذیر احمد" ۔ انھوں نے کسی بڑے نکتے کو پاجانے کے انداز میں کہا " اچھّا آپ میرے نانا جان ہیں " یہ کہہ کر، اُنھوں نے انگلیوں سے مثلث کی شکل بنا کر کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خاکسار، آپ ہی کی صاحب زادی کی ، اس چیز سے برآمد ہوا ہے ۔ اور مولوی فداعلی صاحب کا رنگ اُڑ گیا، اور منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک بار مودودی صاحب کو ساتھ لے کر، میں ان کے وہاں گیا ۔ وہ چارپائی اور ان کی بڑی لڑکی، پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ، اُنھوں نے کہا جوش صاحب میں اس لڑکی کو لندن بھیج رہا ہوں تعلیم کے واسطے، مودودی نہیں چاہتے تھے کہ وہ حیدرآباد سے جائے اس لیے انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب جوان بیٹی کو تنہا بھیجنا مناسب نہیں ۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے اپنے داہنے ہات کی اُنگلی کو، اپنے بائیں ہات کی ڈھیلی مٹھی میں ، بار بار داخل و خارج کرکرکے ، کہا کیوں مولانا مودودی صاحب ، زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا۔ ہو جانے دیجیے لڑکی ، جھینپ کر، بھاگ کھڑی ہوئی، اور مودودی صاحب پسینے پسینے ہو کر رہ گئے۔

ایک دن، شام کے وقت ، ایک لانبے قد کے ، دڑھیل مولانا صاحب ان سے ملنے آئے۔ اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کرکے ، اُن کے ہات آنکھوں سے لگا کر، بڑی عقیدت سے ، چوم لیے ، کہا میں بھی اُجڑی دہلی کا رہنے والا ہوں تفریحاً یہاں آیا ہوا تھا، کل جا رہا ہوں ، میرے دل نے نہیں مانا کہ مولانا عبدالحق محدث کے پوتے ، اور مولوی نذیر احمد صاحب کے نواسے کی زیارت کیے بغیر چلا جاؤں ، یہ کہہ کر وہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے ، اُنھوں نے پوچھا ۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں ؟ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا جوش صاحب بتادیں ؟ میں نے کہا یہ بھی کوئی سرکاری راز ہے ۔ اب اُنھوں نے اپنی شہادت کی اُنگلی انگوٹھے پر جوڑ کر ایک حلقہ بنا کر کہا ۔ ایک تو یہ ہے ، اور پھر

مثلث بنا کر کہا جناب والا اور دو یہ ہیں۔ مولانا پر بجلی سی گر گئی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ السلام علیکم کہہ کر، فوراً چلے گئے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی

سانولے سلونے، دراز قامت، وسیع القلب، متناسب الاعضاء، شگفتہ جبیں وضع دار، خوش فکر، بلند حوصلہ، شعرا پرور، دوست پرست، دشمن نواز، لہجے کے کھانچوں کے باوصف، خوش گفتار۔ اور داڑھی کے باوجود خوبصورت انسان ہیں۔

ان کے جدِ اعلیٰ تھے حضرت باباگرونانک جنھوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو، اور مسلم کی دوئی کو مٹاکر اُن میں وحدت پیدا کردیں، اور دو کو ایک بنادیں لیکن تاریخ کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے، اور ان کی تمنّا کے علی الرّغم سکھوں کے اضافے کے بعد، دو کے تین بن گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

لیکن اُن کی وہ تمنّا، ان کے بچّے مہندر سنگھ نے پوری کردی۔ جن کی ذات میں ہندو مسلم اور سکھ، یہ تینوں گروہ مدغم ہوکر، ایک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔

تقسیمِ ہند سے قبل، وہ پنجاب کے بہت بڑے جاگیر دار تھے۔ اور اب صرف ایک معمولی سے قطعۂ زمین کے مالک ہیں۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہاتی لاکھ لٹے، پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اُن کے چشمۂ فیض سے ہزاروں انسان بالعموم، اور سیکڑوں اُدبا و شعرا بالخصوص آج بھی فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔

میرے قیامِ دہلی کے ابتدائی دور میں وہ مجھ سے اس قدر قریب رہتے تھے کہ میری موٹر اُنھیں کے بنگلے میں رہا کرتی تھی۔ اور جب میں صبح کو اُن کے مکان جاتا تو یہ دیکھتا تھا کہ سیکڑوں

ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ان کے گرد ٹھٹ لگے ہوئے، اور وہ سب کے کشودِ کار میں سرگرم ہیں۔

بیوی اُن کو بھی، قیامت کی نک چڑھی اور کڑوی ملی ہیں۔ اور ہر بھلے آدمی کے واسطے شاید یہ اَمر مقدر ہو چکا ہے کہ اُن کو بیویاں، زندگی بھر جھنجوڑتی رہیں۔

میں نے ان کو کبھی تھکتے نہیں دیکھا۔ وہ پچاسوں میل موٹر سے سفر کر کے مشاعرے جاتے تھے۔ اور تین چار بجے، مشاعرے سے فراغت پا کر، پھر اُسی وقت، موٹر چلاتے، دہلی آتے، اور، نہا دھو کر، مجسٹریٹی کرنے عدالت پہنچ جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اعصاب گوشت پوست کے نہیں فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ اُن کی وضع داری کا استحکام کیا بیان کروں۔ میں جن دنوں ہندوستان جاتا ہوں، وہ میرے گرد، پروانے کی طرح، گھومتے رہتے ہیں۔ اور اس بار جب ۱۹۶۷ء میں دہلی جا کر میں نے آگرہ ہوٹل میں قیام کیا، تو، ہر چند میں چیختا رہا کہ کنور صاحب، میرے پاس کافی روپیہ ہے، لیکن وہ کسی طرح، نہیں مانے اور، میرے کمرے کا چودہ سَو روپے کرایہ، اُنھوں نے، اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ اور "موتی محل" ہوٹل سے جو میرا کھانا آیا کرتا تھا۔ اس کا حساب بھی، زبردستی بے باق کر دیا۔ اس دور میں ایسا "در، نہ ستانی، بَستم می رسد" کا برتاؤ کون کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے غزل گو شاعر ہیں، بلکہ اُن کی پوری زندگی غزل ہے، اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح غزل، مختلف و متضاد اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے، اُسی طرح کنور صاحب کی ذات بھی مختلف و متضاد اشغال کا مجموعہ ہے۔ یعنی مشاعروں کی صدارت کے فرائض، فلم اسٹاروں کی نمائش کا کام، کلبوں کا انتظام، کرکٹ میچوں کا انصرام رقص و سرود کا اہتمام، الیکشنوں کی دوڑ دھوپ، مرغوں، تیتروں، اور بٹیروں کی پالیوں کا بندوبست، اور دنگلوں کا نظم و نسق، یہ تمام مشاغل اُن کی ایک ذات میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ ہے کوئی ایسا جامع الاضداد شخص اس دنیا میں؟؟

اگر حافظ شیرازی کا یہ قول کہ:۔ برایں رواقِ زبرجد، نوشتہ اند، بزر

کہ جز نکوئیِ اہلِ کرم نہ خواہد ماند

صحیح ہے، تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہندر سنگھ، چوں کہ ان غیر معمولی انسانوں میں سے ہیں جو لوگوں کے ساتھ نیکی کئے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ان کا نام قیامت تک باقی رہے گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو

وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت، اپنے رنگ کی طلاقت، اپنی آنکھوں کی مروت، اپنے لہجے کی عذوبت، اپنے تکلم کی موسیقیت، اپنے تبسم کی حلاوت، اپنے خاندان کی وجاہت اپنے دل کی، آفاق در آغوش وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت، اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے، جو اس کرۂ خاکی پر، صدیوں کے بعد پیدا ہوتے اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ:-

مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اُن کا وجود، ہندوستان کا افتخار، ایشیا کا وقار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا اور وہ اس عالمِ اجسام کے ایک ایسے ذی حیات "تاج محل" تھے، جس کو، شامِ اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے الہ آباد کے معنیٰ خیز سنگم پر، گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر، تعمیر کیا تھا۔

اس سے پیش تر دو تین مواقع پر اُن کا تذکرہ کر چکا ہوں، اس لئے ان کے متعلق جو باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں، فقط وہی بیان کروں گا۔

ایک بار یہ سُن کر کہ وہ "کُمبھ" کے میلے میں شریک ہونے کو الہ آباد گئے تھے، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں، غصّے میں بھرا، اُن کے پاس گیا، اور کہا "اِٹو بروٹس"[1]؟

---

[1] شیکسپیئر نے، اپنے ڈرامے "جولیس سیزر" میں لکھا ہے کہ سیزر نے جب یہ دیکھا کہ اس کا سب سے بڑا

انھوں نے بڑی حیرت سے، پوچھا کیوں صاحب میں نے وہ کون ایسی خلافِ توقع بات کی ہے کہ آپ مجھ سے اِتو بروٹس ..کہہ رہے ہیں ۔میں نے کہا پنڈت جی، آپ تو بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ دُنیا کے کسی مذہب سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود سُنتا ہوں آپ کُمبھ کے میلے میں، دھرم کے شعلے کو ہوا دینے کی خاطر، الہ آباد تشریف لے گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا اگر میں وہاں پُجاری کی حیثیت سے جاتا تو آپ کو حق تھا کہ مجھ پر اعتراض کرتے لیکن، میں تو وہاں پبلک مائنڈ (مزاجِ عوام) کے مطالعے کے واسطے گیا تھا۔ میں نے کہا، جی نہیں آپ وہاں گئے تھے، اپنے ووٹوں کی خاطر، رائے عامہ کو متاثر فرمانے کے لئے۔ ابھی وہ جواب دینے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دے ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کاٹجو آگئے۔ پنڈت جی نے اُن سے کہا مسٹر کاٹجو مجھ پر جوش صاحب اعتراض کر رہے ہیں کہ میں کمبھ کے میلے کیوں گیا تھا۔ کاٹجو نے کہا یہ تو خیر میلے کی بات ہے، ایک دن مجھے پوجا کرتے دیکھ کر جوش صاحب نے مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ کاٹجو صاحب آپ بالغ ہو جانے کے باوجود پوجا کرتے ہیں اور جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ پوجا کرنا کوئی بُری بات ہے ؟ تو انھوں نے کہا تھا یہ ایسی بُری بات ہے کہ اسے دیکھ کر کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحبِ فکر آدمی کے دل پر ایسی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ فوراً تڑپ کر مر جائے۔ یہ سُن کر، پنڈت جی نے قہقہہ مار کر، یہ کہا تھا۔ جہاں تک پوجا کا تعلق ہے، میں بھی جوش صاحب کا ہم خیال ہوں اور اس پر کاٹجو کا منھ لٹک کر رہ گیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے فوراً بعد، سردار پٹیل نے، اُس وقت کے دہلی کے مسلمان چیف کمشنر کو، جو علی گڑھ کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے فرزند تھے، معطّل تو نہیں کیا تھا، مگر، زبانی احکام کے ذریعے سے

جاں نثار فلسفی دوست بروٹس بھی، اُس پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کی صف میں، کھڑا ہوا ہے، تو زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، اور فرطِ حیرت سے اُس نے اِتو بروٹس،، (یعنی تم بھی اے بروٹس) کا نعرہ لگا کر، اپنی تلوار پھینک دی، اور یہ خیال کر کے کہ جب میرا ایسا جگری دوست اور اس قدر مدبّر انسان بھی، میرے خلاف ہو گیا ہے تو اس کے سوا اور کوئی معنیٰ ہو ہی نہیں سکتے کہ مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسا زبردست عیب ضرور موجود ہے، جس سے میری قوم اور میرے مُلک کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اپنی گردن جھکا لی، اور اپنے کو قتل ہو جانے کے واسطے، پیش کر دیا۔

اُن کے تمام اختیارات سلب کر کے ، اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رن دھاوا[1] کے سپرد کر دیئے تھے ، اور ، بڑی دھوم دھام کے ساتھ ، مسلمان لوٹے اور قتل کئے جارہے تھے ۔ اُس بھیانک دور میں اگر جواہر لال کھُل کر میدان میں نہ آجاتے ، اور ، خوفناک گلیوں میں گھُس گھُس کر ، اور ہندوؤں کے مُنھ پر تھپڑ مار مار کر ، وہ اُس آگ کو نہ بجھا دیتے تو دہلی میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا ۔

اُسی زمانہ کا یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ دہلی کے محلہ ''سوئی والان'' میں ہندو جب ، ایک مسجد کے دروازے سے باجا بجاتے گزر رہے تھے اور مسلمانوں نے اُن کو مار بھگا دیا تھا ، تو شہر کے ہندو کوتوال نے ، چوراہے پر کھڑے ہو کر ، مسلمانوں کو ماں بہن کی گالیاں دی تھیں اور جب مجھے اس بات کی خبر دی گئی تھی ، میں نے ایک محضر پہ لوگوں کے دستخط لے لئے ، اور اُن سے جا کر کہا تھا کہ پنڈت جی ، اس خطا پر کہ مسلمانوں نے قانون شکنی کی تھی ، اُن پر مقدمہ تو چلایا جا سکتا تھا ، اور ان کی گرفتاریاں بھی عمل میں لائی جا سکتی تھیں ، مگر کوتوالِ شہر کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو ، چوراہے پر کھڑے ہو کر ، ماں بہن کی گالیاں دیتا ۔

اُنھوں نے کہا آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے ۔ میں نے کہا میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں ، آپ اس محضر کو ملاحظہ کریں ، جس پر ہندوؤں کے بھی دستخط ہیں ۔

محضر پڑھ کر ، وہ غصّے میں کانپنے لگے ، اور انسپکٹر جنرل پولیس کو اُسی وقت فون پر ہدایت کی کہ کوتوال کو فوراً معطل کر کے ، اس کی تحقیقات کرو ، اور مجھے اطلاع دو ۔

اُن کو اُردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی ۔ اُنھوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اُردو کے بارے میں میری ذاتی رائے اور ہے ، اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے ۔ لیکن میں گورنمنٹ پر اپنی رائے ''تھرسٹ'' کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاہتا ۔ اس لئے کہ یہ عمل ڈیماکریسی (جمہوریت) کے خلاف ہے ۔

ایک روز لکھنؤ اسٹیشن پر اُنھوں نے ریلوے حکام کو بلا کر ، بہت بُری طرح پھٹکار کر کہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھ کو نِرا جاہل بنا کر رکھ دیا ہے ، ہر طرف ہندی کے بورڈ لگے ہوئے

---

[1] وہ اَدَب کے بڑے قدر دان ہیں لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ ''رن'' بھی ہیں اور ''دھاوا'' بھی ۔

ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کھانے کا کمرہ ہے، یا لواٹری ہے۔

ایک بار۔ جب، پاکستان سے رخصت ہے کر۔ میں جب دہلی میں اُن سے ملا، تو اُنھوں نے بڑے طنز کے ساتھ، مجُھ سے کہا تھا کہ جوشؔ صاحب، پاکستان کو اسلام، اسلامی کلچر، اور اسلامی زبان، یعنی اردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا تھا۔ لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا اور وہاں، یہ دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر، سوفی صد، انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے انگریزی بولی جارہی ہے، اور، انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس بھی دیا جارہا ہے۔ مجھے اس صورتِ حال سے بے حد صدمہ ہوا، اور میں سمجھ گیا کہ "اُردو، اُردو، اُردو کے جو نعرے، ہندوستان میں لگائے گئے تھے، وہ سارے اوپری دل سے، اور کھوکلے تھے۔ اور ایڈریس کے بعد، جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اُردو میں جواب دے کر، سب کو حیران و پشیمان کردیا اور یہ بات ثابت کردی کہ مجھ کو اُردو سے ان کے مقابلے میں، کہیں زیادہ محبت ہے۔ اور جوشؔ صاحب معاف کیجئے، آپ نے جس اُردو کے واسطے اپنے وطن کو تج دیا ہے۔ اُس اُردو کو پاکستان میں کوئی مُنھ نہیں لگاتا۔ اور جائیے پاکستان۔ میں نے شرم سے، آنکھیں نیچی کرلیں۔ اُن سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی باتیں سُن کر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو جب اُردو میں خط لکھا، اور، اُن صاحب بہادر نے، انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو میں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جنابِ والا، میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی

اب چند واقعات اُن کی ادب نوازی، ان کی غیر معمولی شرافت، اور ان کی بے نظیر ناز برداری کے بھی سن لیجیے۔

جب سینٹرل حکومت کے محکمۂ اطلاعاتِ عامّہ میں، میرا تقرر، سرکاری رسالے "آج کل" میں ہوگیا تو میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے پرچے کے واسطے اپنا پیغام جلد بھیج دیجیے،

اگر آپ تساہل سے کام لیں گے تو میری آپ کی زبردست جنگ ہو جائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر اُن کا پیغام آگیا (جس کو "آج کل" فائل میں دیکھا جا سکتا ہے) ۔ اپنے پیام کے آخر میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں جلدی میں پیام اس لئے بھیج رہا ہوں کہ جوش صاحب نے مجھ کو دھمکی دی ہے کہ اگر دیر ہوگئی تو وہ مجھ سے لڑ پڑیں گے۔ اور جب میں نے ان کے پیغام کے شکریئے میں اُن کو خط لکھا تو دبی زبان سے، یہ شکایت بھی کر دی کہ آپ نے میرے خط کا جواب خود اپنے ہات سے لکھنے کے عوض، سکریٹری سے لکھوایا ہے۔ میرے ساتھ آپ کو یہ برتاؤ نہ کرنا چاہیئے تھا۔

اور اُن کی شرافت دیکھیئے، کہ میری اس شکایت پر اُنھوں نے خود اپنے ہات سے مجھ کو یہ لکھا کہ مشاغل کے ہجوم کی بنا، پر میں سکریٹری سے خط لکھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میری اس غلطی کو معاف کریں۔

ایک بار، میں اُن کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازہ پر کھڑے، قدوائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیسے ہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ایک سیکنڈ کے اندر روپوش ہو گئے۔

میں نے قدوائی صاحب سے کہا میں تو اب یہاں نہیں ٹھہروں گا، آپ پنڈت جی سے کہہ دیجئے گا کہ لیڈری اور پرائم منسٹری کو لیڈری اور پرائم منسٹری تک محدود رکھیں، اور اس کو اس قدر نہ بڑھائیں کہ وہ ماتنر کی (بادشاہی) سے ٹکر لینے لگے، قدوائی صاحب نے، مسکرا کر۔ پوچھا کس بات پر آپ اس قدر بگڑ گئے ہیں، میں نے کہا ارے آپ ابھی تو خود دیکھ چکے ہیں کہ میرے آتے ہی وہ روپوش ہو گئے ہیں مزاج پُرسی تو بڑی چیز ہے، اُنھوں نے مجھ سے صاحب سلامت تک نہیں کی۔ اتنے میں جواہر لال آگئے، میں، منھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے کہا جوش صاحب معاملہ کیا ہے، قدوائی صاحب نے سارا ماجرا بیان کر دیا، وہ میرے قریب آئے، اور مجھ سے کان میں کہا کہ مجھے اس قدر زور سے پیشاب آگیا تھا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی، تو پلائے جامے ہی میں نکل جاتا۔ اور یہ عذرسُن کر، میں نے اُنھیں گلے لگا لیا۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجھ سے کہا، میرے وزیر شری سچر نے دہلی سے میرا تبادلہ کر دیا ہے، میں نے کہا یہ شری سچر ہیں یا مسٹر خچر۔ وہ ہنسنے لگے، کہا کیا خوب قافیہ ملایا ہے۔ ہاں

تو میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اور بیگم پٹودی ، دونوں مل کر، پنڈت جی کے پاس جائیں اور میرا تبادلہ رکوادیں۔

دوسرے ہی دن ہم دونوں ، پرائم منسٹرز ہاؤس پہنچے ، اپنے آنے کی اطلاع کی۔ بیگم پٹوڈی کو فوراً بلا لیا گیا - اور میں مُنھ دیکھتا رہ گیا - جواہر لال کی اس بدوضعی پر مجھے تاؤ آ گیا، اور یہ سوچ کر میں وہاں سے اُسی وقت چلا جاؤں اگر اُن سے پھر کبھی نہ ملوں، میں اُٹھا ہی تھا کہ ان کے سکریٹری ، غالباً پیارے لال صاحب آگئے۔ اُنھوں نے ، میری طرف نگاہ اٹھا کر کہا ، کیا بات ہے جوش صاحب ، اس قدر زور سے پانی برس رہا ہے ، اور آپ آگ بگولا بنے کھڑے ہیں ، میں نے اُن سے سارا ماجرا بیان کر کے کہا اب میں یہاں نہیں ٹھہرنے کا۔ پیارے لال صاحب نے کہا آپ فقط دو منٹ ، میری خاطر سے ، ٹھہر جائیں۔ میں ۔ٹھہر گیا۔ وہ سیدھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور دو منٹ کے اندر اندر ، میں نے یہ دیکھا کہ وہ مسکراتے چلے آرہے ہیں ، میرے قریب آتے ہی اُنھوں نے کہا جوش صاحب آپ کے تشریف لانے کی مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی ۔ آپ نے کس سے اطلاع دینے کو کہا تھا ، میں نے کہا ، بملا کماری جی کو، اُنھوں نے بملا کماری کو بلا کر پوچھا تم نے جوش صاحب کے آنے کی مجھ کو اطلاع کیوں نہیں دی۔ بملا کماری نے کہا ، میں نے ، لیڈیز فرسٹ ، (پہلے خواتین) کے خیال سے جوش صاحب کا نام نہیں لیا ، پنڈت جی نے ڈانٹ کر، کہا " نان سینس " Non Sence " اور میرا ہات پکڑ کر اندر لے گئے ، اور کہا آپ بھی کنور مہندر سنگھ کا تبادلہ رکوانے کے خواہشمند ہیں - میں نے کہا جی ہاں - انھوں نے جواب دیا کہ یہ ڈیماکریٹ اصول کے خلاف ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل دوں۔ میں نے کہا پنڈت جی ، میں جانتا ہوں کہ آپ کا دماغ " میڈ ان انگلینڈ ، (ساختہ انگلستان) ہے ، لیکن بعض حالات میں کچھ " ایکسپشنز " ، (مستثنیات) بھی بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پرائم منسٹر سے کسی کے تبادلے کے منسوخ کرنے کا مطالبہ ایسا ہے جیسے ہم کسی ہاتی سے کہیں کہ میز سے ذرا ہماری دیا سلائی اُٹھا لا لیکن آج تو میں ہاتی سے دیا سلائی اُٹھوا کر دم لوں گا۔ وہ ہنسنے لگے ، اور تبادلہ منسوخ کر دیا۔

اس کے بعد ان کے محکمے کے وزیر ، سیجر ، بوزن خچر ، نے بہت زور مارا ، لیکن پنڈت

جی اپنی ضد پر قائم رہے۔

ایک مرتبہ میں، گرمی کی تعطیل منانے کے لئے شملے گیا ہوا تھا۔ تین چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال بھی آگئے ہیں۔ میں نے ان کی جائے قیام پر فون کیا۔ بدقسمتی سے رسیور اُٹھایا اُن کے ایک ایسے نووارد سکریٹری نے جو لہجے سے مدراسی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا نام بتا کر کہا میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں، اور آپ اُن سے وقت مقرر کر کے مجھے مطلع کریں۔ اس گنوار نے کبھی میرا نام سُنا ہی نہیں تھا، اس نے بار بار مجھ سے میرا نام پوچھا، میں نے کہا جوش ملیح آبادی۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، آخر کار میں نے جھلا کر کہا، جے۔ او اس۔ ایچ "اس نے کہا مسٹر" جاش "آپ کے" پارٹیکلرز "(خصوصیات) کیا ہیں، میں نے کہا جو شخص میرے پارٹیکلرز نہیں جانتا، اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں رہے، یہ سن کر اس نے کہا۔ اوہ ایسے بولے گا، میں نے کہا اس سے زیادہ بولے گا۔ اس نے کہا آپ ہولڈ کئے رہیں، ہم پنڈت جی سے پوچھ کر بتائے گا۔ اور، دو منٹ کے بعد اس نے کہا پنڈت جی ایسا بولتا ہے کہ ہم یہاں مجھے (مزے) کرنے آیا ہے، آپ ڈلّی میں ملو۔"

یہ جواب سن کر، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اُمّ الشعراء سے کہا، وزیر اعظم بن جانے کے بعد پنڈت جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں ابھی اُن کو ایسا خط لکھوں گا کہ وہ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ بیوی نے کہا، ہمارے سر کی قسم ابھی خط نہ لکھو۔ اس وقت غصّے میں بھرے ہوئے ہو، نہ جانے کیا کیا لکھ مارو گے۔

پانی پی کر، تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پانی پی کر لیٹ تو گیا۔ مگر دل کی آگ بھڑکتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ لیٹ نہیں سکا۔ بستر پہ انگارے دہکنے لگے۔ میں اُٹھ بیٹھا، اور ایسا خط لکھا کہ اگر اُس قسم کا خط کسی تھلنے دار تک کو لکھ بھیجتا، تو وہ بھی تمام عمر مجھے معاف نہ کرتا۔

خط روانہ کر دینے کے دوسرے دن اندرا گاندھی کا فون آیا کہ آج تین بجے سہ پہر کو میرے ساتھ چائے پیجیے۔ میں نے کہا بیٹی وہاں تمہارے باپ موجود ہوں گے، میں اُن سے ملنا نہیں چاہتا، اُنھوں نے کہا میں پتا جی کو اپنے کمرے میں بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں طیار ہو گیا۔

شام کو جب برآمدے میں پہنچا، ایک چپراسی نے اندر کے کمرے کی طرف اشارہ کردیا، اور جب میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا تو، پیچھے سے آکر، پنڈت جی نے میرا ہات پکڑ کر کہا۔ آیئے میرے کمرے میں۔ میں، ٹھٹک کر، کھڑا ہوگیا، انھوں نے میرا ہات کھینچا، اور، مُروّت کے دباؤ میں آکر، میں اُن کے ساتھ ہوگیا۔

اُن کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے بزرگوں کے ملنے والے سر مہاراج سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا۔ مہاراج سنگھ یہ وہی جوشؔ صاحب ہیں، جنھوں نے مجھ کو ایسا گرم خط لکھا کہ شملے کی ٹھنڈک میں

پسینہ آگیا، مہاراج سنگھ نے کہا، غنیمت سمجھیے کہ یہیں تک نوبت آئی، ان کے بزرگوں سے آپ واقف نہیں۔ وہ جس پر گرم ہو جاتے تھے، اُسے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے، پنڈت جی ہنسنے لگے۔ گھنٹی بجائی، اُس مدراسی سکریٹری کو بلایا، اور، جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا وہ اس پر برس پڑے کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر جوشؔ صاحب کو ایسا بیہودہ جواب کیوں دیا۔ میں ابھی تمھارا ٹرانسفر کیے دے رہا ہوں، کل تم منسٹری آف کامرس میں چلے جاؤ۔

ان کا یہ برتاؤ دیکھ کر، میں پانی پانی ہوگیا۔ اور اُن کی بے مثال رواداری و شرافت پر نگاہ کر کے، میں اُن کو گلے لگا کر، رونے لگا۔

اب اُن کی آخری شرافت و قدرشناسی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے۔

اُن کے انتقال سے چند ماہ پیش تر، میں ہندوستان گیا اور اُن سے درخواست کی تھی کہ آپ کسی دن میری جائے قیام پر آکر، میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہر چند میں اُن کا دل توڑ کر، پاکستان آگیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، میری دعوت قبول کر کے وہ میری قیام گاہ پر آئے، کھانا کھایا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھے رہے۔ اس دعوت میں اُن کی آواز کے ضعف اور ان کے تبسّم کے پھیکے پن سے یہ اندازہ کر کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ اب وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا، اور میرے پاکستان واپس آجانے کے دو تین ماہ بعد وہ آسمانِ شرافت کا آفتاب ڈوب گیا اور ہندوستان ہی میں نہیں سارے ایشیا میں تیرگی پھیل گئی۔ آسماں راحق بود، گر خوں بَبارد، بر زمیں

انگلستان کے شاہِ شطرنج کو چھوڑ کر، اس وقت کرۂ ارض پر جس قدر بھی منسٹر، پریسیڈنٹ، ڈکیٹر اور بادشاہ سلامت ہیں وہ اپنے اپنے ملکوں میں اس قدر مغضوب و مبغوض ہیں کہ عامتہ الناس کے روبرو، جب اُن کا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس خوف سے ادھر اُدھر دیکھ کر، کہ کہیں حکومت کا کوئی پٹھو تو قرب و جوار میں نہیں ہے، ان کے نام پر بے تحاشہ صلواتیں بھیجنے لگتے ہیں۔ اور یہ ارباب اقتدار جب اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں یا باہر سے اپنے ملک آتے ہیں، تو چھوٹے چھوٹے، خوشامد خورے لیڈروں کی دھمکیوں اور بے ضمیر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لوگوں کو لاریوں میں، زبردستی، بھر بھر کر، ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں اور ہوائی جہازوں کے میدانوں میں اس لئے جمع کر دیا جاتا ہے کہ وہ اُن ارباب اقتدار پر، انگارے برسانے کی تمنائی یا تو سہی جھوٹے پھول برسانے اور، در پردہ انھیں کوسنے دینے والی زبانوں سے، اُن کے حق میں "زندہ باد" کے کھوکھلے نعرے لگانے لگیں۔ اور مٹھائی کے وعدے سے ایک پھسلایا ہوا بچہ، اُن کی گردن میں ہار ڈال دے، اور نفرت زدہ شدہ اخباروں میں اُس شاندار استقبال کی، بڑی بڑی تصویریں، شائع فرما دی جائیں۔

اور اُن میں سے جب کوئی معزول ہو جاتا یا مر جاتا ہے تو لوگ اس کی معزولی و موت پر مٹھائی بانٹتے، اور شکرانے کے سجدے ادا کرتے۔ اور پھر دو روز کے بعد، اس کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں، گویا، اس کی ماں نے، اُسے کبھی جنا ہی نہیں تھا۔ لیکن جواہر لال کا مُعاملہ اس کے قطعی برعکس تھا، چند، جن سنگھی اندھے لیڈروں کو چھوڑ کر، ہندوستان کا بچہ بچہ اُن کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور، ان کے انتقال کے بعد بھی دلوں پر ان کی محبوبیت کا اس قدر سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ جس جگہ وہ جلائے گئے تھے وہاں میں نے خود اِن آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صبح، دوپہر اور شام کے وقت ہر عمر اور ہر طبقے کے زائرین کا اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ سڑک رک جایا کرتی تھی۔ اور، لوگوں کی آہ و بکا سے فضا کانپتی رہتی تھی۔ اسے کہتے ہیں حقیقی محبوبیت اور اسے کہتے ہیں سچی لیڈری۔ نہرو میں خود کامی و رکمینگی نہیں تھی۔ وہ بُرے آدمی بن ہی نہیں سکتے تھے اور اسی خطا پر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاستداں نہیں تھے۔"

بات یہ ہے کہ دراصل سیاست ، پیغمبری کا ایک دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے جو نوع انسان کو ، پھولوں کی سیج پر لٹانے کے لئے خود خار اشگاف کانٹوں پر چلتی اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر ، کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست ، اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو کانٹوں پر چلا کر ، خود پھولوں کی سیج پر لیٹتی ، اور اللہ کے کروڑوں بندوں کے پیٹوں پر پتھر بندھوا کر ۔ فقط اپنا ، اور اپنے چہیتوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست چوں کہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی ، اس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے ، میں اس کی تائید کرتا ہوں اس لئے کہ آج کے "اچھے" سیاست داں کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصولِ خدمت وانسانیت کے اعتبار سے وہ ناقابلِ برداشت حد تک برا آدمی ہو۔ ولے لافانی جواہر لال ، روحِ انسانیت کا سجدہ قبول کریں !!

سروجنی نائیڈو

بادۂ شاعری سے سرشار، گردہ شعرار کی غم گسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی لہجے میں ارغنوں، باتوں میں افسوں، میدانِ جنگ میں، جھانسی کی رانی، ایوانِ امن میں قرۃ العین ثانی، تقریر میں، نغمۂ آبِ حیواں، آواز میں جمالِ ماہِ کنعاں - رشتۂ صوت، ریشمی تاگے کا سا مہین، نوائے حرف وحکایت، گوکل بن کی گویا مدُھر بین چشمۂ لولوؤ مرجان، بلبل ہندوستان اگر یہ دور، مَردوں میں جواہرلال، اور، عورتوں میں سروجنی کی سی ہستیاں نہ پیدا کرتا، تو پورا ہندوستان، نابینا ہو کر رہ جاتا۔

میں نے ان کو، سب سے پہلے ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ، حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا۔ اور ان کی شخصیت کی متنا طیسیت نے میرے دل کو، ہمیشہ کے واسطے موہ لیا تھا۔

ان کے گلے میں رگیں نہیں، سارنگی کے کھنکتے ہوئے تار تھے۔ ان کے لہجے میں اس قیامت کا زیر و بم تھا کہ اس کے سامنے، راگنیاں، سُرمہ در گلو ہو کر رہ جاتی تھیں، اور ان کے دل و دماغ کے ایوان میں شاعری کا وہ زمزمہ پرور تموج تھا کہ اس کے روبرو، چاندنی راتوں کا نغمۂ بحر، پانی پانی ہو کر رہ جاتا تھا۔

ہر چند، اُردو اُن کی مادری زبان نہیں تھی، لیکن حیدرآباد کی اُردو آب و ہوا نے اُن کو اُردو اور فارسی کے مذاق میں اس طرح ڈھال دیا تھا کہ فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روانی کے ساتھ اردو بولتیں، بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ اُردو شاعری کو سمجھ لیتیں، اور الفاظ

لہ اس سے قبل ان کے باب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اختصار سے کام لوں گا۔

پکڑ کر، اس طرح داد دیتی تھیں کہ، اُن کو شعر سُنا کر، جی خوش ہو جاتا تھا۔ آج تک یاد ہے مجھ کو وہ رات، جب میں نے اُن کو اپنی نظم ''انگیٹھی''، سنائی تھی، اور، وہ ہچکیاں لے کر، رونے لگی تھیں۔

اُنھوں نے میری اُس نظم، اور، اُسی کے ساتھ، میری اور بھی تیس چالیس نظموں کا، انگریزی میں نہایت اچھا ترجمہ کیا تھا افسوس کہ اس یادگار سرمائے کو، میرے لاابالی پن نے گم کر دیا۔

اُن کی یو۔ پی کی گورنری کے زمانے میں، ایک بار میں لکھنؤ گیا، اور صبح کے وقت گورنمنٹ ہاؤس میں جب میں نے فون کیا کہ میں مسز نائیڈو سے بات کرنا چاہتا ہوں، تو ان کے سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ آپ پیغام دے دیں۔ میں پہنچا دوں گا، وہ خود بات نہیں کر سکتیں۔ میں نے اُس کا یہ جواب دیا تھا کہ میرے ان کے درمیان یہ رسم نہیں ہے۔ میں ریسیور اٹھائے ہوئے ہوں، آپ اُن سے جا کر یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے بات کریں۔ سکریٹری نے کہا آپ اپنا فون نمبر دے دیں، میں تھوڑی دیر میں آپ کو رنگ کر دوں گا۔

دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی، اور سروجنی کی آواز نے، میرے کانوں میں رس گھول دیا، اُنھوں نے پوچھا آپ کب آئے، میں نے جواب دیا ابھی آیا۔ اور سب سے پہلے، آپ کو فون کر رہا ہوں، انھوں نے کہا سب سے پہلے آپ مجھ سے ملنے یہاں آجائیے۔ میں باتھ روم جا رہی ہوں، اگر آپ میرے باتھ روم سے نکلنے سے پیشتر یہاں آجائیں تو ڈرائنگ روم میں انتظار کریں، ایسا نہ ہو کہ منہ پھلا کر چلے جائیں۔

یہ تھا سروجنی کا اخلاق۔ اب اُن شرافتوں کو خوردبین لگا لگا کر، ڈھونڈتا پھرتا ہوں لیکن کہیں پتا نہیں چلتا۔ ہائے کدھر چلے گئے وہ لوگ۔

زندگی کے آخری دور میں وہ بار بار بیمار پڑنے لگی تھیں، اور میں، بار بار، پوچھتا تھا کہ اس بار بار بیمار پڑ جانے کی علت کیا ہے، وہ ہر بار، مختلف اسباب بتا کر ٹال دیا کرتی تھیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ میں نے زور دے کر، بار بار بیمار پڑ جانے کی پھر علت پوچھی تو، وہ اداس ہو کر کہنے لگیں، جوش صاحب آپ نہیں مانتے تو مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے۔ کہ

کہ اس کا سبب ہے میرا بُڑھاپا ، عورت کے منھ سے اعترافِ شیب سن کر، میرا دل غم گین ہوگیا، انھوں نے میری افسردگی کو بھانپ کر، کہا آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میرے بال تو سفید ہو رہے ہیں، مگر، آپ یقین رکھیں کہ میرا دل ابھی تک سیاہ ہے اور جب تک دل سیاہ ہے جوانی باقی ہے۔

میاں محمد صادق

دراز قامت، ژرف نگاہ، شب رنگ، صباح طینت۔ لاہور کے باشندے، دورِ فرنگی کے پولیس افسر، عقیدے کے لحاظ سے قادیانی، نواہی سے بیزار، اوامر کے پابند، نماز پنج گانہ کے بغیر، سانس لینے کو گناہ سمجھنے والے، سخن سنج، شاعر نواز، اخلاص شعار، مردم شناس عُہدے کے اعتبار سے شب یلدا، اور، پاکیزگیٔ طبع و شرافتِ نفس کے نقطۂ نظر سے صُبحِ صادق۔

یہ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے، جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا، اس وقت وہ دہلی خفیہ پولیس کے سینیئر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہر چند ہمارے مابین بڑا تضاد تھا۔ وہ شدت کے ساتھ دیں، دار تھے، میں پابندی کے ساتھ، بادہ خوار تھا اور خدا کے فضل سے اب بھی ہوں) وہ حسینوں کی جانب نگاہ اُٹھانے کو گناہ سمجھتے تھے، میں ان کی طرف نگاہ اُٹھانے کو عبادت سمجھتا تھا۔ وہ کانگریس کے دشمن تھے میں کانگریس دوست تھا۔ وُہ حکومتِ برطانیہ کے وفادار تھے، میں اس کا زبردست باغی تھا۔ اور، اس تضاد کے باوصف، ہم میں گاڑھی چھنتی تھی، ہم ایک دوسرے کے دوست اور جاں نثار دوست تھے۔

اُس محبت و مودت کی علت یہ تھی کہ میاں صاحب شاعری کے اس قدر شیدائی تھے کہ میری تمام خطاؤں سے، چشم پوشی کرکے، مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ان کے اخلاص کا اس قدر پرستار تھا کہ ان کے تمام قصور معاف کرکے، ان کا دم بھرتا تھا۔ اور وہ لے یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ جب وہ دینی اعمال میں غرق ہوتے تھے، میں ان کو ٹوکتا نہیں تھا، اور جب میں اُن کو باغیانہ کلام سناتا تھا، وہ بگڑتے نہیں تھے، بلکہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے

میاں صاحب اس فکر میں رہتے تھے کہ مجھ کو وُہ بنا دیں، جس کو، ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں، "مردِ صالح" کہا جاتا ہے اور یہاں یہ عالم تھا، اور اب تک ہے کہ ع

مَردِ صالح کے تصور سے ہنسی آتی ہے

اور اسی جذبۂ اصلاح کے تحت وہ میری ٹوہ میں رہا کرتے اور میری بیوی تک میری "بداعمالیوں" کی خبریں پہنچایا کرتے تھے۔

ایک بار میری غیر موجودگی میں، وہ میرے گھر آئے، سخاوت نے کہا کہ میاں، نواب صاحب سے ملنے رام پور گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے پوچھا آزاد صاحب کہاں ہیں، اس نے کہا وہ بھی ساتھ گئے ہیں۔ بس پھر کیا، انھوں نے، میری تلاش میں خُفیہ پولیس کے گرگوں کو لگا دیا، اور میرے جو اَڈے اُن کو معلوم تھے، ان کا پتا بتا کر، ہدایت کر دی کہ وہ خاص طور سے مجھ کو وہاں تلاش کریں۔ اور جب، اپنے گرگوں کی معرفت اُن کو پتا چل گیا کہ میں رام پور نہیں گیا، بلکہ دہلی کے فلاں محلے میں، اپنی محبوبہ کے وہاں جشن کر رہا ہوں، تو انھوں نے میری بیوی کو خبر کر دی اور اُن کی رہ بَری کے واسطے خفیہ پولیس کے ایک آدمی کو، اُن کے ساتھ کر دیا۔

وہ تو کہیے خدا نے بڑی خیر کی، میری بیوی کو میری قیام گاہ کی اس وقت خبر ہوئی جب میں وہاں سے رخصت ہو کر، اپنے مکان کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ ابھی میرے تانگے نے آدھی مسافت سے کچھ کم طے کی تھی کہ آزاد صاحب انصاری نے، بے حد گھبرا کر کہا، جوش صاحب آپ کی بیگم موٹر میں آ رہی ہیں۔ بیوی کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ آزاد نے مجھ سے کہا، یہ جو داہنے ہات پر تالاب ہے، مجھے اس میں پھینک دیجیے۔ اتنے میں بیوی کی موٹر تانگے کے سامنے آ گئی۔

اور ہم دونوں، ان کو اس طرح پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے، جیسے چوہے دان میں پھنسا چوہا، باہر کے تماشائیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن اللہ نے ہم پہ یہ بڑا فضل کیا کہ بیوی نے ہم کو نہایت قہر کی نگاہ سے دیکھا، پھر سر کو، بڑی نفرت کے ساتھ، جنبش دی، اور، شوفر کو حکم دیا کہ گاڑی موڑ کر گھر لے چلو اور جب اُن کی موٹر اوجھل ہو گئی، ہم دونوں نے اپنے کو اچھی طرح ٹٹول کر، دیکھا کہ ہم زندہ ہیں یا انتقال فرما چکے ہیں۔ اگر وہ موٹر روک کر، اُس وقت

پوچھ گچھ کرنے لگتیں تو ہم سے کوئی جواب بن نہ پڑتا، اور ہم بے ہوش کر گر پڑتے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مر جاتے۔

اواخرِ ۱۹۶۶ء میں، جب میں ہندوستان کے سفر سے پلٹا تو دو چار روز کے واسطے لاہور میں ٹھہرا تھا۔ اُسی اثنا میں ایک روز صبح کو ان سے ملنے گیا۔ اور، خدا جانے کیوں، اُن کی گلی کے نکڑ ہی پر میں نے ٹیکسی رُکوا دی، اور، اپنے رفیقِ سفر عیش ٹونکی سے کہا اس گلی میں چلے جائیے داہنے ہات پر، چوتھا یا پانچواں مکان میاں صاحب کا ہے۔ دریافت کیجیے وہ مکان میں ہیں کہ نہیں۔ عیش کو بھیج کر، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا دل کیوں دھڑکنے لگا ہے۔ اور اُنھوں نے واپس آکر، جب اُن کے انتقال کی خبر سنائی، تو در و دیوار مجھ کو گھومتے نظر آنے لگے۔

میاں صاحب، آپ اکیلے چلے گئے، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔

علّامہ حیرت

اُلگنی پر لٹکے ہوئے مفلر کی طرح، دُبلے پتلے اور غزل کے اُس بیمارِ غم کے مانند نحیف و زار، جو، ہر آن، کراہتا رہتا ہے کہ "اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبارِ بستر کا"

گورے چٹّے، اور، بڑھاپے کے باوجود، ایسا بھبوکا سا رنگ رکھنے والے کہ عُمر اور ریش، دونوں کی درازی، اس کو بجھا نہ سکی ہے اور چہرے کا وہ عالم ہے کہ حضرتِ مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔

مزاج میں اس قدر ظرافت اور شوخی ہے کہ روتوں کو ہنسا دیں، اور، مدرسوں کے لڑکے ان کے روبرو اپنی چُلبل بھول جائیں۔ ہر چند قدیم شاعری سے وابستہ ہیں، پھر بھی نہایت آب دار شعر کہتے ہیں۔ رہنے والے ہیں بدایوں کے۔ جہاں کے مُلّا مشہور ہیں، مگر حیدرآباد دکن میں رہتے جگ بیت چکا ہے۔ پھر بھی زبان کی شُستگی وہی ہے جو پہلے تھی اور جب دکنی اردو بولنے پر اُتر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے قدیم باشندے ہیں۔

کئی برس کی بات ہے کہ میں حیدرآباد گیا تھا، اُنھوں نے، میری نہاری کی دعوت کی تھی۔ مانی جائسی بھی میرے ہم راہ اُن کے وہاں گئے تھے۔ نہاری کے واسطے جب تڑکے اُن کے وہاں پہنچے، اور ان کے ملاقات کے کمرے میں قدم رکھا تو، اندر سے، علّامہ کی آواز آئی "کیا لائی ہو بیوی"؟ بیوی نے کہا "وضو کے لئے گرم پانی"، انھوں نے بڑے مزے کے ساتھ کہا "ایک زمانہ وہ تھا کہ جب مجھ پر غسل واجب ہو جاتا تھا۔ تم میرے لئے نہانے کے لئے پانی گرم کر کے آواز دیا کرتی تھیں کہ آؤ پانی طیّار ہے، اور اب یہ دور آچکا ہے کہ وضو کا پانی لئے سامنے کھڑی ہو۔ یہ سن کر میرا قہقہہ نکل

گیا۔ اور ان کی بیوی کی آواز آئی "رر بھاڑ میں جائیں ایسی بے غیرتی کی باتیں۔ میرا قہقہہ سن کر، وہ ہنستے ہوئے باہر آگئے۔ اور، زنانے کے دروازے کی طرف منھ کر کے کہا، بیوی شرمانا نہیں ہماری تمھاری باتیں جوشؔ صاحب کے کانوں تک نہیں پہنچی ہیں۔

نہاری کے بعد، میں نے کہا سُنو علامہ صاحب، آپ کے گھر آتے آتے، موٹر میں ایک قصیدہ ہو گیا ہے۔ آپ کی شان میں جس کے چند مصرعے مانی کے، اور باقی اشعار از یں خاک سار ہیں، جس کے قوافی "یہاں"، "وہاں"، ہیں۔ اور ردیف ہے "ہیں علامہ حیرت بدایونی"۔ انھوں نے کہا اللہ اکبر، ایسی شیطان کی آنت کی سی لانبی ردیف، اس دراز قامت ردیف نے اچھے شعر تو کہنے نہیں دیے ہوں گے۔ خیر سنایئے۔ میں نے کہا سُنیے:۔

مکاں ہیں حضرتِ علامۂ حیرت بدایونی
زماں ہیں حضرت علامۂ حیرت بدایونی

اُنھوں نے کہا واللہ کمال کر دیا۔ میری ایک ذات میں زمان و مکان، دونوں کو یک جا کر دیا ہے۔ میں نے کہا اب شعر سُنیے:۔

نہایت نیک طینت ہیں، مگر حد سے سوا کچھ بد
گُماں ہیں حضرتِ علامۂ حیرت بدایونی

وہ یہ شعر سُن کر، بھڑک گئے، اور کہنے لگے "بدگماں" کے دو ٹکڑے کر کے، پہلے مصرع میں "بد" اور دوسرے میں "گماں" لانا، انتہائی مشاقی کی بات ہے۔ میں نے کہا اور سُنیے، اور سر دُھنیے:۔

بڑے سنگین ہیں، لیکن قمر چہروں کے جھرمٹ میں
کتاں ہیں، حضرتِ علامۂ حیرت بدایونی
سُبک روحی میں ہیں یکتا، مگر میزانِ محشر میں
گراں ہیں، حضرتِ علامۂ حیرت بدایونی
مجسّم دادرے ہیں رات بھر، اور صبح کو یک سر
اذاں ہیں، حضرتِ علامۂ حیرت بدایونی

خضاب و خندہ و خوش لہجگی کے فیض سے اب تک
جواں ہیں ، حضرتِ علّامہ حیرت بدا یونی
جو مسجد میں پکارا ، مے کدے سے یہ صدا آئی
یہاں ہیں ، حضرتِ علّامہ حیرت بدا یونی
جھکے سجدے میں ، اور کعبے میں پہنچے ، لوگ چیخ اُٹھے
کہاں ہیں ، حضرتِ علّامہ حیرت بدا یونی ؟

پوچھیے نہیں ، علّامہ کا کیا عالم ہوا ۔ یہ اشعار سن کر ، قہقہے مار کر ، میرے سینے سے چمٹ گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم دُنیا میں کوئی اس ردیف کے ساتھ ، ایسے شعر نہیں کہہ سکتا ۔ اس قدر مزا آیا کہ غسل واجب ہوگیا ، بیوی نہانے کے لئے پانی گرم کر دو ۔

ہم بچھڑے ہوئے شاید اب کبھی نہیں مل سکیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر کوچ کر جائیں گے ۔

کھڑکیاں چھوپی گئیں ، روزنِ در بند ہوئے ۔ ہم نظر بند ہوئے !!

سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ

سیر چشم، کوتاہ قامت، بلند حوصلہ، میہماں نواز، شیر دل، دوست پرور، دشمن قاتل، سلطاں شکار، گدا نواز۔ بدترین دشمن، اور بہترین دوست۔

جب وُہ "ریاست" نکالتے تھے۔ ہز مجسٹی کے قلعوں اور ہز ہائینسوں کے ایوانوں میں زلزلے ڈالتے تھے۔ والیانِ ریاست کی نیندیں حرام کردی تھیں اُن کے قلم نے، بڑے بڑے فرماں روا کانپتے تھے۔ ان کے نام سے۔

دہلی کا واقعہ ہے، ایک روز، سرِ شام۔ ایک ریاست کے وزیرِ اعظم میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دیوان سنگھ آگئے۔ اُنھیں دیکھتے ہی وزیرِ اعظم صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ اور، جب گلاس بھر کر، میں نے ان کے سامنے رکھّا، تو، انھوں نے دیوان سنگھ کی جانب اشارہ کیا کہ ان کے سامنے میں نہیں پیوں گا، دیوان سنگھ نے ان کو اشارہ کرتے دیکھ کر، مجھ سے کہا جوش صاحب، پرائم منسٹر صاحب سے کہہ دیجیے، وہ شوق سے پییں، میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ یہ والیِ ملک نہیں ہیں۔ میں تو فقط والیانِ ملک پر حملہ آور ہوتا ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ میں انسان کا نہیں، سُور کا شکار کھیلتا ہوں۔

ان کی سلطان شکاری کے واقعات سے تو ہندوستان اب تک گونج رہا ہے۔ اب ان کی گدا نوازی کا بھی ایک واقعہ، جو ان کے ایک دوست نے مجھے سُنایا تھا، سُن لیجیے۔ اُنھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ کسی والیِ ریاست کے متعلق ایک ایسی دستاویز ان کے ہات لگ گئی تھی جس میں اُن کے حرامی ہونے کا ثبوت موجود تھا، اُس دستاویز کے زور پر وہ اُس

والیٔ ریاست سے غالباً ساٹھ ستر ہزار روپیہ حاصل کر کے گھر آئے اور نوٹوں کے بنڈل، بڑی بے پروائی کے ساتھ میز کی دراز میں، ٹھونس کر وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے شکستہ حال دوست آ گئے، اور، کھڑے کھڑے کہا سردار صاحب، میں آپ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آیا ہوں، مجھ سے گلے مل لیجئے، وہ کھڑے ہو کر اُن سے گلے ملے، اور، اُنھیں زبردستی بٹھا کر کہا میر صاحب یہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے کیا معنی ہیں، میر صاحب نے کہا، میرے پاس وقت بہت کم ہے، بس اتنا کہوں گا کہ کربلائے مُعلّیٰ جا رہا ہوں، اور، اب جیتے جی واپس نہیں آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ، یہ کہہ کر، میر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، اور جیسے ہی زینے کی طرف جانے لگے، دیوان سنگھ نے، بڑھ کر، اُن کو روک لیا، اور کہا جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے، بھگوان قسم، میں آپ کو جانے نہیں دوں گا، یہ سن کر میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور کہا سردار صاحب، یہ نہ پوچھیے اور مجھے جانے دیجئے، دیوان سنگھ ان کو کھینچ کر، کمرے میں لے آئے، اور کہا جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے، میں قسم کھا چکا ہوں کہ آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا، میر صاحب نے کہا سردار صاحب میں اس قدر مقروض ہو گیا ہوں کہ اب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ میں قرضہ ادا کر سکوں، اس لئے جا رہا ہوں کہ کربلائے معلّیٰ میں زندگی کے باقی دن گزار دوں، اچھا، اب جانے دیجئے، وقت کم ہے، یہ کہ کر میر صاحب پھر اُٹھ کھڑے ہوئے، دیوان سنگھ نے اُن کا دامن پکڑ کر پوچھا آپ پر کس قدر قرضہ ہے، میر صاحب نے کہا پندرہ ہزار روپے۔

دیوان سنگھ نے کہا بس ؟ صرف ایک منٹ اور یہ کہ کر اُنھوں نے گن کر بیس ہزار کے نوٹ میر صاحب کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیئے، میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے، اور، دیوان سنگھ نے ہات جوڑ کر ان کے سامنے سر جھکا لیا۔ ہے کوئی اس دور میں ایسا دوست پرور اور کیا آج کا کوئی ادب پتی بھی اس دریا دلی کی جرأت کر سکتا ہے ؟

"ریاست کے دور میں اُنھوں نے بے حد کمایا، لیکن کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ کھایا پیا اور کھلا پلا دیا۔

اس لئے اُن پر تونگری اور مفلسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ لیکن اگر مفلسی میں کوئی

دوست یا مہمان آجاتا تھا۔ وہ خفیہ طور پر اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر کے، اس کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی، ان کی مفلسی کو بھانپ کر، ان کو دعوت کرنے سے روکتا تھا، تو وہ لڑ پڑتے تھے۔

مجاز نے آکر، ایک دن مجھ سے کہا کہ کل تو سردار صاحب نے کمال ہی کر دیا، میں شام کو ان کے دہاں پہنچا۔ انھوں نے ملازم سے کہا بارہ درجن سوڈے کی بوتلیں لے آ۔ محلے میں ان کا بڑا بھرم تھا، تھوڑی دیر میں بارہ درجن بوتلیں آگئیں۔ انھوں نے ایک درجن بوتلیں رکھ کر، نوکر کو حکم دیا کہ فلاں دُکان پر جا کر ان کو فروخت کر دے، اور ان کو فروخت کر کے جو روپیہ ہات آئے، اس کی ایک وسکی کی بوتل اور کچھ کھانے کا سامان لے آئے۔ یہ تھی اُن کی مہمان نوازی کی شان۔

یہ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے جب میں دہلی سے "کلیم" نکال رہا تھا، اور معاش اور معاشقے کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی، اور پریشان خیالی کا دور تھا، اور اس پر طرّہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آچکی تھی کہ وہ ایک روز، شام کے وقت میرے گھر آئے برانڈی کی بوتل ساتھ لائے (وہ برانڈی کو وسکی پر ترجیح دیتے تھے)

جب دور ختم ہو گیا تو انھوں نے کہا میں بھابی سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، میں نے سخاوت سے کہا سردار صاحب کو اوپر لے جاؤ۔ میری بیوی اس وقت تک پردے کی پابند، لیکن اُن سے کانا پردہ کرتی تھیں۔ جب وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آئے، دو منٹ کے اندر رخصت ہو گئے اور جب میں اوپر گیا تو بیوی نے مجھ کہا سردار صاحب یہ نوٹوں کا بنڈل دے گئے ہیں، وہ کہتے تھے یہ رقم انھوں نے اپنے دوست، نواب بہاولپور سے خط لکھ کر منگائی ہے دیکھی آپ نے دیوان سنگھ کی شرافت اور دوستی!!

ایک زمانے میں جب کہ وہ رفیع احمد قدوائی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھ رہے تھے اس وقت ان کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ میں اُن کے افلاس کا اندازہ کر کے، سیدھا قدوائی صاحب کے پاس گیا، اور ان سے یہ کہا کہ قدوائی صاحب آپ منسٹر نہیں، حاتم دوراں ہیں، آپ کی دوست نوازی کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں۔ لیکن دوست نوازی کوئی بڑا وصف

نہیں۔ ہلاکو، نیرو، چنگیز اور یزید بھی اپنے دوستوں کو نوازتے تھے، البتہ دشمن نوازی ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو نبوت کی سطح پرلے جاتا ہے۔ آپ ہلاکو وغیرہ کی سطح پر قانع رہیں گے یا پیمبری کی سطح تک پہنچنا چاہیں گے۔ انھوں نے مسکراکر، کہا، پہیلیاں سی کیوں بجھا رہے ہیں آپ جو مدعا ہو اُسے کھل کر کہیئے۔ میں نے کہا دیوان سنگھ آج کل سخت پریشان ہیں۔

انھوں نے یہ سنتے ہی گھنٹی بجائی، سکریٹری آیا، اُس کے کان میں انھوں نے کچھ کہا، وہ چلاگیا، اور پانچ منٹ کے بعد وہ چیک لایا، چیک پر قدوائی صاحب نے دست خط کردیئے اور کہا یہ چیک جاکر دیوان سنگھ کو دے آیئے۔ وہ دس ہزار کا چیک لے کر میں اُن کے پاس گیا، انھوں نے کہا چلیئے ابھی کیش کرالیں، چیک کیش ہوگئی تو وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ آدھی رقم آپ لے لیں، اور جب میں نے انکار کیا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہوگئے اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بدترین دشمن بھی ہیں۔ اُس کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ میں پاکستان سے دہلی گیا اور ان کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صبح کو جب میں باہر جانے لگا انھوں نے پوچھا آپ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے جواب دیا ساغر سے ملنے کے لئے۔

ساغر کا نام سنتے ہی وہ اُچھل پڑے، دوڑکر میرا ہاتھ پکڑلیا، کہنے لگے میں آپ کو ایک ایسے منافق کے پاس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا جس کو آپ نے پنڈت جی سے کہہ کر ریڈیو میں نوکر رکھوایا تھا اور اس کا بدلہ اس نے یہ دیا ہے کہ جب سے آپ پاکستان چلے گئے ہیں۔ وہ آپ کے خلاف زہر اُگلتا پھرتا ہے۔ میں نے کہا سردار صاحب، میں نے ساغر کو نوکر نہیں رکھوایا، ساغر نے خود پنڈت جی سے اپنی ملازمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ انھوں نے کہا یہ مجھے معلوم ہے لیکن جب کیسکر نے، پنڈت جی کو دھوکہ دے کر، اس کا پتا کاٹ دینا چاہا تھا، اس وقت تو وہ آپ ہی تھے جس نے کیسکر کے فریب کا پردہ چاک کرکے اس کو نوکری دلوائی تھی میں نے کہا سردار صاحب، ساغر برا آدمی نہیں ہے، اگر اس نے میری پاکستان جانے کے بعد، میرے خلاف آواز بلند کی تھی، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بے چارہ حکومتِ ہند پر اپنی وفاداری کا سکّہ جمارہا تھا۔ اور یہ کوئی ایسی بُری بات نہیں کہ میں اتنے پرانے دوست سے قطع تعلق کرلوں، یہ

سُن کر، دیوان سنگھ نے، مارے غصے کے کانپتے ہوئے کہا آپ آدمی نہیں "دیوتا" ہیں لفظ دیوتا کو اس قدر، دانت پیس کر، ادا کیا تھا گویا وہ کوئی موٹی سی گالی دے رہے ہیں۔ اور جب میں خاموش ہو گیا تو انھوں نے کہا جوش صاحب میں تو جب تک دشمن کا خون چوس نہ لوں، مجھ کو چین نہیں آتا میرے نزدیک دشمن کا مار ڈالنا ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

ہزار حیف ہندوستان کی ناقدر شناسی پر کہ وہ اب اپنا رسالہ بند کر کے دہرہ دون چلے گئے ہیں، اور دو سو رپلّی پنشن پر، زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب اُن کی اُداسی پر نگاہ کرتا ہوں، دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ ہائے دیوان سنگھ کا سا بے نظیر انسان، اور اس قدر پریشان۔ وائے بر کورئ ہندوستان!

مولانا عبدالسلام

وُہ مشرقی عُلوم کے ، حرفِ آخر ، انسان ، اور شاہنشاہ تھے ۔ قرآن ، حدیث ، منطق ، حکمت ، تصّوف ، عروض ، معنی و بیان ، علم الکلام ، تاریخ ، تفسیر ، لُغت ، لسانی قواعد ، ادب اور شاعری کے امام تھے ۔ جیّد عالم ہونے کے باوجود علمائے سو کے تشابہ سے بچنے کی خاطر ، انھوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کرا دیا تھا ۔ وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے ، اور ، اپنے عہدِ شباب میں ، تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکّر لگاتے ، اور ، اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے ۔

لیکن ، زندگی کے آخری اَیّام میں ، وہ ، اس قدر سختی کے ساتھ خلوت پسند اور خود نشیں ہو گئے تھے کہ تقریباً بیس بائیس برس کی مدت میں ، وہ اپنے دہلی کے ترکمان دروازے کی پتلی سی گلی کے بالاخانے سے ، کبھی ایک بار بھی نیچے نہیں اُترے تھے ۔

میں اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور ، گھنٹوں اُن سے استفادہ کیا کرتا تھا ۔ وہ اس قدر کم آمیز ہو چکے تھے کہ اُنھوں نے مجھے یہ حُکم دے رکھا تھا کہ جوش میاں ، جب تک کوئی شخص حسین یا عالم نہ ہو ، اُس کو میرے پاس ہرگز نہ لانا ۔ ایک روز میں ساغر کو اُن کے پاس لے گیا ، وہ خوش ہو کر ، کہنے لگے اچھی چیز لائے ، باتوں باتوں میں جبر و قدر کا مسئلہ چھِڑ گیا اور جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ساغر بھی اس مسئلے پر لب کشائی کر رہے ہیں تو انھوں نے کہا صاحب زادے ، آپ خاموش رہیں ، اچھی صورت کے یہ معنی تو نہیں کہ آدمی خوب رُو ہو کر ، ایسے دقیق مسائل سے بھی آگاہ ہو جائے ۔ آپ پر تو یہی ضرب المثل صادق آتی

ہے کہ "مُوت کی دھار نہ سوجھے، مرا ہریالا بنا"۔

دہلی کی ٹکسالی اُردو بولنے والوں میں اب صرف وہی رہ گئے تھے۔ وہ جب باتیں کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے تھے، اور جی چاہتا تھا کہ وہ پہروں یونہیں بولتے رہیں اور جب اپنی باتوں میں وہ فحش کی آمیزش کر دیتے، تو، خدا کی قسم مزا آجاتا تھا۔

ایک روز، ایک مولانا صاحب کی کج بحثی سے تنگ آکر، اُنھوں نے، کس مزے کے ساتھ، یہ کہا تھا کہ مولانا، حضرتِ حق نے مجھ کو وہ طاقت بخشی ہے کہ اگر میں آپ کے حلقۂ زیریں پر، اپنا عمود لحمی وار کر دوں تو خون کے فوّارے جاری ہو جائیں۔

میں، ایک روز، اُن کے ساتھ، برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ زینے کے دروازے پر دیکھا کہ ایک ڈاڑھیل کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جیسے ہی ان پر مولوی عبدالسلام کی نگاہ پڑی، انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے، اور اپنا اٹھا ہاتھ ہلا کر کہا، آپ کی ریش مبارک ناقابلِ برداشت ہے جلدی گاڑی بڑھایئے، اور وہ اپنا سا منھ لے کر اُتر گئے۔ میں نے کہا مولانا آپ کا یہ عمل اخلاقِ رسولؐ کے خلاف تھا۔ اُنھوں نے فوراً جواب دیا، "لیکن اس قولِ خدا کے مطابق تھا کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

ایک روز اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ریل میں اجمیر شریف جا رہا تھا۔ میرے ساتھ میری بے پوری محبوبہ، اور اس کی ماں بھی تھی کہ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میرے ایک صوفی دوست بھی میرے درجے میں آگئے اور میری محبوبہ کو دیکھ کر انھوں نے "جل جلالہ" کا نعرہ بلند کر دیا، اور میں نے، اپنی محبوبہ کی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے کہا۔ جناب اُمِّ نوالہ۔ بھی تو ارشاد فرمایئے، وہ جھینپ کر رہ گئے۔

ان کی آمدنی صرف تیس روپے ماہانہ تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر خوددار و قانع تھے کہ۔

لہ یعنی بوڑھے تو اس قدر ہیں کہ پیشاب کرتے وقت ضعفِ بصارت کی بنا پر خود اپنے پیشاب کی دھار تک نظر نہیں آتی، پھر بھی دولھا بننے کے تمنائی ہیں۔ دولھا جب دلھن کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو ڈومنیاں گانے لگتی ہیں "مرا ہریالا بنا"، "ہریالا" کے معنی ہیں ہرا بھرا، تر و تازہ، اور "بنا" دولھا کو کہتے ہیں۔)

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک زردی پوش نوجوان نے آکر کہا کہ نیچے ہز ہائی نیس . . . کھڑے ہوئے ہیں، آپ اجازت دیں تو حاضر ہوں، اُنھوں نے کہا، اگر وہ میرے سامنے آکر یہ کہیں کہ میرے تاج سے عبدالسلام کی جوتی اونچی ہے تو شوق سے آئیں ورنہ گاڑی بڑھادیں، ہز ہائنس کی عقیدت دیکھیے، وہ اوپر آئے، انھوں نے وہ الفاظ، بڑے خلوص سے ادا کئے اور دو زانوں ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک بار خواجہ حسن نظامی نے ان کے پاس آکر کہا، مولانا آزاد آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں، زحمت نہ ہو تو کل میرے ساتھ ان کے ہاں تشریف لے چلیے، یہ سنتے ہی اُنھوں نے بگڑ کر کہا خواجہ صاحب اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ایسی بات کہتا تو میں فوراً اس کو موٹی سی گالی دیتا۔ جائیے اور ابوالکلام سے کہہ دیجیے کہ وہ یہاں نو من تیل لے کر آئیں اور میرا . . . . دو گھنٹے تک مسلسل سہلائیں، اور اس کے بعد مجھے اپنے وہاں بلائیں، یہ سن کر خواجہ صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ صرف دو منٹ اور بیٹھے، اور پھر چلے گئے۔

ایک دن ان کے وہاں پہنچا تو میرے دوست نواب مہدی یار جنگ، وزیر تعلیمات حیدرآباد دکن اُن کے کوٹھے سے، اُترتے ملے۔ صاحب سلامت اور معانقے کے بعد میں نے پوچھا خدا نخواستہ کیا مزاج ناساز گار ہے، انھوں نے کہا آپ میرے پاس آئیں گے تو بتاؤں گا، مجھے افسوس ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے مجھ کو مولوی عبدالسلام کے پاس بھیج کر بیٹھے بٹھائے ذلیل کرایا۔ میں اوپر گیا دیکھا کہ مولوی عبدالسلام غصے میں بھرے بیٹھے ہیں، میں نے کہا۔ مولانا کیا بات ہے، انھوں نے کہا ابھی حیدرآباد دکن کے ایک وزیر صاحب جن کا خطاب ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر، میرے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ میں ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دوں، میں نے اُن سے کہا کہ دنیا کے تمام علوم میں جو علم، آپ کو سب سے زیادہ مستحضر ہو، اس کا نام بتائیے، میں اُس علم کے مصطلحات میں یہ مسئلہ آپ کو سمجھا دوں گا۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا، علم معنیٰ و بیان۔ سو جوش میاں، اللہ آپ کا بھلا کرے، میں نے علم معنی و بیان ہی کے مصطلحات میں وہ مسئلہ، حضرت حق کے فضل و کرم سے، ان کو سمجھا دیا۔

وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے، جھک کر، میرے ہات چوم لیے۔ اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ، حیدر آباد تشریف لے چلیں۔ میں نے کہا اب تو کوٹھے سے بھی نیچے نہیں اُترتا ہوں، اتنا بڑا سفر کیسے کروں گا ــــ اس پر انھوں نے جب مجھ سے یہ کہا کہ مولانا میں وہاں لے جاکر آپ کو حضور نظام سے ملاؤں گا، وہ آپ کا اس قدر وظیفہ مقرر فرمادیں گے کہ یہ کمرہ چھوڑ کر، آپ دہلی میں ایک کوٹھی تعمیر کرا کے اس میں رہنے لگیں گے۔

تو میاں جوش میرا ناریل (سر) چٹخ گیا، میں نے کہا آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اُس جاہل نظام کے سامنے، اپنی وجاہتِ علمی کی کمر میں ذلت کی پیٹی باندھ کر، جاؤں، اس مسخرے کو "خداوند نعمت"، اور اپنے کو "فدوی" کہوں۔ نواب مہدی یار آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ میرے موئے زیریں، بمراحل بہتر ہیں، نظام کی مونچھوں کے بالوں سے۔ اور اس دعوے کی یہ دلیل ہے کہ میرے موئے زیریں کی پرورش میں خونِ علم صرف ہوتا ہے، اور نظام کی مونچھوں کے بالوں کو خونِ جہل بڑھاتا ہے جائیے گاڑی بڑھائیے۔

غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدارانند

مولانا عبداللہ عمادی

قد، بوٹا سا، دماغ باؤن گز کا، چہرہ کتابی، داڑھی گھنی، عربی و فارسی کے ہفت قلزم دارالترجمۂ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظرِ اُمورِ مذہبی، بحث پسند و غیر متقی، بردباری کے ساتھ ظریف، منھ پر، لوگوں کے علم کی تعریف کرنے میں بلند آہنگ، ان کے پیٹ پیچھے ان کے جہل کا اعلان کرنے میں بیباک، مزاح کے مواقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے پر مجبور، عقلِ معاش سے بہرہ مند، نظام دکن کے تصوّر سے بھی لرزاں و ترساں، اور عمل پر اکساتے والے شاعر، ایک بار مودودی اور میں نے سازش کی کہ اُنھیں طوائف کے کوٹھے پر لے جایا جائے۔ ہم نے جھٹ سے ایک جھوٹا دعوت نامہ لکھا۔ جس میں (مولانا) عبدالقدیر بدایونی نے اُن کو دن کے دو بجے، گیارھویں شریف میں شریک ہونے کے لئے بلایا تھا - وہ ہمارے چکمے میں آ گئے، ہم اُن کو موٹر میں بٹھا کر "محبوب کی مہندی" لے گئے، جو طوائفوں کا محلہ تھا۔

ابھی موٹر سے اُتر کر، ہم طوائف کے کوٹھے کی طرف چند قدم چلے ہی تھے کہ مولانا عمادی کے ایک دربار رس دشمن، کامل صاحب نے موٹر سے گزرتے ہوئے، ہم کو دیکھ لیا، کامل صاحب نے موٹر سے سر نکال کر، مولانا عمادی کو بڑے غور سے دیکھا، اور، بڑے معنی خیز انداز سے، اپنے سر کو بار بار جنبش دیتے ہوئے گزر گئے۔

مولانا عمادی، اپنے دشمن کی نگاہ، اور اس کے سر کی معنی خیز جنبش، ہم کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اور مجھے یہ لوگ کسی غیر مستحسن جگہ لئے جا رہے ہیں

انھوں نے مجھے اور مودودی کو بڑے غور سے دیکھا ، ہم لوگ بے حد سنجیدہ بنے رہے، اُنھوں پوچھا یہ آپ لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں ، مودودی نے کہا ارے آپ اس قدر جلد بھول گئے ہم لوگوں کو مولانا عبدالقدیر صاحب نے گیارہویں شریف کی شرکت کے لئے مدعو فرمایا ہے اب ہم لوگ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے ، آگے آگے وہ ، ان کے پیچھے میں اور میرے پیچھے مودودی اور مودودی کے پیچھے ، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ، ان کے چھوٹے بھائی سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے ۔

یہ سونچ کر مولانا عمادی ، دن دہاڑے ، رنڈی کے کوٹھے پر چڑھ رہے ہیں ، مجھے بڑے زور کی ہنسی آ گئی ، عمادی صاحب نے گھبرا کر پوچھا یہ آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں میں نے کہا مودودی نے گدگدا دیا ہے ۔ اتنے میں ایک بڑھیا کوٹھے سے اُترتی نظر آئی ۔ عمادی صاحب ٹھٹک تو چکے ہی تھے ، اُنھوں نے پوچھا مائی یہ کس کا مکان ہے ۔ اُس بڑھیا نے کہا پُتریا (طوائف) کا ۔ "پُتریا" ، سنتے ہی مولانا اُچھل پڑے ، اُن کی داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے ، اُنھوں نے ہمیں بڑی قہر کی نگاہ سے دیکھا ، وہ ، اپنے بڑے بڑے پائنچے ہلاتے اور ہم لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے ، بڑی تیزی کے ساتھ موٹر میں بیٹھے نہیں ، بلکہ گر پڑے ، اور گر کر ہانپنے لگے ۔ اور جب ، موٹر کے قریب آ کر ، ہم نے قہقہے مارے تو وہ زخمی شیر کے مانند بپھر کر ، کہنے لگے ۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو دشمنی کی ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس جو علم ہے ، اس کی ہندوستان بھر میں کہیں قدر نہیں ، اس لئے میں نے دکن میں آ کر پناہ لی ہے ، اگر کامل نے سرکار تک یہ خبر پہنچادی تو میں یہاں سے نکال دیا جاؤں گا ، ہندوستان کی کسی مسجد کے حُجرے میں مجھ کو جگہ دی جائے گی ، اور جمعرات جمعرات گوشت اور وہ بھی گائے کا گوشت ملے گا ۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ کسی کے پیٹ پر لات مار دی جائے ، ہم نے کہا ۔

مولانا آپ مزاح المومنین پر اس قدر بگڑ رہے ہیں ، انھوں نے کہا آپ مزاح الکافرین کو مزاح المومنین کا خطاب دے رہے ہیں ۔ اس واقعہ کے بعد اُنھوں نے ہم سے ملنا ترک کر دیا ۔ اور ہماری دفتری زندگی ، بے حد بے لطف ہو کر رہ گئی ۔

جب ان کے غصے اور ترکِ تعلق پر کچھ اُوپر ایک مہینہ گزر گیا۔ تو مودودی نے مجھ سے کہا پہلے آپ مولانا کے پاس جائیں اور منانے کی سعی کریں۔ وہ نرم ہو جائیں تو مجھے بھی بُلا لیجیے گا۔

میں جی کڑا کر کے ان کے کمرے میں داخل ہوا، اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرے سے اُتر کر ایک نشیبی حلقے کی نالی پر بیٹھے پیشاب کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً ایک تیر بہدف تدبیر آگئی۔ میں جوتہ، اُتار کر، دبے پاؤں ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر ان کو پیشاب کرتے، دیکھنے لگا۔ میرا سایہ پڑتے ہی اُنھوں نے بڑی گھبراہٹ سے مُڑ کر دیکھا، فوراً کمر بند باندھ کر، کھڑے ہو گئے، مجھ سے بگڑ کر کہا یہ کیا حرکت تھی۔ آپ سترِ بینی کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ میں نے، بات جوڑ کر، کہا، مولانا گستاخی تو ضرور ہوئی، مگر، اللہ اکبر، یہ تماشا تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُنھوں نے مُنہ جھٹک کر، کہا۔ تماشا کیسا؟ میں نے کہا، مولانا قصور معاف آپ کا پیشاب کرنے والا عضو، آپ کے روئے مبارک سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے۔ گویا۔ دو چار مہینے کے مُسلسل بخار کے بعد، آپ کا منھ بالکل سُت کر نیچے لٹک پڑا ہے۔ یہ سنتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے دونوں شانے ہلنے لگے اور ان کا سینہ اُچھلنے لگا۔ اور مجھ کہا بڑا نادر خیال سوجھا ہے آپ کو، اگر اس مضمون بکر کو آپ نظم کر دیں تو میں آپ کے تمام ذنوب معاف کر دوں گا۔

دوسرے ہی دن، اسی مضمون کا ایک دس بارہ بند کا مسدس کہہ کر میں ان کے گھر پہنچا، دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کسی قدر بخار ہے معاف کیجیے گا۔ اُٹھ نہیں سکتا۔ میں نے کہا آپ آرام فرمائیں، میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا میں نے امتثالِ امر میں ایک مسدس کہا ہے "تنِ بہ تام" کے نام سے اُنھوں نے کہا فوراً سُنائیے۔ اور دوسرے ہی بند پر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور جھوم جھوم کر داد دینے لگے، اور داد دینے میں، اس قدر بار بار ہنسے کہ پسینہ آگیا، کہنے لگے لیجیے بخار اُتر گیا، اللہ آپ کو جزائے خیر دے، وہ مُسدّس اس قدر مردانہ، یعنی فحش ہے جسے میری دیہاتی کُتیاؤں کی سی شرمیلی قوم، برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ایک بند، اول

ایک بیت، بڑی حد تک معتدل ہے، وہ سن لیجئے:۔

مشکل ہے، فرقِ اسفل داعلیٰ، خدا کی شان
کہسار کاہ ہے، کاہ میں جلوا، خدا کی شان

پنہاں ہیں، تاب چہرۂ پیدا، خدا کی شان
صورت ہے جیسی، ویسا ہی...، خدا کی شان

دنیائے فتنہ ساز کے، کرتوت دیکھئے
لٹکا ہوا ہے، چاہ میں، ہاروت دیکھئے

اور بیت ملاحظہ ہو:۔

میانی ہیں، علم وفن کی گرہ کھولتا ہوا
پہنے ہوئے عبا، عربی بولتا ہوا!

میں ان کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ وہ مزاح کے مواقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے لگتے، اور نظام دکن سے لرزاں وترساں رہتے تھے۔ اس کا بھی ایک واقعہ سننے کے قابل ہے۔

ایک روز، نظام کے وہاں ڈنر تھا، ابھی نظام برآمد نہیں ہوئے، اور مولانا مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے جاگیردار آئے، جن کی گردن میں رعشہ اور چہرے پر سفید گل مچھے تھے، مولانا نے، بڑے ادب کے ساتھ، لپک کر، اُن سے مصافحہ کیا وہ مصافحہ کرکے، دو قدم پیچھے ہٹے تو میں نے ان کے کان میں کہا، آپ دیکھ رہے ہیں جاگیردار صاحب کو، یہ تو بالے میاں کی چھڑ، اور "پیسے میں، "آپ ہی آپ" ہیں یہ سنتے ہی، وہ، ہنسی کے مارے بے قابو ہو گئے، بھیں بھیں کرتے کھمبے کے پیچھے چلے گئے، اور پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ اور، یہ خیال کرکے کہ میں کہیں نظام کے سامنے اُن کو ہنسا دوں، وہ کھمبے کے پیچھے سے غائب ہو کر، مہمانوں کے غول میں مل گئے۔ اور میں ہاتھ مل کر رہ گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

اتنے میں نظام برآمد ہو گئے۔ دربار جم گیا، اور قوالوں نے۔ "برتو، ایں مسندِ شاہانہ مبارک باشد،" گانا شروع کر دیا۔ قوالی ختم ہوئی۔ تو نذریں پیش کرنے والے تمام غلامانِ زریں کمر، آقائے زمیں کردگار کی جناب میں، نذریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کو، قطار

ؔ لکھنؤ میں لچکتے تار پر قائم کرکے، ایک روئی کے گالے کا گڈا بنایا جاتا تھا، جس کا سر برابر ہلتا رہتا تھا۔ اور بنانے والا "پیسے میں آپ ہی آپ"، (یعنی خودکار خود متحرک) کی صدا لگا کر، اسے ایک پیسے میں بیچا کرتا تھا

باندھ کر، صف بستہ ہو گئے اور:-

کیوں وہ صیاد، کسی صید پہ توسن ڈالے

صید جب خود ہی چلے آتے ہیں گردن ڈالے

کا تماشا ہونے لگا۔ میں عمادی صاحب کے شکار کے لیے ایک گوشے میں، دبک کر کھڑا ہو گیا اور نذروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب آدھی سے زیادہ نذریں پیش ہو چکیں، میں نے دیکھا کہ مولانا، چاروں طرف نظریں دوڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا، اور مولانا، یہ خیال کر کے کہ میں غالباً آگے کی صف میں ہوں گا، ایک صاحب کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے اور میں دبے پاؤں جا کر، ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اب میری نذر کی باری آ رہی ہے، انھوں نے ایک اشرفی، اور چار روپے جیب سے نکال کر رومال میں لپیٹ لیئے، اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھ لئے۔ میں نے ان کا رومال اچک لیا، انھوں نے، اچھل کر مجھے دیکھا، بڑی بے کسی سے کہنے لگے، برائے خدا اس وقت مزاح نہ فرمائیے ورنہ مجھ کو ہنسی آ جائے گی، اور، بھرے دربار سے، نکال دیا جاؤں گا، اتنے میں ان کی باری آ گئی۔ میں نے ان کا رومال ان کو دے دیا، لیکن وہ میرے اس مذاق سے اس قدر بوکھلا چکے تھے کہ نظام کی خدمت میں نذر گزارنے کے بدلے، وہ شاہ زادیوں کے سامنے جا کر جھک گئے۔ اور نظام نے، گرج کر کہا ارے ادھر آؤ مولانا قاموس اللغات، اتنے بڑے بڑے ہنڈاں (ہانڈے) جل رہے ہیں، اور تمھاری نظر مجھ پر نہیں پڑ رہی ہے۔ مولانا، جھپٹ کر نظام کے روبرو چلے گئے اور نذر پیش کر دی الٹے قدموں پلٹے، اور ستون سے ٹکرا کر، گر پڑے، نظام نے قہقہہ مارا اور میں نے ستون کی آڑ سے کہا۔ آداب عرض ہے مولانا۔

فراق گورکھپوری

مجموعۂ اضداد، آمیزۂ بلور و فولاد۔ گاہ، نسیم بوستاں، گاہ، صرصر بیاباں گاہے، خضر درگاہ، گاہے، گم کردہ راہ۔ گاہ، شبنم برگِ تاک۔ گاہ شعلۂ جوالہ و بے باک۔ گاہ، یزداں بآغوش، گاہ، اہرمن بر دوش۔

رندِ قدح خوار، گوہر شاہ دار۔ آسمانِ خوش لہجگی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر۔

اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیمِ ژرف نگاہی کے تاج دار۔ جودت پناہ، نقاد نگاہ۔ مہبطِ جبریل، شاعرِ بزرگ و جلیل۔

اپنے فراق کو میں، قرنوں سے جانتا، اور ان کی خلاقی کا لوہا مانتا ہوں۔ مسائل علم و ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں، تو لفظ و معنیٰ کے لاکھوں موتی رولتے ہیں۔ اور اس افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

وہ بلا کے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں۔ اور یہ وہ ذکاوتِ مخصوص ہے، جو دنیا کے تمام عظیم فن کاروں میں پائی جاتی ہے۔ کج نہاد صالحین پر آوازے کستے ہیں، اور وہ اُن بے توفیقوں کے کھوکھلے پن پر دل ہی دل میں ہنستے ہیں۔ لیکن ان کی راتوں سے ہوشیار، پینے سے پیش تر وہ یارِ غم گسار ہوتے ہیں اور پینے کے بعد دشمنِ خوں خوار بن جایا کرتے ہیں۔ اور نہایت استعجاب آمیز قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کا اپنی رفیقۂ حیات سے جو برتاؤ ہے، وہ سینۂ انسانیت کا ایک ہولناک

گھاؤ ہے۔ اور اُن کے شدائد سے تنگ آکر، اُن کا بیٹا خودکشی کر چکا ہے۔

وہ ایک دُہری شخصیت کے انسان ہیں، کبھی مسیح دوراں ہیں اور کبھی موسیٰ عمراں، کبھی ہکتے گل زار۔ کبھی ننگی تلوار۔ دہلی کے دوران قیام میں، ایک بار، وہ مجھ سے بھی، بہت ہی بُری طرح، اُلجھ پڑے تھے، اس وقت اگر میں اپنی پٹھونی کا گلا نہ گھونٹ دیتا، تو بڑا خون خرابہ ہوجاتا۔ اُس رات کی صبح کو میں نے اُن پر ایک نظم کہی تھی جس کا صرف ایک شعر یاد ہے

نہ عطا کر، مگر، مجھے معبود
بھول کر بھی شب وصالِ فراقؔ

پی کر لڑ پڑنا اور محفل کو درہم برہم کر دینا، اب ان کی گزک بن چکا ہے، اس لئے اُن کو بُرا نہ کہیئے، اُن پر ترس کھائیے اور ان کی راتوں سے دامن بچائیے۔

ایک بار، کشمیر کے ہاؤس بوٹ میں وہ اور ساغرؔ میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، فضا نہایت خوشگوار، اور جھیل کی موجیں نغمہ بار تھیں۔ دور چلنے لگا۔ اور دو جام خالی کر کے انھوں نے، ساغرؔ کی طرف اشارہ کر کے، مجھ سے پوچھا یہ سامنے کون بیٹھا ہوا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنک گیا، میں نے کہا دیکھو فراقؔ، ہم کو اپنی گزک نہ بنانا۔ وہ چپ ہو گئے۔ لیکن چہرے کے بے پناہ کرب سے پتا چلنے لگا کہ، رنگ پر آنے کے واسطے اُن کا نشہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور اب ان سے رہا نہیں گیا، انھوں نے کہا جوشؔ تم خواہ بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے ساغرؔ بیٹھا ہوا ہے، میں نے کہا پھر تم سے کیا غرض، اُنھوں نے، اپنی گول گول آنکھوں کو گردش دے کر کہا اس لونڈے سَغرُوا (ساغر کی تصغیر) کو بھی، خدا کی شان یہ دعویٰ ہے کہ میں شاعر ہوں، حالانکہ خدا کی قسم، میرا بٹلر اس سے کہیں اچھے شعر کہتا ہے اب کیا تھا، ان کی آرزو پوری ہو گئی، ساغرؔ یہ سنتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور دونوں میں گتھم گتھا ہو گئی۔

ایک بار علی سردار جعفری کسی مشاعرے میں شریک ہونے الہ آباد گئے اور ان کے وہاں قیام کیا، انھوں نے جی کھول کر ان کی تواضع کی، اور خوب کھلایا پلایا۔ اور جب موٹر میں بیٹھ کر، دونوں مشاعرے کی طرف روانہ ہوئے تو مشاعرے کے پھاٹک پر کھڑے

ہوکر، فراق کا جی چاہا تھوڑی سی گزک کرلیں، یہ خیال آتے ہی بانی مشاعرہ سے اُنھوں نے کہا سن لیجئے جناب، یا تو فراق مشاعرے میں شرکت کرے گا، یا علی سَرْدَرْڈا۔ بانی مشاعرہ نے لاکھ لاکھ سمجھایا، اور علی سردار نے کہا فراق صاحب میں تو آپ کا میہمان ہوں، لیکن وہ نہیں مانے، پھاٹک پر یہ تماشائیوں کے ٹھٹ لگ گئے اور وہ علی سردارڈا کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے اور صبح کے وقت، اُسی رات کے سَردرداکی گردن میں بانہیں ڈال کر، مسکرانے لگے۔

لیکن اب کی جب میں دہلی گیا تو ان کے مزاج کا تغیر دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ وہ دہلی میں کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے آئے اور اپنے شاگرد گرگ کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو، دوڑکر، انھوں نے گلے لگا لیا، اور ہر چند رات کے بارہ ایک بجے تک وہ میرے ساتھ پیتے رہے لیکن آخر تک وہ قطعی بگڑے نہیں، بلکہ لڑائی کا گوشہ نکالنے کے عوض، اُنھوں نے اتنے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ان میں سے ایک لطیفہ آپ بھی سن لیجئے۔

اُنھوں نے کہا پرسوں ہم سب کو، ہمارے ایک ماہر آثار قدیم دوست نے بہت تڑکے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ وہ دہلی کی ایک ایک تاریخی اینٹ سے ہمیں آگاہ کر دیں گے۔ چوں کہ یہ جاڑے کا موسم ہے، ہم نے خیال کیا کہ اُنھوں نے صبح کے وقت بلایا ہے اس لئے ناشتے کا انتظام انھیں کے گھر پر ہوگا۔ چناں چہ ہم لوگ تین موٹروں میں بیٹھ کر اُن کے وہاں پہنچ گئے۔ اور جب یہ دیکھا کہ وہاں ناشتے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور وہ قطب جانے کی جلدی کر رہے ہیں، تو ہم سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ وہاں جا کر ناشتہ کرائیں گے، لیکن جب وہاں بھی ناشتہ کا کوئی بندوبست نہیں دیکھا تو ہم پریشان ہو گئے اور وہ ہم کو ایک جگہ سے دوسری، اور دوسری سے تیسری جگہ لئے پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا اور بھوک سے ہم سب کا بُرا حال ہو گیا۔ اس وقت مجھ کو شرارت سوجھی، اشارے سے میزبان کو ایک گوشے میں لے جا کر میں نے کہا جناب والا

لہ "سردار" کی تحقیر و تصغیر۔

اب تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے ساتھ . . . . کردیں ۔ ماہر آثار دوست نے بڑی حیرت سے مجھ کو دیکھا ، اور کہا ۔فراق صاحب آپ اس قدر سنجیدہ آدمی ہو کر مجھ سے ایسی فحش بات کی فرمائش کر رہے ہیں ، میں نے ، بڑی سنجیدگی سے کہا جناب بھوک اس قدر لگی ہے کہ میں سوچنے لگا ہوں کہ آخر کار کچھ تو پیٹ میں جائے ۔

میں نے قہقہہ مار کر کہا ، ارے مرگئے ، اس "کچھ تو پیٹ میں جائے" کی بلاغت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ، اور تمام لوگ ، پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے ۔

لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور بھی سن لیجیے ۔ ہم لوگ احمد آباد بمبئی کے کسی مشاعرے کی شرکت کے واسطے گئے اور ایک بالا خانے کے بڑے وسیع و تابناک ہال میں فرش پر بیٹھے ، شغل کر رہے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان نے آکر کہا کہ میں حضرتِ فراق گورکھپوری سے ملنے آیا ہوں ۔ وصل نے کہا یہ ہیں فراق صاحب ۔ اس نوجوان نے لپک کر ، ان کے ہات چوم لئے ، اور دو زانو ہو کر ، بڑے ادب سے بیٹھ گیا ، فراق نے کہا آپ کا نام ؟ اس نے اپنا نام بتانے کے بعد ، دونوں ہات جوڑ کر کہا ، میں آپ کو کل کا ایک واقعہ سنانے آیا ہوں ، اجازت ہو تو عرض کردوں ، فراق نے کہا ، ضرور کہیے ۔ آپ تو بڑے نستعلیق نوجوان معلوم ہوتے ہیں ، اُس نوجوان نے کہا پرسوں میں بازار سے گزر رہا تھا ، دیکھا کہ برات کا ایک بہت بڑا جلوس ، چو راہے پر رُکا ہوا ، دم بخود کھڑا ہوا ہے ، میں نے پوچھا یہ ماجرا کیا ہے ، ایک صاحب نے بتایا کہ دولھا جس ہاتی پر سوار ہے وہ ہاتی زمین پکڑ کر ، کھڑا ہو گیا ہے ۔ لاکھ لاکھ آنکس مارے جا رہے ہیں ، مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا ہے ، اور چوں کہ دولھا کی سواری کا راستے میں رُک جانا فالِ بد خیال کیا جاتا ہے ۔ اس لئے دولھا کے باپ کے حواس اُڑے ہوئے ہیں ، ابھی وہ آدمی مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا دوڑا ہوا آیا اور اس نے دولھا کے باپ سے کہا میں ہاتی کو اگر ابھی ابھی چلا دوں تو کیا آپ مجھے پچاس روپئے دے دیں گے ؟ دولھا کے باپ نے کہا ارے پچاس نہیں سو روپئے دوں گا ، یہ سن کر اس لڑکے نے ، اُچک کر ہاتی کے کان میں ایک بات ایسی کہی کہ وہ ، بے ساختہ دُم دبا کر بھاگنے لگا ۔ فراق نے پوچھا

آس لڑکے نے کیا کہا تھا۔ اس نوجوان نے بڑی متانت سے کہا کہ اس لڑکے نے اس کے کان میں یہ کہا تھا کہ ابے سالے تیرے پیچھے فراقؔ آکر کھڑے ہو گئے ہیں، یہ سنتے ہی ہم سب کے فلک شگاف قہقہوں سے ہال کی محراب گونجنے لگی، اور وہ نوجوان فوراً بھاگ کھڑا ہوا، اور فراق کی آنکھوں کے دونوں ڈھیلے پہیوں کے مانند گھومنے لگے۔

آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ، میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے ابھی تک فراقؔ کی عظمت کو پہچانا نہیں ہے، سرکار ہند کو چاہیئے کہ وہ ان کو سرآنکھوں پر جگہ دے۔ اور ان کو، بہمہ وجوہ، مطمئن کرکے، اپنے دامن کو مزید پھولوں سے بھر لے۔ اور نمک حرامی کے داغ سے اپنی پیشانی کو بچالے۔

جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراقؔ کی عظیم شخصیت، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اُردو زبان کی آب رو، اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے، وہ، خدا کی قسم، کور مادرزاد ہے۔

زندہ باد فراقؔ ——— پائندہ باد فراقؔ

وحیدالدین سلیم

پانی پت کے باشندے، حالی کے ذی علم ہم وطن، حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر، سید احمد خاں کے سابق سکریٹری، اردو زبان کے مزاج دان "توام، "وضعِ اصطلاحات" کے مُصنّف، غیر معمولی دراک دذہن، بے حد بذلہ سنج، نیچریوں کے استاد مبلغِ الحاد، بڑے جان دار منشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ والدِ گرامی۔ لیکن جسم اس قدر بھدّا اور صورت ایسی ناقابلِ برداشت کہ الامان والحفیظ۔ ان کے چہرے کا رنگ اس قدر کٹھّا اور لبدھڑ تھا، گویا بہت پرانا، چکٹا ہوا کڑا وا تیل جما ہوا ہے، اور ان کے رخساروں پر، ایسی بے آبرو کر دینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اس کی جانب اُٹھتی تھی، تو ہزاروں گِد، دیکھنے والوں کے پپوٹوں پر آکر بیٹھ جاتے اور بیٹ کرنے لگتے تھے اور ان کے وزن سے، آنکھیں جھک جاتی تھیں مگر دماغ اس قدر اخّاذ و جان دار تھا کہ بڑھاپے میں بھی، جب کہ دماغ نئے نئے خیالات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ ہر بہتر جدید خیال کو، بآسانی قبول کر لیتے تھے۔ اور گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کی طرح ان کا دماغ ہمیشہ چلتا، اور کھٹ کھٹ کرتا رہتا تھا۔

ہر چند اس پرانے زمانے میں ان کی تنخواہ ایک ہزار تھی جو آج کے دس ہزار کے برابر ہے لیکن انھوں نے کبھی باورچی یا خدمت گار نہیں رکھا، وہ دوستوں سے تقاضے کر کر کے اپنی دعوتیں کرایا کرتے تھے، اور جس روز دعوت نہیں ہوتی تھی کسی گھٹیا سے ہوٹل میں جا کر دو آنے میں شکم سیر ہو کر آجایا کرتے تھے۔ اُن کو پان کا بے حد شوق تھا مگر دوستوں کے سامنے

جب پان دان کھولتے تھے، تو کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں ڈال کر چاٹنے لگتے تھے تاکہ گھن کھا کر، کوئی ان سے پان نہ طلب کرے۔

وہ گھر میں بڑے پائنچوں کا ڈھیلا ڈھالا پلئے جامہ پہنتے تھے، تاکہ اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مسک نہ سکے، اور آدھے دھڑ سے ننگے رہتے تھے۔ ایک روز، اُنھوں نے، پانی سے بھرا ایک بڑا سا مٹکا اُٹھایا، جس سے ان کی توند دب گئی، اور پلئے جامہ گھٹنوں پر آگیا۔ اُن کو بالکل ننگا دیکھ کر میں نے آنکھیں جھکا لیں اور انھوں نے، قہقہہ مار کر کہا، ارے جی بھر کے، مجھے ننگا دیکھ لو، ایسے مواقع روز روز نہیں آیا کرتے۔

ایک دن صبح چار بجے، ایک نعت کا میرے دماغ، پر نزول ہوا، اور اس قوت کے ساتھ کہ مسلسل تین روز تک وہ مجھ پر نازل ہوتی رہی۔ اور میں کمرے میں بند اور شراب سے مجتنب ہو کر، اسے، ٹائپ رائٹر کے مانند، لکھتا رہا۔ چوتھے روز جب وہ مکمل ہو گئی۔ میں سیدھا وحید الدین صاحب کے پاس پہنچا۔ اور، بڑے ولولے کے ساتھ، انھیں وہ نعت سنانے لگا اور وہ مجھے، پانبرنجیر ہنسی کے ساتھ داد دینے لگے، مجھ کو چاہیئے تھا کہ میں اُن کی دبی ہوئی ہنسی میں جھولتی ہوئی داد کو دیکھ کر، مزید اشعار سنانے سے انکار کر دیتا مگر اس وقت مجھ پر نعت خوانی کا اس قدر شدید جذبہ طاری تھا کہ میں اس کو محسوس نہیں کر سکا، اور شعر سناتا چلا گیا، لیکن جب ایک شعر پر، ان کے منھ سے، ایک فلک شگاف قہقہہ نکل گیا، اور پیک سے ان کا سفید سوئٹر لال ہو گیا تو میں اپنی کاپی کو بند کر کے حیرت سے اُن کا منھ تکنے لگا۔ اور میری سراسیمگی کا اندازہ لگا کر، جب دوبارہ قہقہہ مارتے مارتے ہوئے انھوں نے یہ کہا صاحب زادے کیسی الوہیت اور کیسی نبوت، کس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور، اپنا سا منھ لیئے میں وہاں سے اُٹھ گیا آج تک یاد ہے مجھ کو وہ پشیمانی۔

ذرا زمانے کی یہ ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ اُن بے چارے نے زبردستی کی دعوتوں اور گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں تمام عمر کھانا کھایا۔ زندگی بھر باورچی نہیں رکھا۔ ان کے مکان

کا چولھا کبھی گرم نہیں ہوا۔ اور، کوڑی کوڑی کر کے، جب تیس چالیس ہزار روپے جمع کر لیئے، تو اُن کو موت آ گئی۔ وہ تمام دولت ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ تمام روپیہ ان کا مولوی داماد، نمازیں پڑھ پڑھ کر ہاضم کر گیا، اور ڈکار تک نہ لی۔

دُکھ جھیلیں بی فاختہ، اور کوّے انڈے کھائیں۔ ملحد ڈھول بنائے۔ اور اسے ملّا بجائے۔ واہ ری دُنیا۔

سیّد جالب دہلوی

میں اپنے ذہن کو مبالغے سے پاک کرکے، بلاخوفِ ابطال ڈنکے کی چوٹ پر یہ دعوے کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص معلوماتِ عامّہ حاصل کرنے کی دھن میں کامل ساٹھ برس تک، اس روئے زمین کے تمام عظیم کتب خانوں کو چاٹ کھنگال چکنے کے بعد فقط ساٹھ منٹ کے واسطے ان کی ہم نشینی کی سعادت سے دو چار ہو جاتا تو اس کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایسا ایک اونٹ ہے جو پہاڑ کے نیچے آکر بلبلانا بھول چکا ہے۔

ایک روز وہ کسی حلوائی کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے کہ شوکت تھانوی پہنچ گئے۔ انھوں نے پوچھا سید صاحب کیا خرید رہے ہیں۔ انھوں نے کہا حلوہ سوہن۔ اور یہ کہہ کر وہ گننے لگے، حلوؤں کے اقسام۔ انھوں نے حلوؤں کے اتنے اقسام بتلائے کہ حلوائی دنگ ہو کر، ان کا منہ تکنے لگا اور لکھنؤ کے بے فکرے ان کے گرد جمع ہو گئے اور جب وہ اقسام گِنا چکے تو یہ بتایا کہ حلوا سوہن کی ایجاد اس مقصد سے ہوئی تھی کہ اس کے جوفوں میں خالص گھی بھر کر، امراء کی ضیافتِ طبع کی جائے۔ اس کے بعد انھوں نے حلوا سوہن کے موجد اور اس کے باپ دادا کے نام بتانا شروع کر دیئے اور جب حلوہ سوہن کی پوری تاریخ بتا چکے تو، بچپن سے لے کر آج تک کے تمام حلوہ سوہن بنانے والوں کے نام، اور ان کی دکانوں کا محلِ وقوع بتا دیا حلوائی دکان سے اتر پڑا، ان کے ہات چومے، اور کہا یہ حلوا سوہن حضور کی نذر ہے، میں دام نہیں لوں گا اور گرد و پیش کے لوگ اس طرح داد دینے لگے کہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے۔

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک بلّی گزری، اب کیا تھا انھوں نے بلّی نامہ شروع کر دیا، تمام دنیا کی بلیوں کے نام، اقسام اور ان کے مزاج و علاج بتلائے دنیا میں سب سے پہلے کس نے بلّی پالی تھی، اس کا نام بتایا، اور بیان کرتے کرتے بات حضرت ابوہریرہ تک ۔ بات آن پہنچی ۔

وہ لکھنؤ کے روزنامہ "ہمدم" کے مدیر تھے۔ افیون اور امرد پرستی کے خوگر تھے ایک روز شام کے وقت وہ افیون گھول رہے تھے، اور ان کی چارپائی کے چاروں پایوں پر چار امرد بیٹھے ہوئے تھے کہ حسرت موہانی آ گئے انھوں نے پوچھا سید صاحب یہ لونڈے کیسے بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ حسرت صاحب ان کو مقامی خبروں کے لئے نگار کھا ہے۔ "مقامی خبروں" کی بلاغت، الامان والحفیظ۔

روشن علی بھیم جی

وہ غالباً ۱۹۴۱ء کا دَور تھا۔ جب کہ ہم دونوں نے عروس البلاد بمبئی میں ایک دوسرے سے رشتۂ محبت واُخوت قائم کیا تھا۔ ہماری وہ دوستی آج تک شاداب، اور ہمارے خیالات کی وہ ہم آہنگی، جس نے ہم متحد کردیا تھا، آج کے دن تک قائم ہے، نہ وہ بدلے ہیں نہ میں۔

ہرچند کراچی آکر، وہ ایک سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار فرد بن چکے ہیں، لیکن اس حادثے کے باوجود، اُن کے خون میں وہ زہر سرایت نہیں کرسکا ہے جس کو منحوس دولت کی فراوانی پیدا کردیتی ہے اور جس کے اثر سے انسان کے منھ میں خنزیر کے نیش نکل آیا کرتے ہیں۔

ذرا غور تو فرمایئے کہ بھیم جی دو چار برس سے نہیں انیس برس سے کراچی کی زہریلی ہوا میں سانس لے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود، ان کی انسان دوستی، شرافت اور خوئے دلنوازی میں، ذرّہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے۔ اور ان کی یہ استواریٔ سیرت ایک ایسی چیز ہے جس کو معجزے سے کم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ میں اس صورت حال کو اس بناء پر معجزہ کہہ رہا ہوں کہ جناب والا یہ کراچی ___ سیاست و سرمایہ داری، ہوَس ناکانہ درندگی و بہیمانہ زربندگی، اور فریب کوشی و احباب فراموشی کی عفونت انگیز غلاظت میں ڈوبا ہوا ایک ایسا نامراد شہر ہے جس کی ہوا کھا کر، اور جس کا پانی پی کر ___ زیادہ سے زیادہ چار پانچ برس کے اندر اندر، اولیاء، لفنگے ___ ملائک، شیطان اور دیوتا راکشش بن جایا کرتے ہیں۔

غور فرمایئے اس ہونکتے ہوئے طوفانی دَور پر ___ جب میرے چند کلماتِ حق کو سُن کر، حکومت پاکستان کے ماتھے پر شکن پڑگئی تھی۔ اور اس وقت کے صدر" فیلڈ مارشل ایوب خاں بہادر" کی خسروانہ خرمستی، ان کے کفش بردار الطاف گوہر کی غلامانہ درازدستی اور الطاف گوہر کے پرستار شان الحق کی سفیہانہ باطل پرستی، مجھے اور میرے تمام خاندان کو، درماندگی کے بحرِ ذخار میں دھکیل کر بڑی بے حیائی کے ساتھ، مونچھوں پر تاؤ دے رہی تھی۔ اگر اس وقت بھیم جی، نوح کی کشتی بن کر مجھے اس طوفانی سمندر سے باہر نہ لے آتے تو میرا کیا حشر ہوتا۔

آغا حسن عابدی

یونائٹیڈ بنک کے صدر، میرے آسمان لکھنؤ کے بدر، اور میرے محسن ذی قدر ہیں۔ جس وقت حکومت کے عتاب نے مجھ کو سمندر میں گرادیا تھا، آغا صاحب بھی، بھیم جی کے دوش بدوش کشتی لے کر آگئے تھے انھوں نے بھی، بھیم جی کے ساتھ ساتھ، مجھ کو غرق ہونے سے بچایا تھا۔ آغا صاحب اپنے بینک کو فروغ دینے کے واسطے سے

ایک جا، رہتے نہیں عاشقِ ناکام کہیں   دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اندرون و بیرونِ ملک دَوروں پر دَورے کیا کرتے ہیں۔ دو روز کراچی میں رہتے ہیں اور انتیس دن باہر، اس لئے میں ان سے فقط تین بار مل سکا ہوں۔

ان کو جب میری آنکھوں نے دیکھا نہیں تھا اس وقت ان کے باب میں، میرے کانوں نے یہ سنا تھا کہ آغا صاحب ایک بے فیض وبے وفا انسان ہیں، اور اس قدر کہ انسان کے آڑے وقت کام آنے کو ایک لایعنی فعل سمجھتے ہیں، لیکن جب میں ان سے ملا اور میری نقاذ آنکھیں ان کی طرف اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے خال وخد، اور ان کی آنکھوں کے رنگ میں ایک ایسا انسان جھلک رہا ہے جو خیرِ مجسّم کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جب میرے کانوں نے ان کے دھیمے لہجے کو گرفت میں لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جھٹپٹے کے وقت میٹھے پانی کی نہر بہہ رہی ہے ـــ لگے ہاتوں ایک بات اور بھی کہہ دوں، بعض مسائل پر جب میں نے ان سے مبادلۂ خیال کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک ذی علم و صاحبِ فکر انسان بھی ہیں، اور اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ ہرچند وہ دنیوی اعتبار سے ایک نہایت کام یاب شخص ہیں لیکن قدرت نے ان کو اس اورنگِ علم سے محروم کرکے، جس کے وہ مستحق تھے، ان کو سونے کی سولی پر چڑھا کر، ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اور وہ اس صورتِ حال کی افسوس ناک مثال ہیں، جس کو عربی میں "ظلم" اور انگریزی میں مس پلیس منٹ (MISPLACEMENT) کہا جاتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس ماہ رُخسار، نادرہ گفتار، بلند کردار، اخلاص شعار، سعادت مدار اور پریم اوتار، نوجوان بچے کے — پیدائشی، سکونتی اور جاودانی — تین وطن ہیں۔ الہ آباد، پاکستان، اور میرا دِل (اللہ اکبر میرا دِل، فرش پر عرش کا حامل)

یہ ایک انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے۔ ہر چند قدیم روش کو ترک کر کے، یہ جدید ڈھرّے پر آگیا ہے، لیکن اس کے کلام میں ائمۂ ادب کی سی شان پائی جاتی ہے۔ اس کی شاعری، اس قدر بلند تخیّل اور اس درجہ نرالے طرز بیان کی حامل ہے کہ بسا اوقات سر دُھننے اور اس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے، اور کبھی کبھی تو یہ تمنّا پیدا جاتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ جب وہ لندن چلا گیا تھا، میں کہہ رہا تھا ؎

سروِ سیمینا، بصحرا می روی
سخت بے مہری کہ بے ما می روی

اس بچے کے حالات نامساعد ہو چکے ہیں، یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اقربأ و احباب منہ پھیر لیا کرتے ہیں، مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ جوشؔ اس کے واسطے جان تک دینے کو طیار ہے۔ مصطفیٰ زیدی اپنا دل نہ ٹوٹنے دو، تم ایک دولتِ بیدار ہو، تم کو اپنی قدر اور حفاظت کرنا ہے۔

مجاز

صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ مجاز مر گیا۔

یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجاز کیا تھا، اور کیا ہو سکتا تھا۔ مرتے وقت تک اُس کا فقط ایک رُبع دماغ کھُلنے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اُس ایک رُبع کھُلاوٹ کا کرشمہ ہے، اگر وہ بڑھاپے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا، سب سے بڑا شاعر ہوتا۔

مگر افسوس کہ پینا، اُس کو کھا گیا۔

مَیں نے اُس جوانانِ مرگ کو مخاطب کر کے، ایک "پند نامہ" کہا تھا۔ وہ میری نظم نظم سُن کر رو دیا تھا کہ آپ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے، مگر اُس پر عمل نہیں کر سکا۔ اور عمل کرتا بھی تو کیسے؟

بارہا کہہ چکا ہوں کہ یوں تو دنیا کے ہر کام میں اعتدال برتنا بے حد مشکل ہے لیکن شراب میں اعتدال کا قائم رکھنا تقریباً مُحال ہے۔

مجاز اعتدال برت نہ سکا اور جوانی ہی میں یہ کہتا گزر گیا۔

ہم مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گئے ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

ایک روز کسی اللہ کے بندے نے اُس کو سمجھایا تھا کہ دیکھو جوش صاحب کی طرح شراب کی ایک معیّنہ مقدار کو گھڑی سامنے رکھ کر ایک معین وقت میں پیا کرو، تو اُس نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں، میرا بس چلے تو میں گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں میں اُس کو بار بار سمجھایا کرتا کہ تو نے علم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے، یہاں تک کہ اخبار تک نہیں دیکھتا ہے، اپنے علم اور مطالعے کو بڑھا، لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ بمبئی کا ذکر ہے میں ایک سمندر کے سامنے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، مجاز و ساغر بھی میرے

ہم پیالہ تھے، آسمان پر شفق تھی، زمین پر سمندر، اور میز پر شیشہ و ساغر اور ہوا کم بخت ایسی ملائم چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا ناچنے لگو۔ جب ہمارا کیف خوب گٹھ گیا، تو مجاز نے، اُٹھ کر ساغر کے گلے میں باہیں ڈال دیں، ساغر بھی اُس سے چمٹ گئے۔ مجاز نے کہا میرا "سغروا[1] اَرے میرا سغروا"۔ ساغر بھی اُس کا ماتھا چوم کر "ارے میرا مجزوا، میرا مجزوا" کہنے لگے، ابھی یہ اختلاط ہو ہی رہا تھا کہ مجاز نے، ساغر کا جھٹ سے بوسہ لے لیا اور مٹک مٹک کر کہنے لگا۔

"مگر ایک بات ہے، مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے" ساغر نے کہا کیا بات ہے، مجاز نے کہا اگر یہ بات ہے کہ پیارے تو شاعر بالکل نہیں ہے، ہنستے ہوئے ساغر نے رونا شروع کر دیا مجاز پھر ان کے گلے لگ گئے، پیارے میں تجھ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ تیرا کوئی جواب نہیں۔ ساغر نے رونا بند کر دیا۔

مجاز نے کہا تجھ سے اس قدر محبت کے بعد بھی خدا کی قسم میں تجھ کو شاعر تسلیم کر ہی نہیں سکتا، مگر ایک بات ہے، مگر ایک بات ہے اور ساغر پھر رونے لگے۔

جب میں نے دیکھا کہ بار بار مجاز، ساغر کو گلے لگا لگا کر "مگر ایک بات ہے" سے رُلا رہا ہے تو میں نے کہا، مجاز ختم کر اس تکرار کو۔ بیٹھ جا خاموش سوفے پر۔ اور مجاز جب بیٹھ گیا تو ساغر نے بسور کر مجھ سے کہا یہ مجاز بھی عجیب آدمی ہے، مجھ سے محبت بھی کرتا ہے اور میرا دل بھی توڑتا ہے۔ یہ سُنتے ہی مجاز پھر کھڑا ہو کر، ساغر کی بلائیں لے لے کر کہنے لگا۔ پیارے مجھ کو معاف کر، میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں، خدا کے لیے ہنسنے لگو، نہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جائیگا، ساغر ہنسنے اور تھرکنے لگے، اور عین اسی عالم میں مجاز نے کہا "مگر ایک بات ہے"۔ ساغر نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ہائے رے اُن راتوں کو کہاں سے ڈھونڈھ کر لاؤں۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور آتے ہی تخت پر گر کر ہنسنے اور لوٹنے لگا۔ میں نے پوچھا تو اُس نے بتایا ابھی ایک نیا تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں خان صاحب کے وہاں بیٹھا تھا کہ ان کے نوکر نے آکر کہا باورچی نے یہ کہلا بھیجا ہے کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیجیے، ورنہ ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔

---

[1] ساغر کی پیار بھری تصغیر۔

خاں صاحب نے بگڑ کر کہا، بُلالاؤ باورچی کے بچے کو۔

باورچی آیا تو اُنھوں نے ڈپٹ کر پوچھا کیا کہلوا بھیجا تھا تو نے مجھ سے؟ اُس نے کہا میں نے کہلوا بھیجا تھا کہ ہماری تنخواہ بڑھادیں ورنہ۔

خاں صاحب نے اُس کی زبان سے "ورنہ" سنتے ہی، ڈنڈا تان لیا، اور کہا ہاں کہو "ورنہ" کے بعد کیا کروگے ؟ اور باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا "ورنہ اسی تنخواہ میں نوکری کرتے رہیں گے۔

میں نے ایک دن پوچھا، مجاز تمہارے والدین تو بے حد پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں، پھر تمہاری بادہ خواری کو وہ کیوں کر برداشت کرتے ہیں۔ اس پر اُس نے بے ساختہ کہا جوشؔ صاحب بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ اُن کی اولاد نہایت سعادت مند ہوتی ہے اور میں ایک ایسا خوش قسمت بیٹا ہوں جس کے والدین بے حد سعادت مند واقع ہوئے ہیں۔ میں اُس کے اس جواب سے پھڑک گیا۔

ایک بار دلی میں وہ مجھ سے بے حد ناخوش ہو گیا تھا۔ وہ تازہ تازہ دماغی اسپتال سے بظاہر تن دُرُست ہو کر آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر چند اس کو افاقہ ہو چکا ہے لیکن مرض کا ازالہ نہیں ہوا ہے۔

ایک روز اُس نے دہلی کے چیف کمشنر کو فون کیا کہ مجھے سو روپے بھیج دیجیے، میں نے اس بات پر بہت پھٹکارا اور کہا تو نے اپنی اور پوری شاعروں کی قوم کی عزت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ اُس نے میرے مُنھ پر تو کچھ نہیں کہا، لیکن یہ شعر لکھ کر میرے پاس بھیج دیا ؎

جو گزرتی ہے قلبِ شاعر پر　　　شاعرِ انقلاب کیا جانیں

حیف دُنیا کے کارخانے پر۔ یہاں جو راتیں پل بھر ہنساتی ہیں، وہ مرتے دم تک رلاتی ہیں۔

تارِ جاں، رشتۂ سوزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا　　　موت کی لرزشِ مژگاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
مُہلتِ مختصرِ صحبتِ یارانِ شباب　　　مُستقل ماتمِ یاراں ہے، یہ معلوم نہ تھا

گنبدِ تشنۂ بالیدۂ محرابِ سرِ در　　سایۂ ابرِ گریزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
برگِ سبزہ، ورقِ نسترن و تختۂ گُل　　چادرِ قبرِ بہاراں ہے، یہ معلوم نہ تھا
آبِ خُم خانۂ ہستی و شرابِ ہستی　　شبنمِ گورِ غریباں ہے، یہ معلوم نہ تھا

میرے دور کی

چند عجیب ہستیاں

میر سخاوت حسین

وہ ، اودھ کے کسی قصبے کے سادات میں سے ایک نہایت دُبلے پتلے ، پڑھے لکھے ، ادب دوست ، موسیقی پرست اور نہایت مہذب انسان ، اور میرے یہاں منشی کی حیثیت سے ملازم تھے ۔ لیکن کھانسی ان کی چڑھ تھی ۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی کھانسے ، اور وہ ، چھوٹتے ہی ، اس کو گالی نہ دیں ۔

اگر مجھ کو ان کی اس نرالی عادت کا علم ہوتا تو انھیں ملازم نہ رکھتا ، یا کم سے کم اپنی صحبت میں نہ بیٹھنے دیتا ــــ ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے پاس لکھنؤ کے چند اکابرِ علم و ادب بیٹھے ہوئے تھے کہ ان میں کسی کو کھانسی آگئی ، اور میر صاحب جامے سے باہر ہو کر ، ان کو گالیاں دینے لگے ، میں نے اپنے خدمت گار جگنو سے کہا گدّی میں ہات دے کر ، انھیں محفل سے نکال دو ــــ وہ روتے ہوئے چلے گئے ۔

جب محفل ، بھیانک ہو کر برخواست ہوگئی ، اور میں نے ہزاروں معافیوں کے ساتھ سب کو رخصت کر دیا تو میر صاحب کو بلا کر ، میں نے بے حد ڈانٹا ڈپٹا ــــ میر صاحب بے چارے کانپنے لگے اور کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے لیکن اس کے دوسرے ہی روز ، جب میں زینے سے اُتر کر ملاقات کے کمرے کی طرف جا رہا تھا ، میں نے ملاقات کے کمرے سے اپنے ایک دوست محمود علی خاں کے کھانسنے اور اسی کے ساتھ ساتھ ، میر صاحب کی " دھت تیرے کی ، تیری ماں کی .... " آواز سُنی ۔ غصے میں بھرا میں ان کے کمرے میں گیا ، اور ڈانٹ کر کہا " کیوں میر صاحب ــــ پھر وہی

گالم گلوج :۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑے، چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، ان کا یہ عالم دیکھ کر میرا دل پسیج گیا، بڑی نرمی سے میں نے کہا آپ تو قسم کھا چکے تھے، انھوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا، خاں صاحب میری ایک بات سُن لیجئے۔ میں نے کہا آپ کو لکھنؤ کی تہذیب نے کاڑھا ہے، کیا آپ گالی کا کوئی جواز پیش کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے کہا حضور یہ سچ ہے کہ لکھنؤ نے مجھ کو خراد پر چڑھایا ہے، لیکن آپ اس امر پر کیوں غور نہیں فرماتے کہ مجھ کو موسیقی سے بھی بڑی شیفتگی ہے۔ میں نے کہا موسیقی اور گالی میں کیا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انھوں نے بات جوڑ کر کہا، حضور ہے اور سو فی صد ہے، یعنی یہ ایک امر لازمی ہے کہ جب بھی کوئی کھانسے تو سُر اور تال میں کھانسے، آواز کو راگ میں ڈھال کر کھانسے، لیکن یہ سالے تو بالکل بے سُرے کھانستے ہیں، کھوکھو، کھوکھو، آخ تھو۔ اور مجھ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

ناظم الدین حسن

مضافاتِ لکھنؤ کے رہنے والے، اور لکھنؤ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ لاٹوش روڈ پر ان کی پیلی کوٹھی، موکلوں سے گھری رہتی تھی۔ وہ بھوپال میں صدرالمہام اور حیدرآباد دکن میں چیف جسٹس بھی ہو گئے تھے۔ ان کی ہر سانس خود ساختہ اصول میں جکڑی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اصول پرستی کے فیل پا میں مبتلا تھے۔ ان کے مکان کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں ایک بڑے سے رجسٹر میں ٹکی ہوئی تھیں، اور ہر چیز طاق، مچان یا میز پہ ایک خاص زاویئے کے ساتھ رکھی، اور جب اٹھائی جاتی تو بالکل اسی زاویے پر دوبارہ رکھ دی جاتی تھی۔

ایک بار انھوں نے ملازم کو دیا سلائی اٹھالانے کا حکم دیا، دیا سلائی سے کام لے کر، انھوں نے ڈبیا ملازم کے حوالے کردی، اس نے میز کے بیچوں بیچ رکھ دی، انھوں نے اس پر دو روپئے جرمانہ کر دیئے کہ دیا سلائی پہلے میز کے مشرقی گوشے میں رکھی ہوئی تھی، اس نے وسط میں کیوں رکھ دی۔ ایک بار لکھنؤ کے چند نوجوانوں نے اپنے "مسلم کلب" کے افتتاح کی ان سے درخواست کی، وہ پہنچے، اور بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی انھوں نے افتتاح کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لفظ "کلب" سے ذہن منتقل ہوتا ہے "کَلْبُ" کی جانب اور عربی میں "کلب" کے معنی ہیں "کتا"۔ جب آپ لوگ اس بورڈ پر "مسلم کیلب" درج کرائیں گے تو میں بخوشی افتتاح کروں گا۔

ایک مرتبہ وہ امین آباد پارک میں اپنی گاڑی سے اُترے، اُترتے ہی فوراً چھتری

نکالی، اور پھل خریدنے لگے، اتنے میں ان کے ایک بے تکلّف دوست اُدھر آ نکلے ــــ اُنھوں نے کہا، سبحان اللہ یہ گرمیوں کی رُت اور پھر رات کا وقت، اور اس پر آپ کی یہ چھتری، جواب نہیں آپ کا، انھوں نے کہا، اگر عقل موٹی ہو تو آپ کی سی، میرے کپڑے نمازی ہیں، اگر کسی بدتمیز چیل نے بیٹ کر دی تو کیا ہوگا۔

ان کا معمول تھا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک لکھتے پڑھتے تھے، ان کا ملازم خاص، ٹھیک گیارہ بجے اُن کے کمرے میں داخل ہو جاتا، اور اگر ان کو لکھنے پڑھنے میں مشغول پاتا تھا تو ان کے حسبِ حکم وہ اُن کو زبردستی کرسی سے اٹھاتا، انھیں گھسیٹ کر چارپائی پر گراتا۔ اور صُبح کو اس اصول پرستی کا انعام پاتا تھا۔

جب انھوں نے اپنے بیٹے ناظر الدین حسن کو تعلیم کے واسطے، لندن بھیجا، تو ایک مولوی صاحب کو بھی ساتھ کر دیا تھا کہ وہ ان کی نگرانی کریں، اور ہر ہفتے ان کے تمام اعمال کا کچّا چٹھا لکھتے رہیں۔

کوئی چار پانچ مہینے کے بعد انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ ناظر کے تمام حالات تو لکھتے ہیں، مگر یہ کبھی نہیں لکھتے کہ اس اثناء میں اس کو کتنے بار بدخوابی ہوئی ہے ــ آئندہ سے پوچھ کر بدخوابی کا حال ضرور لکھیئے، اس لیے کہ اگر بدخوابی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مجھے پتا چل جائے گا کہ ناظر نے بدچلنی شروع کر دی ہے۔

اسی طرح وہ اپنی بہو بیٹیوں کی "خاموشیوں" (ایّام کی گدیّوں) کو بھی اپنی تحویل میں رکھتے تھے، تاکہ انھیں ان کی صحت کے اعتدال کا پتا چلتا رہے۔

اپنے دکن کے قیام میں وہ ہر صبح کو باغِ عامّہ ٹہلنے جایا کرتے اور ایک وقتِ معیّن پر گھر واپس آجاتے تھے۔ ایک روز وہ حسبِ معمول، ٹہل رہے تھے کہ نظامِ دکن کی سواری آگئی، تمام باغ رعبِ شاہی سے کانپنے لگا۔ انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور ٹہلتے رہے نظام نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا، یہ کون اُول جلول آدمی ہے، انھوں نے کہا، سرکار یہ چیف جسٹس ناظم الدین حسن ہیں، جب سے یہ آئے ہیں ہائی کورٹ میں ناانصافی اور رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا ہے، نظام نے کہا انھیں بُلاؤ۔ وہ جب نظام کے

سامنے گئے تو اُنھوں نے شاہی آداب کے مطابق جھک کر سلام نہیں کیا، اور السلام علیکم کہہ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ مصاحب تھرا گئے کہ دیکھیں اس گستاخی کا نتیجہ کیا ہوگا، نظام اچھے موڈ میں تھے، مسکرا کر پوچھا آپ یہاں روز ٹہلنے آتے ہیں اُنھوں نے کہا جی ہاں۔ اس کے بعد نظام نے ایک اور سوال کیا، تو اُنھوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا، اب ٹہلنے کا وقت ختم ہوگیا ہے، اچھا السلام علیکم، اور جواب دیئے بغیر، فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک بار جب وہ بھوپال میں تھے، بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی کہ فلاں "کاغذات" لے کر فوراً آجائیے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ جب گاڑی پہاڑی کا آدھا راستہ طے کر چکی، اُنھوں نے، کوچ بان سے، گھبرا کر کہا، گاڑی روک دو، گاڑی رُکتے ہی وہ اُتر پڑے اور اپنے مکان کی طرف پیدل چلنے لگے، کوچ بان نے کہا حضور گاڑی میں بیٹھ جائیے، اُنھوں نے کہا نہیں، میں پیدل جاؤں گا، تم یہیں کھڑے رہو، اور جب کوچ بان نے بہت اصرار کیا تو اُنھوں نے کہا میں "کاغذات" گھر میں بھول آیا ہوں بھول جانا میری خطا ہے، خطا کروں میں، اور سزا بھگتیں گھوڑے، یہ کون سا انصاف ہے۔

ایک بار اُنھوں نے چند اکابر لکھنؤ کو کھانے پر مدعو کیا۔ لوگ دیر میں پہنچے، وہ تمام مہمانوں کو احاطے کے ایک گوشے میں لے گئے، اور، کھُدی ہوئی زمین کی طرف اشارہ کرکے کہا آپ حضرات دیر کرکے آئیں ہیں دیکھئے آپ کا کھانا یہاں دفن کر دیا گیا ہے۔ السلام علیکم۔

اُن کے ایک قرابت دار، ہر جمعے کو، ٹھیک چار بجے ان کے پاس آیا کرتے تھے، اور یہ معمول تھا کہ دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی اُن کی خدمت میں ہمیشہ پیش کی جاتی تھی

ایک بار وہ اُن کی غیبت میں پہنچے، ملازم نے دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی پیش کر دی، چائے پی کر وہ ایک رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگے، اور ایک صفحے پر انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے نام کے نیچے "ہر جمعے کو دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی بمد خیرات لکھی ہوئی ہے تو اُنھوں نے ان کے وہاں آنا جانا ترک کر دیا، اور اُنھوں نے اس صفحے پر لکھ دیا "خیرات بند"

ایک بار وہ انٹرویو لینے بیٹھے، اور ساٹھ درخواست گزاروں میں ایک بھی منتخب

نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ سو سے لے ایک تک کوئی اُلٹی گنتی نہیں گن سکا۔

جب وہ بھوپال میں صدرالمہام تھے، اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ تمام اکابر شہر تعزیت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ اور جب چپراسی ایک تھال میں صدہا کارڈ لے کر، ان کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے پوچھا یہ اس قدر آدمی آج کیوں آئے ہیں، چپراسی نے کہا سرکار کی والدہ کی تعزیت کے لئے آئے ہوئے ہیں، اُنھوں نے چپراسی سے، باآواز بلند کہا۔ ان لوگوں سے پوچھو ہماری والدہ سے ان کا کیا تعلق تھا کہ وہ تعزیت کے لئے آئے ہیں۔ برآمدے تک ان کی یہ آواز پہنچی تو تمام آنے والے اُفتاں و خیزاں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر

وہ اپنے مکان کے چبوترے پر، ڈھیّ لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر اُدھر سے گزرے اور وہ اس کو اپنا کلام سُنائیں۔ اور جب کوئی شاعر ان کے ہتّے چڑھ جاتا تھا وہ اس کو اپنے کمرے میں لے آتے، بڑی مدارت کرتے، اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے۔

یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی، ہزاروں شاعروں کو ہوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا، مگر اُن میں یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا سدھا ہوا ملازم تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگا دیا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے۔ جب باہر سے دروازے بند ہو جاتے تھے، تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے، اور غزلیں سنانا شروع کر دیا کرتے تھے اور سُننے والا جب اُن کو داد دیتا تھا تو، ہر دادِ پر بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے۔ کھڑے ہو جائیے، اور جب وہ حیرت زدہ ہو کر، کھڑا ہو جاتا تھا تو اُس کو اس طرح بھینچ کر گلے لگاتے تھے کہ اُن کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھیئے کہ گم نام پٹھان شاعر صاحب، اپنا کلام سُنا رہے ہیں اور سننے والا واہ واہ سبحان اللہ کہ رہا ہے اور اس بیچارے داد دینے والے کو بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے، "کھڑے ہو جائیے، کھڑے ہو جائیے" اور جب وہ تھکا ماندہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑے زور سے گلے لگایا جا رہا ہے۔ العظمتہ للہ کوئی حد بھی اس عذاب مُسلسل کی۔

اور ایک صاحب نے تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ جب بار بار کھڑے ہونے اور ہر بار گلے ملنے سے تھک کر، اُنھوں نے یہ کہا تھا کہ اب مجھ میں بار بار کھڑے ہونے کا دم باقی نہیں رہا ہے تو اُن پٹھان شاعر صاحب نے اپنے تنبیہہ الغافلین ڈنڈے کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا، اُٹھیئے، نہیں تو اس سے آپ کا سر توڑ دوں گا۔

نبی شیر خاں

ملیح آباد کے محلّہ "صدر پور" کے زمین دار تھے، کڑوے تنے کہ خدا کی پناہ، تمام عمر مقدمہ بازیوں اور فوجداریوں میں گزار دی۔ اُن کی داڑھی چڑھی اور مونچھیں کھڑی رہتی تھیں۔ اور ان کے نام کا جزوِ لاینفک "شیر" تھا، اس لئے وہ ہر آن حملے پر آمادہ رہتے تھے۔ اور میرے باپ کے جاں نثاروں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ وہ، ایک روز، میرے باپ کے انتقال کے بعد آئے اور کہا کہ اللہ بخشے خاں صاحب نے، میری مصیبت کے وقت مجھ کو دس ہزار روپے دیئے تھے پرونوٹ لکھائے بغیر۔ اب میں وہ روپے واپس کرنے آپ کے پاس آیا ہوں یہ کہہ کر انھوں نے دس ہزار کے نوٹ میری میز پر رکھ دیئے۔

میں نے کہا نبی شیر خاں، میرے خیال میں میرے باپ نے یہ روپیہ ایک دوستانہ پیش کش کی صورت سے آپ کو دیا تھا۔ اگر یہ قرض کا معاملہ ہوتا تو وہ آپ سے پرونوٹ ضرور لکھا لیتے۔ اس لئے میں یہ رقم قبول نہیں کر سکتا۔

میرے انکار سے وہ آزردہ ہو گئے، اور چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے ان کے سر کے ایک بڑے بار کو اُترنے نہیں دیا۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اُٹھ کر چلے گئے۔

ایک بار، برکھا رُت تھی، اور وہ اپنے آموں کے باغ میں بیٹھے موسم کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ بھنگوں نے اُن کی ایک آنکھ پر حملہ شروع کر دیا۔ اُنھوں نے ہات ہلا ہلا کر، بار بار بھنگوں کو بھگایا لیکن ٹھہر ٹھہر کر وہ ہر بار[1] حملے کرتے رہے اور جب وہ تنگ آ گئے

[1] آم کی فصل میں بھنگے آدمی کی آنکھ میں گھس جانے کی سعی کیا کرتے ہیں۔

تو اُنھوں نے، جھلا کر، اپنی آنکھ پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ ڈھیلا نکل آیا، اور اُنھوں نے، ایک موٹی سی گالی دے کر، جھینگوں سے کہا لو سالو اب کس چیز پر حملہ کرو گے۔ آنکھ گئی، پیر گئی۔

محمد شیر خاں

”کنول بار۔۔ محلۂ ملیح آباد کے پٹھان، میرے باپ کی ڈیوڑھی کے سپاہی، زبردست ڈاڑھی۔ کام میں بڑے مریل، اعضا کے اعتبار سے، قوی ہیکل، عقل نقطۂ نظر سے گھٹل، اور، اعترافِ تصور کے معاملے میں رشکِ جبل آدمی تھے، وہ آئے دن، غلطیاں کرتے، لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کو سُور کا گوشت سمجھتے تھے۔ اور اس وضع میں اُن کو اس قدر رسُوخ حاصل تھا کہ اگر پیسے پر رکھ کر، اُن کی ایک ایک بوٹی کاٹی جاتی، پھر بھی وہ اعتراف تصور کا ننگ برداشت نہیں کرتے۔

میرے باپ کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ آموں کی فصل میں، اپنے تمام احباب کو آموں کے ٹوکرے بھیجا کرتے اور خریف و ربیع کے زمانے میں اپنے لکھنؤ کے احباب کے پاس غلّہ رُسا دل، ترکاریاں اور گھی روانہ کیا کرتے تھے۔ ایک بار یہ خدمت محمد شیر خاں کے سپرد ہوئی کہ وہ لکھنؤ جا کر حضرتِ جلالؔ کی خدمت میں گھی کا پیپا دے آئیں۔ صبح کو وہ لکھنؤ گئے، اور دوپہر کو مُنھ پھلائے اور گھی کا پیپا اُٹھائے ملیح آباد آ گئے، آتے ہی میرے باپ کو، جھک کر سلام کیا، اور کہنے لگے، میں حضور کے حقِ نمک سے ادا ہو گیا، اگر حضور کے حق نمک کا پاس نہ ہوتا تو جلال خاں کو اُٹھا کر دے مارتا، میرے باپ نے ڈپٹ کر، فرمایا محمد شیر زبان بند کرو، اور یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟ اُنھوں نے کہا جلال خاں نے گھی کا پیپا واپس کر دیا مجھ کو ڈانٹا، پھٹکارا، گنوار کہا، بس حضور کے خیال سے میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ نہیں تو۔۔۔“ میرے باپ نے بات کاٹ کر، کہا، حضرتِ جلال بہت شائستہ

آدمی ہیں، تم نے ضرور کوئی ایسی بات کی ہوگی کہ اُن کو غصہ آگیا۔ بتاؤ تم نے کیا کیا تھا؟
اُنھوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، میں نے تو کوئی بات ، وہ بے کار بے کار
خوخیانے لگے۔ میرے باپ نے کہا۔ محمد شیر، تم اور اپنی خطا مانو، یہ ہو ہی نہیں سکتا
دوسرے دن میرے باپ، محمد شیر خاں کو ساتھ لے کر جلال کے وہاں پہنچے، میں بھی ساتھ تھا
حضرتِ جلال، محمد شیر خاں کو دیکھتے ہی، جامے سے باہر ہو گئے، اور کہنے لگے خاں صاحب اس
جانگلوش کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے، میرے باپ نے اُن کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا، اور
جب وہ مارے غصے کے، داڑھی کو اپنے منھ میں چباتے ہوئے باہر چلے گئے۔ تو جلال نے
میرے باپ سے کہا، خاں صاحب میں کل زنانے میں بیٹھا تھا، آپ کے اس سپاہی نے، اپنے
لٹھ کے گولے سے میرا دروازہ اس قدر زور سے کھٹ کھٹایا کہ میری بیگم اُچھل پڑیں، اور
کہنے لگیں ہے ہے اب لکھنؤ میں یہ بھی ہونے لگا ہے، یہ تو قیامت کے آثار معلوم ہوتے ہیں
ابھی میری بیگم نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا، یعنی باہر سے آواز آئی۔ جلال خاں[1]
ہوت "، میری بیوی نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں، "نادِ علی پڑھنے لگیں، میں غصے کے مارے
کانپنے لگا، دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک جنا در داڑھا پھٹکارے اور ایک پیپا کاندھے پر
اُٹھائے مُنھ کھولے کھڑا ہے، میں نے کہا تم آدمی ہو یا جناور؟ اس نے آپ کا نام لے کر کہا
آپ نے گھی بھیجا ہے، میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے، میں نے کہا چلے جاؤ میرے سامنے
سے۔ خاں صاحب اس شخص نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اہل محلّہ کو مُنھ دکھا سکوں

---

[1] گنوارو زبان ہے۔ یعنی اے جلال خاں ہو کہ نہیں، یا اے جلال خاں، اگر ہو تو بولو۔

کنجو خاں

وہ بھی کنول ہار کے رہنے والے، اور ہماری ڈیوڑھی پر، سپاہیوں کے زمرے میں شامل تھے وہ اس قدر سُرخ و سفید اور گورے چِٹے تھے، آنکھیں اس قدر کنجی تھیں اور داڑھی اس غضب کی بھوری تھی کہ ہو بہو انگریز پادری معلوم ہوتے تھے، اور، اُس کے ساتھ ساتھ، ان کی داڑھی اس بَلا کی جھاڑ جھنکاڑ، ہاتی پچھاڑ اور سرو کے درختوں کی طرح سیدھے بالوں کی تھی، اور ان کی مونچھوں کے پوے، اس قدر گھنے اور ریش پیوستہ تھے کہ ان کا منھ غور سے دیکھنے کے بعد بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ایک روز وہ کسی گاؤں کی طرف سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ گاؤں کے حاشیئے کے کنوئیں پر گاؤں کی چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں، اُنھوں نے اُن لڑکیوں سے پانی مانگا، اُن میں سے ایک شوخ لڑکی نے ٹھٹول کی راہ سے پوچھا، "کھاں صاحب[1] تمرے مُنھ کہاں ہے کہ پانی مانگت ہو"؟ یہ سنتے ہی اُنھوں نے دونوں ہاتوں سے اپنی داڑھی اور مونچھوں کو جدا کرکے کہا، اور یہ مُنھ نہیں تو کیا تمھارے لہنگے کے اندر کی چیز ہے..."؟ اور یہ فحش جواب سُن کر، ساری لڑکیاں، بھاگ کھڑی ہوئیں۔

ایک مرتبہ اُنھوں نے اپنے کھیت کے قریب، ایک موٹے تازے ہرن کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں پھنسا کھڑا، اُبھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نکل نہیں سکتا اُنھوں نے خوشی سے اُچھل کر کہا سالے روز ہمارا کھیت چر جایا کرتے تھے، آج پھنسے ہو،

---

[1] خاں صاحب تمھارا منھ کہاں ہے کہ پانی مانگ رہے ہو۔

اب تمھارے کباب کھائے جائیں گے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنی لُنگی کے ایک گوشے کو اس کی گردن میں ڈال کر، خوب مضبوط گرہ لگادی اور پورا زور لگا کر، اس کو دلدل سے نکال لیا۔ دلدل سے نکلتے ہی، ہرن نے، زور سے ایک جھٹکا دیا۔ ان کی لنگی کھل گئی، وہ لُنگی، سمیت، بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ ننگے ہو گئے، اور آس پاس کے کھیتوں کے لونڈوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اُنھوں نے دوڑ کر ایک لونڈے کو پکڑ لیا۔ اُس کی لُنگی چھین کر باندھ لی، وہ ننگا ہو کر رونے لگا۔ اُنھوں نے کہا اب اور تالیاں بجا، ننگے کنجو خاں پر۔

اُسی وقت وہ سیدھے خلیل خاں کے پاس گئے، خلیل خاں بڑے دھاوت شکاری تھے۔ ان کی گولی سے جب ایک دن اُنھوں نے اُس ہرن کو ہلاک کروادیا، تو اُسے گاڑی میں لدوا کر قصبے میں لے آئے، اور اس کی دونوں ٹانگیں چیر چیر کر، لوگوں سے کہا اس حرام زادے نے کنجو خاں کو ننگا کر دیا تھا، اب دیکھ لو بھائیو اس سالے کو بالکل ننگا۔

ایک دن وہ اپنی آموں کی بَغیا بچا رہے تھے کہ بڑے زور کی کالی آندھی اُٹھی، وہ بلبلا کر، اپنی جھونپڑی سے نکل آئے، اپنی پگڑی آسمان کی طرف بلند کر کے، گڑگڑا گڑگڑا کر، دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ، میں بے حد غریب آدمی ہوں، میری بغیا کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے، نہیں تو سال بھر فاقے ہوں گے، اور بیٹی کی شادی بھی نہیں کر سکوں گا، اے اللہ میرے منھ میں روزہ ہے، کہتے ہیں تو روزہ داروں کی دعا سُن لیتا ہے، میرے باغ کو بچالے۔ اللہ نے ان کی دعا نہیں سنی، اور آندھی نے ان کی تمام کیریاں زمین پر بچھادیں اور کئی درخت بھی توڑ ڈالے۔

اب کنجو خاں کو، اللہ میاں پر غصّہ آگیا۔ اُنھوں نے اپنی جھونپڑی کو آگ لگادی کَھٹیا کو، ڈنڈے میں پھنسا کر، پیٹھ پر لاد لیا۔ مٹکے سے آب خورہ بھر کر، ہات میں لے لیا، آسمان کی طرف، بگڑ کر آنکھیں اُٹھائیں، اور کہا، جناب، ہم نے دانت نکال نکال کر، آپ سے دُعا کی کہ ہماری بَغیا کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے۔ آپ نے ہماری دعا قبول نہیں کی، یہ کہہ کر، آب خورہ منھ سے لگا لیا، پورا آب خورہ پی گئے، اور کہا یہ لیجیے ہم نے روزہ توڑ ڈالا۔ اب آپ بڑے پٹھان ہیں تو کل سے روزہ رکھا لیجیے گا۔ (اور پھر مرتے مر گئے، لیکن کنجو خاں نے کبھی روزہ نہیں کھا)

امیر احمد خاں

اَچھے خاصے، بافراغت، زمیں دار میرے دادا کے مختلف البطن بھائی کے بیٹے تھے نہایت پاک نفس، بڑے فیّاض، افیون کے زبردست رسیا اور بے حد گھمنڈ سے تھے بندھی ٹکی معروف گالیوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، وہ نئی نئی گالیاں ایجاد کیا کرتے تھے۔ اگر میرے قارئین کی اکثریت شرمیلی نہ ہوتی تو میں ان کی تمام نرالی گالیاں درج کرکے، یہ دکھا دیتا کہ اُن میں خلّاقی کا جوہر کس قدر تھا۔

اُن کے ایک خاص مُصاحب تھے محمد اکبر خاں، ایک دن اُنھوں نے لہر میں آکر، انھیں بالکل نئی تراش کی گالیاں دیں، اکبر خاں روٹھ گئے، آنا جانا ترک کر دیا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد وہ اُنھیں منانے اُن کے گھر پہنچے۔ اکبر خاں نے کہا خاں صاحب آپ بہت گالیاں دیتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا تم سالے ہو ہی اس قابل کہ تمھیں روز گالیاں دی جائیں، اکبر خاں نے کہا۔ میاں، اگر ہم اتنے ہی بُرے ہیں تو آپ ہم کو منانے کیوں آئے ہیں، اُنھوں نے کہا کیا کریں یہ کم بخت چودھویں صدی ایسی ہے کہ اکبر خاں، اب تُم سے حرامی بھی کہیں ڈھونڈے نہیں ملتے ہیں، اس پر اکبر خاں ہنس پڑے اور من گئے۔

ان کے انتقال کا واقعہ بھی سُن لیجئے ایسی وضع داری کے ساتھ مرنا، کس کے بس کی بات ہے اُن پر جب کربِ نزع طاری ہُوا، اُنھوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ خدا کے لئے مجھ کو جلدی اٹھا کر بٹھا دو، بیوی نے کہا ارے غضب خدا کا، یہ وقت بیٹھنے کا ہے، اُنھوں نے کہا ارے بیوی جلدی کرو، میری اطاعت تم پر فرض ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ اس حرام زادی

موت کو ایک گالی دے کر تو مروں، بیوی نے، رو کر کہا، ارے کلمہ پڑھو، اُنھوں نے ہات جوڑے کر مجھے بٹھا دو اور جب بیوی نے بٹھا دیا۔ تو اُنھوں نے مٹھی بند کرکے بایاں ہات ہلایا اور کہا "دے حرامن موت یہ موٹا سا ڈاپونا" اور سدھار گئے۔

ہدایت اللہ خاں[1]

میں نے جب اُنھیں دیکھا ان کی عُمر ستّر سے مُتجاوز ہو چکی تھی، تھے تو کم زور، مگر ذرا ذرا سی بات میں لٹھ پونگے پر آمادہ ہو جاتے اور قوی سے قوی نوجوانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ میرے چچا کے وہاں ملازم تھے، اور گھنٹہ بجانے کے سوا اُن سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

ایک روز بیرٹے کے سپاہیوں نے ان سے کہا ہدایت اللہ خاں، تمھیں کچھ خبر بھی ہے تمھاری مونچھوں پر توچنگاریاں اُڑتی ہیں، اور تمھارے پوتے کو خلیل خاں باغوں باغوں لئے پھرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ غصّے کے مارے بل کھا گئے، داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے، اور کہا اچھا آنے دو کھلیل کھاں کو، ڈیوڑھی پر۔

دوسرے دن وہ دوپہر کا گھنٹہ بجا رہے تھے، ابھی پورے بارہ بجانے نہیں پائے تھے کہ خلیل خاں آگئے۔

اُنھوں نے گھنٹے کی موگری فوراً پھینک دی، کھڑے ہو گئے، کمر باندھ کر، اور کہا کھلیل کھاں، ہم تم سے یہ پوچھت ہیں کہ تمھیں ہمرے کالے پوتے میں کا مجا آوت ہے کہ تُم اس شسرے کو باگن باگن لئے پھرا کرت ہو۔"

(خلیل خاں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمھیں ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس بدمعاش کو باغوں باغوں لئے پھرتے ہو)

---

[1] وہ قوم کے ٹھاکر تھے اسلام لے آنے کے بعد ان کا نام ہدایت اللہ خاں رکھ دیا گیا تھا۔

آؤ، آج دو دو ہات ہو جائیں. خلیل خاں بڑے ظریف تھے۔ اُنھوں نے کہا ہدایت اللہ خاں یہاں تو لوگ بیچ بچاؤ کر دیں گے۔ بڑے باغ چلو اور وہاں جا کر اپنا حوصلہ نکال لو خلیل خاں اکڑتے اور ہدایت اللہ خاں ہانپتے کانپتے باغ پہنچ گئے. خلیل خاں نے کہا ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو، تم پہلے وار کرو، انھوں نے کہا اچھا اور لاٹھی اُٹھا کر اُن پر حملہ کر دیا۔ خلیل خاں نے ان کی لاٹھی اپنی لاٹھی پہ روک کر کہا" فش "! ہدایت خاں" پھس پھس کا کرت ہے، اور لے (فش فش کیا کر رہا ہے، اور لے) کہ کر، دوسری لاٹھی ماری، اس لاٹھی کو بھی، اپنی لاٹھی پر روک کر، خلیل خاں نے کہا" فش "، ہدایت اللہ خاں نے" پھس پھس کا کرت ہے، اور لے کہہ کر، پھر لاٹھی مار دی۔ الغرض ہدایت اللہ خاں نے ان کے دس پندرہ لاٹھیاں" پھس پھس کا کرت ہے اور لے۔" کہہ کر ماریں، اور آخر کار "پھس پھس کا کرت ہے، اور لے" کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔

محبوب شاہ مجذوب

زرا سی دھوتی باندھے ننگ دھڑنگ آدمی تھے کبھی کبھی ملیح آباد آتے اور میرے پھپا نواب احمد خاں کی ڈیوڑھی میں ٹھہرا کرتے اور ایک ردی کا غذ لئے گلیوں میں پھرتے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے بھیا اس پر "دس کت" (دستخط) کردو، ہمری (ہماری) سادی (شادی) ٹھہری ہے۔

ان کو روپے پیسے یا کھانے پینے سے کوئی سروکار نہیں تھا، جب کوئی ان کو روپیہ دیتا تھا تو وہ "ارے یو کا ٹھیکرا دیوت ہو" (ارے یہ کیا ٹھیکرا دیتے ہو) کہہ کر اسے پھینک دیا کرتے تھے۔ البتہ پھپا جب اُن کے روبرو کھانا رکھ دیتے تو زرا سا چکھ کر، سرکے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

لوگ جب اُن سے اپنے بارے میں کوئی بات پوچھتے تھے تو وہ سیدھا جواب نہیں دیتے اور "ارے گنے کے کھیت لاگے (لگے) ہیں، کھوب (خوب) گنے کھاؤ، کھجانے (خزانے) بھرے ہوئے ہیں۔ کھوب مجے (مزے) اڑاؤ" کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔

میں ایک زمانے میں ایک لڑکی پر، جس کی منگنی ہو چکی تھی، بہت بُری طرح عاشق ہو گیا تھا، پہل اس لڑکی نے کی تھی، اس لئے میرا عشق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا کہ محبوب شاہ ملیح آباد آ گئے۔ میں اُن کو اپنی نو تعمیر کوٹھی "قصرِ سحر" میں لے گیا میری بیوی مائیکے گئی ہوئی تھیں، میں نے محبوب شاہ سے کہا آؤ، میرے لحاف میں لیٹ جاؤ۔ وہ لیٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا دیکھو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، اگر گنے کے کھیتوں اور خزانوں کا نام

لوگے ، تو یہ تمھاری کچّو داڑھی نوچ کر رکھ دوں گا ، وہ مسکرائے اور کہا۔ یو کا مُرہی بات کرت ہو۔ ،، (یہ کیا بیہودہ باتیں کرتے ہو) ہم پرائی مہریا کو تمھیں کیسے دلائی دیں ،، ۔ (ہم دوسرے کی بیوی کو تمھیں کیوں کر دلادیں) ۔ یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوگئی کہ انھیں میرے دل کی بات کا پتا کیسے چل گیا۔

ایک روز میں نے اُن کو اپنے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں سُلایا ، صبح چار بجے ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ جو گدّا اور لحاف میں نے ان کو دیا تھا وہ پائنتی لپٹا رکھا ہے ، اور وہ آدھے دھڑ سے ننگے چارپائی سے پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں ، میں نے کہا محبوب شاہ ارے اتنی سخت سردی میں اور ننگے بیٹھے ہو ۔

اُنھوں نے کہا ،، بھیّا سوتے بن نہیں پڑت ہے ، ندیا کنارے ڈگن لگائے بیٹھن ہیں ، نہ جانے کب کھٹکا ہو جاوے ۔،، (بھیّا سوتے بن نہیں پڑ رہا ہے ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے کی چھڑ لگائے بیٹھے ہیں ، نہ جانے کب مچھلی کے کانٹا نگل جانے کی کھٹکا رہو جائے) ۔

میں نے کہا یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں ، وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے ،، ابھی تو ان باتن کو بے وکوفی کہت ہو ، جب ہم تم کا مکّے مدینے ، اُڑائی کے لے جیبہا ، تب تم کا پتہ چلیہے گا ، ابھی تو کھوب مجے کرو ، کھوب کوٹھن پر چڑھو ، کھوب گنّے کھاؤ ۔،، (ابھی تو ان باتوں کو بے وقوفی کہہ رہے ہو ، جب ہم تم کو مکّے مدینے اڑا کر لے جائیں گے ، اُس وقت تم کو پتا چلے گا ، ابھی تو خوب مزے کرو ، خوب کوٹھوں پر چڑھو ، خوب گنّے کھاؤ ۔)

حیدرآباد جانے سے کوئی ایک سال پہلے ، جب کہ حیدرآباد جانے کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں تھا ، وہ میرے پاس آئے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے ،، ہم نے تُمرے نام لکھ دینا ہے اکبرپور ، وہاں کھوب مجے کرنا ۔،، (ہم نے تمھارے نام اکبرپور لکھ دیا ہے ، وہاں خوب مزے کرنا) میں نے کہا اکبرپور تو میری بیوی کے نانا کے گاؤں کا نام ہے ، انھوں نے کہا ،، تُمرا اکبرپور[1] دکھن ماں ہے ،، (تمھارا اکبرپور دکن میں ہے ۔)

اس کے ایک سال کے بعد میں حیدرآباد روانہ ہوگیا ۔ اور جب دو چار برس کے بعد

---

[1] چوں کہ حیدرآباد سب سے بڑی ریاست تھی ، شاید اسی بنا پر اُسے اکبرپور کہا تھا ۔

رخصت لے کر وطن آیا تو دیوے کے عرس میں چلا گیا، صبح کا وقت تھا دیکھا کہ محبوب شاہ چلے آ رہے ہیں، اُنھوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے کہا یہاں کیسے آنا ہوا، کہنے لگے "دعا سلامتی کے لئے"۔ میں نے کہا لو محبوب شاہ انگور کھاؤ۔ اُنھوں نے دو ایک انگور کھا کر، مجھے غور سے دیکھا اور ایک شہر کا نام لے کر کہا "بھتیا وہاں کدم نہ رکھیو، نہیں تو کانجی ہوز میں بند کر دیئے جیہو"۔ (بھتیا، وہاں قدم نہ رکھنا، ورنہ کانجی ہوز یعنی محبس مویشیانِ آوارہ، میں بند کر دیئے جاؤ گے۔

لہ دو چار روز کے اندر یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی کہ میں اپنی جس معشوقہ سے ملنے جانے والا تھا اس کے شوہر نے میرا خط پکڑ لیا تھا اور میرے پھانس لینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔

اب جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ بعض افراد مستقبل کے واقعات سے کیوں کر آگاہ ہو جاتے ہیں تو اس کے سوا کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض لوگوں کے پاس ایک چھٹا حاسہ ہوتا ہے۔ جو مستقبل کو اپنے آنکڑے میں پکڑ لیتا ہے۔ وہ چھٹا حاسہ کن کیمیاوی تغیرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ابھی تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ الاماں، یہ کائنات اور یہ انسانی دماغ، دونوں ایسے قلزم ہیں کہ ابھی تک کسی کو ان کی تھاہ نہیں مل سکی ہے۔

پیمائشِ قلزم پہ وہ کیا قادر ہو
قطرے کی جسے تھاہ نہیں ملتی ہے

صبر کر، اے انسان کے ذوقِ تجسس کہ ابھی تیری آسودگی کا وقت نہیں آیا ہے۔

اَلوُیرو

اس اٹلی کے باشندے سے حیدرآباد دکن میں ملاقات ہوئی تھی یہ چہرہ خوانی میں اسے اس قدر بصیرت حاصل تھی کہ وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کے خیالات معلوم کرلیتا اور پوچھے بغیر اس کے سوالات کے جواب لکھ کر دے دیا کرتا تھا

ایک بار سیّد امین الحسن صاحب بسمل اور نواب اصغر یار جنگ کے ساتھ میں ان سے ملنے جا رہا تھا، تو میں نے ان سے موٹر میں یہ کہا کہ میں الویرو سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں فرنگی راج کب ختم ہوگا، میرے دونوں دوستوں نے کہا یہ سوال غلط ہے، ہم لوگ نظام سے وابستہ ہیں اس لئے ہم کو سیاسی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔

جب ہم اس کے وہاں پہنچے تو ہم لوگوں کے سوالات کے جوابات قلم بند کرنے کے بعد، اس نے مجھ سے کہا کہ "آپ نے موٹر میں جو سوال ڈراپ (نظر انداز) کردیا ہے، میں اس سے واقف ہوں، لیکن میرا یہ اصول ہے کہ میں سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سیاسی حیثیت سے آپ بڑے خطرناک قسم کے باغی ہیں، اور زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن آپ کا مستقبل بہت شاندار ہے۔

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں انھوں نے اکبر حیدری سے کہا۔ سر اکبر حیدری اس وقت آپ کے دل میں جو بات ہے اگر آپ اجازت دیں تو

میں بتا دوں! اکبر حیدری یہ سُن کر اچھل پڑے اور کہا "آپ برسرعام میرے دل کی بات نہ بتائیں، ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا"۔ اس نے ایک پرچے پر وہ بات لکھ دی۔ اکبر حیدری دنگ ہو کر رہ گئے۔ اس کے کمال کا اعتراف کیا اور پرچہ کو چاک کر کے جیب میں رکھ لیا۔

مشیر احمد خاں رامپوری

اُن کے بزرگ رام پور سے آکر ملیح آباد میں رہنے لگے تھے۔ وہ پستہ قامت گورے چٹے اور "پچّو" داڑھی رکھتے تھے۔ اُن کے مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ خدا کی پناہ۔ روتوں کو ہنسا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میرے باپ کے بڑے مخلص و رفیق اور نہایت بے تکلّف دوست، تصوّف کے شیدائی، عرسوں کی شرکت کے رسیا، درویشوں، صوفیوں، سدا سہاگنوں کے مستقل میزبان، میرے بچپن کے یار مختار احمد خان کے باپ، اور میرے چچا نواب محمد علی خان کے بھتیجے داماد تھے۔

اُن کے وہاں ہمیشہ دس بیس درویش ٹھہرے رہا کرتے، انگنائی میں دیگیں چڑھی رہتیں، اور ہندوستان کے ہر عرس میں وہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

ان کی جائے داد تنگ اور حوصلے بے حد وسیع تھے۔ آخر کار چھوٹی جائے داد، بڑے حوصلوں کا ساتھ نہیں دے سکی، اور وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر رہ گئے۔ اور میرے باپ کے سہارے زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی افلاس کو بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ اُن کی صاحبِ جائے داد لاولد بہن کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی جائے داد انھیں مل گئی۔

جائے داد ملتے ہی اُن کے وہاں درویشوں کا میلہ پھر لگ گیا، پھر دیگیں

چڑھ گیئں۔ پھر قوالیاں ہونے لگیں۔ اور پھر، جمِ غفیر کے ساتھ، وہ عرسوں میں شریک ہونے لگے۔ کچھ روز کے بعد وہ جائے داد بھی ختم ہوگئی۔ اور پھر مفلسی کا دور آگیا۔ دیگیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ اور مہمانوں کی چہل پہل سے گھر خالی ہوگیا۔ اور میرے باپ کو پھر ہات بٹانا پڑا۔

کوئی چھ سات مہینے اس تنگی میں گزرے تھے کہ اُن کے کسی لا ولد قرابت دار کا انتقال ہوگیا، اُن کی جائے داد ان کو مل گئی اور پھر وہی اللّے تللّے شروع ہوگئے

وہ جائے داد بھی جب مہمانوں اور عرسوں کی نذر ہوگئی تو ایک اور لا ولد قرابت دار سدھار گئے، اور ان کی جائے داد بھی انھیں مل گئی۔ اور پھر وہی رنگ رلیاں ہونے لگیں۔ میرے باپ کا اس اثنا میں انتقال ہوگیا۔ وہ جائے داد بھی برباد ہوگئی، اُن کے پاس کچھ نہیں رہا۔ اور وہ اسی عالمِ افلاس میں بیمار پڑگئے، اور جب اُن کی حالت خراب ہوگئی تو اُن کے ایک رئیس دوست میرزا عابد علی بیگ نے چاہا کہ اُن کا علاج کرا دیں، انھوں نے کہا میرزا اب میرا علاج بے کار ہے۔ اب کوئی قرابت دار ایسا نہیں رہا ہے کہ اس کی جائے داد مجھے مل جائے۔ اس لئے مجھے اب چین سے مرجانے دو۔ بس ہو چکا جینا۔

اور اس کے چوتھے روز اس مردِ بے پروا کا انتقال ہوگیا۔

ایسے مست مولیٰ اب کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔

آفریں باد، بر ایں ہمّتِ مردانۂ تو!

مولوی احمد حسین

میں نے، زندگی میں دو ایک کے علاوہ، اُن کا سا پُر اسرار و صاحبِ کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔

اُن کی دُنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکارِ نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ کے ایک معمولی کلرک تھے، لیکن اُن کی انسانی حیثیت اس قدر ارفع تھی کہ، ایک میرا سا بیگانۂ یقین و بے عقیدہ شخص، یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروروں انسانوں میں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، علمِ کلام اور فلسفے پر اُن کو بڑی قدرت حاصل تھی، لیکن اُفتادِ مزاج کی بنا پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی کائنات کے حقائق، اور، وحدتِ اَنفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ اُن کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تختِ طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے اُن کی اعلائے کلمۃ الحق کی جراُتِ بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپ کو اِس کا علم نہیں ہوگا، اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت نہیں سمجھ سکیں گے۔

اِس لئے اس اَمر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلّق تھا ہراکزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خان بہادر نظامِ دکن کی ذات سے۔

یوں تو ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرمانروا، علم بُریدگی

جہالت پروردگی. گرم و سرد نہ چشیدگی، ہمہ وقت آرامیدگی، خوشامد گزیدگی، ذہن ژولیدگی، اور آمریت پیوشگی کے باعث اس قدر متکبّر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تبختر. اور ہامان وشیطان کا غرّہ، اُن کو دیکھ کر، لرزہ براندام ہو جاتا تھا — لیکن نظام - اللہُ اکبر - جس طرح ان کی ریاست ہندوستان کی تمام ریاستوں سے بڑی تھی، اسی طرح وہ تمام والیانِ ریاست سے عُجب و غرور میں بھی سب سے زیادہ قدآور انسان تھے، اور انسان نہیں خدا معلوم ہوتے تھے اور اُن کے روبرو بڑے بڑے ہمالیہ کوب انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں، اور، بڑے بڑے سورماؤں کے زہرے آب ہو جایا کرتے تھے.

اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شیر افگن تھا اب سنئے، تیس رُپلی ماہانہ کے ایک معمولی سے کلرک مولوی احمد حسین کا واقعہ —

حیدرآباد کی ایک درگاہ میں جس کا نام ہے "خواجہ کا چلّا" بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور، کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے — چناں چہ ایک بار وہاں پہلی صف میں، نظام، اور دوسری صف میں، عین نظام کے پیچھے، مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرأت ہونے لگی اور، خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن جو قرآن کی جان ہے، اس طرح پڑھنا شروع کر دی کہ تمام محفل جھومنے لگی،

ابھی تمام اربابِ درگاہ، قرأت کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے. رُعب شاہی سے قاری کے رشتۂ آواز میں جُھنگی پیدا ہو گئی، اور قرأت ہکلانے لگی،

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا — مگر واہ ری جراتِ مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین آدمی نے جُھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرأت میں باتیں کرنا - سوءِ ادب ہے، آپ خاموش ہو جائیں. نظام نے مڑ کر اُن کو دیکھا — ونکٹارا ما ریڈی کوتوال شہر جو پولیس کے دستے کے ساتھ. نظام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑا تھا. اُن کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا. لیکن نظام نے "نکو نکو" (نہیں نہیں) کہہ کر

اس کو روک دیا۔

قاری کی رُندھی آواز کھل گئی، قرأت پھر پینگ لینے لگی، اور لوگ جھومنے لگے — لیکن ایک مختصر سے وقفے کے بعد، نظام نے مہاراجہ کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کر دیا — یہ دیکھ کر وہ بپھر گئے۔ پہلے تو انھوں نے "سوء ادب" ہی کہا تھا، اس بار انھوں نے باآواز بلند کہا " اثنائے قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے، خاموش ہو جائیے، اور مزید بدتمیزی نہ کیجئے۔"

اُن کی یہ آواز سن کر حاضرین تھرّا اٹھے، قاری کی آواز گلے میں دفن ہو گئی، کوتوال پھر جھپٹا۔ نظام "نکو نکو، انھیں گرفتار نہ کرو۔ اُن کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آجاؤ" کہ کر کھڑے ہو گئے، اور مہاراجہ کشن پرشاد کو ساتھ لیکر، درگاہ سے چلے گئے۔

تمام حاضرینِ محفل، اُس دُبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے، جس کی بوسیدہ شیروانی کی آستینوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں، اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تعریف کرنے لگے۔

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انھوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ بڑوں کی موت نے، مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے، اب چونکہ وہ لوگ باقی نہیں رہے ہیں اس لئے میں ایک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں، اور کوتوال جب ان کا نام اور پتہ پوچھنے آیا، تو انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد، اس سے یہ کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ مجھے گرفتار کرلو، اور پھانسی کے تختے پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ کوتوال اُن کو حیرت سے دیکھنے لگا، اور اس کا کوتوالی کا گُٹھا ہُوا دبدبہ، پلپلا ہو کر اس کے کھلے ہُوئے منہ پر، لٹکنے لگا۔

ابھی درگاہ سے آکر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے، آکر کہا مہاراجہ کشن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا بلالو — مہاراجہ نے ان کے سامنے ایک ایک ہزار کے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب، یہ دس

ہزار روپے سرکار والا تبار نے، آپ کی جرأتِ ایمانی سے خوش ہوکر آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں۔ انھیں قبول فرما لیجیے۔

انھوں نے بڑی مسکنت سے کہا، سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجیے، میں اُن کا ایک ادنیٰ سا نمک خوار ہوں، یہ اُن کی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھ کو جزا دے رہے ہیں، لیکن مہاراج، سرکار کی خدمت میں جاکر عرض کر دیجیے کہ کلمۂ حق فروختنی نہیں ہوا کرتا، اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کرسکتا۔ مہاراجہ نے اُن کو بڑی حیرت سے دیکھا، فرطِ جذبات سے کچھ بول نہیں سکے، اُن کے ہاتھ چوم لئے، اور، سر جھکا کر رُخصت ہوگئے۔

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو، نوکری سے سُبک دوش کرکے، گھر بیٹھے تین سو روپے تاحیات دیئے جائیں۔ اس کو بھی انھوں نے قبول نہیں کیا، اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے، میں تیس روپے ماہانہ میں اچھی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھ کو تین سو روپے کی ضرورت نہیں۔

دیکھا آپ نے اُس ہڈیوں کے مالے کا آہنی کردار؟ اس صدی میں اگر اُن کا کوئی ہمسر گزرا ہو تو خدارا مجھے اُس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وُہ مجھ سے بیحد محبّت کرتے تھے، اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تونے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہِ اشتراک نہیں تھی، وہ تھے مناجاتی، اور میں تھا رندِ خراباتی۔ خدا جانے وہ میری کون سی ادا تھی، جس نے اُن کا دل موہ لیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا تمام کلام الہامی ہے، اور آپ کی شراب نوشی مُراقبہ ہے۔ حالاں کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہام ہے، نہ میری شراب نوشی مراقبہ ہے۔

اب ان کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے، جس کی نوعیت پہلے واقعے سے بالکل مختلف ہے، اور جس کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔

مجھ پر خدا کے فضل وکرم سے جب شاہی عتاب بجلی کی طرح گرا، تو وہ ایک دن میرے پاس آئے، اور پوچھا آپ کے اخراج مبارک میں اب کتنے دن باقی ہیں میں نے کہا صرف آٹھ دس دن۔ انھوں نے کہا تو پھر ایسا کیجیے کہ اس اثنا میں، آپ میرے پاس ہر شام کو، دو گھنٹے کے لئے آجایا کیجئے، اس لئے کہ مجھے آپ کے کانوں تک چند ایسے نکات پہنچانا ہیں، جو فقط آپ تک پہنچا دینے کے واسطے مجھے ودیعت فرمائے گئے ہیں۔ میں نے کہا مولوی صاحب، جھٹپٹے کے سانولے رنگ کی چھاؤں میں تو میں "کالا پانی"[1] پیا کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کوئی پروا نہیں، آپ میرے سامنے بیٹھ کر پی سکتے ہیں۔ آپ میری باتیں سن سن کر، جس قدر بھی کالا پانی پئیں گے، اسی قدر گورے ہوتے چلے جائیں گے۔

چناں چہ، اسی دن، شام ہوتے ہی، میں ہینڈ بیگ میں بوتل، پیمانہ، گلاس، گھڑی اور اگر بتیاں ڈال کر، ان کے وہاں پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور کہا آئیے میرے ساتھ، میں نے آپ سے باتیں کرنے کے لئے دس دن کے واسطے، یہیں پڑوس میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے۔ میں نے کہا شاید اس لئے کہ آپ کے گھر میں بادہ نوشی نہ کی جائے، انھوں نے کہا نہیں، یہ بات نہیں ہے، میں جو باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، وہ باتیں آپ کے سوا، اگر کسی اور کے کان میں پڑ گئیں تو وہ گم راہ ہو کر، رہ جائے گا، آپ کو معلوم ہے کہ عرقِ گُل جسے "گلاب" کہا جاتا ہے۔ بیمار کے جسم میں داخل ہو کر بلغم اور تن درست کے جسم میں حیات آفریں ہو جاتا ہے، یہی حال بعض خیالات کا ہے کہ وہ نادان کے لئے زہر اور دانا کے لئے تریاق بن جاتے ہیں۔

الغرض، آٹھ دس دن تک برابر انھوں نے بڑے ٹھوس مسائل مجھ کو سمجھائے، یہ بھی بتایا کہ عبادات مقصود بالذات نہیں، بلکہ ذریعۂ مقاصد ہیں، اور اسی لپیٹ میں الفاظ کے داخلی و خارجی معانی و مفاہیم، عوام و خواص کے جداگانہ احکام،

---

[1] شراب

تنزیہی و تشبیہی نکات ، اور محرّکِ اوّل کے مجازی و حقیقی تخیّل پر بھی روشنی ڈالی، اور اسی کے ساتھ ساتھ تکوین و تخلیق ، ارتقاء و بقائے اصلح مادّہ و روح ، طریقت و شریعت ، جزا و سزا ، جہنّم و جنّت ، روح و مادّہ ، جبر و قدر ، اوامر و نواہی ، معاش و معاد ، حیات و موت ، قضاء و قدر ، واجب و ممکن اور ذات و صفات کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ اُن پر کٹھ ملّاؤں کی بارگاہ سے بآسانی کفر کا فتویٰ صادر کیا جاسکتا ہے۔ سب سے زیادہ انھوں نے زور دیا اَنفُس و آفاق کی وحدت پر، اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ ۔ اگر ہم خُدا کے تصوّر سے دست بردار بھی ہوجائیں، پھر بھی موجودات کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ، تمام کائنات عینیت کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے ، غیریّت کا کہیں وجود ہی نہیں ہے ، اسماء و اشکال کے حجابات ہم کو دھوکا دیتے ہیں ، اور ان حجابات کو ہٹا دیں تو معلوم ہوجائے کہ تمام کائنات کی تکوینی ماہیّت ایک ہے ۔ خواہ ہم روحانی نقطۂ نظر سے دیکھیں خواہ مادّی ، ہم کو وحدت الوجود کا قائل ہونا پڑے گا ۔ اس لئے کہ کونین ایک حقیقتِ واحدہ کثیر الاسماء والاشکال ہے ۔

اُسی کے دوش بدوش انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام نے جو توحید پر اس قدر زور دیا ہے، اس کا منشاء بھی صرف اس قدر ہے کہ لوگ اپنے کو ایک باپ کے بیٹے اور ، اور ایک دوسرے کو حقیقی بھائی اور بہن سمجھیں ، اور اگر خدا میں تعدّد ہوجائے گا تو لوگ سگے بھائی بہن نہیں رہیں گے ، جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی وحدت درحقیقت انسان و آفاق کی وحدت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ۔

اُن راتوں کی آخری رات بڑی عجیب ہوگئی تھی ، وہ یکایک خاموش ہوگئے ، اور پھر ، ہات ہلا ہلا کر ارے توبہ ، ارے توبہ کے نعرے لگانے لگے ۔ میں اُن سے بے تکلّف ہوچکا تھا ۔ میں نے کہا ۔ ارے یہ مجازیب کے سے شندے ، آپ کیا کر رہے ہیں ، انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھ سے کہا ، میر عثمان علی خان کا مآل دیکھ رہا ہوں ، توبہ توبہ ، یہ خون خرابے ، یہ ذلّتیں ، یہ بے چارگیاں " میں نے کہا ،

جناب والا میں اُن شعبدوں کا قائل نہیں، انھوں نے کہا، میرے بعد آپ کو معلوم ہوجائے گا ——— یہ کہا اور وہ سر جھکا کر پھر خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئے۔ میں حیران ہوگیا کہ یہ آج انھیں ہو کیا گیا ہے، ابھی میں نے اپنا آخری جام ختم کیا تھا کہ انھوں نے آنکھیں کھول کر، مجھے گھورنا شروع کردیا، میں نے کہا حضرت یہ آج آپ کو ہوکیا گیا ہے، انھیں، یہ سن کر جھرجھری آئی، میں ہنسنے لگا، وہ سنجیدہ رہے اور مجھ سے پوچھا احادیث کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے، میں نے جواب دیا کہ عہدِ بنوامیہّ میں تسکیکِ احادیث کی ایسی زبردست دارالضّرب کھول دی گئی تھی، اور، ایسی ایسی جھوٹی حدیثیں وضع کی گئی تھیں کہ اب جھوٹی سچی حدیثوں میں فرق کرنا بے حد مشکل ہوچکا ہے، احادیث کی اب یہ صورت ہوگئی ہے جیسے پلاؤ کی دیگ، تودوں سے اُتار کر زمین پر رکھ دی گئی، ایک کُتّے نے ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کردیا، پیشاب کے قطرے ہوا سے اُڑ کر دیگ میں پہنچ گئے، یہ صحیح ہے کہ ہر چاول ناپاک نہیں ہوا، لیکن ہر چاول مشتبہ ضرور ہوکر رہ گیا۔ انھوں نے پوچھا پھر صحّتِ احادیث کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے، میں نے کہا، لے دے کے صرف یہی ایک معیار رہ ہے کہ جو احادیث قرآن کے آیات و مزاج کے مطابق ہیں، اُن کو صحیح اور اس صورتِ حال کے برعکس احادیث کو غلط سمجھا جائے۔

انھوں نے کہا بے شک یہ معیار بہت اچھا ہے، لیکن اس سے بھی اچھا معیار آپ کو بتاؤں؟ میں نے کہا ضرور بتائیے۔ انھوں نے کہا اس کا کبھی خطا نہ کرنے والا معیار ہے ذاتِ رسول۔ میں نے کہا اُن کی وفات کے بعد اس معیار سے کام لیا ہی نہیں جا سکتا، انھوں نے جواب دیا کہ ظاہری وفات سے کچھ نہیں ہوتا، رسول آج بھی اُسی طرح زندہ ہیں جیسے کل تھے، میں نے کہا یہ آپ کیسی باتیں کرنے پر اُتر آئے ہیں، خیریّت تو ہے، مزاج کیسا ہے، وہ مُسکرا ائے، اور کہنے لگے میاں جوش یہ دو باتیں آپ کے واسطے مقدر ہوچکی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ اپنی عمر کے دورِ آخر میں داخل ہوجائیں گے، قدرت آپ سے

ابلاغِ توحید کا کام لے گی، آپ اَنفس و آفاق کی وحدت کا آوازہ بلند کریں گے، اور وہ آوازہ وحدتِ الٰہی تک جائے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ کو کسی حدیث کی صحّت میں شک ہوگا، آپ براہِ راست خود رسول سے جا کر پوچھ لیں گے۔

یہ سن کر میں نے بہت زور سے قہقہہ مارا۔ اور کہا مولانا یہ آخری رات دیوانگی کی رات ہے، نو راتوں تک تو آپ معقول رہے۔ اور آج مجذوبوں کی سی بَڑ مار رہے ہیں۔ آپ کا والیٔ قدرت اور مجھ سے کام لے، اور رسول کو زندہ فرما کر مجھے اُن کی سرکار تک پہنچائے۔ آپ کو میرے تشکّک کا بخوبی علم ہے۔ اب رہے میرے اعمال سو آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہوں، یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے میرے افکار اور میرا کردار ایسا ہے کہ آپ کا خدا مجھ کو پسند ہی نہیں کر سکتا۔ اور اس حالت میں آپ کی یہ پیش گوئی قطعی طور پر غلط ہے۔

میری یہ بات سن کر وہ اُچھل پڑے۔ کہنے لگے تشکّک "رزدبانِ معرفت ہے" جو جو آپ کو بامِ یقین تک ایک روز پہنچا دے گا۔ اب رہی آپ کی بادہ خواری، سو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ آپ کا مُراقبہ ہے، اپنی شراب کو آپ گناہ سمجھ رہے ہیں، ایسا "بولنا" گناہ ہے۔

میں نے پھر قہقہہ مار کر کہا، آج کی رات تو بڑے مزے کی رات ہے۔ پی میں رہا ہوں، اور بہک رہے ہیں آپ، وہ ہنسنے لگے اور کہا آپ کے قہقہے قضا و قدر کے دھارے کو نہیں موڑ سکتے، جو کچھ پیش آنے والا ہے، آپ خود دیکھ لیں گے۔ میں نے کہا اب میں اجازت چاہتا ہوں، آئیے گلے مل لیں۔ پھر دیکھیے کبھی ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں، انھوں نے بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر کہا۔ میں ایک مہینے تک خواب میں آپ کے پاس آتا رہوں گا۔ اور جب آپ مطمئن ہو جائیں گے، خواب میں آنا ترک کر دوں گا اور ہاں، یہ بھی سن لیجیے کہ اپنے انتقال سے پورے چھ مہینے پیشتر۔ آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے، آپ سے ملنے آؤں گا۔

چناں چہ انھوں نے جو کہا تھا وہی کیا، ایک ماہ برابر وہ میرے خواب میں آتے

اور ہدایتیں کرتے رہے۔ اور انتقال سے چھ مہینہ پیشتر دہلی میں آکر مجھ سے مل بھی لئے۔ یہ کیا طلسم تھا، میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے۔ یا تو یہ میرے ذہن کی طاقت تھی جو برابر مجھے خواب دکھاتی رہی، یا اُن کا تصرّف تھا۔ کوئی فیصلہ کرے، لیکن موت سے ٹھیک چھ مہینے قبل آنا، یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں اپنے ذہن کی کارکردگی سے قطعاً منسوب نہیں کرسکتا۔ . .

میں سمجھتا ہوں کہ میرا جہل مجھ کو ہلاک کرکے چھوڑے گا:

نوابزادہ مصطفےٰ علی خاں

میرے چچا نواب محمد علی خان، تعلقہ دار "سہلامؤ" کے فرزند، یعنی میرے چچا زاد بھائی، لیکن بھائی کم اور دوست بہت زیادہ ہیں۔ اگر وہ فقط بھائی ہوتے تو اُن سے ڈر لگتا، اس لئے کہ میرے خاندان کے بھائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

وہ جوانی میں نہایت خوب رو تھے، چچا نے اُن کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور مسوری کے انگلش اسکول میں داخل کر کے، یہ چاہا تھا کہ وہ علم حاصل کریں، لیکن بدشوقے تھے، اسکول سے گھبرا کر گھر آگئے اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

چچا جان اُن کو بہت چاہتے تھے، لیکن خلفِ اکبر نہ ہونے کی بنا پر، اُن کو تعلقہ دار نہیں بنا سکے، تعلّقہ داری اُن کے بڑے بھائی حامد علی خان کو سونپی، لیکن اُن کے نام اس قدر زمینیں، باغ اور گزارہ لکھ دیا کہ اگر وہ جائے داد باقی رہ جاتی تو کئی پشتوں تک چلتی ـــ لیکن صد حیف کہ میرے بھائی کی افتادِ طبع نے وہ تمام جائے داد برباد کر ڈالی، اور اب وہ لکھنؤ میں راجہ صاحب سلیم پور کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں، بڑی اداسی کے ساتھ، زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔

آسماں را حق بُوَد، گر خوں ببارد بر زمیں!

اب اُن کی داستانِ بربادی بھی سن لیجئے، اور اس امر پر بھی غور کیجئے کہ جذبات کا طوفان انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ خدا بخشے اُن کے باپ چوں کہ بے حد حسن پرست تھے، حسین عورتوں اور طوائفوں سے اُن کا گھر بھرا

رہتا تھا، اور چوں کہ مصطفیٰ علی کا لڑکپن اُن حسینوں کی زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا، اس لئے بچپن ہی سے وہ نمائش بینی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کے مرتے ہی وہ ایسے کھل کھیلے کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

سب سے پہلے وہ سندیلے کی ایک طوائف پر :- "اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے" کی حد تک ریجھ گئے، جب وہ مر گئی، کچھ روز اس کا سوگ منانے کے بعد پھر تو انھوں نے، سیکڑوں طوائفوں پر، یکے بعد دیگرے مرنا شروع کر دیا۔ اور جائے داد دھڑا دھڑ بکنے لگی،

خبر کرو، مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو!

اُن کو بربادی کی شاہ راہ پر، سرپٹ دوڑتے دیکھ کر، اُن کے قرابت داروں اور بہی خواہوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھائی، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ، عیاشی کرو، مگر بجٹ بنا کر، اپنے حدود میں رہو، لیکن وہ نہیں مانے اور سمجھانے والوں سے جھڑک جھڑک کر کہا کہ خاں صاحب فضول خرچی ہماری عادت میں داخل ہے آئندہ نہ سمجھائیے گا، ورنہ قطع تعلّق کرلوں گا۔

وُہ جب اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتے، اور روپیہ اُن کی جیب میں آتا، تو، دس منٹ ضائع کئے بغیر، وہ ریل، ٹیکسی، بس، تانگے، یا اکّے میں بیٹھ کر "گولڈن نائیٹ" (شبِ زرّیں) منانے کے واسطے، لکھنؤ چلے جایا کرتے تھے، تاکہ اُن کی جیب کے سکّوں اور "گولڈن نائیٹ" کے لمحوں کے مابین کوئی فصل پیدا نہ ہونے پائے۔

اور جب اُن کے پاس، پانچ سات روپے باقی رہ جاتے تھے۔ تو اعلیٰ سگریٹ کے بدلے بیڑی پیتے ہوئے ملیح آباد آجاتے۔ اور تقریباً فاقے کرنے لگتے، اور اِس عالم میں اپنے بچوں کے اُترے چہرے دیکھ کر روتے۔ اور اسراف سے توبہ کیا کرتے تھے۔ لیکن جیسے ہی باغ یا زمین کے کسی دوسرے حصے کے فروخت کر دینے میں کام یاب

ہوجاتے تھے۔ تو اپنے فاقوں اور اپنے بچوں کے اُترے چہروں کو فراموش کرکے، وُہ، بڑی گھبراہٹ کے ساتھ، پھر گولڈن نائیٹ منانے کے واسطے لکھنؤ چلے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگئے تھے، جائے داد کے خریداروں نے، یہ سوچ کرکہ وُہ ہر حالت میں جائے داد بیچ ڈالنے پر بُری طرح تُلے ہوئے ہیں خریداری سے انکار کر دیا تھا، تاکہ وہ دس ہزار کی زمین دو ہزار میں فروخت کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اس زمانے میں، چائے کے سٹ، اور چاندی سونے کے برتن بیچ بیچ کر انھوں نے اپنا اور اپنے تینوں بچّوں کا پیٹ پالا، اور ہر آن رویا کرتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ اب روپیہ برباد نہیں کروں گا۔

لیکن ایک روز لکھنؤ کے چوک کی اس قدر یاد آئی کہ انھوں نے اپنی باقی تمام جائے داد اَدنے پَونے مولی گاجر کی طرح بیچ ڈالی، اور روپیہ ہات آتے ہی، گولڈن نائیٹ منانے کے واسطے فوراً لکھنؤ چلے گئے۔ اور جب پائی پائی خرچ ہوگئی تو منھ لٹکائے ہوئے ملیح آباد آگئے، تینوں بچوں کو گلے لگا لگا کر اس قدر روئے کہ پڑوسیوں کے مکان گونجنے، اور دل دہلنے لگے۔

جائے داد تو ختم ہوگئی تھی، اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کھائیں گے کیا۔ معلوم نہیں انھوں نے وہ مصیبت کا دور کیوں کر گزارا، اور کھانا کیوں کر کھایا۔ اِس اثنار میں جب برکھا رُت آگئی، پانی رم جھم برسنے لگا، کوئلیں کوکنے اور پپیہے بولنے لگے تو اُن کو، انگڑائیوں پر انگڑائیاں آنے لگیں۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس، کئی لاکھ روپے کے محل کو جو باپ نے اُن کو عطا فرمایا تھا۔ اور جس کی صرف دو منزلہ ڈیوڑھی کی قیمت تھی دس ہزار۔ صرف تین ہزار رُپلیوں میں بیچ ڈالا اور روپیہ جیب میں آتے ہی، بلاتاخیر" گولڈن نائیٹ" منانے کے واسطے لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ کڑم دھم کڑم دھم

آوازدو کہ جنسِ دوعالم کو جوشؔ نے
قربانِ یک تبسّمِ جانانہ کر دیا

زاہد علی خاں

وہ بھی ہمارے ملیح آباد کے کاہ جسم، کوہ عزم، آہن کردار، آفات کوب، خوف نا آشنا، بات کے پکے، دھن کے پورے، ضد کے سچّے، طبعاً شب نم خو، غضباً شعلہ مزاج۔ جھک کر ملو تو شاخِ سایہ دار، اکڑو تو اُپّی تلوار، ـ بانکے، ترچھے، ہٹیلے اور بڑے جیوٹ اور بیحد جھلّاہٹ کے پٹھان تھے،

انھیں اپنے بھائی غالب علی خان سے جو بقیدِ حیات ہیں بڑی محبّت تھی، لیکن باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے اپنے اس چہیتے بھائی کو جائے داد سے محروم کرکے اس کے شرعی وقانونی حصّے پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بے ایمان اور بدنیت انسان نہیں تھے، پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا، اس کی علت بھی سن لیجیے۔

باپ کے انتقال کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی نے اُن سے کہلا بھیجا کہ، بھائی صاحب، جائے داد کا بٹوارہ کرکے، میرا حصہ مجھے دے دیجیے۔ یہ پیام سن کر وہ جامے سے باہر ہوگئے، انھوں نے کہا میں تو، باپ کے بعد، اس کو اپنا بھائی نہیں، بیٹا سمجھتا تھا، اور ارادہ کر چکا تھا کہ اُس کو آدھے سے زیادہ حصہ دوں گا لیکن اب چوں کہ اس نے غیریّت برت کر، بٹوارے کا پیغام بھیج دیا ہے، اس لئے جب تک میں زندہ رہوں گا، بٹوارہ نہیں ہونے دوں گا، غَلبوا (غالب کی تصغیر) سے کہ دو، وہ جو چاہے کرکے دیکھ لے، میں اس کے حصّے کے باغوں اور زمینوں پر عمر بھر قابض رہوں گا۔ اب اس کی جائے داد "جائے دادِ پدر" نہیں جائے دادِ دگر"

ہو چکی ہے۔

غالب علی خان نے یہ جواب سن کر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدّمے میں کوئی پیچیدگی تو تھی ہی نہیں، دو چار پیشیوں کے بعد فیصلہ ہوگیا۔ اور جس وقت جج نے یہ حکم سنایا کہ آدھی جائے داد غالب علی خان کے نام کر دی جائے۔ تو اُنھوں نے کہا جج صاحب آپ کا یہ فیصلہ آپ کے کاغذات تک محدود رہے گا۔ اس سے جائے داد پر، ذرّہ برابر بھی، اثر نہیں پڑ سکے گا، جج نے، کہا، خاں صاحب آپ یہ کیا کہ رہے ہیں، اُنھوں نے کہا، میں یہ کہ رہا ہوں کہ جس دن آپ کی طرف سے جائے داد کا بٹوارہ ہوکر، خندقیں کھود دی جائیں گی۔ اور حد بندی کے پتھر نصب کر دیئے جائیں گے۔ اس کے دوسرے ہی دن زاہد علی خان، تمام خندقوں کو بھروا کر اور حد بندی کے تمام پتّھروں کو، دور، پھینک کر، بھر پوری جائے داد پر قبضہ کریں گے اور آپ مُنھ دیکھتے رہ جائیں گے۔

جج نے کہا خاں صاحب آپ عدالت کی توہین کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا آپ کو معلوم ہے۔؟

انھوں نے، انتہائی بے پروائی سے۔ ہات ہلاکر، کہا مجھ کو سب معلوم ہے۔ لیکن اُس سے کچھ ہوگا نہیں، غلبوا کو جائے داد نہیں مل سکے گی۔ قبضہ تو زندگی بھر زاہد علی خان ہی کا رہے گا۔

جج نہایت شریف آدمی، اور، پٹھانوں کا مزاج شناس وہم درد تھا، اُس نے کہا خاں صاحب آپ اپنے الفاظ واپس لیں ــ اُنھوں نے کہا یہ کام زنخوں کا ہے۔ اور جب مجبور ہوکر، اس نے اُن کو تین مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا۔ تو انھوں نے کہا بہت اچھا منظور، لیکن اس میرے خدمت گار "چُنوا" کو بھی، جو میرے پیچھے کھڑا ہے تین مہینے کی سزا دے دیجیے، ورنہ وہاں میرا حقّہ کون بھرے گا ــ جج کو ہنسی آگئی اس نے کہا۔ جو شخص جرم نہ کرے اسے کیوں کر سزا دی جاسکتی ہے۔ انھوں نے یہ کہ کر کہ جج صاحب بھلا جرم میں دیر ہی کیا لگتی ہے خدمت گار کو حکم دیا ابے چُنوا

کھول دے پائے جامہ ، اور کر دے پیشاب ۔

چھنوا نے فوراً دَھل دھل پیشاب کر دیا ۔ اس کو بھی تین مہینے کی سزا ہوگئی اور وہ اس کو ساتھ لیے جیل چلے گئے ۔ صبح کو جب رول کال کے وقت جیلر نے آواز لگائی، زاہد علی حاضر ہے ؟ تو انھوں نے کہا ابے گیدی خر ، زاہد علی خان تشریف رکھتے ہیں کہ کر پکار، ہم کوئی چوری چکاری کرکے تو جیل میں نہیں آئے ہیں، ہم کو تو یہاں انتظاماً بھیجا گیا ہے ، جیلر کوئی بھلا آدمی تھا ، اُن کی پھٹکار سنی ، اور پی گیا ۔

جیل کاٹ کر جب باہر آئے ، سیدھے ملیح آباد پہنچے ، پہنچتے ہی بٹوارے کے تمام آثار مٹا کر ، پھر پوری جائداد پر قابض ہوگئے ، پھر مقدمہ چلا ، پھر سزا ہوئی ، پھر چھنوا کو اسی طرح ساتھ لیا ، اور سزا کاٹ کر جب پھر آئے تو پھر بھائی کی جائےداد پر قبضہ کر لیا ۔ اور جب تک وہ مر نہیں گئے بٹوارہ ہو ہی نہیں سکا ۔

میرے نزدیک "بالک ہٹ" "راج ہٹ" اور "تریا ہٹ" میں اگر پٹھان ہٹ کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ اضافہ نہایت مناسب رہے گا ۔

میر بارق لکھنوی

لکھنؤ کی وضع داری کے مکمّل نمونے، پچاسی[۸۵] برس کی عمر میں بھی خوب صورت چلتے پھرتے دوچار میل روز ٹہلتے، اوسط درجے کے شاعر، اعلیٰ درجے کے انسان، اور :-چنداں کہ خدا غنیست، ما محتاجیم" کی حد تک نادار، اور اس پر بھی صاحب کردار۔

ایک بار میرے باپ نے، تخلئے میں، اُن سے پوچھا میر صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ میرے پاس روز تشریف لاتے، لیکن ایک بار بھی میرے ساتھ کھانا تناول نہیں فرماتے ہیں۔ پہلے تو اُنھوں نے احترام افلاس کے باعث، ٹالنے کی سعی کی، لیکن جب میرے باپ نے اصرار کیا، تو انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا کہ خاں صاحب آپ کے دسترخوان پر آپ کے جو احباب دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں۔ میرا معاملہ اُن سے مختلف ہے۔ میرے باپ نے کہا میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ تفصیل فرمائیے: انھوں نے کہا شرم کی بات ہے، میں کہنا نہیں چاہتا، میرے باپ نے اپنے سر کی قسم دے کر پوچھا تو انھوں نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب اصولی بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کے پاس دس بار کھانا کھاؤں تو مجھ پر لازم ہے کہ کم از کم ایک بار تو آپ کو بھی مدعو کروں، لیکن میں اس قدر مفلس ہوں کہ کھانا تو درکنار، آپ کو چائے بھی پلا نہیں سکتا، اس لئے کیا منھ لے کر، آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں؟

اُن کی یہ بات سن کر میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور کہا میر صاحب آپ نے مجھ سے غیریّت برت کر اب تک مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی، اس کے جواب

میں انھوں نے ایک رُباعی سنائی

آں کس کہ کباب می خورد، می گزرد　　آں کس کہ شراب می خورد، می گزرد
سر تہ کہ بکاسۂ گدائی، ناں را　　ترکردہ بآب می خورد، می گزرد

یہ سن کر میرے باپ نے میرے کان میں کہا جاؤ اپنی ماں سے پچیس اشرفیاں لے آؤ، لیکن رومال میں لپیٹ کر لانا۔ جب میں اشرفیاں لے آیا، میرے باپ نے مجھ سے فرمایا، باہر چلے جاؤ۔ میں باہر جاکر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہوکر دیکھنے لگا، میں نے دیکھا کہ میرے باپ کھڑے ہوگئے اور وہ اشرفیاں، رومال پر رکھ کر، اس طرح ان کے سامنے پیش کیں، جیسے کسی بادشاہ کو نذر دی جاتی ہے۔ میرے باپ کی اس پیش کش کو دیکھ کر، وُہ تلملا کر کھڑے ہوگئے، اور، بھرّائی آواز میں کہنے لگے خاں صاحب ہم سادات پر صدقہ حرام ہے، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ برادرانہ پیش کش کو صدقہ کا نام دیتے ہیں۔ خونِ حسین کا واسطہ اس کو قبول فرماکر مجھ کو عزّت بخشیے، یہ سن کر وہ رونے لگے، اور کہا خونِ حُسین کی قسم میں اسے قبول نہیں کروں گا، اور آپ نے اصرار کیا تو آپ کی خدمت میں آنا جانا ترک کردوں گا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد وہ میرے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ خدمت گار مٹھائی کا تھال لیے آئے، تھال احباب میں گردش کرنے لگے، اور جب اُن کے سامنے تھال آیا تو، چوں کہ ان کی وضع میں یہ بات داخل تھی کہ وہ کسی کے وہاں کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے، اس لیے انھوں نے خدمت گار کو دوسری طرف تھال لے جانے کا اشارہ کیا، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ کو معلوم ہے کہ آج محرّم کی ساتویں تاریخ ہے، کیا آپ حضرت امام حسین کی نذر سے بھی انکار فرمادیں گے۔

یہ سن کر انھوں نے برفی کی ایک ڈلی اُٹھالی۔ برفی ابھی اُن کے ہات میں ہی تھی کہ حامد علی خان بیرسٹر آگئے اور خلافِ وضع اُن کے ہات میں برفی کی ڈلی دیکھ کر انھوں نے مزاحیہ انداز میں پکار کر کہا میر بارق صاحب دیکھ لیا۔ یہ سنتے ہی اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور برفی کی ڈلی فوراً تھالی میں رکھ دی۔ یہ دیکھ کر حامد علی خان

کے ہوش اُڑ گئے، دوڑ کر، انھوں نے اُن کے پاؤں پکڑ لئے، اور کہا میر صاحب یہ یہ تو مزاح المومنین کے زمرے کی بات تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ آزردہ ہوجائیں گے، حضرت عباسؑ کی قسم معاف فرمادیجئے۔ انھوں نے کہا بیرسٹر صاحب آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ آپ کی یہ آواز، کوٹھے سے گری تھالی کی مانند، سڑک تک پہنچ جائے گی، اور، سننے والے یہ سوچنے لگیں گے کہ خدا جانے بارق کون ایسا فعلِ شنیع کررہا تھا کہ بیرسٹر صاحب یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ بارق صاحب دیکھ لیا" اب جب تک جُھٹپٹا نہیں ہوجائے گا، میں نیچے نہیں اتروں گا۔ یہ تھی لکھنؤ والوں کی تہذیب اور یہ تھا ان کی عزتِ نفس کا معیار !!

منشی واحد علی ابر قدوائی

نہایت وجیہہ اور نہایت کلّے ٹھلّے کے انسان تھے، چہرہ شاداب تھا، سر پر گنجان پٹے تھے، منھ پر گھنی داڑھی تھی، رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تھا، سرکارِ رام پور میں میر منشی تھے، شان دار انگرکھا، اور بانکی ٹوپی اُن کی خاص دھج تھی۔

ایک بار جب میں رام پور گیا، تو، چوں کہ وہ میرے باپ کے دوست تھے اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، بڑی محبّت سے پیش آئے، کہا میں اس وقت ایک نہایت ضروری کام سے باہر جارہا ہوں، لیکن میاں کل میرے ساتھ کھانا کھانا۔ دوسرے دن چھوٹے دادا کو لے کر وہاں پہنچا ـــــ انھوں نے شاہی کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد وہ ہم کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں یہ دیکھا کہ ہر کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز، اور ہر میز پر سوڈے کی دو دو بوتلیں، اور چورن کی ایک ایک شیشی رکھی ہوئی ہے، اور سامنے تختوں کا چوکا لگا ہوا ہے۔

جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو وہ تخت پر مُتمکّن ہوکر، مُختلف صندوقچوں سے غزلوں کے پرچے نکال نکال کر، تاروں میں لٹکانے لگے ـــ ابھی اُن کا وہ عمل جاری تھا کہ اُن کے چھوٹے بھائی منشی احمد علی شوقؔ ایک بڑی لانبی سی بیاض لئے آگئے، اور چھوٹے بھائی کی مشغولیت سے فائدہ اٹھاکر، اپنا کلام سنانے لگے ـــ اور، خدا جھوٹ نہ بُلائے، ایک سانس میں ساٹھ ستر غزلیں سناڈالیں۔ وُہ

اور بھی سناتے، مگر یہ دیکھ کر کہ چھوٹے بھائی کی غزلوں کے پرچے، چھ سات جھاڑوں کی مانند، تاروں میں لٹک چکے ہیں، اور اُن کے ہونٹ، فَیر کرنے کے لئے بار بار کُھل رہے ہیں، انھوں نے، بادلِ نخواستہ، اپنی بیاض بند کر دی ـ اور اس کے فوراً بعد اَبر صاحب نے جسم کے تین تین جھٹکوں، اور آواز کے، چار چار کھٹکوں کے ساتھ، گرجنا، برسنا، شروع کر دیا۔ اور ہماری داد کی آوازوں سے چھت گونجنے لگی۔

ہر غزل سنانے سے پیشتر وہ یہ کہتے تھے کہ جوؔش میاں، یہ دیکھئے میؔر کے رنگ میں غزل کہی ہے، اور یہ غاؔلب، ناؔسخ، آؔتش، موؔمن اور مصحؔفی کے رنگ کی غزل ہے ـ اور میں بار بار دل میں کہتا تھا کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو ہمیشہ دوسرے شعرا ر کے رنگ میں کہتے ہیں، اور اُن کا ذاتی رنگ ہے ہی نہیں۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو چھوٹے دادا کی قوّتِ برداشت نے جواب دے دیا، وہ، ایک دم سے کھڑے ہوگئے، اور مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں اب تو ہمارا دم نکلا جا رہا ہے، السّلام علیکُم، یہ کہہ کر، انھوں نے چک اٹھائی اور باہر نکل گئے ــــ اُن کی اس حرکت سے مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا، میں نے کہا ابر صاحب قبلہ، چھوٹے دادا بڑے اُجڈ پٹھان ہیں، معاف کیجئے کہ میں اُن کو ساتھ لے کر یہاں آگیا۔ اُنھوں نے، جھینپی مسکراہٹ سے کہا مجھ کو حیرت ہے پٹھانوں میں آپ اور آپ کے والد گرامی کیسے پیدا ہوگئے۔ آپ اس کا خیال نہ کریں، سوڈے کی بوتلیں اور چورن کھالیں، تاکہ غذا ہضم ہو جائے۔

اب مجھ کو معلوم ہوا کہ چوں کہ ہم کو دیر تک جگانا تھا، اس لئے سوڈا اور چورن رکھ دیا گیا تھا، میں نے چورن کھا کر ابھی سوڈا پیا ہی تھا کہ انھوں نے پھر کلام سنانا شروع کر دیا۔

اب رات کے تین بج گئے، میرے اور حاضرین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ داد کی آوازوں میں ضعف آگیا اور ہمارے گلوں سے بقر عید کے ترساں بکروں کی سی بھائیں بھائیں نکلنے لگی۔ لیکن وہ غزلیں پڑھتے رہے۔ آخر کار جب

پَو پھٹنے اور اذان کی آوازیں گونجنے لگیں، تب انھوں نے ہمارے داد سے چھلے ہوئے گلوں کی چُرمُر آوازوں، اور شب بیداری کے رندے ہُوئے چہروں کا اندازہ لگا کر ارشاد فرمایا شاید آپ لوگوں کو نیند آرہی ہے، اچھّا خدا حافظ، لیکن یاد رکھئے کل بھی آپ یہیں کھانا کھائیں گے۔

ہم کھُد بُدائی کھوپڑیوں اور سنسناتے اعصاب کے ساتھ، کمرے سے نکل کر، جب سواری کی طرف جانے لگے تو شوقؔ صاحب نے کہا آپ سب حضرات میرے کمرے میں تشریف لے آئیں، یہیں منھ ہات دھو کر ناشتہ فرمالیں، پھر جاکر سو رہیں۔ یہ دعوت سن کر ہماری پنڈلیاں کانپنے لگیں، لیکن اودھ کی وضع داری، ہمارے کان پکڑ کر، ہم کو اُن کے کمرے میں لے کر چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر ہم نے حوائجِ ضروری سے فراغت کی، اور منھ ہات دھو کر، ناشتہ کیا، ناشتہ ختم کرکے ہم اُٹھنے والے ہی تھے کہ شوقؔ صاحب نے اپنی بیاض کھول دی، اور ہم کو غزلوں پر دھر لیا۔ میرا عالم یہ ہوگیا کہ مجھے اس کا پتہ نہیں رہا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر، اور یہ قدوائی صاحب کلام سنا رہے ہیں، یا اونٹ بول رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے یہ بات دل میں ٹھان لی کہ مرجاؤں گا، لیکن ان دونوں بھائیوں کے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔ اب دو واقعات اور سن لیجئے — میں، قاضی خورشید احمد، ابرار حسن خاں، رفیع احمد خاں، مانیؔ اور فانیؔ کو لے کر علی گڑھ جوبلی میں شریک ہونے گیا ہوا تھا۔ ایک روز ڈائننگ ہال میں ہم لوگ پہنچے تو یہ دیکھ کر، دم نکل گیا کہ وہاں آبر صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں، ہم نے چاہا اُلٹے پاؤں نکل جائیں، اتنے میں انھوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم سب نے اُنھیں سلام کیا، اُنھوں نے ہمیں گلے لگایا، اور اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ مانیؔ صاحب نے میرے کان میں کہا ہم لوگ بہت آہستہ آہستہ کھائیں گے، وہ پہلے سے کھا رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے پہلے اُٹھ جائیں۔

ابر صاحب نے مجھے چُٹکی دینے کے واسطے کہا میاں جوش، اب ہم بھی

تمھاری طرح چڑیوں اور کھیتوں پر نظمیں کہنے لگے ہیں۔ میں نے کہا کسی وقت حاضر ہوکر سنوں گا۔ انھوں نے کہا ارے کسی وقت کی بات نہیں، اسی وقت آپ سب کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا، میں نے کہا بہت اچھا۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، ہم لوگوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، اور سر جھکا لئے۔ اتنے میں وہ کھانے سے فارغ ہوکر ہمارے انتظار میں، پھاٹک پر جا کر کھڑے ہوگئے۔ مانی نے کہا گھبرائیے نہیں اُدھر اوٹ کے پیچھے ہات دھونے چلئے، تدبیر سمجھ میں آگئی ہے۔

اوٹ کے پیچھے جاکر مانی نے، چاکو سے قنات میں بڑا سا شگاف کر دیا، اور ہم لوگ چوروں کی طرح اس شگاف سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بھاگے تو عین پھاٹک کے سامنے سے، آبر نے ہم کو بھاگتے دیکھا تو اُن کے منہ سے چیخ نکل گئی، اور چلّا چلّا کر انھوں نے کہا ارے میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، مہذب شعراء گیدڑوں کی طرح بھاگے چلے جا رہے ہیں۔۔ ارے۔ ارے ارے

اب دوسرا واقعہ بھی سماعت فرما لیجیے ـــ لکھنؤ کا ذکر ہے۔ ایک بار، ہم لوگ، یعنی مولانا صفی، حضرت عزیز، نواب ببّن صاحب بلیغ، منّے میرزا صاحب شزر، محمد صاحب بہار، اور حکیم منے آغا صاحب فاضل، ایک چھوٹے سے میدان کو طے کرکے، حامد علی خان بیرسٹر کی عیادت کو جا رہے تھے کہ دیکھا آبر صاحب، گھوڑا گاڑی پر اُسی طرف چلے آرہے ہیں، مولانا صفی نے ہم سب سے ارشاد فرمایا کہ اے مسیح کی بھیڑوں، اس املی کے تنے کے پیچھے دبک جاؤ، ورنہ یہ آنے والا بھیڑیا سب کو کھا جائے گا۔ ہم سب تنے کی آڑ میں ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے ہوگئے، اور جب اُن کی سواری درخت سے قریب ہوکر گزرنے لگی، اتنے آدمیوں کو ایک درخت کیا چھپا سکتا تھا۔ انھوں نے ہمیں دیکھ لیا، گاڑی رکوا دی، ہماری طرف آنے لگے، ہمارے مُنھ تُھتَھیا کے سے ہوگئے۔

اور جب وہ قریب آگئے، تو ہم لوگ، بڑے مداہنت آمیز تبسّم کے ساتھ، اُن کے مقدم کے واسطے بڑھے، انھوں نے، مُسکرا کر پوچھا، یہ املی کے نیچے کیا ہو رہا

تھا؟ صفی صاحب نے کہا ذرا دم لینے کھڑے ہوگئے تھے، اب یہاں سے حامد علی خان کی عیادت کے واسطے جائیں گے ۔ ابر صاحب نے کہا اس املی کی چھاؤں کے نیچے میری ایک تازہ غزل تو سن لیجئے ۔ یہ سنتے ہی ہم سب بدحواس ہوگئے اور انھوں نے غزل شروع کردی اور ہم واہ واہ سبحان اللہ پر مجبور ہوگئے۔ لکھنؤ کا معاملہ تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھیڑ سی لگ گئی، اور بھیڑ والے بھی داد دینے لگے ۔ اور جب انھوں نے تیسری غزل شروع کردی اور مجمع سے ایک آواز آئی " ارے املی کے نیچے آم پک رہے ہیں" تو مولانا صفی نے کہا۔ راستے میں کلام سنانا لکھنؤ کی تہذیب اور آپ کی شان کے خلاف ہے، ہم سب درِ دولت پر حاضر ہوجائیں گے اور خوب جی بھر کر آپ کے کلام سے فیض یاب ہوں گے، بدمزا ہوکر، جیب میں غزل رکھتے ہوئے ابر صاحب نے کہا تو پھر آپ تمام حضرات کل غریب خانے ہی پر افطار کریں، اور خاصہ بھی تناول فرمائیں ۔ بات پکی ہوگئی نا؟ مولانا صفی نے کہا بالکل پکّی بات، اور ابر صاحب یہ کہہ کر کہ دیکھئے میں آپ کو مولائے کائنات کی قسم دیتا ہوں کہ کل آپ حضرات ضرور تشریف لائیں۔" رخصت ہوگئے۔

جب وہ ہم سے وعدہ لے کر چلے گئے تو صفی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب ہم کو حسبِ وعدہ ابر صاحب کے وہاں جانا اور اس ماہ رمضان میں سولی پر چڑھنا ہی ہے تو یہ کیجئے کہ کل چار سوا چار بجے آپ سب غریب خانے پر آجایئے، ابر صاحب میرے مکان کے قریب ہی گونگے نوّاب کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور ہم سب:
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے "کی صورت سے ایک ٹولی بنا کر چلیں گے۔

دوسرے دن حسبِ قرار داد، ہم سب مولانا صفی کے وہاں پہنچے، انھوں نے کہا آیئے ہم سب آپس میں گلے مل لیں، خدا جانے پھر کبھی ملاقات ہوگی بھی کہ نہیں ۔ اور جب ہم لوگ گلے مل چکے تو انھوں نے زنانے دروازے کی طرف مُنھ کرکے بڑے دردناک لہجہ میں کہا ۔ " بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا " اور جب اندر سے آواز آئی ، ہے ہے ، کیا بات ہے ، ارے جلدی کہئے،

یا مولیٰ مشکل کشا مدد،، تو مولانا صفی نے کہا " ہم سب منشی واحد علی صاحب ابر کا کلام سننے جا رہے ہیں، ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ اور ہنستے ہنستے ہم سب کا بُرا حال ہوگیا۔

حکیم دانش لکھنوی

جسمانی حیثیت سے بے حد کمزور، اور شعری نقطۂ نظر سے، بڑے تگڑے تھے، پہلے اُن کے دو شعر سن لیجئے۔

روئے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے ✓ اک پرانا واقعہ ہے خانہ ویرانی مری
اپنی رفعت پر بہت عرشِ بریں کو ناز تھا ✓ مل گئی، سنگِ درِ جاناں کو، پیشانی مری

مجھ کو آج تک اُن کا آخری مشاعرہ یاد ہے، اس مشاعرے سے کوئی ایک مہینہ پیش تر وہ نابینا ہو چکے تھے، اور اُن کے اس شعر پر:

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو، نہ مے خانے کو ✓ آخری دَور ہے، بھر دے کوئی پیمانے کو

تمام حاضرین رونے لگے تھے اور مشاعرہ مجلسِ عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ لکھنوی تہذیب کے مکمل اور آخری نمونے تھے ـــ ایک روز وہ حضرت عزیزؔ کے وہاں بیٹھے تھے کہ ظریف صاحب آگئے اور آتے آتے انھوں نے کہا، میری جیب کٹ گئی، اور منی بیگ غائب ہوگیا۔

یہ سنتے ہی دانش صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا، زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہا، جوتے پہنے، جریب اٹھائی، اور اٹھ کر جانے لگے، حضرت عزیزؔ نے حیران ہو کر پوچھا حضرت (حضرت) خیریت تو ہے۔ انھوں نے کہا عزیزؔ صاحب خیریت ہوتی تو یہاں سے جاتا کیوں، عزیزؔ صاحب اور تمام لوگ کھڑے ہوگئے اور پوچھا للہ کچھ تو بتایئے کہ ماجرا کیا ہے؟

انھوں نے کہا عزیز صاحب، لکھنؤ کا سا شہر، اور پھر آپ کی محفلِ ادب، اور وہاں فحاشی ہونے لگے۔

ظریف نے کہا قبلہ وکعبہ یہ آپ فرما کیا رہے، انھوں نے، ظریف صاحب کی طرف نظر اٹھا کر پوچھا آپ نے یہاں آتے ہی کیا ارشاد فرمایا تھا؟ ظریف نے کہا میں نے آکر یہ سانحہ بیان کیا تھا کہ میری جیب کٹ گئی۔ اور منی بیگ غائب ہوگیا، یہ سنتے ہی انھوں نے کہا نعوذُ باللہ، نعوذ باللہ " عزیز صاحب اس نکتے کو پا گئے، انھوں نے کہا حکیم صاحب انگریزی میں روپے کو "منی" کہتے ہیں۔ انھوں نے، بات کاٹ کر کہا، حضت انگریزی سے ہمیں کیا غرض، ہماری زبان میں تو یہ لفظ فحش ہے۔ لکھنؤ میں اور فحاشی، استغفراللہ، استغفراللہ" کہتے ہوئے صاحب سلامت کئے بغیر وُہ فوراً چلے گئے۔ ظریف اپنا سا مُنھ لے کر رہ گئے۔ اور حضرت عزیز ان کی طہارتِ زبان پر سر دُھننے لگے۔

ایک روز انھوں نے مجھ سے پوچھا، صاحب زادے آپ کہاں رہتے ہیں، میں نے کہا لاٹوش روڈ کی گلی میں، انھوں نے لاٹوش روڈ سن کر مُنھ پیٹ لیا۔ کہنے لگے میاں آپ کا سا شیریں مقال اور رہے ان ثقیل حروف کے اندر، جہاں خیر سے "ٹ" بھی ہے "ڑ" بھی ہے اور "ڈ" بھی لا ٹھونش ڑوڈ" جب تک آپ ان حروفِ ثقیل کے اندر رہیں گے، میں آپ کے پاس ہرگز ہرگز نہیں آؤں گا" لا ٹھونش ڑوڈ" معاذاللہ لا ٹھونش ڑوڈ ـ توبہ، توبہ، استغفراللہ!

نواب رستم علی خاں مہر

وہ میری ماں کے بڑے بھائی اور میرے ماموں[1] تھے، جب میں نے چاہا کہ ان پر قلم اٹھاؤں، تو میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا، آپ اُن کے حالات شوق سے لکھیں، مگر ان کا نام تحریر نہ کریں، صرف "ایک نواب صاحب" لکھیں، اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ آپ کے ماموں تھے، ورنہ دونوں کی بے عزتی ہو جائے گی،

لیکن یہ سوچ کر میں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کہ ماموں کے عیب سے بھانجا متاثر نہیں ہو سکتا، اور ماموں کا عیب تو ایک قطعی نفسیاتی بیماری کا نتیجہ تھا اور نفسیاتی بیماری کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میں نے اُن کا نام اور اپنا رشتہ بیان کرنے میں پس وپیش سے کام نہیں لیا،

وہ ریاست دھول پور کے سب سے بڑے جاگیر دار تھے۔ ان کی شادی نواب صاحب رامپور کے خاندان کی دلبری بیگم سے ہوئی تھی، جو شادی کے کچھ روز کے بعد، ماموں سے روٹھ کر رام پور چلی گئی تھیں، اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئیں۔

ماموں جان شاعری میں میر نفیسؔ اور درسیات میں مفتی میر محمد عباس کے شاگرد تھے، رئیسوں کو بالعموم علم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، مگر وہ علم کے پرستاروں میں

---

[1] میرے تین سوتیلے ماموں نواب محمد اکرم علی خان اور نواب محمد احسن علی خان تھے، افسوس کہ اُن سب کا انتقال ہو چکا ہے، ان میں سے میرے بڑے ماموں اکرم علی خان کی شادی ایک ہز ہائی نس کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی، وہ ممانی بھی اب دنیا سے سدھار چکی ہیں۔

سے تھے، فارسی، عربی، ہیئت، منطق، حکمت، موسیقی، تاریخ، تفسیر، احادیث علم کلام، اسمار الرجال، طب اور کیمیا پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا، کہ بڑے بڑے علمار و صوفیار ان سے فیض حاصل کیا کرتے تھے، اسی کے دوش بدوش وہ اسقدر متقی بھی تھے کہ کبھی اُن کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی، اور سحری کے بغیر ہمیشہ تیسوں روزے رکھا کرتے تھے،

اُن کے سر پر پٹے، اور منھ پر گھنی داڑھی تھی، جسے کبھی ایک بار بھی نہیں منڈایا تھا،

وہ سنّی سے شیعہ ہوگئے تھے، تعزیہ داری، مرثیہ گوئی اور عزاداری میں ان کو بیحد غلو تھا، عمر کے آخری حصے میں وہ صوفی ہوگئے تھے، اور ہندوستان بھر کے عُرسوں میں بڑے خشوع و خلوص کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے، لیکن علم کی اس جامعیت اور تقشف کی اس شدت کے باوجود، اُن کو بیحد شوق تھا دروغ گفتاری کا۔ آغازِ تاریخ سے لے کر اس عالمِ کون و فساد میں جس قدر بھی دروغ گو انسان ہو چکے ہیں، وہ اُن سب سے قطعی طور پر مختلف تھے، ان کی دروغ گوئی کسی مادی فائدے کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذّات تھی، یعنی دروغ اُن کا ایک ایسا عجیب گھوڑا تھا، جس پر وہ قطع مسافرت کے لئے نہیں، بلکہ فقط جلبِ مسرّت کے واسطے سوار ہوتے، اور سود کے بجائے زیاں حاصل فرمایا کرتے تھے، اور اِسی جذبے کے تحت وہ ہر سال بجٹ بناتے، اور اِس میں مبلغ شش ہزار سالانہ "برائے پرورشِ کذب" کی بھی ایک مد ہوا کرتی تھی، اب میں آپ کو ان کے چند واقعے سناتا ہوں، جس سے "برائے پرورشِ کذب" کی بات سمجھ میں آجائے گی،

ایک بار وہ ملیح آباد تشریف لائے، میں نے اپنے ایک دوست مختار احمد خان کی پریشانی کا حال اُن سے کہا۔ اُنھوں نے فرمایا۔ مختار کو بلاؤ، مختار آئے تو انھوں نے بگڑ کر، کہا۔ تو بیحد نالائق ہے، تو نے آج تک مجھ سے اپنی پریشانی کا حال نہیں کہا، تیرا باپ میرا دوست ہے، میری زندگی میں اور تو مصیبت اُٹھائے، یہ ہو نہیں سکتا،

میں اجمیر شریف سے ہوتا ہوا دسمبر کی سترہویں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا، تو اٹھارویں کو دھول پور آجانا۔ میں تجھ کو آٹھ دن کے اندر مہاراجہ دھول پور کی سرکار میں نوکری دلا دوں گا۔ مختار نے اُن کی اس بےحد شفقت سے متاثر ہو کر اُن کا شکریہ ادا کیا، اور یہ وعدہ کر کے کہ میں اٹھارہویں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی انھوں نے مجھے حکم دیا کہ مختار کو دوبارہ بلا بھیجو۔ مختار سامنے آئے تو انھوں نے کہا، پہلی نالائقی تو تُو نے یہ کی کہ مجھ سے اپنا حال نہیں بتایا، اور تیری دوسری نالائقی یہ ہے کہ تُو نے مجھ سے کرایہ طلب نہیں کیا۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے خادمِ خاص محمد کو آواز دی اور اُس سے کہا، میاں مختار کو دو سو روپے لا دو، اُن کی اس بے کراں سرپرستی سے مختار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور جب مختار اٹھنے لگے تو انھوں نے بطورِ تاکید کہا دیکھ بیٹا سترہویں کو ضرور دھول پور پہنچ جانا، یہ کہتے ہی انھوں نے اپنا منھ پیٹ لیا، اور توبہ توبہ کر کے فرمایا، میں نے جلدی میں سترہویں کہہ دیا، یہ بات منھ سے غلط نکل گئی۔ اللہ اس غیر ارادی جھوٹ کو معاف فرمائے۔ دیکھ، سترہویں کو نہیں، اٹھارہویں کو دھول پور پہنچ جانا، سمجھ گیا؟ سترہویں کو نہیں، اٹھارہویں[1] کو آجانا، اور اس یقین کے ساتھ آنا کہ آٹھویں دن تو ضرور نوکر ہو جائے گا۔

مختار ٹھیک اٹھارویں دسمبر کو دھول پور پہنچ گئے، کوٹھی کے ایک آراستہ کمرے میں ان کو ٹھہرا دیا گیا، دو خدمتگار ان کے واسطے مختص کر دیئے گئے، نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا اور ناشتہ آنے لگا، اور ایک سواری مختص کر دی گئی ان کی سیر کے واسطے، — اب کیا تھا، مختار رئیسانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اور نواب صاحب نے اِس بات کا مزہ لینا شروع کر دیا کہ مختار کو یقین ہے کہ میں اس کو آٹھ دن کے اندر ملازمت دلا دوں گا حالاں کہ میں اس کو نوکری دلواؤں گا ہی نہیں۔

جب مختار کو دھول پور آئے ہوئے آٹھواں دن ہو گیا، تو وہ صبح ہوتے ہی طیّار

---

[1] یہ شدت اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ یہ بات مختار کے دل میں ترازو ہو جائے کہ وہ کس قدر شدت کے ساتھ راست گفتار آدمی ہیں۔

ہو کر بیٹھ گئے کہ آج نواب صاحب ضرور نوکری دلا دیں گے، لیکن جب شام ہوگئی تو انھیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب آگرے تشریف لے گئے ہیں۔

اور جب اِس متواتر شش و پنچ میں چار مہینے گزر گئے تو مختار نے جی کڑا کر کے نواب صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا، نواب صاحب نے کہا، کیا کروں استخارہ نہیں آرہا ہے، جس دن استخارہ آجائے گا اس دن تم نوکر ہو جاؤ گے۔ مختار نے کہا، میں تو آپ کے سائے میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں، لیکن میرے اہل و عیال۔۔۔ یہ سُنتے ہی نواب صاحب نے چھاتی پیٹ لی، کہا، مجھ سے بڑی چُوک ہوگئی، یہ کہتے ہی محمد کو حکم دیا کہ جب تک میاں مختار کی نوکری نہیں لگتی دو سو روپے ماہانہ ان کی بیوی کے نام منی آرڈر کرتے رہو،

مختار کے سر سے بڑا بار اُتر گیا، اور نواب صاحب ہر رات کو تکیے پر سر رکھکر اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ مختار کو اس کا یقین کامل ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو نوکر رکھا دوں گا۔ حالاں کہ میں اس کو کبھی نوکر رکھاؤں گا ہی نہیں۔

الغرض آٹھ آٹھ دِن کے وعدوں اور استخارے کی اُمید دن پر انھوں نے کچھ اوپر دو برس تک مختار کو اپنے گھر مہمان رکھا اور، ہر ماہ اُن کے گھر منی آڈر بھی جاتا رہا۔

اور آخرکار اُن کو اس نیم کے نیچے لیجا کر، جس کو آخری جھوٹ سینچا کرتا تھا[1] انھوں نے مختار کو ایک ہزار روپے دے کر کہا تم کچھ روز کے لئے اپنے بال بچّوں سے مل آؤ، استخارہ آتے ہی میں تم کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دلا دوں گا۔

اور جب مختار چلے گئے تو وہ تکیہ پر سر رکھ کر اس بات کا مزا لینے لگے کہ مختار کو یقین ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دِلا دوں گا، حالاں کہ یہ ایک امرِ طے شدہ ہے کہ میں اس کو نوکری دلاؤں گا ہی نہیں،

صرف مختار ہی نہیں سیکڑوں آدمی اس طرح اُن کے گھر مہمان رہے۔ اور بعض تو آٹھ

---

[1] ان کے بعد وہ نیم خشک ہو کر رہ گئی

کا مزہ لوٹنے لگے کہ یہ بیوقوف مجھ کو اپنا عاشق سمجھ رہی ہے، حالاں کہ میں اس کا عاشق ہوں ہی نہیں۔ اور پھر اس "حالاں کہ" کا مزید لطف اٹھانے کے لئے انھوں نے اس سے فرضی نکاح بھی کر لیا، اور اس کو اس کے بیٹے، بھانجی بھانجے سمیت لے کر ڈھول پورے آئے اس کو اپنے گھر کے سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا، لیکن چوں کہ وہ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند تھے، انھوں نے اسے کبھی ہات تک نہیں لگایا۔

وہ طوائف تادمِ مرگ کوئی پچیس تیس برس تک اُن کے گھر بھر پر مسلّط، اور اُن کے مال ومتاع پر قابض رہی، اور وہ اس پچیس تیس برس کی طویل مدت تک اس کا مزا لیتے رہے کہ اس طوائف کا بیٹا مجھ کو ابا جان کہہ رہا ہے اور وہ طوائف مجھ کو اپنا شوہر سمجھ رہی ہے حالاں کہ میں اس کے لڑکے کا ابا جان ہوں نہ اس طوائف کا شوہر۔

کیا یہ کرّہ ارض، اور یہ عالمِ کون وفساد، اپنی تمام حیرت ناکیوں کے باوجود اس نوعیت کے کذب کی کوئی نظیر پیش کر سکتا ہے۔؟ اور کیا تمام نوعِ انسانی میں سے ایک فرد بھی، آج تک ایسا گزرا ہے جس نے علم وفضل اور تقشّف وطہارت کے باوجود، دروغ بافی سے اس قدر لطف اٹھایا ہے۔؟ شنوم فدائے دروغے کہ راست مانند است!

چھدّو خاں

ملیح آباد کے بڑے زمینداروں میں سے تھے، زندگی بھر ریل میں نہیں بیٹھے، جب کبھی مقدمات کی پیروی کے لئے لکھنؤ، یا اپنے موضع کی "تحصیل وصول" کے واسطے شاہجہاں پور جاتے تو ادّھے[1] پر سفر کیا کرتے تھے، آگے آگے اُن کا ادھا ہوتا تھا، اُس کے پیچھے تین اَدھے اور ہوتے تھے، جن پر کھانے کا سامان، بکرے، اور سپاہی لدے ہُوا کرتے تھے، — لاکھ لاکھ لوگوں نے سمجھایا کہ ریل پر سفر کیا کیجیے، مگر انھوں نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی، اور ہمیشہ یہ کہا کہ خاں صاحب! جو سواری ہمارے اشاروں پر نہیں چل سکتی اس پر بیٹھنا بیکار ہے۔

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جو شخص ان کے غُصّے، جھڑکی یا گالی کا فوراً جواب نہیں دیتا تھا، اس کو وہ پٹھانوں کے زمرے سے خارج کرکے اس سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے۔

اور تیسری خصوصیت یہ تھی کہ جو ملازم ان کے پکارتے ہی، دو سیکنڈ کے اندر اندر حاضر نہ ہوجائے وہ اسے چھڑا دیا کرتے تھے، اور اسی بنا پر "نادرشاہی" حکم کی طرح "چھدّو خانی" حکم دور دور تک مشہور تھا۔

اُن کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ جب کوئی پٹھان اُن کے پاس، نوکری کے

---

[1] چھوٹی بیل گاڑی

لئے آتا تھا، وہ مسکرا کر، اس سے پوچھتے تھے کہ آپ خدمت گاروں کے زمرے میں آسکیں گے،؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ ہم پٹھان ہیں، خدمت گاری سے تو ہمارے باپ دادا بھی نہیں واقف۔ تو وہ خوش ہو جاتے، اس کے متعلقین کے باب میں دریافت کرتے کہ وہ سب کس قدر ہیں، اور جب معلوم ہو جاتا تو اس کے بال بچوں کی تعداد پر نگاہ کرکے، وہ اس کی اسی قدر تنخواہ مقرر کر دیا کرتے، اور، چوں کہ خشک[1] تنخواہ کے وہ قائل نہیں تھے اس لئے وہ پوچھتے تھے کہ خاں صاحب آپ کتنی روٹیاں، کتنی دال اور کس قدر گوشت کھائیں گے، اور کتنا دودھ پیئیں گے؛ اور جب وہ جواب دیتا کہ میں آٹھ روٹیاں اور پاؤ بھر گوشت کھاؤں گا، اور آدھ سیر دودھ میں میرا کام چل جائے گا، تو وہ اپنے منشی قمرالدین خاں کو حکم دیا کرتے تھے، "قمری، دارو" یعنی اے قمرالدین خان اس کا نام فہرست ملازمان میں درج کر لو، مع خوراک۔

ایک بار اُن کی بیوی نے کہا کہ جس سپاہی کی روزانہ آٹھ روٹیاں مقرر کی گئی تھیں اس کے دسترخوان سے آج ایک روٹی بچ کر آگئی ہے ــ وہ یہ سن کر باہر آئے، اس سپاہی کو بلایا اور کہا، خاں صاحب، آج آپ نے ایک روٹی کم کھائی ہے، یہ بات ہمارے آپ کے معاہدے کے خلاف ہے، سپاہی نے کہا، حضور آج میری طبیعت خراب تھی، انھوں نے کہا، نہیں کھا سکتے تھے تو اپنی بچی روٹی گھر لے جاتے، یہ کہہ کر انھوں نے اپنے منشی قمرالدین خاں کو پکارا اور ان سے کہا، "قمری، یہ خاں صاحب نہ دارد" (یعنی برخواست کر دیئے گئے)۔ سپاہی نے، بڑی لجاجت سے کہا، حضور، مجھے "نہ دارد" نہ کریں، انھوں نے کہا خاں صاحب آپ نے معاہدہ توڑ ڈالا آپ پورے ایک ماہ تک "نہ دارد" رہیں گے، ایک ماہ بعد پھر "دارد" ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ انھوں نے خدمت گار کو پکارا، خدمت گار دو تین منٹ کے بعد آیا، انھوں نے پوچھا دیر کیوں کی، اس نے کہا پانی بھر رہا تھا، انھوں نے کہا میرے پکارتے ہی تم پر یہ بات لازم ہوگئی تھی کہ رسی کو فوراً ہاتھ سے چھوڑ کر دوڑ پڑتے

---

[1] تنخواہ بے خوراک [2] وہ "دارد" اور "نہ دارد" کے الف کو پورا کھینچ کر زبان پر لاتے تھے "داآرد" اور "نہ داآرد"

اتنا کہہ کر انھوں نے حکم دیا " قمری، یہ خدمت گار نہ دارد"

وہ سال میں تین مرتبہ غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے، ایک بار انھوں نے تمسخر کے طور پر، کسی غریب آدمی سے پوچھا، کبھی ایسا کھانا تمہارے باپ نے بھی کھایا تھا؟ اس نے کہا ـــ میرا باپ جو کھانا کھاتا تھا وہ آپ کے باپ نے بھی نہیں کھایا ہوگا، انھوں نے پوچھا۔ تمھارے باپ کیا کھاتے تھے؟ اس نے کہا جوار کی سوکھی روٹی اور چٹنی، وہ ہنس پڑے اور کہا تم سچ کہتے ہو۔ اگر تم مجھ کو پلٹ کر جواب نہ دے دیتے، میں تم کو ابھی ابھی نکلوا دیتا۔

ایک مرتبہ ان کے ایک خدمت گار نے آکر اُن سے کہا کہ حضور آپ کے رحیم الدین خاں سپاہی آج یہ کہہ رہے تھے کہ چھدّو خاں کی نادر شاہی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، اب کی تنخواہ مل جائے تو میں اُن کی نوکری چھوڑ دوں گا، اور نہ چھوڑوں تو میرے نطفے میں فرق ہے ـــ یہ سن کر انھوں نے رحیم الدین خاں کو بلایا، اور کہا خاں صاحب! آپ کی مستعدی سے ہم بہت خوش ہیں، آج سے آپ کی تنخواہ دُگنی کر دی ہے مزے سے رہئے، اور پکار کر کہا، " قمری، یہ خاں صاحب آج سے دگنے دارد" سپاہی خوش ہوگیا، اور بیحد جی لگا کر کام کرنے لگا، اور جب وہ ایک مہینہ کام کر چکا انھوں نے اسے بلا کر دونی تنخواہ دے دی، اور قمرالدین خاں سے کہا " قمری، رحیم الدین خاں آج سے نہ دارد" رحیم الدین خاں نے پوچھا، حضور میری کیا خطا ہے، تو انھوں نے کہا آپ نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ اب چھدّو خاں کی نوکری کروں تو میرے نطفے میں فرق ہے، لیکن جب میں نے تنخواہ دونی کر دی، تو آپ نے لالچ میں آکر اپنے پر گالی چڑھالی، بس اب آپ جائیں" قمری، "نطفے کا فرق" نہ دارد"

ایک بار ان کے سپاہی نے شکایت کی کہ حضور پرسوں سے میرا دودھ نہیں آرہا ہے، وہ غصے میں بھرے گھر پہنچے، اور اپنی بیوی سے، گرجتی آواز میں کہا اشرف[1] کی ماں، تم نے حیدر خاں کا دودھ بند کر دیا ہے؟ ان کی بیوی نے کہا کیا کروں، تین

---

[1] بیٹے کا نام

بھینسوں نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے ۔ صرف ایک بھینس دودھ دے رہی ہے اس کا دودھ کثرت کے بعد اشرف پی لیتا ہے ۔ انھوں نے کہا اشرف خاں دودھ پئیں اور دآّرد کو دودھ نہ ملے، اچھا ابھی چھٹی کا دودھ یاد دلائے دیتا ہوں، باہر آکر انھوں نے للکار کر کہا " قمری چاروں بھینسیں نہ دآّرد " قمرالدین خاں حیرت سے ان کا منھ تکنے لگے ۔ انھوں نے کہا میرا منھ کیوں تک رہے ہو، قمرالدین خاں نے کہا، بھینسوں کا نہ دارد میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے ۔ انھوں نے کہا، اس کے یہ معنی ہیں کہ فوراً قصائیوں کو بلاؤ اور چاروں بھینسوں کو ذبح کرا ڈالو، قمرالدین خاں ان کے بڑے پرانے خیر خواہ تھے، انھوں نے کہا بھینسوں کو کس خطا میں ذبح کر ڈالا جائے گا. انھوں نے کہا اشرف کی ماں نے ہمارے " دآّرو کا دودھ نہ دآّرو کر دیا ہے. اس لئے ساری حرام زادی بھینسیں" نہ دارد " قمرالدین خاں لاکھ لاکھ چیختے رہے، مگر انھوں نے چاروں بھینسیں ذبح کرا کے اُن کا گوشت غریبوں میں، کھڑے کھڑے، تقسیم کرا دیا ۔

ایک دن وہ اپنے باغ میں بیٹھے، قمرالدین خاں سے باتیں کر رہے تھے، کہ ان کے بیٹے، اشرف خاں نے آکر سلام کیا، انھوں نے پوچھا لکھنؤ ہو آئے، بیٹے نے کہا، جی ہاں، ابھی ابھی لکھنؤ سے آیا ہوں، اور آپ کو سلام کر کے گھر جاؤں گا. اتنے میں اُن کی نظر، بیٹے کی جوتی پر پڑ گئی، جامے سے باہر ہو کر پوچھا اس جوتے کا نام کیا ہے ۔ بیٹے نے کہا. باوا اس کا نام ہے" ڈاسن " انھوں نے کہا پٹھان کا پوت اور یہ زنخی جوتی، اس جوتی کی ماں کی ۔ ۔ ۔ ۔ " قمری، نکال چاکو، اور ٹکڑے ٹکڑے کر دے اس چھنال جوتی کے ۔ یہ ڈاسن کی جوتی اشرف کی پھنولی کو ڈس لے گی اور جوتی کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر، جب اشرف خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو انھوں نے کہا ۔ ابے زنخے جورو کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دور ہو جا میری نظروں سے ۔ اور جب اشرف خاں سر جھکا کر اندر چلے گئے تو انھوں نے کہا " قمری، اشرف نہ دآّرد " قمرالدین خاں اُچھل پڑے ۔ اُن کا منھ کھُلا کا کھُلا رہ گیا ۔ پوچھا خان صاحب بہادر بیٹا اور "نہ دارد " یہ ہو

کیونکر سکتا ہے، انھوں نے کہا وہ نہ دارد ہوسکتا ہے عاق ہو جانے کے بعد، قمرالدین خان نے کہا، اتنی ذرا سی بات پر، انھوں نے کہا، یہ ذرا سی بات ہے؟ میں نے اسے گالی دی، اس نے پلٹ کر جواب نہیں دیا، قمرالدین خاں اُن کی ضد سے واقف تھے، دوڑے ڈیوڑھی پر گئے، اور لونڈی سے کہا، بڑا غضب ہوگیا، خان صاحب بہادر اشرف خان کو عاق کردینے پر تُل گئے ہیں، جلدی بی بی کے پاس جاکر وہ انھیں گھر بلا کر سمجھا دیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا، لونڈی نے ڈیوڑھی سے پکار کر کہا، میاں آپ کو بیوی بلا رہی ہیں۔ وہ اندر گئے، تو بیوی نے سر پیٹ کر کہا، ہے ہے، یہ کیا اندھیر ہے۔ ایک نگوڑی جوتی پر بچے کو عاق کئے دے رہو۔ انھوں نے کہا یہ نگوڑی جوتی کی بات نہیں، میں نے اُس کو گالی دی، وہ پی گیا، پلٹ کر مجھ کو گالی نہیں دی، اگر وہ اصلی پٹھان ہوتا تو فوراً مجھے بھی گالی دیتا۔ ان کی بیوی نے کہا ارے یہ تو سوچو، بیٹا باپ کو گالی کیسے دے سکتا ہے۔ اُنھوں نے کہا یہی تو تمھاری بھول ہے پٹھان، باپ تو باپ، اللہ کی گالی کو بھی برداشت نہیں کرسکتا، اشرف سے کہو، مجھے پلٹ کر گالی دے، نہیں تو، اُن کی بیوی نے منھ پیٹ کر بیٹے سے کہا ارے تو بھی گالی دے دے، جب بیٹے نے پس و پیش کیا تو انھوں نے کہا دیکھ ایک۔ دو۔ تین، کہتا ہوں، اگر تین پہ گالی نہیں دے گا تو اپنی سات پشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کھڑے کھڑے عاق کردوں گا، یہ کہہ کر انگلی اٹھائی اور کہا۔ ایک۔ بیٹا چپ رہا۔ پھر انھوں نے کہا۔ دو۔ ان کی بیوی نے بیٹے کے منھ پہ تھپڑ مار کر کہا، دے دے گالی، نہیں تو دودھ نہیں بخشوں گی اور جب انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ انگلی اور سر اُٹھا کر کہا۔ تین۔ تو اشرف خان نے کہا "ابے تر نخے جورو کے ......" تو انھوں نے دوڑ کر، بیٹے کو گلے لگا لیا، منھ چوما اور پیٹھ ٹھونک کر کہا، تو پٹھان۔ تیرا باپ پٹھان۔ تیرا دادا پٹھان ـــــ اور گھر سے نکل کر بڑی گرجتی آواز میں کہا قمری، اشرف دارد۔

میرے مُعاشقے

گویند ذکرِ خیرش، در خیلِ عشق بازاں

ہر جا کہ نامِ حافظ، در انجمن در آید !

ذَردا ــ کہ رازِ پنہاں ، خواہد شد آشکارا !

طالعِ شہرتِ رُسوائیِ مجنوں، بیش است
ورنہ، طشتِ من و اُو ــ ہر دو، زِ یک بام افتاد!

دَردِ عشقے، کشیدہ اَم — کہ مَپرس
زہرے ہجرے چشیدہ اَم — کہ مپرس

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں رِندِ ازلی، بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا، اور میرے باپ نے مجھ کو، اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ، پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اُس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے۔

اور اُسی بناء پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی — اور کسی مردانہ جراءت کا تو ذکر ہی کیا، مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہو گیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا، تو دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں۔

اور :-

گوری — دھیرے چلو، گگریا چھلک نہ جائے

کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔

میرے انتہائی شرمیلے پن کے سیکڑوں واقعات میں سے، فقط ایک واقعہ سُن لیجئے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں، نام خدا، کس حد تک شرمیلا تھا۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، میرے باپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے کہ ایک روز، شام کے وقت میرے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک رنگین مزاج، تماش بین قسم کے، سپاہی، سبحان علی خاں، عرف سُبحَن نے مجھ سے کہا منجھلے بھیّا، چلیئے آج آپ کو چوک گھما لائیں۔

میں ان کے ساتھ ہو لیا اور وہ مجھ کو لئے ہوئے، ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ گئے —— طوائف پر نظر پڑتے ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ بلا کی حسین تھی، میں

قیامت کا شرمیلا ، اس کی جوانی بھرپور ، میں شرم سے چکنا چور ــــ میرے اندر چھپے ہوئے شاعر نے کہا ، اس کے مکھڑے سے نظریں نہ ہٹاؤ ، اور میری تربیت نے حکم دیا کہ آنکھیں نہ ملاؤ ــــ تربیت کا حکم غالب آیا ، اور میں ہڑبڑا کر فرش پر بیٹھ گیا ، میری لانبی لانبی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور فراوانیِ شرم سے اس کے کمرے کے قالین کے ریشے نوچنے لگا۔

طوائفوں کے مجرے تو بارہا دیکھ چکا تھا ، لیکن طوائف کا حجرہ ابھی تک نہیں دیکھا تھا ، اس لئے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔

طوائف تو چنچل چلبلے ، چناخ پٹاخ تماش بینوں کی خوگر تھی ، مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگی جس طرح کوئی سلوتر گھوڑے کو آنکتا ہے۔

تھوڑی دیر تک تو وہ مجھے گھورتی رہی ، لیکن جب میں ٹس سے مس ہی نہیں ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا اور اپنا ماتھا اوپر چڑھا کر اُس نے کہا" اے ہے صاحب زادے میرا تو نگوڑا جی اوبھا جا رہا ہے ، اے اللہ کچھ تو مُنھ سے بولئے ، سر سے کھیلئے۔

اس کے اس کہنے سے میں اور بھی شرما گیا۔ اور میری ، قالین کے ریشے نوچنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔

سُجن نے کہا" منجھلے بھیا " میں نے ہات کے تحکمانہ اشارے سے انھیں روک دیا۔ اب وہ طوائف میرے قریب آگئی ، میری ٹھڈی میں ہات ڈال کر ، کہا " ہے ہے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ کر آئے ہیں آپ ، ارے للہ کچھ تو بولئے ، میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے " اس کی اس التجا سے مجبور ہو کر آپ جانتے ہیں ، میں نے کیا جواب دیا؟ نہیں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے ، سنیئے مجھ سے۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا ، اور شیشے کی طرح درکتی آواز میں ــــ رُک رُک کر اس سے کہا کہ ایک مہینے کے بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے ، اللہ سے دعا کیجئے کہ میں پاس ہو جاؤں۔

میری یہ التماس سُن کر طوائف ، ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی ، اور سُجن بھی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے ــــ میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔

طوائف نے ہنسی کے دورے سے نجات پائی تو میری طرف بڑی شوخی سے نگاہ اٹھائی اور کہا، صاحب زادے یہ طوائف کا کوٹھا ہے، خواجہ غریب نواز کی درگاہ نہیں ــــ اور میرے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

جس طرح ایک چانول کو دیکھ کر، پوری دیگ کا پتا چلا لیا جاتا ہے، اسی طرح ــــ مندرجۂ بالا، ایک واقعے سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میری اٹھان کیسی تھی۔

جی ہاں، میرے باپ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، مجھ کو "وہ" بنا دینے میں جس کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں "جوانِ صالح" اور اہلِ نظر کی زبان میں "مُخَنَّث" کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں، جس کو اللہ رکھے، اسے کون چکھے، میرے باپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت و غیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں ــــ مطرب کو چھوڑ کر، موذن سے دل لگاؤں، مکھڑوں کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں، صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کر، استنجوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرۂ نسب ملاؤں۔ شراب کے پیمانوں میں تیرنے کے بدلے، وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں، اور کالی زلفوں کی گھنیری چھاؤں سے بھاگ کر، سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں۔

کس قدر صادق آتا ہے یہ شعر مجھ پر ــــ

کوئی کمی نہ کی تھی، دلِ بے قرار نے
مجھ کو بچا لیا، مرے پروردگار نے

اب سنیئے میری گھٹن کیوں کر دُور ہوئی، اور قوت و حیات کی بے پایاں شفقت نے "اندک اندک عشق، درکار آوَرد بیگانہ را" کے طور پر، مجھے کس حکیمانہ توقف و تدریج کے ساتھ، فردوسِ ادب کی جانب موڑا۔

سب سے پہلے میرے ذوقِ جمال کو مرتب و مہذب بنانے کی نیت سے، اس نے افق کا گریبان پھاڑ کر نازل کر دیا مجھ پر طلوعِ صبح کا قرآن ــــ اب کیا تھا، مشرق کی

زرّیں دھاریوں سے اترنے لگے میرے ذہن پر آیات ۔ پھولوں کے امواجِ رنگ و بو سے اڑنے لگے میرے سر پر جبریل ۔ مرغانِ سحر کے چہچہوں سے گونجنے لگے میری محرابِ وجود میں نغماتِ داؤد ۔ اور آنے لگی ہر طرف سے یہ آواز کہ ؎

ادب سے دیکھ چمن میں بہار پھولوں کی
جھلک رہی ہیں پیشانیاں رسولوں کی

اسی کے دوش بدوش اس نے سیپیوں، قمقموں، جھاڑ کے قلموں، حریر و پرنیاں کے تھانوں، انگیٹھیوں کے انگاروں، چاندی کی ریزگاریوں، سونے کی اشرفیوں، اور تتلیوں کے پروں کی دھاریوں پر جمادیں میری نگاہیں۔

پھر وہ لے آئی میرے سامنے چاندنی راتیں، دمکتے ستارے، جھلکتے چاند بھری برساتیں، کالی گھٹائیں، کوُکو، پی ہو کی صدائیں، اور رم جھم رم جھم کی بھیگی ہوائیں۔

اور جب خیر سے بھیگ گئیں میری مسیں، تو اس معلمہ نے موڑ دیئے میری جانب کاکل و رخسار کے گنگا جمنی دھارے ۔ کڑکا دی میرے سر پر نوخواستہ جوانیوں کی زرّیں کمانیں ۔ اور چلانے لگی میرے دل پر شامِ اودھ اور صبحِ بنارس میں ڈھلے ہوئے نکیلے مکھڑوں کے بان ۔

اور پھر ؎

حُسنِ جنید، زخواب دمژہ برہم زد
فتنہ بر باشد و نشتر برگِ آدم زد

کے بعد میری عملی تربیت کا آغاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ، ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک پٹاخا سی کم سن اور بلور اندام طوائف، مجرے کے لئے آئی ۔ اس کے گالوں کی جلد بنارسی ساری کے مانند باریک تھی ۔ ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈا کورا ہے اور اس کے تلوے میں ہلکا سا جھول پڑنا شروع ہو گیا تھا ۔ معاذ اللہ !

جب اس کی نشیلی انکھڑیوں میں کھلا نرت کا باب، میرے تارِ وجود پر مچلنے

لگی مِضراب ۔ اور جب ناچتے ناچتے وہ بالکل میرے قریب آئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی شربتی پیش واز کا ملائم سرا میرے ہات کی پشت سے مَس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں تیزی کی لہر دوڑ گئی ۔ اُٹھنے لگی ایک بھاپ سی میرے مسامات سے، ہوا سنکنے اور پوسی پھٹنے لگی میرے جسم کے اندر ۔

اک دامنِ حریر کے لمسِ خفیف سے

لَو دے اُٹھا ہے خونِ رگِ جاں کبھی کبھی

یہ تھا میرا پہلا آپریشن ۔ جو برگِ یاسمین کی دھار سے کیا گیا تھا اب سنیئے دوسرا واقعہ ۔ لڑکپن سے لے کر جوانی تک مجھ پر دردِ سر کا دورہ پڑا کرتا تھا، ایک دن، جب دردِ سر کا دورہ پڑا، تو رجیا میرا سر دبانے لگی ۔ وہ کھڑی بیل کی سرو قامت، شہابی رنگ والی چودہ برس کی رجیا، ہمارے گھر کے چوکیدار بدلوگدی کی بیٹی تھی ۔

سر دبانے میں وہ بار بار جو میرے منہ کی طرف جھکی تو اس کی سانسوں کی کچی خوشبو میرے دل میں چبھنے لگی، اور اس کی ملائم ملائم ہتیلیوں کی میٹھی گرمی، ایک ایسے جزیرے میں لے گئی مجھ کو، جہاں پکے اناروں پر بھونرے منڈلا رہے تھے ۔ اور سینکڑوں قوسِ قزح کی سی بانہیں میری گردن میں پڑتی چلی جارہی تھیں ۔ اور اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد، میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا میری پور پور میں ۔ میں نے رجیا کی طرف نظر اٹھائی، اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، اور ابھی اس کی آنکھوں کے ڈوروں کی زبان کھلی ہی تھی کہ میری ماں کی مغلانی عباسی خانم آگئیں اور وہ طلسم پل بھر میں، ٹوٹ کر رہ گیا ۔ جنابِ والا، یہ طلوعِ صبح کی جگمگاہٹوں سے لے کر، رجیا کی ہتیلیوں کی گرماہٹوں تک کے تمام واقعے تو ایسے تھے جیسے ڈھیلے ہاتوں کی مار ۔ اب سنیئے گھَن کا ماجرا ۔

ایک دن، جب گلابی جاڑے کی نویلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر، حسبِ دستور محوِ خواب، اور میں حسبِ عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کی ہری بھری نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب کی کوٹھری میں رہنے والی

جُونٹی لونڈی ظہورن، میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مجھے گھورنے لگی۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم، رنگین سی ملگجاہٹ ہے ـــــ اس کے ہونٹوں کے ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضیٰ ہے اور اس کا ٹھڈی تک اُبھرا سینہ، گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے ـــ تو میں نے پوچھا "ظہورن کیا بات ہے"۔ اس نے کہا " اے جرنیلی ٹوپی کے منجھلے بھیّا، میری کوٹھری میں ذری چلے چلو تو بات بتاؤں ـــ میری کوٹھری بڑی گرم گرم[1] ہے۔

مروّت کے مارے انکار نہیں کر سکا۔ وہ آگے آگے چلی، اور میں اس کی گرم گرم سانسوں میں لپٹا ہوا، کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری میں قدم رکھتے ہی کڑوے تیل کی خوش بو سے میری سانس بوجھل ہو گئی چراغ کی بامروّت روشنی نے میرے کان میں ایک ایسی بات کہی، جسے میں سمجھ نہیں سکا۔

ظہورن نے بڑے چاؤ اور بلا کے سبھاؤ کے ساتھ کہا، منجھلے بھیّا ذری لیٹ جاؤ، میں تمہارے پاؤں داب دوں ـــ میں، بڑی معصومیت کے ساتھ لیٹ گیا اس نے مجھ پر رضائی ڈال دی، اور رضائی کے اندر ہات ڈال کر بڑے بچے تلے انداز سے میرے پاؤں دابنے لگی ـــ تھوڑی دیر پاؤں دابتی رہی اور اس کے بعد ...... میں نے تڑپ کر کہا، ارے یہ کیا ظہورن۔ اس نے اپنے سیدھے ہات سے میرا منہ بند کر دیا، اور ارے اللہ، ارے اللہ، ارے اللہ، کے نعرے لگانے لگی ۔

من، فدائے بتِ شوخ کہ بہنگامِ وصال
بمن آموخت، خود آئینِ ہم آغوشی را

(مولانا شبلی)

اس گھُن یا یوں کہیے کہ، اس آپریشن کے بعد، میری بے جاجیا کا مادّہ فاسد

---

[1] گرم کی (ر) کو بافتح کہا تھا۔

کلیتہً نہ سہی، لیکن بڑی حد تک میرے جسم سے نکل گیا۔ پھر موڑ دی قدرت نے میری باگ، جادۂ عشق بازی کی جانب۔

دوش وقتِ سحر، از غصّہ نجاتم دادند

بندہ پرور، ایک بار نہیں، میں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا، لیکن مجھے دیکھئے کہ اٹھارہ قیامتیں میرے سر سے گزر چکی ہیں، اور میں ابھی تک زندہ ہوں اور شاخِ حیات پر اونگھا نہیں بیٹھا، بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں۔

آفریں باد، بریں ہمّتِ مردانۂ ما!!

اپنے معاشقوں کے ذکر سے پہلے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی اہم باتوں پر روشنی ڈال دوں کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہے۔

ا۔ سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کہ محبوبوں کے دل موہ لینے کا تعلق ہے، میرا ایک معاشقہ بھی ناکام نہیں رہا۔ اور یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود مجھ سے عشق کیا، اور بعض نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں نازِ معشوقانہ پیدا کر دیا۔ آپ میرے ان مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں (جو میرے مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں) تو میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

۱۹۲۰ء

میری پرسش اور تیری بزمِ ناز
آفریں اے شاہدِ عاشق نواز
اک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں آئے، اور تمکینِ ناز
تیری طبعِ ناز، اور آشفتگی
تیرا پہلو، اور دردِ جاں گداز

لے گلو گرفتگی

یہ ترا رُخ ، اور گردِ خستگی
یہ ترے لب اور حرفِ سوز و ساز
آہِ سوزاں اور تیرے لعل لب
اشکِ خونیں اور تیری چشمِ ناز
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

سنہ ۱۹۳۰ء

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا
وہ ابتدائے محبت کی تُند راتوں میں
بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا
وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشمِ نم تیری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا
وہ بات بات میں چھالا سا اِک تپک اٹھنا
نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا
وہ تیری زلف کے خم سے ، مری پریشانی
وہ ، اپنی سانس کی خوشبو سے اضطراب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

۱۹۳۷ء

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنّا تجھ کو
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس، میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھ کو
راستے سے کوئی آواز جب آجاتی تھی
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھ کو
تھرتھراتا تھا، مرا درسِ تحمّل تجھ پر
زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھ کو

۲۔ دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میرے ناقدین میری عاشقانہ شاعری کے باب میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں میر تقی میر اور فانی بدایونی کا سا غم نہیں پایا جاتا۔
اگر ناقدین غور سے میری عاشقانہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو انھیں پتا چل جائے گا کہ عنصرِ غم کی اس میں کمی نہیں، لیکن میرے اور حضرت میر وغیرہ کے غم میں فرق یہ ہے کہ ان کا غم شکستگیِ دل پر اور میرا غم معشوقوں کی مفارقت پر مبنی تھا میرے کلام میں ہجر کی ہچکیاں تو ضرور گونجی ہوئی ہیں، مگر شکستِ دل کی جھنکار موجود نہیں ہے۔ آپ خود ہی انصاف کریں، جس کا دل کبھی توڑا ہی نہیں گیا ہو، وہ شکستِ دل کا رونا کیوں کر رو سکتا ہے۔
جنابِ عالی، روتے دھوتے تو وہ ہیں جنھیں معشوق منھ نہیں لگاتے، دربانوں سے اُن کو ذلیل کراتے، ان کی آنکھوں کے سامنے غیروں کو چھاتی سے لگاتے، اور بڑی بے حیائی کے ساتھ عاشق کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

بے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اگر نصیب دشمناں میں جوانی میں ایسے شرمناک حادثے کا شکار ہو جاتا تو خدا کی قسم بے حیا معشوق اور سالے رقیب ، دونوں کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میں اس نکتے سے بخوبی واقف ہوں کہ عاشقی پرسان چڑھتی ہے ایک تو معشوق کی بے اعتنائی و کج ادائی ، دوسرے اس کی جدائی سے۔

آیئے پہلے اس کی بے اعتنائی و کج ادائی پر نگاہ ڈالیں ، اور دیکھیں کہ عاشق پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

(الف) اس سے عاشق احساسِ کم تری کا صیدِ زُبوں ہو کر رہ جاتا ہے اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خارشیتا ٹینی کتا اس کے روبرو کھڑا دُم ہلا رہا ہے۔

(ب) احساس کم تری کے گھن سے شیشۂ اَنار کے چکنا چور ہو جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بجھ جاتا ہے کہ وہ قرابت داروں اور یاروں کو منھ دکھانے سے جھجکنے اور شرمانے لگتا ، اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

(ج) جب اُس کی غم اور ذلت میں ڈوبی ہوئی گوشہ نشینی پر ایک مدت گزر جاتی ہے تو اس کے دل میں اقربا و احباب کی جانب سے یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی میرے معشوق کے مانند سراسر نامہربان اور سراپا ناقابلِ اعتماد ہیں اور بعض اوقات تو فانی بدایونی کی طرح ، وہ تمام عالم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معاشرے کے واسطے ایک زہریلا انسان بن جاتا ہے۔

(د) اس تمام صورتِ حال کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر اس کے عشق میں جان کم ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے عشق پر اوس پڑ جاتی ہے ، اور گاہ گاہ کی ایک آہِ سرد کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن اگر عشق قوی اور حوصلہ ضعیف ہوتا ہے تو وہ آہستہ

آہستہ گھل گھل کر مرجاتا ہے اور حوصلہ بھی عشق کے مانند قوی ہو تو خودکشی کر لیتا ہے یا خود معشوق کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

۳۔ آیئے اب دوسری شق یعنی سازگار و غم گسار معشوق کی جدائی کے اثرات پر نگاہ ڈالیں۔

جدائی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک طویل، ایک مختصر۔

طویل جدائی میں شعلہ بار و پائے دار جذبات رکھنے والا عاشق یا تو کڑھ کڑھ کر مرجاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے۔ یا عاشق میں اگر زیادہ حدت نہ ہو تو کچھ روز تڑپتے رہنے کے بعد اُس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور بالآخر صبر آ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ "طولِ فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہوگئیں"۔ اور پھر: "اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں"۔ کا عالم طاری ہو جاتا ہے لیکن گاہ گاہ کی جدائی اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ وہ عشق کو فاقوں سے مارتی نہیں، اُسے غذا دیتی ہے۔ وقت کو ٹھہرا، اور زندگی کو ٹھہرا دینے والی یک رنگی سے بچاتی ہے اور تواترِ عیش و تسلسلِ قربِ محبوب کے یخ کدے سے بار بار باہر نکل کر، شعلۂ عشق کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

قدرت کو چوں کہ مجھے زندہ، اور ر شاش رکھنا، اور مجھ سے کام لینا تھا اس لئے اس نے بڑی توسط آمیز دیدہ وری کے ساتھ مجھ کو معشوقوں کی جان لیوا بے اعتنائی اور ولولہ سوز طویل جدائی کے تہلکوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا، اور اُسی کے ساتھ ساتھ میری ذہنی پرورش و تربیت کی خاطر یہ انتظام بھی کر دیا کہ مجھ کو بار بار مفارقت سے ڈسوایا، لیکن کسی مفارقت کو اس قدر طویل نہیں ہونے دیا کہ سارا کھیل ہی بگڑ کر رہ جائے۔

اور اس مشفقانہ و مدبرانہ صورتِ حال نے ایک حکیمانہ توازن قائم کر کے مجھ کو زمزمۂ و شیون، کرب و کیف، اور نیش و نوش کے بین بین رکھا اس طرح

عشرت دریدگی و حزن گزیدگی، دونوں سے بچایا

طغیانِ ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
آرد بزیرِ تیغ و شہیدش نہ می کُند!

اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس و فرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے عشق کرنے کے بدلے، اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سواس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا، میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک، یہ صورتِ حال معشوقیت کو زوجیت کے بیلے تہ خانے میں قید کر دینے کی بدمذاقی۔ بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی۔ جذباتِ نو بنو کا احتباس، قانونِ تغیرات کی خلاف ورزی۔ ذوقِ تنوع کی بے حوصلگی۔ تصور کی تہی دستی اور تخیل کا افلاس ہے۔

اس لئے میری طبع رواں نے یہ جمود اختیار نہیں کیا۔ اور "بہتا دریا، جوگی چلتا اچھا"، کے جادے پر ہمیشہ گام زن رہا۔ پروانہ کبھی نہیں بنا، کہ

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع، تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

کی سی کھوکھلی داستانِ عبرت بن کر رہ جاتا۔ اس کے برعکس میں نے بھونرے کی زندگی کو اپنایا، ہر گلِ نودمیدہ پر منڈلایا، اس کا گن گایا، اس کی خوش بو پی اس کا رنگ چکھا، اس پر کالی گھٹاؤں کے سائے میں گایا، گونجا، اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا:۔

در ہیچ مقامم نہ گزارد بد رنگے
از بوئے، بوئے برد، از رنگ برنگے

مجھ پر جمال نے بار بار جال پھینکے، میں بار بار گرفتار ہوا، اور ہر بار یہ کہتا ہوا

جال سے نکل گیا کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف کیجئے، اس صورتِ حال کو عشق نہیں، عیاشی کہتے ہیں، تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی تجھ کو میرے اس اہتمام کی مطلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو، ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی و جسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ حائل رکھا کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں بھی، ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے پائے۔

جی ہاں، میں نے، جی بھر کے عیاشی کی ہے، لیکن اس طرح کہ رات ہوتے ہی اس کی شمع جلائی، اور صبح ہوتے ہی بجھا دی۔

میں نے کبھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن بننے نہیں دیا، بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ بنائے رکھا، اور ایسا مسافر خانہ، جس پر صبح کی پہلی کرن کبھی نہیں پھوٹتی

میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے کبھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا اور زندگی میں ایک بار بھی ان کے انتظار میں چشم براہ و گوش بر آواز بن کر نہیں بیٹھا

البتہ عشق کو میں نے کلیجے سے لگایا، سر آنکھوں پر بٹھایا، راتیں جلائیں پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھائیں۔ ہچکیوں سے دل کو ڈسایا، تڑپا، تلملایا، تکیئے بھگوئے، پلکوں میں آنسو پروئے۔ تارے گنے، اور تلواروں کی دھاروں پر کروٹیں بدلیں۔ جان لیوا خطروں کو ٹھوکر لگائی، موت کے سامنے آنکھیں نہیں جھپکائیں۔ اور ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ عین ماں سون کے ہیجانی موسم میں اس امر کے باوجود کہ میں تیرنا نہیں جانتا الا اللہ کہ گرما ہو نکتے سمندر میں جھم سے کود پڑا

بندہ نواز، اپنے کو اگر ایسے ہول ناک تہلکے میں ڈال دینا عیاشی ہے، تو خدا کے واسطے بتایئے کہ پھر عشق نام ہے کس چڑیا کا ؟

جی ہاں، میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر۔ لیکن عشق بازی کی ہے، جی سے گزر کر۔
عیاشی نے، میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں۔ عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں
عیاشی نے لذاتِ حواس سے دوچار کیا۔ عاشقی نے نشاطِ شعور سے سرشار کیا۔
عیاشی نے، گردن کو نقرئی بانہوں سے اُجالا۔ عاشقی نے گردن میں قوسِ قزح کا زریں ہار ڈالا۔

عیاشی نے، موج ہائے زنگار رنگ میں ترایا۔ عاشقی نے گردابِ خونِ جگر میں گھمایا۔
عیاشی نے فقط مکھڑوں کی چاندنی دکھائی۔ عاشقی نے میرے سامنے انفس و آفاق کی نقاب اُٹھائی۔

عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا۔ عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور قلب گداختہ کی دولتِ بیدار مرحمت فرما کر، مجھ کو شاعری اور محبتِ نوعِ انسانی کا راستہ دکھایا

میرا جسم بھی متمول ہے۔ میری روح بھی مالا مال ہے اب کمی کس چیز کی ہے۔

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہتے کیا ہو پیمبری مل جائے؟

اس قدر طویل۔ لیکن ضروری دیباچہ پڑھ چکنے کے بعد، آیئے میرے صحیفۂ عاشق کی سعادتِ قرأت حاصل فرمایئے۔

لیکن یہ بھی سن لیجیے کہ اب میرا حافظہ اس قدر گھٹا ٹوپ ہو چکا ہے کہ اپنے بہارے اٹھارہ معاشقوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ بہت سے واقعات قطعی بھول چکا ہوں اور جو یاد بھی ہیں وہ بھی آدھے بھلا چکے ہیں اس لئے نیم حافظ نشیں معاشقوں ہی پر روشنی ڈال سکوں گا۔

دہرائی جا سکے گی نہ اب داستان عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں، کہیں سے ہم[1]

اے حافظے، ہر قدم پر ساتھ نہ چھوڑنا، اور، ہر موڑ پر منھ نہ موڑنا، اور اے نظام جبر، اے عظیم و کار فرما، آفاقی توانائی، اور اے شہرۂ آفاق و نامعلوم شہریار۔ اے گلوں کو رنگ و بو، بلبلوں کو ہاؤ ہو، گھٹاؤں کو اُمنگ، بھونروں کو ترنگ، برہمنوں کو نیاز، تموج کو ناز۔ اور شاعروں کو ولولۂ نگاہ اور حسینوں کو جمال چہرہ عطا فرمانے والے، تو نے میری جوانی کو عاشقی پر مامور فرمایا تھا تیرے حکم سے، مجال نہ تھی مجھ کو سرتابی کی۔

اور اب جب کہ میں، تیری فرماں برداری کر کے، بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ارباب منبر و محراب مجھ سے کہتے ہیں اے روسیاہ، تو نے عبادت کے عوض ساری جوانی گنوا دی کافر زلفوں کے سائے میں، بول اے سیاہ کار، کیا جواب دے گا قیامت کے روز۔ طیار ہو جا دہکتی آگ کے واسطے۔

میں دراز ریش بچوں سے کیا الجھوں۔ صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر مجھ کو دوزخ میں جھونکا گیا تو میں اس کے پھاٹک کی محراب پر، آتشیں حروف میں یہ عبارت کندہ کر دوں گا کہ زمین ہی کی طرح، آسمان پر بھی عدل و انصاف کا کوئی پتا نہیں پایا جاتا۔

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

چور سے کہو، چوری کر، شاہ سے کہو تاکتا رہ۔ قربان اس معدلت گستری کے۔

الا، یا ایہا الساقی، ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل، ولے افتاد مشکلہا

---

[1] بسمل سعیدی ٹونکی دعم کی۔ مرد والدہ)

ہائے میں اپنی داستانِ محبت کیوں کر لکھوں۔ حافظے کے ایوان میں بڑی تاریکی ہے۔ خدارا، واپس آجاؤ، اے میری جوانی کے گونجتے، گرجتے، کھنکتے گنگناتے، چہچہاتے، اور بھاؤ بتاتے، رنگین و شاداب لمحو۔ ٹپک پڑو، میرے برگِ حیات سے اے شبنم کے قطرو برس پڑو، میرے دیدۂ خشک سے اے آنسوؤں کی بوندو — ابل پڑو، اے میری ترنگوں کے خشک چشمو۔ گرج اٹھو میرے سفید سر پر، اے میری برکھا کی کالی گھٹاؤ۔ لَو دینے لگو، اے میرے شبستانوں کی بجھی شمعو۔ پھوٹ جاؤ اے میرے گلابی جاڑوں کی کرنوں۔ جھڑی لگا دو اے میری کھوئی ہوئی، بھری برساتو۔ دمک اٹھو۔ اے میری خوابیدہ چاندنی راتو۔ کوک اٹھو۔ اے میری امریوں کی خاموش کوئلو۔ نصب ہو جاؤ دوبارہ، اے میرے رامش و رنگ کے، خاک آسودہ خیمو۔ جھنک اٹھو اے میرے سازِ شکستہ کے تارو۔ اور جگمگا اٹھو اے مجھ پر صحیفۂ انانیت نازل کرنے والے، نکیلے اور صبیح مکھڑو۔

ہائے ماہ و سال کی دبیز تاریکیوں کے الجھے ہوئے لچھے۔ ان لچھوں کے پیچ و خم میں اس طرح، جھلمل ہو رہے ہیں کچھ واقعات اور چند چہرے۔ جیسے دور کے جنگل کے جگنو، جیسے کُہرے میں بھاگتے آہو، جس طرح دل سے آنکھوں کی طرف چلتے ہوئے آنسو اور جیسے خواب کے بن میں کوئل کی کوکو

سامنے ایک رنگ و بو کا میلہ سا لگا ہوا ہے گویا تاریک جنگل میں دیئے ٹمٹما رہے ہیں، کوئی لمحہ، اور کوئی مکھڑا نقاب الٹ کر سامنے نہیں آرہا ہے۔

اچھا۔ اب میں اس میلے، اور دور کی اس بلبلاہٹوں کی ریلے کی جانب خود بڑھوں۔ شاید کچھ نظر آسکے۔ لیجیے میں پچاس قدم آگے بڑھ گیا

ہاں اب تو کچھ واقعات اُجاگر ہو رہے ہیں کچھ مکھڑوں[1] سے نقابیں ہٹ رہی ہیں دوربین نے بڑی مدد کی ارے یہ صفِ اوّل میں کون کھڑا مسکرا رہا ہے؟ ہائیں یہ تو "س۔ ح" کا مکھڑا ہے۔ ذرا اور قریب آؤ میرے بچھڑے محبوب کہ تم پر قلم اُٹھا سکوں۔ بڑی مہربانی کی تم نے کہ میرے پاس آگئے۔

اب آپ "س۔ ح" کے حالات سُنیں۔ بسم اللہ۔

---

[1] اُن مکھڑوں کے نام:۔ س۔ح ۔ ع۔ج ۔ الف الف خ۔ م۔ ج ۔ ت۔ ز ۔ ش۔ د ۔ الف۔ ن ۔ ک ۔ د ۔ ع ۔ ج ۔ الف ۔ خ ۔ ر۔ ب ۔ مس میری ۔ مس گلینی ۔ م۔ ب ۔ ر۔ ک ۔ ط ۔ ج ۔ ج۔ ب ۔ اور ع ۔ خ ۔

س، ح

یہ نام خدا اُن :۔ جوانی کی راتوں ،مرادوں کے دن کا واقعہ ہے، جب کہ میری عمر نے، کھیل کود کے میدان سے نکل کر، میری بھیگی مسوں کے ساحل پر ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ ایک روز چراغ جلے، ایک بھبوکا سا یورو شین لڑکا، میرے چچا کے ہاتی پر سوار، میرے گھر کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا۔

وہ گلابی جاڑے کی ٹھنڈی سہانی شام، وہ جلسے کی دھوم دھام۔ اور وہ اُمردِ گل فام۔ وہ پھاٹک پر بجتی شہ نائی، اور ہاتی پر وہ اس طفلِ پری زاد کی رعنائی، دھرتی بولے رام دُہائی۔

اگر میر تقی میر، اُسے دیکھ لیتے تو: "اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔" کی رسم ترک فرما دیتے، اور انشا اللہ خاں انشاؔ۔ ارے رے رے، ارے رے رے ارے رے کہ کر، زمین پر بیٹھ جاتے۔

ارے ہاتی کے اوپر اس کا جھلجھلاتا تاباں چہرہ :۔

"دوشیزے پہ، آنی دمک رہی تھی گویا۔"

میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے، مانی صاحب جائسی سے (جو اب میرے ٹیوٹر کم اور بے تکلف دوست زیادہ ہو چکے تھے) کہا خدا کے واسطے اس کو میرے پہلو میں لاکر

بٹھا دیجئے۔

مانی صاحب جو پہلے ہی سے اس کو دل دے چکے تھے۔ بڑی عجلت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو بڑے ہی چاؤ سے لاکر، میرے پہلو میں بٹھا دیا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی، میرے بائیں پہلو میں گرمی محسوس ہونے لگی۔ اور مانی اس کو اس حسرت کے ساتھ دیکھنے لگے کہ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔

اتنے میں ناچ گانا ہونے لگا۔ اور طوائف، ہر چند خوب رو اور کم سن تھی مگر "س ح" کے مقابل کو ب چہرے کے سامنے، ایسی نظر آنے لگی گویا گیس کے سنناتے ہنڈے کے سامنے، ریوڑی والے کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔

میرے کان مطربہ کی ٹھمریوں کے جھولے میں جھول رہے تھے اور میری آنکھیں اس کے گلابی چہرے سے اٹھتی ہوئی لوؤں پر رقص کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا عرب کی "ہزار راتیں" اس ایک رات میں سمٹ کر آگئی ہیں۔

میں نے اس پر اس طرح نظریں جما دیں کہ اس کے رخسار کی جلد میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں۔ اس نے، مڑ کر، مجھے دیکھا۔ ایک ہی نظر میں جان گیا میرے دل کا عالم۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ یوں مسکرایا کہ میرے سر پر بنارس کی صبح طالع ہو گئی اور :۔ "تم ہمارے، ہم تمہارے ہو گئے۔" کا غیر ملفوظ بیان ہو گیا اور ہمارے چہروں کے رنگ میں، آبی تلواروں کی دھار مچلنے لگی۔ اور دونوں پر ایسی ربودگی طاری ہو گئی کہ زبانوں سے ایک حرف بھی نہیں نکل سکا۔

اور جب پچھلے پہر، محفل برخواست ہونے لگی، اس نے بڑے لوچ کے ساتھ مجھ سے ہات ملایا، اور "خدا حافظ کہ کر، رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی خیمہ بھائیں بھائیں کرنے لگا، ہر گوشے سے ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں اور بجھی ہوئی مشعلوں کا دھواں میری آنکھوں میں لگنے لگا۔

جب مانی بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ، رخصت ہو گئے، محل سرا میں آکر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر کی شکنوں میں دھار پیدا ہو گئی۔ لاکھ لاکھ کروٹیں بدلیں، نیند نہیں آئی۔ میری زندگی میں وہ پہلی عشق کی رات تھی۔

اتنے میں گھڑیال نے، چار بجے کا گجر بجایا، ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن۔ اور چلنے لگا میرے دل پر گھن

یہ سوچ کر کہ اب نیند نہیں آنے کی، بستر سے اٹھا، پڑھنے کے کمرے میں گیا اور کتاب اٹھائی کہ اس سے جی بہلاؤں۔

کتاب کے ورق پر خیمہ نصب ہو گیا۔ مجرا ہونے لگا، حروف کانپے، پھیلے، شیشے کی محراب بن گئے اور اس محراب میں "س۔ح"، کا چہرہ دمکنے لگا۔

آپ بھی وہ شعر سن لیں کہ میری عاشقانہ شاعری کی انھیں سے ابتدا ہوئی ہے

آئیں اسکول کے احباب سنیں درد مرا   گرم کر دے گا لہو، ہر نفسِ سرد مرا
ایک تنکا بھی اگر آنکھ میں پڑ جاتا ہے   آدمی ہے کوئی ایسا جسے چین آتا ہے؟
چین لینے دیں بھلا کیا مجھے ایسی آنکھیں   جن کے پردوں میں سمائی ہوں کسی کی آنکھیں
اپنی آنکھوں کی اذیت کو بھلا دیتا ہوں   میز سے بڑھ کے، کتاب ایک اٹھا لیتا ہوں
روبرو آنکھ کے جس وقت کتاب آتی ہے   اک جھلک، صفحۂ قرطاس پہ پڑ جاتی ہے
دیر تک کچھ نظر آتا نہیں بجلی کے سوا   دفعتہً ہوتی ہے، ہر سطر میں جنبش پیدا
حرف دب جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں رفتہ رفتہ   صاف کھنچ جاتا ہے ہر لفظ پہ چہرہ انکا

صبح ہوتے ہی مانی صاحب کے وہاں پہنچا۔ وہ دادا میاں کی بارہ دری کے پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں رہتے تھے۔ میں نے زینہ طے کر کے، دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے۔ رُوبانسی آواز آئی "کون؟" میں نے اپنا نام بتایا، دروازہ کھل گیا وہ میرے گلے لگ کر رونے لگے۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا کیا بات ہے۔ انھوں نے

کہا کیا پوچھتے ہو، رات کو اس نے میری طرف نگاہِ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا۔"
پھرتی رہیں وہ آنکھیں پلکوں کے سائے سائے۔"

ان کا دل رکھنے کی خاطر، میں نے کہا مانی صاحب، یہ بات نہیں ہے، اس نے آپ کی طرف کئی بار نگاہ اُٹھائی، آپ ایسے منہ لٹکائے بیٹھے تھے کہ دیکھ نہیں سکے۔

یہ سن کر ان کا چہرہ بشاش ہوگیا، اور کہا "تری آواز مکے اور مدینے۔"

اُنھوں نے پوچھا تمھاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں، میں نے کہا پرسوں، انھوں نے کہا تو میں "س۔ ح" کو نرسوں تمھارے پاس لے کر آؤں گا لکھنو میں۔

اس کے تیسرے روز میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ اور میرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن، مانی صاحب آگئے۔ آتے ہی اُنھوں نے بڑے اہتمام سے خط بنایا، دیر تک غسل کیا، اور ناشتہ کر کے، جب باہر جانے لگے تو کہا آج شام کو میں اسے لے کر تمھارے پاس آؤں گا۔ ان کے جاتے ہی میں اپنے مکان کی صفائی و آرائش میں مشغول ہوگیا، ہر گوشے میں جھاڑو دلائی میزیں کرسیاں بچھوائیں، گملوں میں پانی ڈلوایا، چھت گیری درست کرائی، چھت میں لٹکے ہوئے قمقموں کو دھلوایا، لیمپ صاف کرائے، ایک اور نیا لیمپ خرید لایا، جس میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم لٹکے ہوئے تھے۔ ایک موتیوں کی جھلجھلاتی چک خریدی اسے زینے کے بالائی دروازے پر لٹکا دیا۔

آرائشوں سے فارغ ہو کر، کوئی تین بجے لیٹ گیا، تاکہ آرام کرنے سے چہرے پر تازگی آجائے۔ پانچ بجے بستر سے اُٹھا، کٹی کو را صابون سے خوب مل مل کر نہایا، چالیس ہزار مارکہ کی چھالٹین کا پائجامہ، اور بنارسی ریشم کا کرتہ پہنا، کرتے میں حنا کا عطر ملا اور ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گیا۔

غلغلہ ہے جواں کے آنے کا
رنگ دیکھو غریب خانے کا

روح کو آئینہ دکھاتے ہیں
درو دیوار مسکراتے ھیں
آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی کی بیدار
جمع ساماں ہے عیش وعشرت کا
خوف ، دل میں فریب قسمت کا
سوزِ قلب کلیم ، آنکھوں میں
اشکِ اُمید وبیم آنکھوں میں
چشم بر راہ ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

جب دن ڈوب گیا ، سائے بھاری اور ملگجے سے ہو گئے ، ٹھنڈی ہوا دبے پاؤں چلنے لگی ، وقت کے منہ پر سانولا پن دوڑ گیا ۔ مدھ ماتی شام اودھ کی لٹیں رومانی فضا کے ماتھے پر مچلنے لگیں اور لیمپوں کی روشنی ہمکنے لگی تو ، خدا خدا کرکے ، نازک قدموں کی آہٹ سے زینہ بجنے لگا ۔ میں چھلانگ لگاکر ، زینے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دیکھا کہ ، نام خدا " س ۔ ح " ، چلا آرہا ہے ، اور مانی ایک مرید یا مصاحب کے مانند اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں ۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا ۔ سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے ، اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوا گویا آفتاب اُبھر رہا ہے اور یوسف کی پیشانی ، کنویں کی جگت سے طلوع ہو رہی ہے ۔ اوپر آکر جب اس نے مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملایا ، تو میرے وجود کے ستار ے پر شہنائی سی بجنے لگی ۔

مانی صاحب نے شکریہ طلب آنکھوں سے مجھے دیکھا میری پلکوں کی جھپک نے ان کا شکریہ ادا کیا ۔

اب ہم جگمگ جگمگ کمرے میں آگئے "س۔ح" میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مانی، باورچی خانے چلے گئے۔ اور مجھ پر:۔

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پرے بیٹھے ہیں

کا عالم طاری ہو گیا۔

اتنے میں مانی آگئے، علی شبیر خاں سپاہی اور نوروز باورچی نے میز پر مٹھائیوں میووں، پھلوں کی بھری پلیٹس، بالائی کی قابیں اور چائے کا سامان چن دیا۔

جب کھانا پینا ہو چکا تو کمرے پر ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی، مگر بولا نہیں گیا۔ الفاظ کو زبان پر کھینچ کر لاتا تھا تو وہ راستے ہی میں گر پڑتے تھے۔ یعنی"

کل ان کے آگے، شرحِ تمنا کی آرزو
اتنی بڑھی کہ نطق کو بے کار کر دیا

میں نے گھبرا کر، اسے دیکھا، اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی اور جھپکتی پلکیں باتیں کرنے لگیں۔

اس جمود کو توڑنے کی نیت سے مانی صاحب نے کہا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا ہے"، ہم دونوں نے شرما کر، آنکھیں جھکا لیں۔

پھر مانی صاحب نے کہا شبیر اپنی وہ نظم تو سناؤ:

دفعتاً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا

میں نے جی کڑا کر کے وہ نظم سنائی، ہر چند وہ بظاہر پردہ نشین، مگر لکھنؤ کی ماں کی گود میں پلا ہوا تھا اس نے جی کھول کر مجھے داد دی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ میرے اشعار اس کی آنکھوں کے پردوں

میں چبھ رہے ہیں۔ مانی سے رہا نہیں گیا، اپنے اظہار عشق کی خاطر انھوں نے کہا میری ایک تازہ غزل بھی سن لیجئے۔ میں نے کہا ارشاد۔

اور انھوں نے ایسی درد بھری چبھتی، ٹھہر ٹھہر کر بہتی، اور چھالے کی طرح چکتی آواز میں اپنی غزل سنائی، گویا ایک کلیجہ ہے جو ململ کے دامن کی طرح، برابر پھٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد، جی کڑا کر کے میں نے "س۔ح" سے پوچھا کیسا مزاج ہے اس نے، ذرا سا مسکرا کر کہا۔ اچھا ہوں۔ ہائے اس اچھا ہوں کی مٹھاس۔

اب اس نے کہا اجازت ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا جواب دوں، میں نے گھبرا کر کہا اچھا، کیا جائیے گا۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو، میں نے، بڑی بے کسی کے ساتھ، سر جھکا کر، کہا بہت اچھا۔

اور جب وہ گلے لگ کر چلا گیا تو مانی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے، میں نے کہا کہئے کیسا مزاج ہے، انھوں نے غصے میں سر اٹھا کر، کہا۔ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ ارے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ معشوق جانے کی اجازت طلب کرے، اور عاشق صاحب بہادر اکھڑ پن سے ارشاد فرمائیں۔ اچھا، کیا جائیے گا۔ اس اچھا کیا جائیے گا، کی ایسی تیسی۔ پٹھان لاکھ لکھنؤ میں پروان چڑھے، مگر لٹھ ہی رہتا ہے لٹھ نرا لٹھ۔

عاقبت، گرگ زادہ، گرگ شود
گرچہ با آدمی، بزرگ شود

ان کی اس ڈانٹ پھٹکار سے میں کٹ کر رہ گیا، اور دل ہی دل میں لعنت بھیجنے لگا اپنے اُجڈ پن پر۔

اور اس بڑھاپے میں بھی "اچھا، کیا جائیے گا،" کا لٹھ پن جب یاد آ جاتا ہے تو اپنے پر نفرین کرنے لگتا ہوں۔ اچھا، کیا جائیے گا" پر شیطان کی پھٹکار ایک نہیں ہزار بار۔

ع . ج

سیتا پور برانچ اسکول میں ہم دونوں ہم جماعت تھے ۔ پورا کلاس ۔ ایک محمل تھا ، اور اس کی ذات لیلیٰ ۔ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اس کا دوست بن جائے ، اس کا غرور حسن کسی کو منھ نہیں لگاتا تھا ۔

صرف لڑکوں ہی کی نہیں ۔ اساتذہ کی نظریں بھی ، اس کی طرف بار بار اُٹھتی تھیں لیکن وہ

بمکتب می رود ، طفلِ پری زاد
مبارک باد ، مرگِ نو بہ اُستاد

کسی کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتا تھا ۔ غرور حسن کے ساتھ ساتھ ، اس کو اپنے خاندان کی وجاہت اور اپنے باپ کے سرکاری عہدے کی جلالت پر بھی بڑا ناز تھا ۔

اس کی طرف میری آنکھیں اُٹھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے تصور جمال کے سانچے میں ڈھالا گیا ، اور میری آنکھوں کے مشورے سے اس کے خد و خال تراشے گئے ہیں ۔

ہر چند وہ میری آنکھوں کی دعائے مستجاب تھا ۔ لیکن اس کے تبختر پر نگاہ کر کے میں اس سے بات نہیں کرتا تھا ۔

کئی مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے۔ میں اس کے قریب جانے سے بھاگتا۔ لیکن در پردہ اس کی جانب دوڑتا رہا۔ وہ

بڑھتا چلا گیا ہوں، اُسی کی طرف کچھ اور
یوں بھی ہوا ہوں اس سے گریزاں کبھی کبھی

ایک دن، اسکول جاتے ہوئے میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے خودداری و طلب گاری کی ملی جلی کیفیت سے اس کی جانب نگاہ اُٹھائی تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بجتی ہوئی آواز سے پوچھا تمہارا نام شبّیر ہے؟

میں نے کہا ہاں میرا نام یہی ہے۔ اس نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے جواب دیا ملیح آباد کا۔ اس نے، بشاش ہو کر، کہا۔ ارے وہ تو ہمارے لکھنؤ کا ہی ایک محلہ ہے۔ تم شیعہ ہو کہ سُنّی؟ میں نے کہا آدھے سے زیادہ شیعہ۔ اس نے کہا پورے شیعہ بن جاؤ، تو میرے تمہارے پینگ بڑھ جائیں۔ میں نے کہا پہلے مجھ سے پینگ بڑھاؤ، پھر پورا شیعہ بناؤ۔ یہ سن کر اس کی سونے کے ورق کی سی چہرے کی باریک جلد کے نیچے، ایک رنگ دوڑنے لگا۔ وہ میری طرف دو قدم بڑھا اور میرے قریب آ کر، اپنے ماتھے سے میرے ماتھے پر زور سے ٹکر مار دی۔ اس کے ٹکر مارتے ہی میرے بدن میں لہو تیزی سے دوڑنے لگا۔ ٹکر ہر چند زبردست، لیکن بلا کی میٹھی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے، اور اس نے بڑے تحکم کے ساتھ، اپنی بلوریں انگلی اُٹھا کر، مجھ سے کہا آج اسکول کے بعد میرے گھر چلنا ہو گا۔ میری باچھیں کھل گئیں اور کہا ضرور چلوں گا۔

کہتے ہیں "شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر"، لیکن یہ کہاوت اس موقع پر بالکل الٹی ہو کر رہ گئی۔

اس ٹکراؤ کے بعد میں اس کے گھر جانے لگا، محبت، دن دونی، رات چوگنی بڑھنے لگی اور اس میں اس قدر غلو پیدا ہو گیا کہ جس دن، کسی مجبوری کی بنا پر اس کے گھر نہیں جاتا تھا تو منھ کا مزا پھیکا پھیکا سا محسوس ہوتا تھا۔

میں اس کے جمال کی شرح کیوں کر کروں ، الفاظ پر جب اس کے حسن کا بار ڈالتا ہوں تو ان کی بندلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ میرے نزدیک رب جمال نے ، بڑی کیمیا دی دیدہ دری کے ساتھ ، سب سے پہلے تو وادیٔ کشمیر کی روپہلی چاندنی ، اور صبح کوہسار کی سنہری کرنوں کو ہلکی سی بنوٹے کی آنچ پر رکھ کر پگھلایا ، پھر تختِ الماس میں نچوڑ دیا۔ پھر چنبیلی اور موتیئے کے پتوں کو خوب مل کر کے ، اس میں گھول دیا ، اور پھر اوپر سے پگھلا ہوا سونا ٹپکا دیا۔ اس کے بعد کھرل میں کُٹے ہوئے موتیوں کا باریک سفوف اس پر چھڑک دیا ، اور اس کے بعد اس نیم سیال مرکب کو نسیم شمال کی راہ گزار میں رکھ دیا اور جب وہ جم گیا تو اُس سے اس کی موہنی صورت تراش لی۔

ایک روز بڑے دن کی چھٹی منانے کے واسطے ، ہم دونوں سیتاپور سے لکھنو کی طرف روانہ ہوئے۔ خوش قسمتی سے ہمارا ڈبّا خالی تھا ، ہم نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سفر کیا۔

ہماری گاڑی جب کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی تھی ، میرا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا کہ کہیں کوئی مسافر نہ آدھمکے اور ہمارے طلسم کو توڑ ڈالے ۔ مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ آخر تک کوئی مسافر نہیں آیا اور ہم موج کرتے رہے ، سچ کہا ہے کسی نے "اُلسفر وسیلۃ الظفر" رات ہوتے ہی وہ میرے زانو پر سر رکھ سو گیا اور چودھویں کی چاندنی اس کے سنہری گالوں میں جذب ہونے لگی اس وقت اس کے چہرے سے جو اثر میں نے قبول کیا تھا۔ آج تک دل پر نقش ہے ہائے وہ جھلکتی چاندنی اور ہائے وہ اس کا دمکتا چہرہ۔

ایک روز لکھنؤ میں اس نے کہا شبّیر کل آنا تو دو اشرفیاں لیتے آنا ۔ اور جب میں اپنی ماں سے دو اشرفیاں لے کر اس کے پاس گیا ، اور ریشمی رومال میں رکھ کر ، میں نے وہ اشرفیاں پیش کیں ، اس نے کہا اپنے پاس رکھو ۔ میں تو تمھیں آزما رہا تھا۔ میں نے غصّہ میں آکر وہ اشرفیاں کوٹھے سے نیچے پھینک دیں ، اس نے گھبرا کر کہا ارے یہ تم نے کیا کیا ، میں نے کہا تم دو کوڑی کی دو اشرفیوں سے میری محبت کا امتحان لے رہے تھے ، یہ دیکھو میری محبت ، یہ کہتے ہی میں نے ، میز سے چھری اُٹھائی اور اپنے

سینے میں ماری، دَھل دَھل خون بہنے لگا۔ اس کے منھ سے چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے، اپنی قمیص کا دامن پھاڑ کر، اُسے پانی میں تر کیا اور زخم پر رکھ دیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینھ برسنے لگا۔

اتنے میں اس کا گرد ے کی سی داڑھی والا "منھ بولا چچا" آگیا۔ وہ ہم دونوں کی یک جائی سے خار کھاتا تھا۔ اس نے مجھ کو لہولہان، اور "ع ۔ ح" کو زار و قطار روتے دیکھا تو کم بخت لال پیلا ہو کر پوچھنے لگا سچ بتاؤ۔ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ "ع ۔ ح" نے، بڑی لجاجت کے ساتھ کہا شبیر چھری لے کر سیبوں کے ٹوکرے کی طرف بڑھے، ٹھوکر لگ گئی، گر پڑے، اور چھری سینے میں لگ گئی۔

اس خبیث نے، کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا یہاں تو سیبوں کا کوئی ٹوکرا نظر نہیں آرہا ہے، "ع ۔ ح" نے کہا چچا وہ ٹوکرا ابھی ابھی کوئی اُٹھا کر، اندر لے گیا ہے۔ اس نے کہا کون اُٹھا کر لے گیا ہے اس کا نام بتاؤ۔ اس نے کہا جب وہ ٹوکرا اٹھا کر کمرے سے نکل رہا تھا۔ میں نے فقط اس کی گُدّی دیکھی تھی نام کیا بتاؤں، چچا نے دانت پیس کر کہا کل کا چھوکرا اور مجھے اُتو بنا رہا ہے، ابھی تیرے باپ سے جا کر شکایت کرتا ہوں یہ کہہ کر وہ نیچے اُتر گئے اور ہم دونوں ہراساں ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

"ع ۔ ح" نے مجھ سے کہا اگر ابا تمھیں بلائیں، اور پوچھیں تو کیا جواب دوگے میں نے کہا میں کیا جواب دوں گا، یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ اس نے کہا وہ میرے باپ ھیں تم بھی ان کو اپنا باپ سمجھ کر جواب دینا۔ پھٹولی پر نہ اُتر آنا، کہ اتنے میں داڑھی والا مردود چچا آگیا اور کہا تم دونوں کو میرزا صاحب (یعنی "ع ۔ ح"، کے والدِ ماجد نے بلایا ہے۔

ہم دونوں ان کی خدمت میں پہنچے۔ اُنھوں نے، بکمالِ شفقت، نظر اُٹھائی اور فرمایا شبیؔر تم کو نہیں معلوم ہمارے تمھارے خاندان کے کتنے پرانے تعلقات ہیں۔ تمھارے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا اور میرے دادا . . . . کے مابین

برادرانہ تعلقات تھے، مجھے یقین ہے کہ تم پٹھان، اور عالی خاندان ہو جھوٹ نہیں بولوگے اور جو واقعہ ہوگا، سچ سچ بتادو گے۔

میں نے کہا اچھا جس طرح میرے پردادا اور آپ کے دادا کے درمیان برادرانہ تعلقات تھے ویسے ہی میرے اور "ع-ح" کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں، انھوں نے میری برادرانہ شفقت کو آزمانے کے لئے مجھ سے کہا کل دو اشرفیاں لیتے آنا، میں سمجھا انھیں ضرورت ہے۔ میں لے آیا۔ اور جب میں ان کو وہ اشرفیاں دینے لگا انھوں نے کہا مجھ کو ضرورت نہیں۔ میں تو فقط تمھیں آزما رہا تھا۔ یہ سن کر مجھے غصہ آگیا میں نے اشرفیاں نیچے پھینک دیں، اور اپنے سینے پر چھری مارلی۔

میرزا صاحب نے "ع-ح" سے کہا۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا، آج انھوں نے اپنے چھری مارلی ہے، کل تمھیں چھری ماردیں گے، پٹھان کا پوت گھڑی میں ادلیا، گھڑی میں بھوت۔

اور بیٹے کو سمجھانے کے بعد میرزا صاحب نے اُس مردود، چغل خورے "چچا" سے کہا.... خان، یہ تو ایک طفلانہ کھیل تھا، ایسے واقعات کو بڑھا چڑھا کر اور بُرا رنگ دے کر پیش کرنا حماقت ہے اور ہم دونوں، "چچا" کو طعن آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے، اپنے بالا خانے پر آگئے۔ "ع-ح" نے فرطِ خوشی سے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ بڑے دن کی چھٹیاں منانے کے بعد، اب ہم پھر سیتا پور آگئے اور زندگی مزے سے گزرنے لگی۔

"ع-ح" کے ایک اُستی پچاسی برس کے معلم، اس کے گھر میں رہتے تھے، انھوں نے ع-ح کے ایما سے مجھ پر شیعیت کا گہرا رنگ چڑھانا شروع کردیا، اور جب میں پکا شیعہ بن گیا، تو اس نے، بڑی دھوم دھام سے میری دعوت کی، اور کہا اب میں ہمیشہ کے لئے تمھارا ہوگیا۔ اور میری ہڈیوں کے گودے تک اس کی محبت اتر گئی۔

اسی اثنا میں، یہ ایک بہت بڑا المناک سانحہ پیش آیا کہ میرے باپ نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں سیتا پور برانچ اسکول سے نام کٹا کر فلاں تاریخ کو لکھنؤ پہنچ جاؤں

وہ مجھے حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کرا دیں گے ۔ اور میرزا حبیب حسین صاحب ہڈ ماسٹر کی نگرانی میں رکھیں گے ۔

جب یہ خط پہنچا ، زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی دل اس زور سے دھڑکا گویا منہ سے نکل جائے گا ۔ اور جب میں نے وہ خط " ع ۔ ح " کو دکھایا ۔ وہ چارپائی پر گر گیا ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دجلہ بہنے لگا ۔ پھول سا چہرہ ، دھلے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا ۔ میں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ کلیجے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔

جاتا ہے آسماں ، لئے ، کوچے سے ، یار کے
آتا ہے جی بھرا درو دیوار دیکھ کر

اور ، آخر کار ، اس کے چوتھے دن بصد نالہ و فغاں سیتاپور سے رخصت ہو گیا

بنو میدی ، حزیں ، از کوئے او بارِ سفر بستم
خدا ، صبرے کند روزی ، دلِ امیدوارم را

مِس میری رُومالڈ

یہ اس دور کا ذکر ہے، جب میں لکھنؤ چرچ مشن ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم اور لاٹوش روڈ کی گلی کے ایک دو منزلہ مکان میں، رئیس احمد اور ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ ایک وسیع اور دو منزلہ مکان تھا، اس مکان کے ایک حصّے میں مس میری رومالڈ اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز روبی رومالڈ کے ساتھ رہتی تھی۔ زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا۔ اور آتے جاتے ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔

ہماری خواب گاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا، اور جب ہم اپنے بستروں پر لیٹے تھے تو فریقین، دیر تک، ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سُنا کرتے تھے۔

ایک روز، سرِ شام، ہم دونوں زینے پر چڑھ رہے تھے، وہ آگے تھی، میں پیچھے اس کے پونڈر کی خوشبو میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یکایک اس نے مڑکر مجھے دیکھا، اور " او گاڈ" (ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی، اور بڑے کرب کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میں نے، انگریزی میں پوچھا۔ آپ کو کیا تکلیف ہے، اس نے کہا میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے، آپ مجھ کو سہارا دے کر میری خواب گاہ تک پہنچا دیں، او مائی گاڈ، او مائی گاڈ۔

میں نے لپک کر اس کی چھلا سی کمر میں، ہاتھ ڈال دیا، اور سہارا دے کر اسے

اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر تڑپنے لگی۔ میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ اس نے کہا۔ نہیں، پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں، اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر کو بلا لائیں۔

میں۔ بڑے انہماک کے ساتھ، اس کا پیٹ سہلانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں، مجھے، بڑے تشکر سے دیکھا اور کہا اگر تکلیف نہ ہو تو یہ سامنے کی سوڈے کی بوتل کھول کر مجھے پلا دیجئے۔

میں نے بوتل کھول کر، گلاس میں سوڈا بھرا اور پیش کر دیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور کہا آپ پہلے اسے ذرا سا چکھ لیں، میں نے ایک گھونٹ پی کر گلاس اس کو دے دیا، وہ میری طرف نگاہیں اٹھا کر، اس طرح پینے لگی، گویا سوڈے کے ساتھ، وہ مجھے بھی پی رہی ہے۔

مجھے اور سوڈے کو پی کر، اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا۔ میری ماں باہر گئی ہوئی ہیں۔ اکیلے جی گھبرائے گا۔ تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اس نے کہا نہیں۔ میرے بستر پر بیٹھ جائیے۔

میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر پر جو اس کے سرہانے آویزاں تھی، چادر ڈال دی۔

اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے اور ابرار اس کی سوتیلی ماں پر ریجھ گئے اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔

ایک روز ہم لوگ حضرت گنج کے ایک شاندار ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ دو گورے جو نشے میں دھت تھے وہاں آ گئے۔ میری اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ تم یورپین ہو کر نیٹو آدمیوں کے حلقے میں بیٹھی ہوئی ہو۔ میں نے ان کو ڈانٹا کہ بدتمیزی نہ کرو۔ ہمارا ہی نمک کھاتے اور ہمیں پر غراتے ہو۔ ایک گورے نے، میری بات ان سنی کر کے، مس میری کی جانب ہاتھ بڑھایا، میں نے اس کے سر پر ڈنڈا مار دیا، دوسرا گورا بڑھا تو ابرار نے اس کے سر پر

اچار کی بھری بوتل مار دی۔ اچار آنکھوں میں پہنچا تو وہ بلبلا گیا اور دونوں گورے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک روز اس کی کتیا، دو منزلے سے انگنائی میں گر کر دم توڑنے لگی، میری نے چیخ کر مجھ سے کہا ارے وہ سامنے برانڈی کی بوتل رکھی ہوئی ہے، جلدی سے لے آیئے، میں نے کہا میں برانڈی کی بوتل نہیں چھو سکتا، اس نے مجھے قہر سے دیکھا، دوڑ کر بوتل اٹھائی اور نیچے اتر کر دم توڑتی کتیا کے جبڑے چیر کر، کوئی آدھی بوتل اس کے منھ میں انڈیل دی اور یہ دیکھ کر، مجھے حیرت ہو گئی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کتیا کی حالت بہتر ہو گئی، اور کلیلیں کرنے لگی۔

اس نے مجھ سے کہا تم نے برانڈی کا معجزہ دیکھا، جو چیز مُردوں کو جلا سکتی ہے تم اس کو ہات تک نہیں لگا سکتے۔ شرم شرم، شرم۔

ایک شام کو اس نے مجھ سے کہا جب تم سہ پہر کو ٹہلنے چلے جاتے ہو تو روز ایک حبشی نوجوان آتا، اور میرے کمرے کی طرف منھ اُٹھا اُٹھا کر، کچھ گاتا اور پھر چلا جاتا ہے۔ کل تم ٹہلنے نہ جانا اور یہیں بیٹھنا اور اس کالے حبشی کا دماغ صحیح کر دینا، دوسرے دن میں ٹہلنے نہیں گیا اور ٹھیک پانچ بجے، سڑک سے آواز آنے لگی۔

"مارے ہیں جو اس لاکھوں اے رشکِ چمن تو نے، اے رشکِ چمن تو نے، اے رشکِ چمن تو نے۔ بن بن کے دُلھن تو نے۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہی حبشی نوجوان تھا۔ ڈنڈا لے کر میں نے اس کی ایسی ٹھکائی کردی کہ پھر اس نے کبھی اس گلی کا رُخ بھی نہیں کیا۔

مس میری نے، مسکرا کر کہا تم تو بہت بڑے "نائٹ" ہو جو گوروں کو بھی پیٹتا ہے اور کالوں کو بھی۔

اڑتے اڑتے میرے معاشقے کی خبر میرے باپ تک پہنچی۔ وہ نہایت دانش مند انسان تھے، ابرار کو بلا کر انھوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ فرنگی لڑکی اگر مسلمان ہو جائے اور پردہ نشینی اختیار کرے تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں کہ تشبیر سے اس کا عقد کردوں

جب میں نے میری کے سامنے اپنے باپ کی یہ دونوں شرطیں پیش کیں تو اس نے کہا۔ ڈارلنگ میں تمھاری خاطر پردہ نشینی کی گھٹن تو برداشت کرلوں گی لیکن اسلام کبھی قبول نہیں کروں گی، اس لئے کہ یہ گنڈوں کا دین ہے۔

یہ سنتے ہی مجھ کو تاؤ آگیا، عشق کو جذبۂ اسلام نے دبوچ لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سامنے رکھا ہوا ایک بھاری اسٹول اس کو کھینچ کر مار دیا، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسٹول ایک لکڑی کی الماری پر لگا اس کا پٹ چور چور ہو گیا۔ اور میں اسے اور عیسائی مذہب کو برا بھلا کہتا، اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد، میں اس کے وہاں پھر کبھی نہیں گیا۔ اور لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو گیا۔ اس واقعہ کے کوئی سال بھر کے بعد جب چھٹیوں میں لکھنؤ آیا تو، نہ جانے اسے کیوں کر پتا چل گیا۔ وہ عین دوپہر کے وقت میرے پاس آئی۔ اور جب میں نے اس کی جانب نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر میرے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا کہ صرف ایک سال کی مدت میں اس کا آدھا حسن برباد ہو چکا ہے اور وہ شام کے مرجھائے پھول کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر، مجھ سے چمٹ گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ اس نے مجھ سے کہا ڈارلنگ تمھاری محبت مجھ کو کھا گئی، مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو، ورنہ وہیں پہنچتی۔ تمھاری جدائی کے ہاتھوں ڈارلنگ مجھ کو دق کا مرض ہو چکا ہے میری سانس سے دور ہٹ کر بیٹھو۔ میں اس وقت تمھارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آج سے ایک سال قبل میں نے جو اسلام کی توہین کی تھی، تم اسے معاف کردو، اب میں اس دنیا سے جا رہی ہوں، جانے والے کا یہ حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دل سے معاف کر دیا جائے۔ ڈارلنگ جو اسٹول تم نے کھینچ کر مارا تھا کاش وہ میرے لگ جاتا، میں اسی وقت مر جاتی، لیکن یہ دن نہ دیکھتی۔

میں نے اسے ، بڑی گرم جوشی کے ساتھ چمٹا لیا ۔ میری آنکھیں پھر برسنے لگیں میں نے کہا پیاری میری میں تمہیں دل سے معاف کر رہا ہوں ، اور میں تم کو مرنے نہیں دوں گا ۔ میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہارے علاج پہ نثار کر دوں گا ۔ تم گھبراؤ نہیں ۔ اس نے کہا تبیتہ تم میرا علاج نہ کراؤ ، اب میں بچوں گی نہیں ، اور ہاں یہ بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پیشتر میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد ، میرے پیٹ سے تمہاری لڑکی پیدا ہوئی تھی ، ہو بہو تمہارا نقشہ تھا اور تمہارے سیدھے پاؤں کی انگلی میں جو تِل ہے ، وہ بھی اس نے وراثت میں پایا تھا ۔ ہائے وہ مرگئی ۔ یہ کہہ کر اس کی آواز رندھ گئی اس کے گورے گورے گالوں پر ملگجا پن سا دوڑنے لگا ۔ میرے منھ سے چیخ نکل گئی اور دوبارہ آنسو بہنے لگے ۔

میں نے اس کے علاج پر ، اپنی مال سے لے کر ہزاروں روپئے صرف کر دیئے ۔ ڈاکٹروں پر ڈاکٹر بدلے ۔ ان کے بورڈ بٹھائے ، بڑے بڑے نامی طبیبوں کو بلایا ، لیکن ہائے وہ بچ نہیں سکی اور مجھے دغا دیکر وہاں چلی گئی جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا ۔

اس کا پھول سا چہرہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اور مجھ سخت جان کی بیری اب تک اس زمین پر سانس لے رہی ہے یہ کتنی عبرت انگیز اور شرمناک بات ہے

پس از معشوق جینا ، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے ، مرگیا اور ہم کو مرنا ہے

ہائے اے میری مس میری ، صرف ڈھائی یا تین سال کی قلیل مدت کے لئے تیرے گلستانِ جمال نے مجھ پر پھول برسائے اور اب تیری موت پچاس سال سے مجھ پر انگارے برسا رہی ہے ۔ مسرت کی عمر کس قدر قلیل اور غم کی عمر کس قدر طویل ہوتی ہے ۔

ہم کو صرف ایک بوند بھر تبسم کی لہروں میں تیرا کر ، آنسوؤں کے بے شمار گردابوں میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جاتا ہے ۔ ارے کیسا یہ کارخانہ ہے ؟ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے گل ، مجھ سے عبرت حاصل کرو ، اور خوشی کے حصول سے ہات اٹھالو

مگر تم ایسا نہیں کر سکتے، سفاک قدرت تمھاری جوانی کو تازیانے مار مار کر حصولِ مسرت کے میدانوں کی جانب، ایک ظالم چرواہے کی طرح ہنکائے گی، اور پھر مسرور ہونے کے جرم میں، تم کو، مرتے دم تک رُلائے گی۔ ہائے:۔

انھیں سے کھائی ہیں، خاروں کی لاکھوں برچھیاں میں نے
وہ دو سانسیں، جو لی تھیں، بوئے گل کے درمیاں میں نے
گھمایا جا رہا ہوں۔ اس خطا پر دشتِ عبرت میں
کیا تھا کیوں طوافِ حجلہ ہائے دل براں میں نے
دَرِ قصرِ کشائش کیوں نہ مجھ پر بند ہو جاتا
کہ کھولے تھے کبھی، بندِ قبائے مہ وشاں میں نے
جھکایا جا رہا ہوں، اس لئے پائے گدائی پر
کہ پہنا تھا۔ علی الرغمِ قضا، تاجِ شہاں میں نے
غبارِ دقت کی چادر پڑی ہے فرقِ سیمیں پر
کہ بخشی تھی جوانی کو قبائے کہکشاں میں نے
ٹپکتی ہیں۔ دلِ صد پارہ سے اب خون کی بوندیں
پئے تھے ہائے کیوں رنگیں لبوں سے گلستاں میں نے
گرایا ہے مجھے قدرت نے، خوش چشموں کی نظروں سے
کہ اپنی سمت پھیری تھیں ہزاروں انکھڑیاں میں نے
مرے ہونٹوں پہ قفل، اس جرم میں دنیا نے ڈالا ہے
کہ گونگی ادھ کھلی آنکھوں کو بخشی تھی زباں میں نے
کہوں کس سے کہ بالآخر بجبرِ قسمتِ راشں
بُنی ہے راگ کے ڈوروں سے پوشاکِ نغاں میں نے

وہاں بیٹھے ہوئے ہیں سسکیوں کے ہر طرف پہرے
جہاں آباد کی تھیں، مُرکیوں کی بستیاں میں نے
نظر آتے ہیں کافورِ دکفن کے اب وہاں ڈیرے
جہاں کھولا تھا، بازارِ حریر و پرنیاں میں نے
وہاں، قبروں کی لوحوں کے پڑے ہیں دور تک پتھر
سجائی تھی، جس انگنائی میں، شیشے کی دُکاں میں نے

مِس گلینسی

لکھنؤ کے ایک اسپتال کی خوب رو، خوش چشم، اور کم سن لیڈی ڈاکٹر تھی، جب میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا تھا. اس وقت میرے باپ نے اس کو ملیح آباد بھیجا تھا کہ وہ میری منکوحہ کا معائنہ کرکے اس کے بلوغ کا سرٹیفکیٹ دے دے.

جب وہ ملیح آباد سے معائنہ کرکے آگئی تو میرے باپ نے مجھے اس کے پاس بھیجا کہ میں اُس سے اپنی منکوحہ کے بلوغ کی سند لے آؤں.

میرے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے اور گلینی کے درمیان معاشقہ ہو جائے گا تو وہ کبھی مجھ کو اس کے پاس نہ بھیجتے.

میں اس کے وہاں پہنچا. ابھی برآمدہ طے کر رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت خوب رُو اور کم عمر عورت، غسل خانے سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں کھڑی، اپنی بھوری زُلفیں نچوڑ رہی ہے. اور چوں کہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا. اس لیے اسے پہچان نہیں سکا. اتنے میں اس کی نظر میری طرف اُٹھ گئی، اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر انگریزی میں پوچھا، آپ کون ہیں؟ میں نے کہا جوش، اس نے، بڑی چھانولی کے ساتھ کہا اوہ "Ebullition, agitation, heat" (یعنی ولولہ، ہلچل، حرارت) ــ اس کے اِس انداز سے میں نے بھانپ لیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے، میں نے مُسکرا کر پوچھا اور آپ کون ہیں، اُس نے، سر کو جنبش دے کر

کہا مس گلینسی ۔ میں نے کہا صرف ایک Glance ، اچٹتی نظر کے واسطے آیا ہوں۔ وُہ، آنکھیں جھکا کر مُتبسّم ہوئی اور پوچھا اور کوئی کام؟ میں نے کہا آپ میری منکوحہ کے معائنہ کی خاطر ملیح آباد گئی تھیں۔ میں اس کی رپورٹ لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا میری خواب گاہ میں آجائیے۔

وہ میرے بالکل سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی، اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، اور غُسلِ صبوحی کی تازگی و بالیدگی اُس کے رُوئے گل گوں پر مچل رہی تھی، اس نے پوچھا آپ نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اُس نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں، آپ کی بیوی کا رنگ بالکل ہم لوگوں کا سا ہے۔ وہ بے حد خوب صورت ہے، میں نے کہا بالکل آپ کی طرح؟ اس نے دونوں ہاتوں سے اپنا مُنھ چھپا لیا۔

اتنے میں اس کا ملازم تھالی میں ایک کارڈ لے آیا، اس نے کارڈ پڑھ کر میز پر رکھ دیا، کہا ٹھہرو، اور میری بیوی کے بلوغ کی سند میرے حوالے کر کے کہا آپ غسل خانے کے دروازے سے باہر چلے جائیں، جب میں جانے لگا، اس نے کہا اب کب آئیے گا، میں نے کہا کل صبح کو، اُس نے کہا صبح کو نہیں، شام کو آئیے گا ٹھیک سات بجے۔

جب میں نے جا کر اپنے باپ کو سرٹفکیٹ دیا، وہ نہایت دانا تھے، اُنھوں نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اُٹھا کر فرمایا، یہ تمھارا چہرہ اس وقت کیسا ہو رہا ہے؟ دل میں چور تھا، باپ کی اس دیدہ وری سے گھبرا گیا، اور آنکھیں جھک گئیں میری اس حالت سے میرے باپ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے، کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا۔ میں نے تمہیں اس ڈاکٹرنی کے پاس بھیج کر بڑی غلطی کی، دیکھو خبر دار اب اس کے پاس نہ جانا، ہرگز نہ جانا، میں نے بڑی معصومیت آمیز سعادت سے کہا، بہت اچھا، اور دل ہی دل میں کہا خدا کی قسم جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔

بابا تو جلوۂ رُخِ جاناں نہ دیدۂ!

دوسرے دن ٹھیک سات بجے میں اس کے وہاں پہنچ گیا، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی کلی کی طرح چٹک گیا۔ بڑی گرم جوشی سے ہات ملایا، ہات کیا تھا دھنکی روئی کا گالا، اور اس لہجے میں میرا مزاج پوچھا جیسے انگیٹھی میں فرطِ حرارت سے کوئلہ چٹک جاتا ہے۔ تڑاق سے۔

مجھ کو، وُہ، بڑے تپاک سے ڈرائینگ روم میں لے آئی۔ بوائے (خادم) کو بلا کر ٹوٹی پھوٹی اُردو میں حکم دیا کہ تم برآمدے میں بیٹھ جاؤ، اگر کوئی آئے تو کہ دو مس صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ڈرائینگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مجھے خواب گاہ میں لے گئی، کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے۔ اور صوفے پر میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ پوچھا وسکی پیوگے یا برانڈی یا بیئر؟ میں نے کہا میں پیتا نہیں ہوں، آپ شوق کریں، اور میں آپ کی آنکھوں سے پیوں گا۔ وہ بیئر کی بوتل اٹھا لائی، اور پینے لگی۔ جب دوسری بوتل آدھی ختم ہوگئی۔ اس کے چہرے پر طلوعِ صبح کی سی دھاریاں مچلنے لگیں، اور آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔

اب اس نے صوفے کی ٹیک پر اپنا سیدھا ہات۔ اس طرح پھیلا کر رکھ دیا کہ وہ میری گردن سے مل گیا۔ مجھ کو جھرجھری سی آگئی۔ میں نے بھی اپنا ہات اسی طرح پھیلا دیا اور ہمارے پہلوؤں کے درمیان اب ہاتوں کا وجود باقی نہیں رہا۔ دوسری بوتل ختم کر کے وہ آہستہ سے میری طرف کھسک آئی، میرے پہلو میں انگیٹھی سی جلنے لگی اور اعصاب کے اندر دھمّال سا ہونے لگا۔

اُس کے بعد وہ اُٹھی، روشنی بند کر دی، پھر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی تاریکی میں اس کا مکھڑا اور بھی دمکنے لگا۔

اب اس نے اپنا گال میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کے گالوں کا رنگ اور اس کی جلد کی خوشی، ڈنڈغاکر، پی لی۔ اور پھر ہم دونوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔

اس کے بعد، ایک دھیما سا بلب اس نے جلا دیا، اور اس کے چہرے پر طوفانی رات کا پچھلا پہر مچلتا نظر آنے لگا۔ ارے جمال کی دوشیزگی ابھر آئی! میں نے دیکھا گھڑی پونے نو بجا رہی ہے۔ میں اپنے باپ سے حضرت گنج کی سیر کا بہانہ کرکے آیا تھا، اور عرض کر دیا تھا نو بجے تک آ جاؤں گا۔ اس لئے میں نے اجازت طلب کی، اس کا منھ اُتر گیا۔ "نہیں تمھیں صبح ۵ بجے تک یہاں ٹھہرنا ہے۔" اُس نے بڑے تحکّم سے کہا۔ عشق اس قدر جلد گھل مل جاتا ہے۔ گویا برسوں کے پرانے تعلقات ہیں۔ یہاں ماہ و سال کی گردشیں، ایک لمحے کے اندر گھومنے لگتی ہیں۔

میں نے، بڑی نرمی سے کہا میرے باپ بہت سخت آدمی ہیں، میں اُن سے نو بجے تک واپس آنے کا وعدہ کرکے آیا ہوں ۔ وقت پر نہیں پہنچا تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ اس نے کہا اچھا کھانا تو کھا لو میرے ساتھ، میں نے کہا کھانا کھا لوں گا تو باپ پوچھیں گے یہ کھانا کہاں سے کھا کر آیا ہے

اس رات کے بعد میرے اس کے پینگ یہاں تک بڑھ گئے کہ ہم دونوں دوسرے تیسرے دن ملنے لگے، اور ہر بار ایک تشنگی سی لے کر جدا ہوئے۔

اس نے بے حد کوشش کی مجھے شراب پلانے کی، مگر میں اس قدر کٹّر اور احمق تھا کہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔

ایک بار، رات کے وقت ہم لوگ تانگے میں ٹھنڈی سڑک سے گزر رہے تھے، وہ میرے پہلو میں تھی، اور علی شیر خان سپاہی، موٹا سا لٹھ کاندھے سے لگائے، کوچ بان کے پاس بیٹھا تھا کہ چھتر منزل کلب سے ایک کار تیزی کے ساتھ نکلی، اس کی روشنی مس گلینسی کے چہرے پر پڑی، اس انگریز نے اپنی موٹر آڑی کرکے سڑک پر ٹھہرا دی، اور ڈارلنگ کہہ کر پکارنے لگا۔ اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی، تانگے والے نے کہا صاحب بہادر راستہ دیجئے۔ اس نے تانگے والے کو گالی دی۔ میں نے کہا علی شیر خان، اس بندر کا دماغ درست کر دو۔

علی شیر خان نے اس کی کھڑی موٹر کے پاس جاکر کہا آپ ہمارا راستہ روکے ہوئے کیوں کھڑے ہیں۔ اس نے گلینسی کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بھیج دو۔ شیر علی خان نے اُس کے مُنہ پر تھپیڑ مار دیا۔ وہ موٹر سے اُتر کر ہاتھا پائی کرنے لگا۔ میں تانگے سے کود پڑا اور کوچ بان کا ہنٹر اس پر برسانے لگا۔ اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے، اور وہ انگریز موٹر اسٹارٹ کرکے بھاگ کھڑا ہوا۔ گلینسی نے میری پیٹھ ٹھونکی، اور کہا مجھے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ میں تمھارے سے بہادر آدمی کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔

جب تانگہ آگے بڑھا کھانچوں نے برا حال کر دیا۔ اور وہ کہنے لگی آج ہی تمھاری موٹر کو خراب ہونا تھا، یہ بھی کوئی سواری ہے "شیک، شیک، شیک" (لرزندگی، لرزندگی، لرزندگی) اس نے "شیک" کو اِس طرح ادا کیا کہ میرے تمام بدن میں سنسنی پیدا ہوگئی۔

ایک رات کو جب میں گلینسی کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے زانو پر بیٹھی بیئر پی رہی تھی کہ اس کی خواب گاہ کا دروازہ یکایک دھڑام سے کھل گیا اور ایک لمبا تڑنگا، ادھیڑ عمر کا انگریز۔ جو اس کا چچا یا ماموں تھا، ہاتھ میں پستول لئے لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ گلینسی اور میں دونوں گھبرا کر کھڑے ہوگئے، اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دھڑام سے مجھ پر گولی چلا دی، گلینسی نے سقف شگاف چیخ ماری اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی۔ نشانہ خطا ہوگیا تھا، میں نے، جست کرکے اُس کی کلائی پکڑ لی، اور پستول چھیننے لگا۔ اسی کشمکش میں اس نے دوسری گولی چلا دی جو چھت میں جا کر لگی۔ اور میں نے جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ اتنے میں اس کے نوکر چاکر اور پڑوس کے بنگلوں کے دس بیس آدمی خواب گاہ میں آگئے۔ انھوں نے اس انگریز کو پکڑ لیا، اس کے بعد تھوڑی دیر میں پولیس آگئی اور ہمارے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اس انگریز کو گرفتار کرکے تھانے لے گئی اُس تھانے کا انچارج میرے باپ سے واقف تھا، اُس نے صبح ہوتے ہی

یہ خبر میرے باپ تک پہنچا دی، ــ میرے باپ نے مجھ کو طلب کیا، میں کانپتا ہوا اُن کے سامنے گیا، انھوں نے، بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا میں نے منع کر دیا تھا کہ اُس ڈاکٹرنی کے وہاں ہرگز نہ جانا۔ لیکن تم نے میری بات نہ مانی، یہ کہہ کر، میرے مُنھ پر اِس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گیا، میری ماں، ہانپتی کانپتی آئیں، اور پوچھا یہ کیا قصّہ ہے، میرے باپ نے سارا ماجرا بیان فرما دیا، میری ماں نے، اپنے زانو پر میرا سر رکھ کر کہا، اگر، سو سو سمندر پار، شیطان کے کان بہرے تیرے گولی لگ جاتی ننھے۔ تو ہائے میں کیا کرتی، میں تو زندہ درگور ہو کر رہ جاتی، ہائے ماں اللہ آمین سے پالے اور بچہ اپنے کو آفت میں ڈالے،

اس کے بعد میں، ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا، اور در و دیوار کے سناٹے سے گلَینسی گلَینسی کی آوازیں آنے لگیں،

میرے باپ نے، پولیس کی مُنھ بھرائی کرکے۔ مقدّمے کو تو ختم کرا دیا، لیکن مجھ کو قید سے باہر نہیں نکالا۔

ایک روز، شام کے وقت جب کہ میں اپنے زنداں میں اداس بیٹھا ہوا تھا، ایک بڑی مالوس آواز میرے کان میں آئی، دل نے کہا ہو نہ ہو یہ تو گلینسی کی آواز ہے، میں سلاخوں دار کھڑکی کے پاس گیا۔ اور، دیکھا کہ گلینسی میری ماں کے قدموں پہ سر رکھّے یہ درخواست کر رہی ہے کہ خدا را شبیر کو ایک نظر دکھا دیجیے۔ اور میری رقیق القلب ماں، ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میاں (میرے باپ) باہر گئے ہوئے ہیں اُن کی واپسی تک ٹھہر جاؤ۔ اور گلینسی قدموں سے سر اُٹھا کر۔ بڑی بے کسی کے ساتھ، میری ماں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا، خاندانی آداب کا پاس اور غیرت کا احساس، اگر میرے منھ پر بات نہ رکھ دیتا تو میں ایسی چیخ مارتا کہ میرے زنداں کی چھت گر پڑتی،

میں نے بڑے زور سے اپنے سینے کو دبایا، دانتوں پر دانت جما کر، اپنی

آہوں کو روکا۔ اور دل پر اس قدر دھکا لگا کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا، گرتے ہوئے میز پر پاؤں لگا اور میز پر رکھی ہوئی اچاری پتھر کے فرش پر گر کر تڑاق سے ٹوٹ گئی۔ میری ماں گھبرا کر کھڑی ہوگئیں، جھپٹ کر، میرے زنداں کا دروازہ کھولا، اور ہائے میرے بچے کہہ کر زمین پر بیٹھ گئیں، اور میرے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

گلینسی کو موقع مل گیا، وہ میرے کمرے کی طرف جھپٹی۔ ابھی دہلیز تک پہنچی تھی کہ میرے باپ آگئے، انھوں نے یہ خلاف توقع سماں دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے، اور، ڈانٹ کر فرمایا ڈاکٹر نی۔ ابھی میرے باپ کچھ اور نہیں کہنے پائے تھے کہ وہ "پاپا" کہہ کر اُن کے قدموں سے لپٹ گئی۔ میرے باپ لاکھ تُند خو پٹھان سہی، مگر شاعر تھے، اُن کا دل پسیج گیا، اسے میرے زنداں میں لے کر آگئے اور وُہ میرا اترا ہوا منھ دیکھ کر رونے لگی،

میں نے باپ کی موجودگی کے باعث اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی، اور اپنی رسوائی سے میرا تمام بدن ٹھنڈا ہوگیا۔

میرے باپ نے کہا ڈاکٹر نی۔ اگر تو مسلمان ہونے اور پردہ نشینی اختیار کرنے پر طیار رہے تو میں شبیّر سے تیرا نکاح کرا دونگا۔ میں دلوں کو توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا،

گلینسی میرے باپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی، سوالیہ انداز میں اُس نے میرے باپ کی طرف نگاہ اٹھائی،

میرے باپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ شبّیر اس کو میری بات انگریزی میں سمجھا دے، میں شرم کے مارے بول نہیں سکا، تو میرے باپ نے کہا، میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ انگریزی میں اس ڈاکٹرنی کو میری بات سمجھا دے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر، انگریزی میں اس کو بات سمجھا دی، اس نے کہا پاپا سے کہ دو، مجھ کو یہ دونوں شرطیں منظور ہیں۔

میرے باپ نے فرمایا، اس سے کہ دو جمعرات کے روز، وہ یہاں آجائے، فرنگی محل چل کر، مولانا عبدالباری کے سامنے مشرّف باسلام ہوجائے اور نوکری سے استعفٰی دے دے میں جمعے کے دن اس کا نکاح پڑھوا دوں گا

میں نے گلینسی کو یہ بات بھی سمجھا دی اور اس نے خوشی کے ساتھ، منظور کرلی، بدھ کے دن سرِشام، اس کے وہاں پہنچا تو اس کے بنگلے پر کچھ اس طرح کی سوگ واری دیکھی کہ مجھے یقین ہوگیا کہ خدا نخواستہ، میں کسی نہایت الم ناک سانحے سے دوچار ہونے والا ہوں۔

جب ڈرائینگ روم میں قدم رکھا تو ایک شخص نے، یہ کہ کر، مجھے اس کی خواب گاہ میں جانے سے روک دیا کہ مس گلینسی پر دل کا بے حد شدید دورہ پڑا ہے، اُن کو گیس دی جا رہی ہے، یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی، دل، زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ٹھنڈا پسینہ آنے لگا، تمام بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی،

اتنے میں وہ آدمی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا، میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا، وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی،

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا آپ باہر چلے جائیں۔ میں ڈرائینگ رُوم میں آگیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ اس کونے سے اُس کونے کے درمیان، ایک ایسے عالم میں ٹہلنے لگا جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتا۔

اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد، جو میری نظروں میں ہزار ہا صدیوں کے برابر تھا، ڈاکٹر نے باہر آکر کہا افسوس کہ وہ مرگئی۔ میں اسے بچا نہیں سکا۔ میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوکر وہیں گر گیا۔

جب رات گئے ہوش آیا، پہلے تو دیر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں۔ اور یہ میری حالت کیا ہے۔ جب تھوڑی دیر میں حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ میں اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں ہوں، اور میرے باپ میرے روبرو ننگے سر کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

میرے آنکھ کھولتے، میرے باپ میری طرف جھکے، اور، بڑی مسرت آمیز نرمی سے پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے۔ میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا میاں میں اچھا ہوں، میرے باپ سجدۂ شکرانہ میں گر گئے، میرے سر سے صدقہ اُتارا گیا۔ اور تمام اسپتال میں مٹھائی تقسیم کی گئی،

گلینی کی موت نے مجھ کو اَدھ مُوا کر دیا۔ زندگی میری نظر میں بے معنی اور سپاٹ ہو کر رہ گئی۔۔ مجھ کو ہر روز دو بجے دن کے بعد خفیف بخار آنے لگا، اور چہرہ اس قدر اُتر گیا کہ میرے باپ کو سخت تشویش پیدا ہوگئی، وہ مجھ کو نینی تال لے گئے۔ ابرار اور مختار کو میرا جی بہلانے کے لئے ساتھ لے لیا، میرے باپ میرے ساتھ نہیں ٹھہرے، ایک دوسری کوٹھی میں قیام کیا۔ اور صبح و شام ڈاکٹر کو لے کر آتے رہے۔

جب کوئی چار مہینے کے بعد سہ پہر کے خفیف بخار سے مجھ کو نجات حاصل ہوگئی اور میرا رنگ ٹھہرنے لگا، تو ملیح آباد لے آئے، اور ایک سال تک لکھنؤ جانے نہیں دیا۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ یہ بات سچ ہے، لیکن سو فی صد صحیح نہیں۔ ہر چند وہ اگلی سی اداسی باقی نہیں رہی، لیکن بار بار دل میں برسوں کسک ہوتی رہی۔ اور اب بھی، جب اس عمر میں بھی، گلینی کی موت یاد آجاتی ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔

ہائے وہ اپنا دین بدل رہی تھی، پردہ نشینی کی گھٹن پر آمادہ ہوگئی تھی، مرنے سے ایک روز بیش تر، استعفیٰ بھی دے چکی تھی، اور جمعے کو دُلھن بننے والی تھی۔ بُدھ کو ہمیشہ کے واسطے سو گئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں، خواہد شد آشکارا
کشتی شکستگانیم، اے بادِ شُرطہ، برخیز
باشد کہ باز بینیم، آں یارِ آشنا را

م - بیگم

یہ ایک دیسی ریاست کا ذکر ہے۔ میں ایک نواب صاحب کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ چھوٹے دادا اور ابرار میرے ساتھ تھے۔

اس حویلی کے ایک گوشے میں ایک دوسری حویلی تھی۔ جس میں نواب صاحب کے فرزند رہتے تھے۔ ایک دن میری غیر موجودگی میں ابرار اپنا سامان اُٹھا کر۔ چھوٹی حویلی میں منتقل ہوگئے۔ اور رہنے لگے اس کے بالاخانے پر۔ میں نے ابرار سے اس انتقال مکانی کا سبب دریافت کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ مجھ کو یقین ہوگیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

میں شام ہوتے ہی اُن کے پاس پہنچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر۔ اُن کے مُنھ پر کلونچ سی دوڑ گئی۔ میں نے پوچھا ابرار کیا بات ہے۔ انھوں نے۔ بڑی بے کسی کے ساتھ کہا، کیا بتاؤں۔ میری پیٹ میں لو لگ گئی ہے۔ میں نے کہا یہ پیٹ میں لُو لگنا کیا ہوتا ہے، لُو تو پورے جسم کو جھلسا دیتی ہے، اور تمھارا تمام بدن چھوڑ کر صرف تمھاری پیٹ پر لُو کا اثر ہوا ہے۔ کیا گھانس کھا گئے ہو؟ یا مجھے جُھندھلا رہے ہو۔

ابرار نے کہا شبیر حسن خان۔ قُرآن مجید کی قسم سچ کہہ رہا ہوں ۔۔ کہ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ——— آدھا پٹ کھلا، اور اس سے جھانکا م بیگم[1] نے

---

[1] وہ حسینہ چھوٹے نواب صاحب کے منھ بولے بیٹے کی منکوحہ تھی، جو نہایت بدشکل اور رِنڈوا زنا مردِ بھی تھا۔

نے ـــ اللہ اکبر وُہ اس کی اٹھتی جوانی، وہ شہابی رنگ، وہ دھانی دوپٹہ۔ اور وہ کتابی مکھڑا۔ میں ایک ہی نظر میں، اس پہ ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ اور جب ایک پل کے بعد اس نے پٹ بند کرلیا تو میں نے کہا جناب، ابرار حسن خان صاحب، آثر ملیح آبادی:۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے بھی وہ اُڑیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

وُہ جو آپ کی پشتِ مبارک میں لُو لگ گئی ہے۔ اس کو میں نے دیکھ لیا ہے اور اُس کو دیکھ کر میرے سینے میں بھی لُو لگ گئی ہے۔ کہئے کیا ارشادِ عالی ہے؟

ابرار نے کہا، شبیر حسن خان، قرآن مجید کی قسم یہ بات نہیں، میں تو اس لڑکی سے واحد شاہد ہی نہیں۔ قرآن مجید کی قسم آج پہلی بار اس کو دیکھا ہے

میں نے کہا خاں صاحب اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو مجھ کو یہ سوچ کر بڑا اطمینان محسوس ہو رہا ہے کہ میرے آپ کے مابین رقابت کا قدم نہیں آنے پائے گا۔ جگنو سے کہئے، میرا بستر یہیں لے آئے۔ ابرار کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں انھوں نے کہا شبیر حسن خاں یہ کمرہ بڑا خطرناک ہے، یہاں رات کو بچھو نکلتے ہیں اور ایک دن تو ایک کالا سانپ بھی رینگ کر اس سامنے والی نالی میں داخل ہوگیا تھا۔

میں نے کہا ابرار حسن[ؔ] خان پھر آپ اس خطرناک جگہ کیوں قیام فرما ہیں۔

انھوں نے کہا میری جان، قرآن مجید کی قسم آپ کی جان کی سی قیمتی نہیں ہے

میں نے کہا بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ جس کی خاطر آپ اپنی جان کو اس قدر خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ میں بھی اسی کی خاطر اس خطرے کو اپنے سر لے رہا ہوں۔ بلائیے جگنو کو اور منگائیے میرا بستر۔ ابرار کا منھ ذرا سا نکل آیا۔ وہ۔ بوڑھوں کی طرح جھکے جھکے اٹھے، جگنو کو، دھڑکتے دل سے، آواز دی۔ جگنو

ؔ کبھی کبھی میں ان کو اس نام سے بھی پکارا کرتا تھا۔

موجود نہیں تھا، اُسے تلاش کرنے کے لئے، زینے سے اُتر کر، بڑی حویلی چلے گئے۔
اتنے میں دوبارہ پٹ کھُلا۔ اور:۔ اس تکلف سے گویا بُت کدے کا در کھُلا۔
میں نے اس پچوڑی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دل، حسن کی شفق میں ڈوب گیا۔ اُس نے، کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی نظروں نے بات کی، میری نگاہوں نے جواب دیا۔ آنکھوں کی زبان اِس قدر سلجھی، صاف، اور دوٹوک ہوتی ہے کہ غلط فہمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ آنکھوں کی بات چیت ہوا میں نہیں تیرتی خون کی لہروں میں ڈوب جاتی ہے، ایک دل کہتا ہے، دوسرا دل سمجھ لیتا ہے،

نگاہے معنئ دارد کہ در گفتن نمی آید

اور ہم دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہوگیا۔

اتنے میں ابرار آگئے۔ انھوں نے پٹ بند ہوتے اور میرے چہرے پر عزؔ رانہ و نیاز کھلتے دیکھ لیا۔ سَن سے ہو کر رہ گئے۔ اُن کے چہرے کی بشاشت کا خیمہ گر گیا۔ وہ میرے سامنے اپنی ذہانت اور طلاقت کھو کر خاموش ہو کے بیٹھ گئے، اور میرے بچھے ہوئے بستر کو اس طرح دیکھنے لگے، گویا اُن کی قبر کھود دی گئی ہے۔

میں نے کہا ابرار تم کہو تو اپنا بوریا بدھنا اُٹھا کر، بڑی حویلی میں چلا جاؤں تھوڑی دیر کچھ سوچ کر انھوں نے جواب دیا۔ آئیے، ہمارے آپ کے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ ہوجائے، آپ یہیں رہیں، لیکن ہم دونوں، اپنے اپنے در بانٹ لیں۔ ایک در کے نیچے، انگنائی میں گائے بندھی ہوئی ہے، ایک در کے نیچے گھڑونچی رکھی ہوئی ہے، آپ جو در چاہیں پسند کرلیں، میں نے کہا گھڑونچی والا در مجھے دے دو، گائے والا در تم لے لو۔ میرے در کا تعلق ہوگا پانی سے، اور تمھارے در کا دودھ سے۔ ابرار نے یہ تقسیم منظور کرلی۔ اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دروں میں، اس پری زاد کی جھلت پھرت دیکھنے کے لئے، اس طرح دن دن بھر بیٹھنے لگے جیسے ماہی گیر، دریا میں جال ڈال کر، ساحل پر بیٹھے

نظر آتے ہیں - ارے میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب ہمارے مابین دروں کی تقسیم ہوئی تھی تو ابرار نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھیے ہم دونوں بڑی ایمانداری کا کھیل کھیلیں گے، اگر وہ میرے در کے سامنے زیادہ، آپ کے در کے سامنے زیادہ آئے گی، یا آئے گی ہی نہیں تو آپ اس کے عشق سے دستبردار ہو جائیں گے، اور معاملہ اس کے برعکس ہوا تو میں دست بردار ہو جاؤں گا۔

جب ہم ڈھنگی لگاکر، دروں میں بیٹھنے لگے تو اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس پری زاد نے ادا سے آکر، میرے در کے نیچے کی انگنائی میں آنا، اور اُوپر آنکھیں اٹھانا شروع کر دیا اور ابرار بے چارے کا در سونا ہو کر رہ گیا۔

میں کیا بتاؤں اس کے آنکھیں اُٹھانے کا انداز۔ قاعدہ ہے بجلی اوپر سے نیچے گرتی ہے، لیکن جب وہ انگنائی سے میرے در کی طرف آنکھیں اٹھاتی تھی تو نیچے سے اوپر، بجلی گرنے لگتی تھی۔

اس کی متواتر بے اعتنائی سے ابرار کا دل ڈوبنے لگا، مجھ سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی، میں نے کہا ابرار اب میں کل ہی بڑی حویلی میں اُٹھ جاؤں گا۔ ابرار نے کہا اب آپ کا یہاں سے اُٹھ جانا بے کار ہے۔ اس کا دل آپ پر آگیا ہے، میں اس کی نظروں سے گر چکا ہوں۔ قرآن مجید کی قسم ایسی بے وفا عورت پر میں لعنت بھیجتا ہوں، اب آپ یہاں رہیں، میں بڑی حویلی میں اُٹھ جاؤں گا۔ میں نے ابرار کو گلے لگالیا، اور کہا نہیں تم بڑی حویلی میں ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے، تمھیں یہیں رہنا پڑے گا۔

ان باتوں میں رات کے نو بج گئے اور ہم دونوں کھانا کھاکر سو گئے۔

غالباً آدھی رات گزر چکی ہوگی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی نہایت ملائم چیز میرے تلوؤں سے مس ہو رہی ہے، میں ہڑبڑاکر، اُٹھ بیٹھا ــ اور یہ دیکھ کر دنگ ہو گیا کہ وہ آفتِ روزگار، میرے تلوؤں سے اپنے گال لگائے بیٹھی ہے، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہے۔

میں نے اسے کھینچ کر کلیجے سے لگا لیا، اُس نے ابرار کی چارپائی کی طرف اشارہ کیا، میں اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

پچھلے پہر جب وُہ سینے پر ڈوپٹہ ڈال کر، اور موباف باندھ کر، رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا میرے ابّا، میری اس شادی سے خوش نہیں ہیں، وہ کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے طلاق دلا کر گوالیار لے جائیں، اور میری دوسری شادی کر دیں۔ اب میں آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کو ہات نہیں لگانے دوں گی۔ کل آپ جا رہے ہیں، میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی اس لئے کہ آپ کی اماں جان نے تار دے کر، آپ کو بلایا ہے، لیکن میرے سر کی قسم، سات دن کے اندر آ جائیے گا، اگر آپ نہیں آئیں گے تو ابا مجھ کو گوالیار لے کر چلے جائیں گے۔ مجھے مجبور کریں گے دوسری شادی پر اور میں زہر کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گی۔

میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا سات دن تو بہت ہوتے ہیں، میں چوتھے یا پانچویں دن ہی آجاؤں گا، اور تم کو آگرے لیجا کر، اپنے ایک قرابت دار کے گھر میں رکھوں گا، اور وہاں سے ہم دونوں پھر لکھنؤ چلے جائیں گے۔ دیکھو، بالکل نہ گھبرانا میرا وعدہ پکّا ہے۔ وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگی، اور میرے آنسو بھی بہنے لگے۔

دوسرے دن جب میں، گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن جانے لگا۔ اس نے بالاخانے کے غرفے سے مجھ کو جھانک کر دیکھا، اس کی موتیوں کی سی آب دار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور برستی آنکھیں چیخ رہی تھیں کہ وقت پر آجانا۔

ملیح آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابرار نے میری ماں کو میرا سارا کچّا چٹھا لکھ بھیجا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں اس ریاست میں رہا تو میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

ماں سے، میں نے، شرم کے مارے ابرار کے خط کا کچھ نہیں پوچھا، لیکن جب تیسرے دن میں نے اس ریاست کے سفر کی اجازت طلب کی، تو، اُنھوں

نے فرمایا اگر تو وہاں گیا تو دودھ نہیں بخشوں گی۔ میرے سر کی قسم وہاں قدم نہ رکھنا

ماں کی اس شدید تاکید کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ابرار کے خط والی بات صحیح ہے، ایک طرف تو ماں کا احترام، اور ایک طرف اپنے وعدۂ محکم کا پاس۔ میں عجب کش مکش میں پڑ گیا، اور دل پر کچھ ایسا دھکا لگا کہ ہلہلا کر مجھ پر بخار چڑھ آیا، اور ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ گیا، گھر بھر میں کہرام مچ گیا، دن میں چار چار پانچ پانچ بار ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آنے لگے۔ بار بار میرے سر پر برف رکھی گئی، دو دو گھنٹے کے بعد پاؤں میں جھانویں کئے گئے، تین تین گھنٹہ میں دوائیں پلائی گئیں منتیں مانی گئیں، ہر صبح کو قرآن کی ہوائیں دی گئیں۔ پھر بھی بیس روز سے پہلے بخار نہیں اُترا، اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

ابھی میں پورا تن درست ہونے نہیں پایا تھا کہ میرے پاس اس ریاست سے، میرے ایک محرمِ راز کا خط آیا کہ "م۔ بیگم" کو اس کا باپ گوالیار لے کر چلا گیا وہاں اس کی شادی ٹھہرائی، اور عین اس وقت جب کہ گھر میں شادی کے ڈھول بج رہے تھے، اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، جوڑی آ گئی، جوڑی کے بعد بخار آ گیا، اور ایک دم سے ایک سو تین ڈگری ہو گیا۔

کہاں تک بیان کروں اپنی دردمندی۔ جسم کو بخار جلا رہا تھا، اور دل میں اس نامراد کی خودکشی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور ہر بُنِ مو سے ہائے ہائے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اللہ دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ میں کم بخت مر کیوں نہیں گیا۔

اللہُ اکبر یہ تیغ در دست و کفن بر دوش قاتل زندگی۔

جہاں۔ بسمل گہِ درد است، آسائش کہ دید ایں جا؟

بقدرِ سخت جانی ، ہر کسے ، بر خود طپید ایں جا!

صاحبِ "زہرِ عشق" نے عشق کے باب میں کتنی سچّی بات کہی ہے:۔

بس میں ڈالے نہ کبریا اس کے ۔ رحم دل میں نہیں ذرا اس کے
مار ڈالا تماشہ بینوں کو زہر کھلوا دیا حسینوں کو

ر۔ کماری

ایک بار، مختار احمد خان ملیح آبادی سے ملنے اور سیر کرنے کلکتے جا رہا تھا۔ چھوٹے دادا، جگنو اور علی حسین خدمت گار ہم سفر تھے۔

میرے ڈبّے میں، ایک سیٹ پر ایک بوڑھا انگریز لیٹا ہوا تھا، اور ایک سیٹ پر ایک دراز قامت گل چہرہ، چھریری لڑکی، آدھی لیٹی، کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے نُکیلے چہرے کی موج ہائے رنگارنگ سے نکل نکل کر، ایک سنہرا آنکڑا بار بار میری طرف آتا اور میری نظروں کو، اپنی گرفت میں لے کر، اس کے گالوں کی طرف لیجاتا تھا۔ یہ مشغلہ تا دیر جاری رہا۔ لیکن وہ مطالعے میں اس قدر مستغرق تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میں کب ڈبے میں داخل ہوا، اور کیسی ترسی نظروں سے اُس کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اُس کی کتاب پر نظر جمائی تو دیکھا کہ وُہ شکسپیئر کا ڈراما "رومیو جولیٹ" کا مطالعہ کر رہی ہے، میرے دل نے کہا آثار اچھے ہیں، نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا۔ انشاءاللہ۔

تھوڑی دیر میں ہوا بہت ہی تند ہوگئی، اور وُہ اپنی شیشے والی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نازک بدن سے کھڑکی نہیں سنبھل رہی ہے

اور اس کی گوری گوری کلائیاں لچکی جا رہی ہیں، بس اس، قدرت کے عطا کردہ زرّیں موقع سے فائدہ اُٹھانے کے واسطے۔ جلدی سے اس کے قریب گیا، اور شیشہ چڑھا دیا۔ اس نے، میری طرف نگاہ اٹھائی، اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا گویا اس نے، کوئی چیز جلدی سے نگل لی، مسکرا کر، میرا شکریہ ادا کیا، ہات سے کتاب رکھ دی، اور ماتھے سے لٹیں ہٹانے لگی۔ اور میں نے دل ہی دل میں کہا مبارک ہو میاں جوش۔

سرِ شام گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی، تو وہ بوڑھا ہم سفر انگریز اُتر گیا۔ اور میں دُعائیں مانگنے لگا کہ اب کوئی دوسرا مسافر آخر تک نہ آئے۔

جب گاڑی وہاں سے چلی، اور کوئی مسافر ہمارے درجے میں نہیں آیا، میرا دل باغ باغ ہوگیا، اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کے چہرے پر، اس صورتِ حال سے بحالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

اب ہماری نگاہوں کے جلد جلد مبادلے ہونے لگے۔ لیکن ایک دوسرے سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی — اور میں سوچنے لگا کہ بچپن کی تربیت انسان کو کس قدر شرمیلا بنا دیتی ہے۔

اب آفتاب ڈوب گیا، اور میں اپنے طلُوع کی طیّاری کرنے لگا۔ بوتل کھولی، کاک بولا کھٹاک، کھچ سے دیا سلائی سلگائی، اگر بتّی جلائی، گلاس بھرا چھچے سے، سوڈے کو گردش دی، جھاگ اُٹھے، چھچھ گلاس سے نکالا، گیس کی پتلی سی کمر لچکنے لگی، ایک گھونٹ، زیرِ لب بسم اللہ کہہ کر پیا، تین منٹ کے اندر طبیعت اُجاگر، اور اُمنگ بیدار ہوگئی،

جب دوسرا جام بھرا، اس نے، آہستہ سے کہا رام رام۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا اگر کی لپٹیں، ہر دے میں اُترتی چلی جا رہی ہیں میں نے کہا بجھا دوں؟ اس نے کہا نہیں۔ ایک بتی اور جلا دیجئے، میں نے دوسری بتی جلا کر، پوچھا آپ کہاں جا رہی ہیں، اس نے کہا بنارس، اس نے دریافت کیا اور

آپ؟ میں نے کہا کلکتے ۔ اُس کے چہرے پر دھواں سا دوڑ گیا۔

اُس نے پوچھا آپ کا نام، میں نے کہا جوشؔ، میں نے پوچھا آپ کا نام؟ اس نے کہا "ر۔ کماری ۔ اس نے کچھ ایسی لٹک سے اپنا نام بتایا، جیسے کوئی کسی مفلس کو خزانے کا پتہ بتاتا ہے۔

میں نے دریافت کیا، آپ کرتی کیا ہیں، اس نے کہا فرسٹ ایر میں پڑھتی ہوں۔ تیسرے جام کا ایک گھونٹ پینے کے بعد میں اپنا بستر درست کرنے کے بہانے سے، بامقصد لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، اور یہ ظاہر کیا کہ میرے جسم کا توازن بگڑ گیا ہے، اور جب تکیے سیدھے کرنے کو جھکا تو، ایک جھٹکے کے ساتھ، اس کی طرف اس طرح جُھک گیا کہ میرے دونوں ہات اس کے سینے پر جا کر ٹِک گئے۔ اس کے مُنھ سے، ہلکی سی چیخ نکل گئی، میں معافی طلب کرتا، سیدھا ہونے لگا تو اُس نے، اپنے ملائم ہاتوں سے میری دونوں کلائیاں پکڑ لیں، اور کہا جلدی سے بیٹھ جائیے، نہیں تو گر پڑیے گا۔ یہ کہتے ہی اُس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا، اس نے کہا ڈرنک بُری چیز ہے، یہ آدمی کو گرا دیتی ہے۔ میں نے کہا آپ کو کیا معلوم، اس نے کہا ابھی ابھی تو آپ ہی کو گرتے ہوئے دیکھا ہے اور میرے پتاجی بھی ڈرنک کرتے اور ڈگمگانے لگتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے بال کھول دیئے، صدری اتار دی، گھڑی کلائی سے نکال کر، سرہانے رکھ لی، میرے پہلو سے پہلو ملا دیا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کور کھٹکنے لگی، اور میں اس کے چھلکتے ساغرِ جمال میں ڈوب گیا ـــــــ

صبح آنکھ کھلی، ایک عجیب شیریں تبسّم کا مبادلہ ہوا، اور ایسا لگا جیسے ہم ایک ہزار برس سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں۔ اور "آپ" سے گزر کر، "تم" کی نوبت آ گئی۔

محبّت کتنے برسوں کے فاصلے ایک چھلانگ میں طے کر لیتی ہے۔

وُہ ایک جادو کے جزیرے کی پری کی مانند بستر سے اٹھی، الجھے بال سلجھائے

اور میری سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک ایک شاہ زادی کی مانند کہا، تم اب کلکتے نہیں جاؤ گے، بنارس میں اُترو گے. میں نے ہات جوڑ کر کہا، جو حکم ہو، دیوی جی کا۔

پھر اُس نے کہا اب تم جوش نہیں، جوشی ہو۔ اپنا پرانا نام بھول جاؤ، میں نے کہا بہت اچھا سرکار۔

اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی رُکی، اس کا بوڑھا خادم آگیا، غسل کا سامان غسل خانے میں رکھ دیا۔ اور جب وہ نہاکر نکلی، فضا پر صبحِ بنارس طلوع ہوگئی،

اُس نے اپنے کالج اور سڑک کا نام بتایا، کہا کہ میرے کالج کے بالکل سامنے ایک نہایت عمدہ ہوٹل ہے. تم اس میں ٹھہر جانا۔ میں انٹرول میں ملنے آؤں گی۔ اور دیکھو بنارس اسٹیشن پر بالکل اجنبی بن جانا۔

میں دوسرے اسٹیشن پر چھوٹے دادا کے کمپارٹ منٹ گیا، اُن سے کہا اب میں بنارس میں اُتروں گا، اس کے بعد کلکتے جاؤں گا، چھوٹے دادا نے مُنھ بنا کر حسب دستور کہا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ آخر بنارس میں کیا کام نکل آیا ہے، بھائی شبیر حسن خان یہ اس لڑکی نے شاید نیا گل کھلایا ہے جو آپ کے ڈبے میں سفر کر رہی ہے۔ دیکھیۓ ہندو مسلم لفرت کا آغاز ہو چکا ہے۔

میں نے کہا چھوٹے دادا آپ اطمینان رکھیں:-

جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب ورکیب سب جانتے ہیں

چھوٹے دادا نے ملازموں کو خبر کردی - اور جب بنارس کا اسٹیشن آیا میں نے اس لڑکی سے بیگانگی اختیار کرلی، سوکھے مُنھ سے اُترا۔ اور اس کے بتائے ہوۓ ہوٹل میں، جوشی کے نام سے، ایک کمرہ لے کر ٹھہر گیا۔

کمرے میں پہنچ کر، چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خاں، ہم کو آپ کی یہ باتیں پسند نہیں، بنارس میں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے، میں نے بنارس اسٹیشن سے

پہلے ہی تینوں لوٹے چمڑے کے تھیلے میں بند کر دیے تھے کہ کوئی یہ نہ بھانپ سکے کہ ہم مسلمان ہیں، آپ کہتے ہیں وہ یہاں دوپہر کو آئے گی۔ اگر کسی کو اس کا پتہ چل گیا، اور پتہ چلنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے تو ہم سب یہیں قتل کر ڈالے جائیں گے۔ دیکھیے ہم سب پہلے ہی سے کہے دیتے ہیں میں نے کہا چھوٹے دادا پٹھان ہو کر آپ ایسی ڈر جانے والی باتیں کر رہے ہیں، اُنھوں نے کہا پٹھان ہونے سے کیا ہوتا ہے ایک کی دوا دو، دو کی دوا چار۔ ایک آدمی ایک غول کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے، کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ وُہ، ایک مزدور کو ساتھ لئے، کمرے میں در آئی، مزدور سے کہا سامان یہاں رکھ دو، مزدور نے سامان رکھ دیا۔ اور اجرت لے کر چلا گیا، چھوٹے دادا اور دونوں خدمت گار بھی کمرے سے نکل کر، برآمدے میں، چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔ اس نے ڈبے کھول کھول کر، میز پر مٹھائی، اور پھلوں کا انبار لگا دیا اپنی جیب سے نہایت خوبصورت سونے کی گھڑی نکال کر۔ اپنے دستِ ناز سے، میری کلائی پر باندھ دی۔ ایک بنڈل کھول کر دو دھوتیاں اور دو شربتی کرتے میرے سامنے رکھ کر اس نے کہا کل بہت تڑکے گنگا جی کے گھاٹ پر یہ دھوتی باندھ کر اور یہ کرتہ پہن کر آجانا۔ اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو جانا میں تم کو.... مندر لے چلوں گی۔

یہ کہ کر اس نے ایک لپٹا ہوا زنّار نکالا اور کہا اسے گلے میں ڈال لینا۔ اس کے بعد ایک ڈبیا سے چندن نکال کر کہا اسے چلتے وقت، ماتھے پر لگا لینا۔

میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال کر کہا... کماری چائے پیو گی، یا آئس کریم کھاؤ گی،

اس نے بڑے مزے سے کہا، تمھارا درشن چائے ہے، اور تمھاری باتیں آئس کریم۔ اور میں نے اسے، بھینچ کر، سینے سے لگا لیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد، چھوٹے دادا، غضب و خوف کو اپنی مونچھوں اور گالوں پر بٹھائے کمرے میں آئے اور میں نے سارا ماجرا اُن سے بیان کر دیا

اُن کے ہوش اُڑ گئے، کہا ارے غضب خدا کا، بنارس کے مندر میں ہندو بن کر جاؤگے، اگر، خدانخواستہ، کسی نے تم کو پہچان کر، شور مچا دیا تو کیا کروگے۔ یہ کلکتے کا سفر تو بڑا خطرناک ثابت ہوا، ہم تو پہلے ہی کہتے تھے، میں نے کہا چھوڑیئے بھی ان باتوں کو، یہ مٹھائی اور پھل کھائیے، اور وہ تمام خطروں کو یکسر بھول کر، کھانے پر ٹوٹ پڑے اور خود اُن کے بقول، کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیئے۔

میں صبح جب گنگا کی طرف، پورا ہندو بن کر، چلنے لگا، تو چھوٹے دادا کانپنے لگے، مجھ کو بہت سمجھایا، میں نے اُن کی بات نہیں مانی، پھر جگنو سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ منجھلے بھیا اگر جانے ہی کی ٹھان لی ہے تو مجھے اور علی حسین کو ساتھ لے لیجئے ہمارے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور جیب میں چاکو۔ میں نے کہا جگنو کوئی خطرے کی بات نہیں، تمھارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔

یہ کہہ کر میں روانہ ہوگیا۔ اور جب راستے میں مڑ کر دیکھا تو جگنو اور علی حسین نظر آئے، میں نے اشارے سے کہا مجھ سے دور رہو، انھوں نے اپنی چال سُست کردی،

گھاٹ پر پہنچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی، — ہائے وہ دھندلکے کا جادو بھرا گھاٹ، وہ گنگا مائی کا گنگناتا پاٹ۔ وہ الھڑوں کے قدم اُٹھانے کا ڈھنگ، جیسے چلتے پھرتے رنگ۔ گوری نکس چلو مورے سنگ

وہ، بہکی بہکی جوانیاں، وہ حسن کی دھندلی دھندلی گل فشانیاں — وہ متوالی ڈبکیاں، وہ نندا سی انکھڑیاں — وُہ، دھندلکے میں الھڑ کنیّاؤں کا ریلا گویا خواب میں پریوں کا میلا۔ وُہ بھیگی ململ کی ساریوں کی عریاں سامانی، گویا کُہرے میں برستا پانی۔ سنگِ مرمر کے قبّوں کی تابانی۔ وہ پلکوں کی جھپکوں میں بجتی شہ نائیاں، وہ، لہروں میں ڈوبی گدرائیاں وہ، اشنان کا نکھار، وہ مکھڑوں کی چہکار۔ وہ نسیم صبح کی سرسراہٹیں، وہ گلابی مسکراہٹیں۔ وہ کمروں کے لچکاؤ، وہ بے ناچ کے بھاؤ۔ وہ دُھلے دُھلے گال، وہ چِکنے چِکنے خد و خال۔ لہروں میں

وہ ہلکی ہلکی سارنگیاں، اور، وہ ڈوپٹوں میں بھیگی بھیگی نارنگیاں۔

خورشید طلوع ہو رہا ہے

افسانہ ، شروع ہو رہا ہے

اُسی، جادو بھری سہانی فضا میں، میرے من مندر کی وہ دیوی میرے سامنے آئی، گویا گوکل بن میں صبح مسکرائی ۔ اور۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی

جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

پھر اس نے مجھے آواز دی، جوشی بھیا، میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ اور میں جوشی بھیاّ کے مزے میں ڈوبا ہوا، گردن ڈال کر، اس کے ساتھ ہو لیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک جمال و جلال میں ڈوبا ہوا مندر نظر آیا، اس نے اشارہ کیا، اور میں، خدا کا نام لے کر، بت خانے میں داخل ہو گیا، اور بھجن سننے لگا اور، بھجنوں، گھنٹیوں، اور لپٹوں میں ڈوب کر جاری ہو گیا میرے دل کی زبان پر "لا موجود الا اللہ"

اس عالمِ استغراق میں ایک جانب میری نگاہ اٹھی، دیکھا کہ ایک صاحب مجھ کو عجیب کش مکش کے عالم میں، گھور رہے ہیں۔ میرا دل سن سے ہو گیا۔ اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اگر مجھ کو پہچان کر، انھوں نے یہ اعلان کر دیا کہ بھائیو، ہمارے اس مندر میں ایک ملیچھ مسلا بیٹھا ہوا ہے، تو میں، پل بھر میں دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جاؤں گا۔ چھوٹے دادا نے سچ کہا تھا کہ تم بڑا خطرناک کام کر رہے ہو۔

دل سے آواز آئی۔ عشق بازی کرو، اور، پھر بھی مرنے سے ڈرو، مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی، بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ معشوق کے قدموں میں جان دے دو اور باوازِ بلند کہو:-

بجُرمِ عشق مرامی کُشند وغوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ارے تیغ و خنجر — برپا پوش قلندر !

یہ سوچ کر میں نے اپنی طرف گھورنے والے کی جانب پھر نظر اٹھائی، اُس نے، سر کی جنبش سے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی اسی طرح، سلام کا جواب دیا اور اس یقین کے ساتھ کہ مجھ کو پہچان لیا گیا ہے قتل پر آمادہ ہو کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں بھجن ختم ہو گئے، مجمع برخواست ہونے لگا، وہ بھی کھڑی ہو گئی، باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے مندر کے باہر آ گیا۔

ابھی ہم دونوں چند قدم ہی چلے تھے کہ پشت سے آواز آئی، جوش صاحب آداب عرض ہے۔ میں نے مڑ کر جواب دیا۔ دیکھا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو مجھے گھور رہے تھے، انھوں نے، قریب آکر کہا بندے کا نام بدری پرشاد بدر ہے۔ میں نے آپ کو الہ آباد کے مشاعرے میں دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، اور میں آپ کی ادب نوازی اور شرافت کا قائل ہو گیا کہ آپ نے مجھ کو مندر میں دیکھا اور خاموش رہے۔ انھوں نے کہا بندہ پرور میں کائستھ ہوں، ہمارا اور مسلمانوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، آپ شاعر کی حیثیت سے مندر، مسجد اور گرجا، سب جگہ جانے کا حق رکھتے ہیں، آپ کا قیام کہاں ہے، میں جی بھر کے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ آدمی بہت شریف اور بے خطر تھے، لیکن اس خوف سے کہ وہ ہوٹل میں آئیں، اور اُن سے اس کی مڈبھیڑ ہو جائے، میں نے کہا میں آج سہ پہر ہی کو کلکتہ چلا جاؤں گا۔

انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، اور یہ شعر سنا کر چلے گئے۔

میانِ کعبہ و بت خانہ فرق یک گامیست
میانِ شیخ و برہمن، ہزارہا فرسنگ

جب میرے اور بدر صاحب کے مابین بات چیت ہو رہی، وہ، تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی سن رہی تھی۔ اس کے چہرے کا عجیب عالم تھا، اور اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ چہرے پر ایک رنگ آرہا، اور ایک جا رہا تھا۔

راستے بھر وہ کچھ نہیں بولی، اور ہوٹل پہنچتے ہی وہ دھڑام سے بستر پر گر پڑی۔ مجھ سے کہا جلدی پانی لاؤ۔ پانی پی کر وہ اُٹھ بیٹھی، اور کہنے لگی جب وہ آدمی تم سے بات چیت کر رہا تھا، میری چھاتی دھک دھک ہو رہی تھی کہ ہے رام اب کیا ہوگا۔ میں نے کہا، پیاری تمھارے پریم میں مر جانا سو زندگیوں سے بہتر ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور، آنکھیں پوچھتی کالج چلی گئی۔

اتنے میں چھوٹے دادا کمرے میں داخل ہوئے اور، منھ پھلا کر، کہنے لگے، بھائی شبیر حسن خاں اس خطرے میں کب تک پڑے رہوگے۔ میں نے کہا بس دو چار دن اور رہوں گا۔

لیکن ر۔ کماری نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں، کچھ اوپر ایک مہینہ تک مجھے روکے رکھا۔ کیا بتاؤں، ہر دن عید تھا، اور ہر رات شب برات۔

ایک دن وہ انٹرول میں بے حد گھبرائی ہوئی آئی، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، اس نے جلدی جلدی سانس لے کر کہا میرے پتاجی کو میرے پریم کا پتہ چل گیا ہے، یہ خبر اس ہوٹل کے کسی آدمی نے اُن تک پہنچا دی ہے، پتاجی کے تیور بہت برے ہیں، میں تو سب کچھ بھگت لوں گی، لیکن تم آج ہی، بلکہ ابھی ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ میں کرسمس کی چھٹی میں اپنی چاچی سے ملنے لکھنؤ آؤں گی، اپنا پتہ لکھ دو۔ میں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ اس نے کہا اچھا رام رام۔ یہ کہہ کر وہ رک گئی اور چیخ مار کر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر، زور و قطار رونے لگی، میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور ہم دیر تک چمٹے ہوئے روتے رہے — اور اس کے بعد وہ، مجھ کو مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی رخصت ہوگئی اور میرے دل پر بجلی گر پڑی اور میں اسی وقت بنارس سے رخصت ہوگیا۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے   آتا ہے جی بھرا۔ در و دیوار دیکھ کر

ط، ج

ایک بار میرا قیام تھا ایک بہت بڑے شہر میں۔ اور میرے پڑوسی تھے، ایک چالیس سال کے نواب صاحب۔ وہ شعر تو معمولی کہتے تھے لیکن سخن سنجی میں ان کو بڑی دست گاہ حاصل تھی۔

میں گاہ گاہ ان کے محل میں جایا کرتا تھا اور شاعری کے ساتھ ساتھ گانے بجانے کی صحبتیں بھی گرم ہوا کرتی تھیں۔

ایک روز کوئی دس بجے میں ان کے وہاں پہنچا دیکھا کہ اطاق پذیرائی (ڈرائنگ روم) خالی پڑا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ وقت تو ان کے موجود ہونے کا ہے آخر وہ کہاں چلے گئے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بغلی کمرے سے ... بُوا ایک مخملی تھیلی اُٹھائے میری طرف بڑھیں، میں ٹھٹک گیا، بُوا نے مجھے سلام کرکے تھیلی میری طرف بڑھا دی میں نے کہا اس میں کیا ہے، اُنھوں نے کہا الائچیاں، میں نے پوچھا کس نے بھیجی ہیں بُوا نے کہا بی بی[1] جان نے بھیجی ہیں۔ میں نے پوچھا یہ بی بی جان کون ہیں انھوں نے اپنے ہاتوں کی دسوں اُنگلیاں، اپنے ماتھے پر چٹخا کر کہا، اے میں قربان جاؤں نواب صاحب بہادر کی منجھلی صاحب زادی ہیں۔ میں نے بھونچکا ہو کر کہا۔ بوا میں نے تو آج تک انھیں دیکھا ہی نہیں ہے، اُنھوں نے کہا۔ آپ دیکھتے کیسے، وہ تو جم جم پڑے

---

[1] جان کو گھر والے بی بی جان کہتے ہیں۔

میں رہتی ہیں ، البتہ وہ آپ کو اس اوپر کے کمرے سے بار بار دیکھ چکی ہیں ۔ میاں کہنے کی بات نہیں کیا کہوں ۔ یہ ٹانگ کھولوں تو لاج ، وہ ٹانگ کھولوں تو لاج ۔

میں نے کہا ایسی بھی کیا بات ہے کہ کچھ تو بتاؤ بُوا ۔ اُنھوں نے اپنا سفید چونڈا کھجلا کر کہا ، میاں بات یہ ہے کہ اُنھوں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے ، بس آپ ہی کا دم بھرتی رہتی ہیں ، کونوں کھُتروں میں بیٹھ بیٹھ کر آپ کے لئے روتی ہیں ۔ میں نے بی بی جان کو ایک عمل بتا دیا ہے ۔ وہ ہر جمعرات کو آدھی رات کے وقت پاؤں کنوئیں میں لٹکا کر آپ سے ملنے کے لئے وہ عمل پڑھا کرتی ہیں ۔ یہ بات آپ تک رہے ، اگر بی بی جان نے سن لیا تو میرے سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا ۔

میں نے پوچھا نواب صاحب کہاں ہیں ، انھوں نے بتایا کہ وہ شیر کے شکار کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں ۔ اور بیگم صاحب ، اپنی امی جان سے ملنے کے لئے میکے تشریف گئی ہیں ۔

میں نے وہ لچکے پٹھے کی مخملی تھیلی ، بُوا کے ہات سے لے لی ، اور پوچھا بی بی جان کو دیکھوں کیسے ۔ کہ اتنے میں بالا خانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی ۔ بوا نے کہا نگاہ رو برو ۔ میں نے آنکھیں اُٹھائیں تو دیکھا کہ ایک بجلی ہے جو ادھ کھلے پٹ میں لپلپا رہی ہے ۔ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں ، اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پٹ بند کر لیا ۔ ایک تیر تھا کہ میرے دل میں ترازو ہو کر رہ گیا اور ہال پر اندھیرا چھا گیا ۔

بُوا نے کہا اوپر چلیئے ، میں قریب سے بی بی جان کا جھمکڑا دکھا دوں ۔ اور جب میں بُوا کے پیچھے پیچھے اوپر گیا اور دو قدم اس کی طرف بڑھائے ، تو وہ ہائے اللہ کہتی بھاگ گئی ۔

رُک گئی نبض عاشقِ جاں باز
اُف رے تیرا فرار کا انداز

بُوا نے کہا ابھی اللہ رکھے بچی ہیں ، آپ کو دیکھ کر شرما گئیں ، میں نے پوچھا اب کیا ہوگا ۔ اُنھوں نے چھاتی ٹھونک کر کہا ، میں آپ کو ملا کر دم لوں گی ۔

دوسرے دن بُوا میرے پاس آئیں، اور کہا میں نے آپ کا انتظام کر دیا ہے میرا خاوند نواب صاحب کی ڈیوڑھی کا چوکی دار ہے آپ رات کے دو بجے آئیں، میں ہال کا دروازہ اندر سے کھلا رکھوں گی، میرا خاوند آپ کو زنانے مکان کے دروازے تک پہنچا دے گا، وہاں میں کھڑی ملوں گی اور آپ کو بی بی جان کے کمرے میں پہنچا دوں گی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے پائے گی۔

میرا تمام دن اس خوشی میں گزر گیا کہ آج رات کو دو بجے بی بی جان کے پاس جانا ہے۔ دل بار بار قلقاریاں مارتا رہا۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ خبیث آفتاب کب ڈوبے گا۔ دوپہر کا کھانا بھی خوشی میں نہیں کھایا گیا۔ قیلولے کے واسطے لیٹا۔ نواب صاحب کا محل، بُوا کا چہرہ، اور بی بی جان کا جلوا آنکھوں کے نیچے پھرنے لگا۔ خیال آیا کہ اگر میرے پہنچتے ہی جگا ہر ہو گئی تو شاید میری جان چلی جائے، اپنی جان کی پروا نہیں، لیکن اگر اُس نازنین کی رسوائی ہو گئی تو ساری زندگی اس کی بیکار ہو کر رہ جائے گی، میں بوڑھوں کی طرح سوچنے لگا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ جاؤں، بیوی گھر میں موجود ہے میں اس سے شادی تو کر نہیں سکوں گا، کیوں اس کے پاس جاؤں

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میری سوئی ہوئی جوانی بیدار ہو گئی اس نے میرے مُنہ پر طمانچہ اور دل پر گھونسا مارا، بی بی جان کے تصور کو میرے دماغ میں اُبھارا اور کہا کہ تو نہیں گیا تو بی بی جان کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا میں دیوانی جوانی کے بہکائے میں آ گیا، اور رات کے دو بجے جانے کے خیال میں ڈوب گیا۔

خدا خدا کر کے دن ڈوبا، میں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ، خط بنا کر، حمام کیا اچھے اچھے کپڑے پہنے، کپڑوں میں عطر لگایا سامنے چنبیلی کے پھولوں کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی، اس کو منھ کے قریب لا کر، بڑی بڑی گہری سانسوں کے ساتھ سونگھا اور بار بار سونگھا تاکہ دماغ میں تازگی اور چہرے پر شگفتگی آ جائے اور جب پونے دو کا وقت ہو گیا۔ کئی کئی صابون سے پھر منھ دھویا، پھول پھر سونگھے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی، لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کرتے کی جیب میں پستول رکھا، ہات

میں ڈنڈا لیا، اور گھر سے دبے پاؤں نکل گیا۔ ویران گلی پر نگاہ ڈالی، رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سچ ہے چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔

کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچا۔ بُوا کے شوہر نے، جھک کر سلام کیا۔ ہال میں سے ہو کر زنانے مکان کے دروازے پر گیا۔ بُوا نے، میری بلائیں لیں، اور مجھے بی بی جان کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔

خواب گاہ کی سجاوٹ، اور خوش بوؤں کی لپٹ۔ کیا بیان کروں، جنّت کا تصور اُجاگر ہو گیا۔ بی بی جان، سر سے لے کر پاؤں تک رضائی اوڑھے لیٹی ہوئی تھی میں نے پٹی کے پاس کھڑے ہو کر اس کے اعضاء کے پیچ و خم دیکھے۔ خون موجیں مارنے لگا آہستہ سے اس کی مسہری پر بیٹھا، چپکے سے رضائی کھینچی، اس نے اپنا منہ دونوں ہاتوں سے چھپا لیا۔ میں نے اس کی گوری گوری کلائیاں پکڑ کر مُنہ سے ہات ہٹانا چاہا اس نے زور لگایا۔ میں نے اس سے زیادہ زور لگا کر ہات ہٹا دیئے، اور چاند سا مکھڑا جگمگانے لگا اور آرسی مصحف کا مزا آ گیا۔

وہ داہنی پٹی کی طرف، ذرا سی سرک گئی اور میں اس کے معطر پہلو میں لیٹ گیا۔ میں نے کہا میری بی بی جان۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، میں نے کہا کیا بالکل بولو ہی گی نہیں؟ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، تبسّم کی لہریں۔ گلابی ہونٹوں پر دوڑ گئیں۔ میں نے بھینچ کر، اس کو سینے سے لگایا، اس کا دھڑکتا دل، میرے دل پر ضربیں مارنے لگا۔ ہر چند گلابی جاڑے کی رات تھی، لیکن میں پسینے میں ڈوب گیا۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک ایسے انداز سے میری طرف نگاہ اُٹھائی کہ

بسیار شیوہ ہاست بُتاں را کہ نام نیست،،

میں نے کہا بی بی جان، چلتے وقت تو کچھ بات کر لو۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت نمودار ہوئی اور بڑی آہستگی سے کہا، آگ لگے اس دلِ کو، اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی۔ میں نے کہا بی بی جان رخصت کے وقت تو ایسی باتیں نہ کرو

تم سلامت رہو، ہزار برس۔ اتنے میں بُوا آگئیں۔ اُنھوں نے روانگی کا اشارہ کیا اور میں اس پر نظر ڈالتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

اب یہ میرا معمول ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے اس پری وش کے پاس رات کے دو بجے جاتا اور صبح کے چار ساڑھے چار بجے گھر پلٹ آتا تھا۔

اے کہ در کوئے خرابات مقامے داری
جم وقتِ خودی، ار دست بجامے داری
اے کہ با زلف و رُخِ یار گزاری شب و روز
فرصت باد کہ خوش صبحیٔ و شامے داری

اب ایک رات کا حال سُنیئے جو بڑی قیامت کی رات تھی، اور داد دیجیے اس جُرأت رندانہ، اور ہمت مردانہ کی، جو عاشقوں کے دل کے علاوہ، اور کہیں پائی نہیں جاسکتی۔ ایک روز، حسب معمول، میں دو بجے رات کو وہاں پہنچا دیکھا کہ خلاف عادت دربان پڑا سو رہا ہے۔ میں نے، آہستہ سے اُس کو جگایا، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، میں نے پوچھا یہ آج تُم سو کیسے رہے تھے، اس نے کہا آج ناغے کی رات ہے، میری گھر والی، اپنی خالہ کے وہاں گئی ہوئی ہے، وہ کہہ گئی تھی کہ آپ آج نہ آئیں۔ میں نے کہا تم کو چاہیئے تھا کہ مجھ کو آ کر خبر کر جاتے، اس نے کہا سرکار کے پاس گیا تھا، آپ کوٹھی پر نہیں تھے، میں آپ کے خدمت گار جگنو سے کہہ آیا تھا کہ وہ آپ سے کہہ دے۔

میں نے کہا جگنو نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے کہا حضور، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے کہا۔ اب تو میں آگیا ہوں، اندر جائے بغیر مانوں گا نہیں، اس نے حیران ہو کر کہا جائیے گا کیسے، اندر سے دروازہ کون کھولے گا۔ اس کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا، اور بالآخر، ایک تدبیر میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے اس سے کہا پائیں باغ جاؤ، اور پُرانی کی رسی لے آؤ۔ اس نے، بھوچکا ہو کر کہا، خاں صاحب بہادر آپ نے کیا کہا "رسی"؟ میں نے کہا ہاں رسی، اس نے پوچھا رسّی

کیا کیجیے گا۔ میں نے کہا ہے آؤ تو بتاؤں گا۔

جب وہ رسّی لے آیا تو میں نے کہا، اس کوٹھی کے پیچھے جو ایک گرے ہوئے محل کی اینٹوں وغیرہ کی پہاڑی سی بنی ہوئی ہے اُدھر چلو ہم اس پہاڑی کے ذریعے سے اس کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں گے۔ وہاں پہنچ کر، تم میری کمر میں رسّی باندھ کر مجھے اس طرح انگنائی میں اتارنا جیسے کنویں میں ڈول ڈالا جاتا ہے۔ میری اس خطرناک تجویز کو سن کر وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بار بار اپنا سر کھجانے لگا۔ اور ہات جوڑ کر اس نے کہا۔ سرکار یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا آپ بڑے آدمی ہیں، آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں غریب مارڈالا جاؤں گا۔

میں نے کہا، میں تمھاری جان کا محافظ ہوں، تمھارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا یہ دیکھو میری جیب میں پستول ہے، اگر نواب صاحب نے تم کو چھڑا دیا۔ میں اس سے دگنی تنخواہ پر تم کو ملازم رکھ لوں گا۔ اور کل صبح کو تم کو دو سو روپے بھی دوں گا۔ بالکل خوف نہ کھاؤ۔ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔

اس نے کہا بہت اچھا سرکار۔ مگر یہ کام ہے بڑا جان لیوا۔ میں نے کہا بہت آسان ہے، پروا نہ کرو۔

ہم دونوں اس گرے ہوئے مکان کے انبار پر، گھوڑے بن کر چڑھے اور گھٹنوں کے بل منڈیر کی طرف رینگنے لگے۔

بڑی مصیبت یہ تھی کہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اس کوٹھی کے دائیں جانب کے مکان میں ایک دمے کا مریض برابر کھانس رہا تھا اور داہنے طرف کے مکان میں ایک عابدِ شب زندہ دار اوراد پڑھ رہا تھا۔ دونوں طرف جگاہر ہو رہی تھی۔ لیکن میں ہمت نہیں ہارا، اور جب رینگتا رانگتا، منڈیر کے قریب پہنچ گیا، تو ایک کالا سانپ عین میرے منھ کے سامنے کھڑا ہو کر، پھنکاریں مارنے لگا۔ العظمۃ اللہ۔ وہ خوف ناک سماں، وہ موت کا سامنا۔

میں اس کو کیوں کر مارتا۔ اس لیے کہ اگر اس پر ڈنڈا چلاتا تو سارا گھر جاگ اُٹھتا

اس لئے میں نے آنکھیں بند کرلیں ۔دربان دور ہٹ کر بیٹھ گیا اور سانپ کی پھنکاروں کی ہوا میرا ماتھا چھونے لگی۔ اور موت، بھیانک موت میرے دل پر دستک دینے لگی۔ میں نے دل میں کہا شوق سے ڈس لیجئے سانپ صاحب۔

میں اسی طرح دو تین منٹ تک یقینی موت کے سامنے بیٹھا رہا۔ اتنے میں پھنکار کی آواز بند ہوگئی، میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر جان میں جان آگئی کہ ناگ دیوتا رخصت ہو چکے ہیں۔

دربان کو مڑکر دیکھا تو وہ کانپتے ہاتھوں سے اشارہ کررہا تھا کہ اتر چلیئے۔ میں نے بڑے تحکمانہ اشارے سے ہدایت کی کہ وہ میری کمر میں رسی باندھ دے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری کمر میں رسی باندھ دی اور دو زانو ہوکر، مجھ کو نیچے اتارنے لگا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کمر سے کھول دی، دربان نے اوپر کھینچ لی اور میں بی بی جان کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔

لیکن جب میں نے یہ سماں دیکھا کہ اس کی مسہری کی پائینتی والی چارپائی پر ایک مرمرے کے تھیلے کی سی، بڑی بی، بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی ہیں، تو زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور اس قدر بدحواس ہوگیا کہ بی بی جان کی مسہری کے نیچے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کون سا جتن کروں کہ اس فتنۂ خوابیدہ کی آنکھ کھل جائے اور وہ اُن بڑی بی کو وہاں سے چلتا کرے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا ایک بڑی گھونس میری طرف آرہی ہے جیسے ہی وہ میرے قریب آئی، میں نے اس کی طرف زور سے ہاتھ جھٹک دیا وہ گھبرا کر بھاگی تو میز سے ٹکرا گئی، اور میز پر رکھی ہوئی صراحی، دھڑسے زمین پر گر پڑی۔ صراحی کے دھڑاکے سے بڑی بی کی آنکھ کھل گئی، اور وہ چور چور کہتی باہر نکل گئیں ان کے جاتے ہی میں اس کے بستر پر آگیا پہلے تو وہ گھبرا گئی پھر اس نے بستر پر اپنے دونوں پاؤں کھڑے کرکے، مجھ کو ان کے جوف میں لے لیا اور اوپر سے رضائی اوڑھ لی۔

بڑی بی کی صدا سن کر بی بی جان کے چچا کمرے میں داخل ہوئے، پوچھا بیٹی کیا بات ہے، اس نے کہا چچا جان، میرا پاؤں لگنے سے صراحی نیچے گر پڑی اور اچھو خانم نے چور چور کا غل مچا دیا۔ چچا نے ہنس کر کہا اچھو خانم تو ہولا خبطا ہے ہی، بی بی جان نے کہا۔ چچا اب اس کو میرے کمرے میں نہ بھیجئے گا۔ کم بخت اس زور سے خراٹے لیتی ہے کہ نگوڑی نیند اچٹ جاتی ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب اس کے چچا اس سے باتیں کر رہے تھے، ان کا گھٹنا میرے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا۔ اور ڈرنے کے عوض مجھ کو ہنسی آ رہی تھی۔

چچا کے جاتے ہی اس نے اندر سے کمرہ بند کر لیا۔ اور جب میں نے اس سے پورا سانحہ بیان کیا کہ میں کن کن خطروں سے گزر کر اس تک آیا ہوں وہ دنگ ہو کر رہ گئی۔ کہنے لگی اگر تمھارے دشمنوں کو کچھ ہو جاتا، تو میں زہر کھا کر سو رہتی۔ یہ کہتے ہی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں چار بجے کا گجر بجنے لگا۔ وہ مجھ کو گوچھے میں لے کر باہر نکلی، اور، دبے پاؤں، مجھ کو گلے لگا کر رخصت کر دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اس کے بعد نواب صاحب، شکار کے اتنے دھتیا تھے کہ پورے خاندان کو لے کر اددھ فارسٹ چلے گئے۔ اور میں ویران ہو کر رہ گیا۔ میری زندگی کے گلستاں میں خاک اڑنے لگی، حیات کے منھ کا ذائقہ بدل گیا۔ یاروں کے جمگھٹے اور راتوں کے جلسے کھوکھلے اور سپاٹ ہو کر رہ گئے۔ شامیں ہی نہیں صبحیں تک اداس ہو گئیں اور طلوع کی رنگینیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مرتد ہو چکا ہوں اور اپنے رسول کے سامنے جھینپا جھینپا کھڑا ہوا ہوں۔

اس کی مفارقت نے مجھ کو وہ بچہ بنا دیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے اور ہٹڑک ہٹڑک کر، اس کا منھ تتہیا کا سا ہو جاتا ہے۔

اب مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے رخت سفر باندھا، اور اددھ فارسٹ جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گیا، راستے میں کم بخت موٹر خراب ہو گئی۔

اسٹیشن پہنچا تو ریل چھوٹ چکی تھی۔ میں سُن سے ہو کر رہ گیا۔ میں نے قلی سے کہا اگر کوئی مال گاڑی اُدھر جا رہی ہو تو میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ[لہ] لے کر اس میں روانہ ہو جاؤں۔ قلی نے کہا ایک مال گاڑی شاید آدھ گھنٹے میں اسی طرف جانے والی ہے میں بکنگ آفس گیا، بکنگ بابو نے کہا "وہ مال گاڑی نہیں فوجی گاڑی ہے، اس میں آپ سفر نہیں کر سکتے۔ میں نے باہر آکر قلی سے کہا، مجھے اس فوجی گاڑی تک پہنچا دے وہ مجھے یارڈ لے گیا، دور سے گاڑی بتا دی، ہینڈ بیگ میرے حوالے کیا، اور اُجرت سے دُگنا معاوضہ لے کر چلا گیا۔ اور میں گلے میں بیگ ڈال کر، گاڑی چھوٹنے کے انتظار میں زمین پر بیٹھ گیا۔

چوں کہ وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، اور فوجی گاڑیوں تک کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس لئے میں بڑے شش و پنج کے عالم میں یہ سوچتا ہوا بیٹھا رہا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا، تو جاسوسی کے جرم میں کھڑے کھڑے گولی مار دی جائے گی یا گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ خدا خدا کر کے شاید گیارہ بجے انجن نے سیٹی دی، اور میں لپک کر گارڈ کے ڈبے کے پیچھے بمپر پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا، میں نے، جھجکا کر، دونوں ہاتوں سے بمپر کو پکڑ لیا کہ اتنے میں یوروپین گارڈ نے پیچھے کی کھڑکی کھول دی، مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ اُچھل پڑا۔ پستول جیب سے نکال کر، تان لیا، اور ڈپٹ کر پوچھا (who is there) (تم کون ہو) میں نے بڑی مردانہ آواز میں کہا "shut up, that is love affair" (خاموش یہ معاملہ عشق ہے۔ "I am going to my beloved" میں اپنی معشوق کے وہاں جا رہا ہوں۔)

گارڈ اگر ہندوستانی ہوتا تو ٹھائیں سے گولی مار دیتا، مگر وہ انگریز فوجی منچلا انگریز تھا۔ میرا یہ مردانہ جواب سن کر اس نے کہا، بریوو، بریو (شاباش بہادر) اور دونوں ہاتوں سے مجھ کو اندر کھینچ لیا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر، غور سے میرا

لہ ریلوے کا یہ قاعدہ ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر مال گاڑی میں گارڈ کے ڈبے میں سفر کیا جا سکتا ہے

منھ دیکھا اور مسکرا کر کہا "Oh an exact lover's face"

(ارے بالکل عاشق کا چہرہ) اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ، اس نے کہا۔

"Pleas sit down mister lover, I am also a lover" (بیٹھ جائیے، مسٹر عاشق، میں بھی عاشق ہوں)

میں بیٹھ گیا تو اس نیک مرد نے مجھ کو بیئر پلائی، بھنا ہوا گوشت کھلایا، اور جب میرا اسٹیشن آ گیا تو میرے ساتھ آ کر مجھ کو گیٹ سے باہر نکال دیا۔

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا، ستم و جورِ نا خدا کہیئے

اس کے بعد، جب ہم نواب صاحب کے ساتھ، ان کے وطن آ گئے تو دو تین مہینے کے بعد یہ سننے میں آیا کہ بی بی جان کی شادی ٹھہر چکی ہے، یہ خبر توپ کے گولے کی طرح میرے دل پر لگی۔ اور جب، حسبِ دستور، رات کے دو بجے اس سے ملاقات ہوئی تو اس خیال سے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہر چند وہ میرا جوانی کا دور تھا لیکن مجھ پر اس وقت پیرانہ مآل اندیشی طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے میرا عقد تو ہو نہیں سکتا، اور وہ ہمیشہ بِن بیاہی رہے اس کا بھی امکان نہیں اس کی شادی جس سے ٹھہری ہے وہ صحت و شباب کے اعتبار سے ایک کم زور و کم خواندہ رئیس زادہ ہے اس کی صورت میں بھی کوئی دل کشی نہیں، عقل کے اعتبار سے بھی نہایت کم زور ہے، اس کی اور میری پرانی ملاقات بھی ہے، اگر اس کم رو، اور کم زور شخص سے اس کی شادی ہو جائے گی تو وہ کسی طرح بھی بی بی جان کے دل کو موہ نہیں سکے گا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ شادی کے بعد، پردے زردے کی یہ سختی بھی باقی نہیں رہے گی۔ میں جب چاہوں گا، اس سے بآسانی مل سکوں گا، ان تمام باتوں پر غور کر کے۔ میں نے بی بی جان کے دل میں یہ بات اتار دی کہ وہ اپنی شادی سے پریشان نہ ہو۔

عورت منطقی نہیں، جذباتی ہوتی ہے۔ اس لئے لو ہے لگ گئے اس کو سمجھانے میں، ایک ہفتے تک میں بڑے بڑے لکچر دیتا رہا۔ تب جا کر اس نے خودکشی کا ارادہ ترک کیا اور اس شدید اصرار سے بھی دست بردار ہو گئی کہ میں اسے لے کر کسی دوسرے شہر میں بھاگ جاؤں۔

لیکن جب شادی کا دن آیا اور صبح کو اس کی کوٹھی سے نوبت بجنے کی آواز آنے لگی، تو میرا دم لبوں پر آگیا، ساری منطق بھول گیا، اور آنکھوں سے آنسوؤں کا مینھ برسنے لگا۔

میری اس کیفیت کا کسی قدر اندازہ، مندرجۂ ذیل نظم[1] سے لگایا جاسکتا ہے

کدھر ہے اے موت؟ آ، کہ غم سے لبوں پر اب جان آرہی ہے
وہ شمع، جو یادگار شب تھی، اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے
دُہائی حسنِ خجستہ خو کی، کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
چھٹے ہوؤں کو ملا رہی ہے، ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے
اُدھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیامِ شادی
اِدھر نسیمِ سحر کی جنبش، ترانۂ غم سنا رہی ہے
اُدھر، عروسی لباسِ زریں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
ادھر، کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پنھا[2] رہی ہے
قدیم پیغام بَر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے
اِدھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، اُدھر، شگوفے کھلا رہی ہے
اِدھر، کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگِ ناگہانی
اُدھر شبستانِ رنگ و بو میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے
اِدھر عرق ہے مری جبیں پر اُدھر جھمکتی ہے جوشِ افشاں
اِدھر لبوں پر ہیں سرد آہیں اُدھر صبا گنگنا رہی ہے

---

[1] مطبوعہ "نقش و نگار"۔ ایسے بے کراں شدید جذبۂ غم میں یہ نظم کہی تھی جب شعر کہنا امکان سے خارج تھا۔
[2] صحیح لفظ "پہنانا" ہے۔ مجھ سے شدت غم کی بدحواسی میں غلطی ہوگئی۔

اور، اسی سلسلے کی ایک دوسری نظم بھی سن لیجیے :۔

کیا وہ بتائے کیا کیا ، عشوۂ روزگار نے
مارا ہو جس غریب کو حُسنِ وفا شعار نے
اب وہ شہیدِ التفات ، دل کی گرہ کسے دکھلائے
بند کیا درِ طرب ، جس پہ کشودِ کار نے
سمجھے گا کون نکتہ رس ، اس کی حدیث خونچکاں
جس کا لہو بہا دیا ، تیغِ وفائے یار نے
کون یقین لائے گا ، کس سے کہوں یہ ماجرا
لوٹ لیا مرا چمن ، عربدۂ بہار نے
مصحفِ انبساط نے ، آیۂ حزن پیش کی
فتح سے دور کر دیا ، نصرتِ کردگار نے
مجھ کو دُرِ نشاط نے ، اشکِ الم عطا کیے
شام شکست نذر کی ، صبحِ ظفر شکار نے
حُسن کے جذبِ عشق نے ، دل کو تباہ کر دیا
پھول کی روح کھینچ لی ، شبنمِ اشکبار نے
بھیس میں آ کے عشق کے ، جوش تجھے مٹاؤں گا
مجھ سے ، قسم یہ کھائی تھی ، حسنِ ستم شعار نے

ج ب۔ ع خ

ایک[1] بار دفتر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھا کہ میری بیوی تخت پر متمکن ہیں، اور صوفے پر ایک بیس اکیس برس کی نہایت قبول صورت خاتون بیٹھی ہوئی ہیں میں یہ سمجھ کر کہ کوئی پردہ نشین میری بیوی سے ملنے آئی ہوئی ہیں، جب اُلٹے پاؤں باہر جانے لگا تو میری بیوی نے، رُکتی سی آواز میں کہا یہ تم سے ملنے کو مدراس سے آئی ہیں۔

میں پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرف بڑے معصومانہ انداز میں دیکھنے لگا کہ وہ اس خاتون کا مجھ سے تعارف کرادیں۔

جب بیوی کچھ نہیں بولیں اور، منھ پھلائے، گُم سُم بیٹھی رہیں، تو میں ایک عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ بیوی کی موجودگی میں یہ ہمت تو پڑی نہیں کہ اس آنے والی سے براہ راست بات کروں ــ آخر کار تنگ آ کر میں نے بیوی سے پوچھا آپ کون ہیں؟ بیوی نے کہا تم خود پوچھ لو، میں کیا کروں گی بول کے۔

اس آنے والی نے عجیب شش و پنج کے عالم میں نظر اٹھائی، اور کہا میں آپ سے ملنے کے لئے مدراس سے آئی ہوں۔ میرا نام ہے " ج۔ ب۔ رہنے والی یو۔پی کی ہوں، مگر قیام ہے مدراس میں ــ میرے دل میں تین شخصیتوں

---

[1] یہ غالباً ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ جب کہ میں حیدرآباد دکن میں تھا

یعنی ابوالکلام آزاد، انور پاشا اور آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، انور پاشا کا انتقال ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے مل چکی اور آج آپ سے ملنے آئی ہوں، مجھے شاعری سے بیحد شوق ہے، آپ کی کتاب "روحِ ادب" شروع سے آخر تک مجھے یاد ہے، میں آپ کی بے حد عقیدت مند ہوں، میں نے، آج سے کئی برس پہلے، آپ کی ایک نظم "جنگل کی شاہزادی کا یہ آخری شعر جب پڑھا تھا:۔

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

تو میں رونے لگی تھی، اور ابھی میں رو ہی رہی تھی کہ نانی جان آگئیں، انھوں نے مجھ سے پوچھا اری کیوں رو رہی ہے، میں نے کہا جوش صاحب کو آپ جانتی ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں جانتی ہوں، میں نے کہا تو جوش صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے، جنگل میں گاڑی رکی، وہ ریل سے اُتر کر، جنگل کی سیر کرنے لگے، اور اس قدر محو ہو گئے کہ گاڑی چھوٹ گئی، اور وہ جنگل میں رہ گئے، نانی جان اللہ سے دعا کیجیے کہ اُن کی جان بچ جائے، میری نانی جان نے، قہقہہ مار کر کہا اری دیوانی تو شاعروں کی بات پر نہ جا، یہ روز مرتے اور روز جیتے ہیں۔

چاہئے تو مجھے یہ تھا کہ یہ ماجرا سن کر، میں اس سے گھل مل کر باتیں کرتا، مگر بیوی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اس لئے میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کے بے وقوف آدمی کی طرح، اس کی طرف دیکھ کر گدّی کھُجلانے لگا۔

اس نے مجھ کو غور سے دیکھا، معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے کہا آپ کا مکان شہر سے دُور ہے، یہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی، میں جس ٹیکسی پر آئی تھی اسے رخصت کر دیا ہے، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھ کو میری سہیلی کے مکان تک پہنچا دیجیے، جس کے پاس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔

میں ایک عجیب اُدھیڑ بن میں پڑ گیا، جاتا ہوں تو بیوی کو ناگوار گزرے گا

نہیں گیا تو اس کو رنج ہوگا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں۔
آخر یہ فیصلہ کرکے کہ اُسے اُس کی جائے قیام تک پہنچا آؤں۔ میں اُٹھا بیوی کی جانب نگاہ نہیں اٹھائی، اس سے کہا چلئے میں پہنچا آؤں۔
وہ مجھ سے چھ سات میل کے فاصلے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ جب میری گاڑی ایک بہت بڑے بند کی سڑک سے گزرنے لگی، اُس نے مجھ سے کہا جوش صاحب بڑی پیاری شفق پھولی ہوئی ہے۔ پل بھر گاڑی روک لیجئے کہ یہ منظر دیکھ لوں۔
جب گاڑی رک گئی، اس نے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا اور اپنی بھری بھری انگیا سے ایک پرچہ نکال کر میرے ہات میں دے دیا۔
پرچہ پڑھا تو اسے اظہارِ عشق سے لبریز پایا۔ میرے ہات کانپنے لگے۔ ط۔ج کی مفارقت کا گھاؤ ابھی مندمل نہیں ہوا تھا اور اس وقت تک میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں نے جیب سے قلم نکالا اور اس پرچے کی پُشت پر یہ لکھ کر کہ میں آج کل، بُری طرح، زخمی ہوں، کسی نئے زخم کی تاب نہیں لا سکتا۔ ایک نہایت طویل بیداری کے بعد اب کوشش کر رہا ہوں کہ سو جاؤں، مجھ کو جگائیے نہیں۔
میرے جواب کو پڑھ کر، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ آنکھوں میں نمی آگئی، اس نے، بڑی بے کسی کے ساتھ کہا، تو پھر مجھے یہیں اُتار دیجئے۔ میری سہیلی کا مکان قریب آگیا ہے، میں پیدل چلی جاؤں گی۔
یہ سن کر میں کانپ گیا، اُس کا ہات اپنے سینے سے لگا کر، کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو یہیں اُتار دوں، آپ کو میرے دل کا حال نہیں معلوم، آپ کی طرف میرا دل کھنچ رہا ہے، مگر ــــ اُس نے آس ٹوٹ جانے کے بعد آس بندھ جانے کی نظر سے مجھے دیکھا، اور کہا، آپ کا شکریہ۔
راستے بھر وُہ خاموش رہی، اس خاموشی میں ہزاروں باتیں تھیں، جنہیں کانوں نے نہیں دل نے سن لیا۔

میں نے دل میں کہا میاں جوش خدارا پھر کسی نئے تہلکے میں نہ پڑ جانا، سنبھلے رہو اپنے کو، اب عشق کیا تو مرکر رہ جاؤ گے خاں صاحب۔

اتنے میں اس کی سہیلی کا مکان آگیا۔ میں نے موٹر سے اُتر کر دروازہ کھولا وہ اُتری، پوچھا تھوڑی دیر بیٹھئے گا بھی نہیں ؟ میں نے کہا خود میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ بیٹھ جاؤں اور پہروں بیٹھوں مگر ـــ میں پھر کسی وقت آؤں گا اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا، میں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا حُسنِ مغموم میرے دل کو زخمی نہ کردے، فوراً آنکھیں جھکالیں، اور جلدی سے، روانہ ہوگیا۔

گھر آیا، بیوی کو آگ بگولا پایا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں، اور کہا اور تو اور، اب تو میری آنکھوں کے سامنے تم عشق بازی کرنے لگے ہو، میں نے کہا اشرف جہاں اللہ اللہ کرو۔ تم میری ایک شرافت اور مروّت کی بات کو عشق بازی کہ رہی ہو۔ میں اور عشق، الٰہی تیری پناہ۔ یہ سُن کر انھوں نے میرے گریبان پر ہات ڈال دیا، اور اسے، چَرسے، پھاڑ ڈالا۔ اور کہا جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسو، میں نے کہا خدا کے واسطے بات سمجھنے کی کوشش کرو، اور یہ سوچو کہ کوئی اتنا بڑا سفر طے کر کے میرے گھر آئے، اور، گِھگھیا کر کہے کہ مجھے میری جائے قیام تک پہنچا دو، اور میں اُس کو ٹکا سا جواب دے دُوں یہ بات شرافت کے خلاف ہے، ارے تم شرافت کو بھی عشق بازی سمجھتی ہو، یہ تو بڑا اندھیر ہے۔

بیوی نے کہا اچھا قسم کھا کر بتاؤ اس پَخنیدی کے ساتھ، اس کے گھر جا کر بیٹھے تھے کہ نہیں، میں نے کہا، بیٹھنا کیسا، میں نے تو اس کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا

بیوی نے کہا تم سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا سکتے ہو؟ سانچ کو آنچ نہیں، لے آؤ قرآن، وہ قرآن لے آئیں، میں نے سر پر قرآن رکھ کر قسم کھالی۔ اُن کا غصّہ ٹھنڈا ہوگیا۔ کہنے لگیں، ناحق میں نے تمھارا گریبان پھاڑ ڈالا۔ لاؤ سی دُوں۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد، میں دفتر میں بیٹھا تھا. چپراسی نے آکر کہا کوئی بیگم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں. اور ٹیکسی میں بیٹھی انتظار کر رہی ہیں. نیچے اُترا تو دیکھا وہی ہے. صاحب سلامت کے بعد. اس نے کہا موٹر میں آجایئے. میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا. کہ آپ آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے لیکن آئے نہیں.

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے شوفر سے کہا باغ . . . . لے چلو

باغ میں موٹر ٹھہری، اس نے کہا آیئے اس کنج میں تھوڑی دیر بیٹھ جائیں

کنج میں بیٹھتے ہی اس نے کہا جوش صاحب، آپ کا کلام پڑھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے. لیکن دیکھا تو وہ پتھر نکلا. سچ بتایئے، شعر آپ خود کہتے ہیں یا کوئی اور آپ کو لکھ کر دے دیتا ہے ؟

میں نے کہا میں آپ کے پاس کل آنے والا تھا. آتا اور ضرور آتا. آپ اس قدر بدگمانی سے کام نہ لیں ـ طبیعت کی ناسازگاری کی بنا پر کل پرسوں نہیں آسکا. اس نے مسکرا کر کہا جس کی طبیعت ناساز ہوتی ہے اس کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو چھوڑنے والی نہیں، اسی وقت میرے ساتھ . . . . . نہر کے کنارے چلئے. یہ کہتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی، موٹر میں آتے ہی اس نے شوفر سے کہا پہلے مجھ کو جہاں سے لائے ہو وہاں لے چلو. اور جب گاڑی اس کی قیام گاہ پر آکر رکی، اس نے کہا، جوش صاحب اندر آیئے میں . . . . نہر پر اپنی سہیلی کو بھی لے چلوں گی ـ

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی سہیلی کو آواز دی کہ ادھر آؤ، جوش صاحب کے ساتھ . . . . . نہر پر چلنا ہے ـ

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلی آگئی، سرمئی دُلائی اوڑھے اور اس کا سرا منھ پر ڈالے ہوئے. میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا گویا اُفق کے گریبان سے آفتاب طلوُع ہو رہا ہے. اور جب اس نے اپنی گوری ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے پان دیا، تو میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہات کی ہتھیلی پر، مہدی کا ہلال بنا ہوا ہے اور اس ہلال کے اندر مہدی ہی سے لکھا ہوا ہے " جوش " میں نے اپنے آپ

کو حد سے زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی، پھر بھی میرے تمام بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی ۔۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

الغرض کھانے پینے کا سامان لے کر ہم تینوں، .... نہر کی طرف روانہ ہو گئے راستے میں مجھے خیال آیا کہ بیوی پریشان ہوں گی، اور بدگمان بھی، میں نے ایک موڑ پر گاڑی رکوا دی، اور اپنے ایک دوست سے بیوی کو ٹیلی فون کرا دیا کہ آج میرے گھر جلسہ ہو رہا ہے، اس لئے جوش صاحب کو میں نے روک لیا ہے، وہ کل دوپہر تک گھر پہنچ جائیں گے۔

..... نہر کے کنارے پہنچ کر ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے، میں نے کہا ہم تھوڑی دیر آرام کر لیں یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے آدھا یا پون گھنٹہ ہوا ہو گا کہ "ج۔ب" نے آکر میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے، اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ بھی آکر میرے پاؤں دبانے لگے۔ سہیلی نے کہا باجی میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ لیکن جب اس نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی آکر پاؤں دبانے لگی۔

میں نے کہا ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں، برائے خدا ایسا نہ کیجئے میں شرم کے مارے کٹا جا رہا ہوں۔

لیکن وہ نہیں مانیں، اور میں دس پندرہ منٹ کے بعد، شرم کی تاب نہ لا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور منھ ہات دھونے کے لئے غسل خانے چلا گیا، میرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی "ج۔ب" بھی آ گئی، اور ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی سہیلی کو بھی وہیں بلا لیا،

مجھ سے اُن دونوں کی موجودگی کے باعث اچھی طرح منھ نہیں دھویا گیا، اور جب الٹا سیدھا منھ دھو کر، میں تولیا کی طرف بڑھا تو "ج۔ب" نے کہا نہیں تولیہ نہیں، میں اپنے ڈوپٹے سے آپ کا منھ پوچھوں گی۔ میں کیا کرتا، اُس نے اپنے

ڈوپٹے سے میرا منھ پوچھا، پھر اُس نے مجھ سے کہا آپ کرسی پر بیٹھ جائیں اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ جگ سے میرے پاؤں دھلادے، اس نے تعمیل کی۔ اور جب میرے پاؤں دُھل گئے تو ڈوپٹے کے عوض اس کی سہیلی نے اپنی زلفیں کھول کر میرے پاؤں پوچھنا شروع کر دیئے، میں اُس کی اس وضع سے گھبرا گیا، پاؤں کھینچ لئے اور شرم کے مارے پسینے پسینے ہوگیا۔

اب شام ہوگئی، رسٹ ہاؤس کے بُوائے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جاکر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں ہائے وہ رنگین شام، وہ سامنے دو گل فام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام — وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پہ ابر کے ہلکے ہلکے ٹکے، وہ لہروں میں ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چادر، مدھ بھری انکھڑیوں میں جادو ٹونا۔

جب میں نے اس حلقۂ جمال میں دو پیگ ختم کرکے، تیسرا پیگ بنا کر، سامنے رکھ لیا، تو "ج - ب" نے مجھ سے پوچھا وہ "جنگل کی شاہزادی" سچ مچ تھی، یا خیالی، تو میں نے کہا میں نے آج تک کوئی خیالی اور ہوائی نظم نہیں کہی ہے۔ اُس نے کہا آپ نے اپنی اس نظم میں اُس جنگل کی لڑکی کا جو حسن وجمال بیان کیا ہے، اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں اور جب میں نے کہا قطعی کوئی مبالغہ نہیں ہے تو اس نے کہا جب آپ اس کو بھول گئے تو ہمیں بھی بھول جائیں گے۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہوگا، میرا دل ایک مرقّع ہے جس میں اس کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے، اسی طرح آپ کی تصویر بھی لگی رہے گی، اس نے کہا آنکھیں بند کر لیجئے اور میرے سر کی قسم، جب تک میں نہ کہوں میچے ہی رہئے۔

جب میں نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے میری آنکھ کا بوسہ لے لیا، مجھ پر ایک ناقابل شرح کیفیت طاری ہوگئی، پھر اس نے سہیلی سے کہا آ تو دوسری آنکھ کا بوسہ لے لے۔ اُس نے کہا باجی میرا ہیاؤ نہیں پڑ رہا ہے میری طرف سے آپ ہی بوسہ لے لیں۔ اُس نے چٹ سے میری دوسری آنکھ

کا بھی بوسہ لے لیا ۔ اور میرا سر ہوا میں اُڑنے لگا ۔ اُس نے کہا آپ آنکھیں کھول دیجئے ۔ اور مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی

چوتھا پیگ ختم کرکے میں نے کہا اب اندھیرا ہوگیا ہے ، آئیے رسٹ ہاؤس چلیں ۔

ناہموار ساحل سے جب موٹر کی طرف چلا ، ایک بہت نکیلا پتھر میرے گٹے میں چبھ گیا ۔ اور خون نکلنے لگا ، "ج ۔ ب" نے اپنا پلّو پھاڑ کر سوڈے میں تر کیا ۔ اور میرے گٹّے پر باندھ لیا ۔

اب ہم آکر موٹر میں بیٹھ گئے ، میرے بائیں طرف "ج ۔ ب" اور داہنی طرف اس کی البیلی سہیلی "ع ۔ خ" بیٹھ گئی ۔

موٹر نے ابھی ، بمشکل آدھا فرلانگ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی سہیلی نے مجھ سے کہا ذرا اپنا گٹّا دکھا دیجئے ۔ میں نے گٹّا اس کی طرف بڑھا دیا ، اس نے اپنی کلائی میرے گٹّے پر چسپاں کر دی ،

ج ۔ ب نے پوچھا کیا کر رہی ہے ، اس نے کہا باجی ۔ میں نے اپنی کلائی کو دانتوں سے لہو لہان کرکے اس کو جوش صاحب کے گٹے پر اس لئے چسپاں کر دیا ہے کہ جوش صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے

یہ سنتے ہی "ج ۔ ب" سہیلی سے بگڑ گئی ۔ اور کہنے لگی میں تو یہاں تجھے تفریح کرانے لائی تھی ۔ تُو تو جوش صاحب سے عشق لڑانے لگی ۔

سہیلی نے روہانسی آواز میں کہا باجی آپ انسانی ہمدردی کو عشق لڑانا کہہ رہی ہیں ۔ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی ۔ اتنا کہ کر اس نے پلّو سے منھ چھپا لیا اور رونے لگی ۔

اب ہم رسٹ ہاؤس پہنچ گئے ۔ میں نے دیکھا "ج ۔ ب" کی آنکھوں میں رقابت کی سرخی اور "ع ۔ خ" کی انکھڑیوں میں ، گھٹن کی ملگجاہٹ پائی جاتی ہے ۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ "ج۔ب" کے مزاج میں نپولین کی سی سختی اور "ع۔خ" کے مزاج میں حضرت مسیح کی سی نرمی کارفرما ہے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے "ع۔خ" کو حکم دیا کہ تم اس سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ تمہارا کھانا ادھر ہی بھیج دیا جائے گا۔ وہ اداس ہوکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے، میرے دل کو بڑا دھکا لگا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

وہ رسٹ ہاؤس کی رات، عجیب رات تھی۔ جس میں شیرینی بھی تھی، تلخی بھی۔ کیف بھی تھا، کرب بھی، "ج۔ب" کی موجودگی کا نوش بھی تھا، اور "ع۔خ" کی غیر موجودگی کا نیش بھی۔

میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو میں یہ کہوں کہ ہر چند "ج۔ب" کی بھرپور جوانی، اور اس کے رخساروں کی گل فشانی بے حد نظر فریب تھی۔ لیکن ہائے اس کی سہیلی "ع۔خ" کا مکھڑا۔ اور اس مکھڑے پہ اس کی مسکینی کا جمال، میرا دل ٹوٹ کر اس پر آچکا تھا۔

اب سنئے اللہ کا کرنا کیا ہوا، اس واقعے کے دو ماہ بعد۔ جب میں "ج۔ب" کا تار پاکر مدراس گیا، اور اس کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا، اس کے پانچویں دن "ع۔خ" بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں[1] پہنچ گئی۔

اس کو دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ، دوڑ کر "ج۔ب" سے لپٹ گئی۔ "ج۔ب" نے اپنے چہرے کی تلخی پر جھٹ سے نقاب ڈال کر، اس کا ماتھا چوم لیا۔

"ع۔خ" نے اس کے یعنی "ج۔ب" کے چہرے کی تلخی محسوس کرلی تھی، اس لئے

---

[1] اس کے بھائی کو کسی ضروری کام سے مدراس جانا تھا۔ اس نے، یہ سوچ کر کہ میں وہاں موجود ہوں اپنے بھائی سے استدعا کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو، سمندر کی ہوا سے میری صحت درست ہوجائے گی۔

اس کو اپنے ماتھے کے چوم لئے جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، اور اُس کی جھکی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں مومن کا یہ شعر سر پٹیتا نظر آیا۔

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں، کوچۂ رقیب میں بھی، سر کے بل گیا

"ج۔ب" نے ہم دونوں کی طرف بار بار نظر اُٹھائی۔ اور، بڑی تلخی کے ساتھ، میرے کان میں کہا آگ، دونوں طرف لگ چکی ہے۔ اور میں بیچ میں کھڑی جل رہی ہوں

اُس کو دوسرے کمرے میں لیجا کر میں نے کہا تمھارا یہ خیال غلط ہے، مجھ کو محبّت تم سے ہے۔ اور ترس اس پہ آتا ہے کہ اس بیچاری کی صحت روز بروز گرتی چلی جارہی ہے۔

"ج۔ب" نے کہا۔ اچھا قسم کھا کر کہو تم میرے ہو یا اس کے؟ میں نے قسم کھا کر کہا میں تمھارا اور صرف تمھارا ہوں، اُس نے کہا عورت سے زیادہ کوئی محبّت کی نظر کو پہچان نہیں سکتا۔ تمھاری نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس ہڈیوں کے ملبے پر دل جان سے فدا ہو چکے ہو۔

بات تو اس نے سچی کہی تھی، لیکن میں نے، دھاندلی اور بے ایمانی سے کام لے کر اُس سے کہا تم دھوکا کھا رہی ہو۔ کہہ چکا ہوں کہ اس کی صحت کی خرابی پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے، تم ترس کھانے والی نظر کو محبّت کی نظر سمجھ بیٹھی ہو، یہ تمھاری بڑی نادانی ہے۔ ارے کہاں تم اور کہاں وہ۔

چہ نسبت خاک را، با عالمِ پاک

اُس کے چہرے پر بحالی آگئی۔ اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں صرف اُسی کو چاہتا ہوں، اس نے "ع۔خ" کو جو باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑے پیار سے آواز دی کہ وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو، یہاں چلی آؤ، وہ کبک دری کی طرح قدم اُٹھاتی خوش خوش آئی اور میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

لہ معاف کیجیے۔ ایک بڑی ان مل بے جوڑ بات لکھ رہا ہوں۔ یعنی آج ۱۳، نومبر، ۱۹۶۷ء کو پونے تین بجے

میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ " ع۔خ " کی جانب نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس لئے کہ ایسا کیا تو پکڑا جاؤں گا۔ میں، سختی سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا۔ لیکن اُسے کیا کرتا کہ میرا چہرہ پھُرپھُرانے اور الف ہونے لگا۔ اتنے میں "ج۔ب" کوئی چیز لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بے حد عجلت کے ساتھ ع۔خ کی طرف نگاہ اٹھائی، اس نے میری جانب دیکھا، نظروں میں دو دو باتیں ہوگئیں اور اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا۔

"ج۔ب" نے پٹ کی آڑ سے یہ ماجرا دیکھ لیا، وہ کمرے میں آئی "ع۔خ" سے کہا آؤ میں تمھارا کمرہ تمھیں دکھا دوں، اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں، اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

"ع۔خ" کو اس کے کمرے میں بٹھا کر وہ میرے پاس آئی، اس کا منھ پھولا اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے کہا۔ کیوں صاحب یہ نظروں کا ملاؤ اور چھاتی کا کٹاؤ کیسا تھا۔

میں نے کہا تمھارے جاتے ہی دروازہ کھٹ سے بولا۔ میری نظر اُٹھ گئی، اتنے

سہ پہر کے وقت، جب کہ میں اس سطر کو تمام کرکے، آگے بڑھنے والا تھا۔ میری وفادار بیوی یخنی کا پیالہ ہات میں لئے آئیں اور کہا، جلدی سے کلّی کرکے، اسے پی لو، اور، گُڑ کے ہاتوں، وہ شکھاڑے اور بتاسے بھی کھالو۔ جو میں نے تمھارے واسطے منگائے ہیں، اور، کھا پی کر، تھوڑی دیر کے واسطے آرام کرلو، صبح چار بجے سے لگاتار لکھ رہے ہو، اب تین بجے کا عمل ہے، بس لکھنا بند کردو۔

میں نے دل میں سوچا کہ اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ میں اپنے حالاتِ عشق لکھ رہا ہوں، تو پیالہ ان کے ہات سے چھوٹ جائے، اور مجھ پر برس پڑیں کہ آج بھی میرے دل میں جوانی کی یادیں مچلتی رہتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ہر چند میں اُن کی سرکار جمال کا نمک حرام ہوں، پھر بھی اُن کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ، یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ جو زریں پر دوں کی چڑیاں، میری جوانی کے موتی چگنے کے لئے، مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں، میری جوانی کے ختم ہوتے ہی، وہ پھرّا مار کر اڑ چکی ہیں، اور، ہزاروں شکنیوں کے باوصف، میری بیوی آج تک میری محبّت کا دم بھر رہی ہیں۔

اللہ کرے میری محراب پیری کی یہ شمع تاباں، کم سے کم، اس وقت تک روشن رہے، جب تک کہ میرا چراغ حیات گل نہ ہوجائے۔

عشق و محبت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ عشق کا نشہ۔ جوانی کے بعد اتر جاتا ہے اور محبت کا نشہ، جوانی کے بعد اور بھی چڑھ جاتا اور، ہر آن، تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں تمھاری سہیلی کو کھانسی آگئی، فرطِ کرب سے اس نے اپنے سینے پر گھونسہ ماریا، یہ دونوں عمل فطری تھے، اس میں بدگمانی کی کیا بات۔

اس نے بگڑ کر کہا، میں اِن باتوں میں نہیں آنے کی، کان کھول کر سن لیجئے صاحب، میں آپ کو اپنے ہات سے نکلنے نہیں دوں گی، اب مجھے آپ، اور اس پر سختی کرنا پڑے گی، میں نے کہا تم شوق سے سختی کرو، سرِتسلیم خم ہے، لیکن وہ سختی ایک بدگمان دل کی بے جا سختی ہوگی۔

اتنے میں ایک نوعمر بے حد گھبرایا ہوا آیا، اس نے ج۔ب" سے کہا خالہ جان سلام میری ماں پر دل کا دورہ پڑگیا ہے، جلدی میرے ساتھ چلئے "ج۔ب" بد حواس ہوگئی، مجھ سے کہا میری بڑی بہن کے دل پر دورہ پڑا ہے، میں اُن کی تیمار داری کے واسطے جارہی ہوں، اللہ خیر کرے، میں رات گئے آجاؤں گی، لیکن نہ آؤں تو آپ پریشان نہ ہو جئے گا، یہ کہتے ہی وہ دیوانہ دار اٹھی اور، تیزی کے ساتھ زینہ طے کرکے، مکان سے چلی گئی۔ اور میں زینے کا دروازہ بند کرکے، اپنے کمرے میں آگیا۔

میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ، دبے پاؤں "ع۔خ" آگئی، پوچھا باجی کہاں گئی ہیں؟ میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اور، اس کے پہلو میں جاکر بیٹھ گیا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھیں میری طرف اُٹھائیں اور کہا میں یہاں ناحق آئی، باجی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے پردہ شروع کردوں، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میں نے اس کو سینے سے لگالیا، اور کہا تم اُن کی سختی کی پروا نہ کرو، وہ میرے دل پر حکومت نہیں کرسکتیں، ان کی مجال نہیں کہ تمھاری محبت کو میرے دل سے نکال دیں۔ اس نے پوچھا آپ میرے ہیں؟ میں نے، اس کا ہات چوم کر کہا تمھارا نہیں تو اور کس کا ہوسکتا ہوں، اُس کے لبوں پر تبسّم آگیا اور میں نے اُس کو آغوش میں لے لیا۔

صبح ہوتے ہی "ج۔ب" آگئی، اس کے چہرے پر شب بیداری کے آثار تھے

میں نے پوچھا۔ خیریت تو ہے۔ اس نے کہا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بہن کی جان بچ گئی، لیکن یہ تمھارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے، کیا رات بھر جاگتے رہے ہو۔ میں نے کہا تمھاری مفارقت نے سونے نہیں دیا، جھپکیاں لے لے کر رات گزاری ہے، اور پھر اس خیال سے بھی پریشان رہا کہ تمھاری بہن پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا "ع۔خ" تو اس طرف نہیں آئی تھی، میں نے کہا تمھارے جاتے ہی میں نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا، کوئی نو بجے تمھارا ملازم کھانا لے کر آیا، بس اتنی دیر کے لئے دروازہ کھلا۔ کھانا کھایا نہیں گیا۔ تمھاری جدائی میں، در و دیوار سے رونے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ دو چار الٹے سیدھے لقمے نگل کر، نوکر کو رُخصت کر دیا۔ اور بستر پر لیٹ کر، کروٹیں لینے لگا۔ اللہ نے صبح ہوتے ہی، تمھاری چاند سی صورت دکھائی تو جان میں جان آئی۔

میری اس مکمل ایکٹنگ کا اُس پر بڑا اثر پڑا۔ مجھے۔ بڑھ کر، سینے سے لگا لیا اور کہا آؤ، ہم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں، دو گھڑی پڑ کر سو جائیں۔

ہم دونوں کوئی دس بجے سو کر اٹھے، نہائے دھوئے، ناشتہ کیا، اور نوکر سے اُس نے کہا "ع۔خ" کے کمرے میں ناشتہ پہنچا آؤ۔

اِن مراحل کے بعد اس نے کہا آج سرِ شام سمندر کے ساحل پر چلیں گے اور شام ہوتے ہی جب ہم روانہ ہونے لگے "ع۔خ" کالا برقع اوڑھے آئی، اور کہا باجی، ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے، باجی یہ سن کر چند سیکنڈ کے واسطے خاموش ہو گئیں، اور پھر، کہا اچھا، تم بھی چلی چلو۔

"ج۔ب" نے مجھ کو موٹر کے دروازے کے پاس بٹھایا، بیچ میں خود بیٹھی اور "ع۔خ" کو اپنے پہلو میں بٹھا دیا۔ اور ٹیکسی روانہ ہو گئی، ساحل کی طرف۔

"ع۔خ" نے، "ج۔ب" کی آنکھ بچا کر اور اپنے ہاتھ کو اس کے پیچھے دراز کر کے، میرے ہات میں ایک پرچہ دے دیا، جس کو میں نے جلدی سے شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

"ج۔ ب" سنک گئی، اُس نے موٹر رکوا دی، مجھ سے کہا فٹ پاتھ پر آئیے اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا ۔ اب وُہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ مرد، مرغوں کی طرح، کئی کئی مرغیوں پر حکومت کریں، آپ صاف صاف بتادیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا "ع۔ خ" سے۔ میں نے کہا اللہ ری بدگمانی، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے محبّت کرتا ہوں، اس نے قلم اور کاغذ دے کر، مجھ سے کہا، یہ بات اس کاغذ پر لکھ دیجیئے۔ میں نے بادلِ ناخواستہ وہ بات لکھ دی، ۔ اس نے کہا یہ پرچہ اپنے ہات سے "ع۔خ" کو دے دیجیئے، میرا ہات کانپنے لگا، اس نے پرچہ میرے ہات سے چھین کر "ع۔خ" کے ہات میں دے دیا۔ اس نے پرچہ پڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

اب ہم ساحل پر آگئے، لہریں بجلی کی روشنی میں جگمگ جگمگ چمک رہی تھیں، مان سُون کا زمانہ تھا، سمندر اچھل اچھل کر ہونک رہا تھا، اور اُس کے سیاہ بخارات بچھوں کی صورت میں پرواز کر رہے تھے،

"ع۔ خ" عین سمندر کے کنارے جاکر کھڑی ہوگئی، اس کے اس طرح ہٹ کر کھڑا ہو جانے سے میرے دل پر بڑی چوٹ لگی، مگر منھ سے اُف تک نہیں کی۔

اتنے میں پاور ہاؤس کی کسی خرابی کی بنا پر روشنیاں گُل ہوگئیں "ج۔ب" نے مجھ سے کہا منظر بھیانک ہو چکا ہے، آئیے گھر چلیں، یہ کہتے ہی اُس نے میرا ہات پکڑ کر سیڑھیاں طے کرنا شروع کر دیں، میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، "ع۔خ" کہیں نظر نہیں آئی۔ ۔ میں نے اس سے اپنا ہات چھڑا لیا۔ اور دیوانہ وار اس کا نام لے لے کر، اُسے پکارنے لگا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، اتنے میں بجلی چمکی، اور مجھ بدبخت نے یہ دیکھا کہ وہ سمندر کی بپھری موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہے

ہر چند مجھے پیرنا نہیں آتا، اور گھرے ٹب میں بھی ڈوب سکتا ہوں

لیکن میں نے پروا نہیں کی اور چھم سے سمندر میں کود پڑا۔

سمندر کی موجیں ساحل کی طرف آ آ کر اسے میری طرف ڈھکیل رہی تھیں میرا ایک ہاتھ ساحل کے چبوترے پر ٹکا ہوا، اور دوسرا ہاتھ اسے پکڑ لینے کے واسطے بڑھا ہوا تھا۔ کہ اتنے میں کسی اللہ کے بندے نے مجھ سے کہا یہ چھتری لیجئے اور اس کی موٹھ اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچ لیجئے۔

اتنے میں سمندر کی موجیں زیادہ تیزی کے ساتھ میری طرف آنے لگیں، میں نے، حواس درست رکھتے ہوئے، چھتری کے ہینڈل کو اس کے برقعے میں پھنسا کر، اسے کھینچنا شروع کر دیا، اور دل میں ارادہ کر لیا کہ اگر اسے اُوپر نہ لا سکا، تو چبوترے پر سے ہاتھ ہٹا کر خود کو سمندر کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن قسمت نے میری مدد کی، میں نے اُس کے برقعے سے اُلجھے ہینڈل کو، زور سے کھینچنا شروع کر دیا۔ اور جب وہ قریب آ گئی، تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی، اور ساحل کی سیڑھیوں کی طرف اُسے کھینچنے لگا۔ اس نے چیخ مار کر کہا، مجھ کو اب زندگی کی طرف واپس نہ لے جاؤ، یہ کہ کر، وہ بے ہوش ہو گئی، اور میں اُس کو کھینچ کر ساحل کی طرف لے آیا۔ اور چبوترے پر لٹا دیا۔ ہزاروں تماشائیوں نے مجھ کو حلقے میں لے لیا۔ "ج۔ب" نے کہا اب کیا کرو گے۔ میں نے کہا ہسپتال لے جاؤں گا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ٹیکسی لے آیا، لوگوں نے میری مدد کی اور پھر اسے ٹیکسی میں ڈال کر ایک یوروپین اسپتال میں لے گیا۔ اور ایک ادھیڑ انگریز نرس کی سرکردگی میں تین چار ہندوستانی نرسیں اس کی تیمار داری میں سرگرم ہو گئیں۔

"ج۔ب" اس کی پٹّی کے پاس کھڑی ہو گئی، اور میں، پاگلوں کی طرح، برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ اور اسپتال کا عملہ مجھ کو غور سے دیکھنے لگا — ایک جوان یوروپین نرس نے مجھ سے کہا آپ گھبرائیں نہیں، وہ جلد ہوش میں آ جائے گی۔

آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ کو چکر پہ چکر آنا شروع ہوگئے۔ وہ جوان نرس دوڑی ہوئی کمرے میں گئی اور دوا کا ایک گلاس دے کر، کہا اسے فوراً پی لیجئے۔ میں نے دوا پی لی۔ سر کا چکر، تھوڑی دیر میں کم ہوگیا

کوئی سوا گھنٹے کے بعد جب اُسے ہوش آیا، تو اس کی نحیف آواز سنائی دی " جوش، جوش، جوش۔

میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا، اور اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو اُبلنے لگے

ادھیڑ نرس نے۔ اشارے سے کہا کہ میں اس کے ساتھ برآمدے میں چلا چلوں برآمدے میں پہنچ کر اس نے، انگریزی میں پوچھا آپ کا نام۔ میں نے بتایا جوش اس نے کہا یہ جوان عورت جو کمرے میں کھڑی ہوئی ہیں، یہ اس مریضہ کی کون ہیں، میں نے کہا بڑی پرانی سہیلی، اس نے پوچھا آپ مریضہ کے قرابت دار ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ آپ مریضہ کو کب سے جانتے ہیں؟ میں نے کہا دو تین مہینے سے، میں تو اس کمرے میں کھڑی ہوئی خاتون کا ملنے والا ہوں۔

پھر اُس نے سوال کیا کہ اس پرانی سہیلی پر تو کوئی اثر نہیں تھا، آپ تو مریضہ کو فقط دو ماہ سے جانتے ہیں، آپ اس قدر بے تاب کیوں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ میں شاعر ہوں، شاعروں کے دل نرم ہوا کرتے ہیں۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ مریضہ نے، ہوش میں آتے ہی، اپنی پرانی سہیلی کے بدلے، آپ ایک نئے آدمی کو کیوں پکارا؟ میں نے جواب دیا اس عظیم سانحے کے باعث اس کے حواس میں پراگندگی آگئی ہے۔

نرس نے میرے چہرے کو بغور دیکھا، اندر چلی گئی، اور فون کرنے لگی، میرا ماتھا ٹھنک گیا، ہونہ ہو یہ پولیس کو بلا رہی ہے۔ اور اس کو یہ شبہ ہوگیا

ہے کہ یہ عاشقانہ خودکشی کا واقعہ ہے۔

اُس وقت مجھے وُہ پرچہ یاد آگیا جو "ع۔خ" نے مجھے موٹر میں دیا تھا، اس لئے اسے دیکھنے کے لئے میں غسل خانے چلا گیا، پرچہ نکالا، وہ بھیگ کر خراب ہو چکا تھا صرف پہلی سطر پڑھ سکا، جس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ میری زندگی باجی اور آپ کی بیوی کے واسطے ایک عذاب بن چکی ہے۔ اس لئے۔۔۔ اس کے آگے پڑھا نہیں گیا، میں نے پرچہ پھاڑ کر، نالی میں بہا دیا۔ اور سیدھا "ع۔خ" کے پاس جا کر کان میں کہا۔ پولیس اگر بیان لینے آئے، تو میرے سر کی قسم تم یہ کہنا کہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہنا۔

اتنے میں پولیس آگئی اور ایک سارجنٹ نے اس سے پوچھا آپ سمندر میں کیسے گر گئی تھیں، اس نے کہا پاؤں پھسل گیا تھا۔ سارجنٹ نے دریافت کیا آپ کو کسی نے دھکّا دے دیا تھا، اُس نے کہا نہیں، اس نے سوال کیا کیا آپ کے دل کو کسی نے دھکّا دے دیا تھا۔ اس نے زبان سے تو کہا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ تو کہئے خیر یہ ہوگئی کہ سارجنٹ اس کے سرہانے کے ڈسک پر کہنیاں ٹیکے اس کا بیان لے رہا تھا، وہ اس کے آنسو دیکھ نہیں سکا، ورنہ بڑی آفت آجاتی۔

جب سارجنٹ بیان لے کر چلا گیا تو میرے پیٹ میں سانس آئی ۔ نرس نے مجھ سے کہا چوں کہ یہ خاتون بے حد نازک اور کمزور ہے، میں رات بھر اس کو اسپتال میں رکھوں گی، اور اس کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو کل دوپہر تک چھٹی دے دوں گی ۔ اب آپ جائیں اور صبح خبر لینے آئیں

"ج۔ب" نے کہا جوش صاحب آیئے اب گھر چلیں ۔ میں اس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ اور اس سے کہا تم جاؤ۔ میں رات یہیں بسر کروں گا۔ اُس نے کہا رہئے گا کہاں۔ میں نے کہا اسی لان پر، اس نے کہا سردی میں اکڑ جایئے گا،

لہ پورا مکالمہ یاد نہیں رہا ہے

اور مینھ برسنے لگے گا تو؟ میں نے جواب دیا برآمدے میں چلا جاؤں گا۔ یہ سن کر اس نے بڑے طنز سے کہا اُفوہ، آپ تو بڑے جاں باز عاشق نکلے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ اور وہ، سخت بدمزہ ہو کر چلی گئی۔

اب میں، نم خوردہ لان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور، پان کی ڈبیا نکالنے کے لئے جیب میں ہات ڈالا تو معلوم ہوا کہ جیب کٹ چکی، اور روپے کا بٹوہ غائب ہو چکا ہے۔ دھک سے ہو کر رہ گیا، خیال آیا کہ اب کیا ہوگا، صبح کو اسپتال کا بل کیوں کر ادا کر سکوں گا۔ سوچا کہ "ج۔ ب" سے جا کر روپیہ لے آؤں، غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ اور پھر یہ بھی سوچا کہ وہ یہاں سے آٹھ دس میل دُور رہتی ہے، ٹیکسی کا کرایہ کہاں سے لاؤں گا۔ اُس سے کرایہ بھی دلواؤں۔ قرض بھی مانگوں، یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

حسنِ اتفاق سے وُہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر، جس نے مجھے برآمدے کی کرسی پر بٹھا کر، دوا پلائی تھی۔ برآمدے سے گزر کر جب کسی کمرے کی طرف مڑنے لگی، مجھ پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور، دبے پاؤں میرے پاس آکر پوچھا کیا آپ تمام رات اس لان پر گزار دیں گے۔ میں نے کہا جی ہاں، اس نے کہا آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ میں جھیل لوں گا۔ اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا آپ میرے کمرے میں چل کر آرام کریں — میں ساتھ ہو لیا — اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر، اس نے، جلدی جلدی، کھڑکیوں کے تمام پردے گرا دیے،، دروازہ بند کر لیا، بڑی مہربانی کے ساتھ مجھے صوفے پر بٹھایا، الماری کھولی، برانڈی اور بیئر کی بوتل نکالی۔ سامنے کی میز سے، دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اٹھالائی، برانڈی میرے سامنے رکھ دی اور خود بیئر پینے لگی۔

جب ہم دونوں پی چکے، وہ تلے انڈے اور توسٹ لے آئی، اور ایک گدّے لگی بید کی بنچ پر، تکیے لگا کر مجھے لٹا دیا، کمرے کی لائیٹ گل کر دی۔

غسل خانے کا دھیما بلب جلا دیا، اور مسہری پر جاکر لیٹ گئی۔

میں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ سو جاؤں، مگر نیند نہیں آئی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگا، اور دیکھا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہے

ابھی میں اسی کرب کے عالم میں تھا کہ وہ، بڑی احتیاط کے ساتھ، اپنی مسہری سے اُٹھی، آہستہ آہستہ میری طرف آئی، اور جُھک کر، میرا منھ دیکھنے لگی۔ اور، جب میں نے اُس کی طرف آنکھیں اٹھائیں، اس نے، بڑی دھیمی آواز میں پوچھا۔ کیا نیند نہیں آرہی ہے؟ میں نے، بنچ پر بیٹھتے ہوئے، کہا بالکل نہیں۔ اس نے میری کلائی پکڑ کر کہا چلیے میرے بستر پر۔ وہاں نیند آجائے گی میں اٹھا، اور اس کی مسہری پر، جاکر، لیٹ گیا۔ اور، اس نے، اپنا ہات، تکیے کے طور پر میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اور میری نیند اور بھی اُچٹ گئی،

صبح جاگتے ہی ہم دونوں نے تبسّم کا تبادلہ کیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا بل بتا دیجیے تاکہ میں اپنی قیام گاہ پر جاکر روپیہ لے آؤں۔ اس نے، آنکھیں جُھکا کر، کہا بل میں ادا کر دوں گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ میرے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہوگئی۔ اور، تھوڑی دیر کے بعد، اس کا دوبارہ شکریہ ادا ، اور ہفتے کی شام کو ملنے کا وعدہ کرکے، میں اسپتال سے باہر آگیا، اور گیٹ پر کھڑے ہوکر سوچنے لگا کہ بل تو خیر وہ ادا کر دے گی، لیکن نرسوں وغیرہ کو انعام کہاں سے دوں گا، اور "ع۔خ" کو ٹیکسی پر لے جاؤں گا تو کیا "ج۔ب" سے کرایہ دلاؤں گا، اور، فرض کیجیے کہ یہ بھی ہوگیا تو میں اس عالمِ افلاس میں یہاں رہوں گا کیوں کر؟ پھر خیال آیا کہ تار دے کر گھر سے روپیہ منگالوں، لیکن سوال یہ ہے کہ تار کیسے دوں؟

میرا سر چکرانے لگا، اور کبیر کا یہ دوہا یاد آگیا "اک دن آن پھنسو گے پیارے جیسے بن کا ہرنا"

اِس ادھیڑ بُن میں جب گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ریاست ٹونک کے دیوان، قاضی سر عزیز الدین صاحب موٹر سے گزر رہے ہیں جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں، قاضی صاحب نے موٹر رکوالی، دوڑ کر میرے گلے مل گئے، اور کہا ارے یہ دولتِ غیر مترقبہ اور مدراس میں۔ آپ کب آئے اور یہاں اس طرح اداس کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔؟

میں نے کہا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اُس نے آپ کو اس وقت، میرے پاس بھیج دیا۔ اگر آپ کے سے بے تکلف دوست کے بدلے کوئی اور آتا، تو میں اُس سے اپنا عالم کیوں کر بیان کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب نے گھبرا کر، کہا جلدی کہئے، بات کیا ہے۔ میں نے کہا جیب کٹ گئی ہے اور پورے تین ہزار غائب ہو چکے ہیں، قاضی صاحب نے کہا، کوئی اپنی پوری پونجی بٹوے میں رکھ کر باہر نکلتا ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے، اور پانچ ہزار کے نوٹ، ایک پرس میں بھر کر، میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کر کے کہا میں گھر جا کر یہ رقم واپس کر دوں گا۔ انھوں نے، میرا گریبان پکڑ کر کہا مجھ سے اور اس قدر غیریت کی باتیں ۔ اب ناشتہ کر کے جایئے گا، اور کل رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایئے گا۔

میں غسل اور ناشتہ کر کے جانے لگا، انھوں نے کہا آپ میری گاڑی پر جائیں، تاکہ میرا شوفر آپ کا گھر دیکھ لے، اور کل آپ کو یہاں لے کر آجائے۔

میں اُن کی موٹر پر اسپتال پہنچا "ع۔خ" کو بحال پایا، دل کی کلیاں کھل گئیں۔ اس نے پوچھا باجی ساتھ نہیں آئیں۔ میں نے کہا وہ تو رات ہی کو چلی گئی تھیں، اس نے پوچھا آپ کہاں رہے۔ میں نے کہا اسی اسپتال میں۔ اس کی آنکھوں میں کام یابی اور تشکّر کے آنسو آگئے۔

جب اسے لے کر "ج۔ب" کے وہاں پہنچا تو اس نے، چھوٹتے ہی کہا، اگر

تم ڈوب جاتیں، تو ہم لوگ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرتے۔ میں نے سوچا اللہ اکبر، رقابت بھی بڑی بدبلا ہوتی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ اگر تم، خدا نخواستہ ڈوب جاتیں تو میرا دل شق ہو جاتا، یعنی اس کے نہ ڈوبنے کی اس کو صرف اس لئے خوشی ہوئی کہ وہ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرنے کے عذاب سے بچ گئی۔

اللہ رقابت کی ڈاہ سے بچائے۔

وہ دونوں سہیلیاں ابھی تک، خدا کے فضل و کرم سے بقیدِ حیات ہیں ایک کلکتہ میں رہتی ہے، ایک مدراس میں۔

میں جب ہندوستان جاتا ہوں تو فرض کرکے، اُن دونوں سے ملتا ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری ہر نظر ہینکڑوں افسانے کہنے لگتی ہے۔ تمام مناظر اور تمام واقعات ہمارے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ اور ہمارے مابین کے تمام رنگین مکالمے، گونجنے لگتے ہیں ہمارے کانوں میں۔

ابھی دو ڈھائی برس کی بات ہے کہ میں ہندوستان گیا اور "ع۔خ" کو تار دے کر دہلی بلا بھیجا تھا۔

مدّت کے بعد جب ہماری آنکھیں چار ہوئیں، فریقین ڈوب گئے ماضی کے سمندر میں، اور ایک دوسرے سے دیر تک بات نہ کر سکے۔

اس ملاقات سے متاثر ہو کر، میں نے، اسی زمانے میں، جو چند رُباعیاں[1] کہی تھیں، آپ بھی انھیں سن لیں۔

---

[1] وہ رباعیاں مندرجۂ ذیل تمہید کے ساتھ میرے ایک مجموعے میں شائع ہو چکی ہیں۔
حسن و عشق کا باہمی ارتباط، شباب کے مہکتے خیاباں سے ہوتا ہوا، جب شیب کے دہکتے ریگستان میں قدم رکھتا ہے، اور، تسلسلِ عشق و درازیٔ عمر کے گرم و سرد دریا، جب آگے بڑھ کر ایک ہو جاتے ہیں، تو تھکی ہوئی زندگی کے سامنے، ایک ایسا دھندھلا ساحل آجاتا ہے کہ اس کی بے پناہ اداسیوں پر نگاہ کرکے، اگر روتے روتے آنکھیں پھوٹ جائیں، اور دھڑکتے دل ڈوب جائیں، تو یہ ایک ایسا متوقع حادثہ ہوگا کہ کسی دیکھنے والے کو اس پر تعجب کرنے کی جرأت نہیں ہو سکے گی۔ کون اس عبرت ناک صورتِ حال کا اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ ماہ و سال کا وزن، جب گردن کو خم کر دیتا ہے تو اس وقت، ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے سے گردن کے اعصاب، اور دل کی رگوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جس پر بیتا کبھی پڑی ہی نہ ہو وہ کیوں کر سمجھ سکتا ہے کہ جب چاہنے والے کا چہرہ اُدھڑ، اور محبوبہ کا مکھڑا اُجڑ جاتا ہے، اور اس اتھاہ

مدھم مدھم ہے، ضوفشانی اُس کی
سونی سونی ہے راج دھانی اُس کی
طالع ہو، مرے دل کے اُفق پر اُے موت
مائل بغُروب ہے، جوانی اُس کی

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ
پھر یارِ قمر جبیں کا اُترا چہرہ
شاید مرے چہرے کو منانے کے لئے
اس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی پہ بَل کھاتی ہے
پازیب اُتارے انھیں جگ بیت چکا
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

بے کسی کے عالم میں، مزلیقین کی خوگرِ جمال آنکھیں، جب ایک دوسرے کا اُترا ہوا منھ دیکھتی ہیں، تو وہ لمحہ اس قدر جاں کاہ ہوتا ہے کہ صرف زمین و آسمان ہی نہیں، خود سنگ دل موت کراہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جوانی کے تلخ و شیریں عشق پر تو ہزاروں دیوان موجود ہیں، لیکن وقت گزیدہ عشق و حسن پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔ شاید میں پہل کر رہا ہوں۔ لیکن اس شرمندگی کے ساتھ کہ میرے دل پہ جو بیت چکی اور بیت رہی ہے، اس کا کروڑواں حصہ بھی سپردِ قلم نہیں کر سکا ہوں۔

انجام کے آغاز کو دیکھا میں نے
ماضی کے ہر انداز کو دیکھا میں نے
کل نام ترا لیا، جو بوئے گل نے
تا دیر اس آواز کو دیکھا میں نے

بے مائگیِ نیاز و افلاسِ گداز
ناداریِ عشوہ و تہی دستیِ ناز
کوتاہ نگاہوں کو بتاؤں کیوں کر
کیا حادثۂ عظیم ہے عمر دراز

آنسو آنکھوں میں کس لئے ہیں، اے جان
جھوٹا ہے یہ آئینہ مری بات کو مان
میری آنکھوں میں دیکھ اپنا مکھڑا
تو کیوں ہے اداس اداس تیرے قربان

پانی کی جھڑی، ملھار گاتی تھی کبھی
بدلی ہر آن گھڑ گھڑاتی تھی کبھی
میری نگری سے اے گزرنے والے
برکھا اس دیس میں بھی آتی تھی کبھی

چہرے ہیں اداس اداس گم سُم طرفین
اچھا ہے کہ اَندھی ہی رہے پیت کی رین
لہجوں ہی سے دیکھیں گے ہم اک دوسرے کو
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

کاش، اہلِ چمن، یہ باغباں کو سمجھائیں
جھونکوں کو یہ حکم دے کہ دھومیں نہ مچائیں
تا۔ صبح کو غنچوں کے چٹکنے کی صدا
مرجھائے ہوئے پھول نہ سُننے پائیں

تیری زُلفوں میں ہے کہانی میری
تیری پلکوں میں پریشانی میری
یہ جو تری آنکھوں میں ہیں غلطاں ڈورے
گزری تھی یہیں سے کل، جوانی میری

تصانیفِ جوشؔ

رُوحِ ادب	۱۹۲۱ء
نقش و نگار	۱۹۳۵ء
شعلہ و شبنم	۱۹۳۶ء
فکر و نشاط	۱۹۳۷ء
جنون و حکمت	۱۹۳۷ء
حرف و حکایت	۱۹۳۸ء
آیات و نغمات	۱۹۴۱ء
عرش و فرش	۱۹۴۴ء
رامش و رنگ	۱۹۴۵ء
سُنبل و سلاسل	۱۹۴۷ء
سیف و سُبو	۱۹۴۷ء
سرود و خروش	۱۹۵۳ء
سموم و صبا	۱۹۵۵ء
طلوعِ فکر	۱۹۵۷ء
الہام و افکار	۱۹۶۶ء
نجوم و جواہر	۱۹۶۶ء

جوش اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲۷

اکبر روڈ - صدر - کراچی نمبر ۳